دارالعلوم دیوبند کا ترجمان
دارالعلوم
فروری
مدیر
حبیب الرحمٰن قاسمی

فہرست مضامین

ختم خریداری کی اطلاع

یہاں اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے، اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عبیر داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کردیں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔
- بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس الرحمن سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

اداریہ

حرفِ آغاز

دینی مدارس کے طلبہ واساتذہ
اسٹاف اور تمام مسلم عوام کے متفقہ مطالبات

۲۱/۲۲ نومبر ۱۹۹۴ء کی شب میں (I.B) - (انٹلی جنیس بیورو) کی غلط خبروں کی بنیاد پر دلی سے بھیجے گئے کمانڈوز اور مرکزی فورس اور ان کے ساتھ تعاون کرنے والے پولیس افسران نے دارالعلوم ندوۃ العلماء پر عین دو بجے جب کہ سارا شہر سو رہا تھا' اور دن بھر پڑھنے والے طلبہ آرام کر رہے تھے' جو مجرمانہ' دہشت گردانہ اور ظالمانہ حملہ کیا ہے اور جس سے اب لاعلمی کا مظاہرہ مرکزی حکومت کے ذمہ دار اور ریاستی حکومت کے کارپرداز کر رہے ہیں۔ اس سے ہندوستانی انتظامیہ کے دیوالیہ پن حکومت کی خوفناک سازش اور ہندوستانی فوج اور پولیس کے اندر تعصب' منافرت اور فرقہ واریت کے مسموم اور زہریلے اثرات پھیل جانے کا واضح ثبوت ملتا ہے۔

اس سے پہلے اس سے ملتا جلتا واقعہ دارالعلوم دیوبند کے ساتھ ہوا' اور پھر دینی مدارس کے ساتھ مجرمانہ اور فرقہ وارانہ کارروائیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

ہم ان واقعات کو جزوی اور اتفاقی واقعات کی حیثیت سے نہیں دیکھتے بلکہ ہمارے نزدیک بابری مسجد کی شہادت اور پھر ہزاروں بے گناہ نہتے اور امن پسند مسلمان شہریوں کا بے دریغ قتل اور ان پر انسان نما بھیڑیوں اور درندوں کو حملہ کرنے کی کھلی چھوٹ اور ٹاڈا کے کالے اور ظالمانہ قانون کی آڑ میں ہزارہا ہزار مسلمانوں کو اذیت ناک سزائیں ان کی حرمتوں پر حملہ اور مسلمانوں کی اجتماعی کردارکشی (DEMORALIZATION) اور حکومتی

سطح کی دہشت گردی (TERRORIZATION) یہ سب مسلمانوں کو مشکوک و مشتبہ بنانے کی ایک گھناؤنی، شرمناک اور مجرمانہ پالیسی ہے۔ جس کی ذمہ دار بنیادی طور پر مرکزی حکومت ہے۔ بی، جے، پی۔ وشوہندو پریشد۔ شیوسینا۔ بجرنگ دل اور ان جیسی کھلی دشمنانہ تنظیموں سے ہم واقف ہیں، ان کی پالیسیاں سب کو معلوم ہیں لیکن سیکولزم اور جمہوریت (DEMOCRACY) پر یقین کا دعویٰ کرنے والے اور اقلیتوں کی بہی خواہی کا دم بھرنے والے جب اس سازش میں ملوث ہوں تو یقیناً ہم کو زیادہ چوکنا ہونا پڑے گا، اور ازسر نو اپنے رویہ کے بارے میں سوچنا ہوگا۔

ہندوستان ہی نہیں برصغیر میں پھیلے ہوئے دینی مدارس صرف علم دین کے محافظ ہی نہیں بلکہ انسانیت، اخلاق، شرافت، حب الوطنی اور وفاداری کے مضبوط قلعے ہیں جہاں سے جہاد آزادی کی تحریک کو اصل سرمایہ ملا، ان ہی مدارس میں پڑھنے والے مجاہدین نے انگریزوں کا مقابلہ کرکے اس ملک کو آزاد کرایا، ان کو پھانسی پر چڑھایا گیا، کالا پانی بھیجا گیا، ان کی املاک وجائداد کو تباہ کیا گیا لیکن انھوں نے اس ملک اور اس کی عزت و آزادی کی خاطر ہر قربانی دی، اور ہر مصیبت کو خندہ پیشانی کے ساتھ سینہ سے لگایا۔

یہ مدرسے ایک ایک صدی سے بلکہ اس سے بھی زائد عرصہ سے قائم ہیں حکومتیں آئیں اور چلی گئیں، بساط سیاست بھی اور لپیٹ دی گئی لیکن حق وصداقت اور انسانیت وشرافت کے یہ قلعے محفوظ رہے۔

آج ان مدارس کو آئی، ایس، آئی اور دہشت گردوں کا اڈہ بتانا اور ان پر چھاپہ مارنا ایک ایسا گھناؤنا اور بدترین جرم اور اور ایسی مجنونانہ کارروائی ہے جسے کسی طرح برداشت نہیں کیا جائے گا۔ ان مدارس کے طلبہ کی شرافت انسانیت اور بلند اخلاق کا اعتراف ہر ضلع اور شہر کے حکام کو ہے، ان مدرسوں کا کوئی طالب علم ڈبوں کے شیشے توڑتا ہے، نہ ریلوں کی چین پلنگ کرتا ہے، نہ پتھر چلاتا ہے، نہ کسی پر بیجا ہاتھ اٹھاتا ہے اس نے نہ کسی مندر کو توڑا، نہ دھرم شالہ کو، اس نے احتجاج او مظاہروں کے عام

طریقوں کو بھی اختیار نہ کیا، اس کے ہاتھ سے آج تک کسی کی نکسیر نہیں پھوٹی اس پر الزام تراشی
س کی کردار کشی، اس کو بدنام کرنے کی سازش حکومت وقت اور اس کے انتظامیہ کا
کھوکھلا پن، دیوالیہ پن اور ایک دہشت گردانہ کارروائی ہے، کیا حکومت کے ذمہ داروں
کو بابری مسجد شہید کرنے والوں کی دہشت گردی اور درندگی نظر نہیں آتی کیا پورے
ملک اور خاص طور پر بمبئی وسورت کے شہروں میں ہزاروں نہتے اور بے گناہ مسلمانوں پر
وحشیانہ مظالم کرنے والے مجرم دکھائی نہیں دیتے، دہشت گرد اور آئی۔ ایس۔ آئی
کے ایجنٹ کیا بعید ہے کہ حکومت کی صفوں میں پائے جاتے ہوں، دہشت گرد انتظامیہ
میں چھپے ہیں، دہشت گردوں کو تلاش کرنا ہے تو کورٹ سے ان مجرموں کی فہرست
طلب کی جائے جنھوں نے اجودھیا جیسے پر امن شہر میں بربریت اور وحشیت کا
ننگا ناچ کیا، دہشت گردوں کو تلاش کرنا ہے تو آر۔ ایس۔ ایس اور وشو ہندو پریشد
بجرنگ دل اور شیوسینا کے دفتروں اور اداروں میں تلاش کیا جائے اور اپنی دہشت
گردی کا سبق پر امن شہریوں کو نہ پڑھایا جائے، ورنہ پورا ملک خون کے سمندر میں
ڈوب جائے گا۔

مندرجہ بالا وضاحت اور حقائق کی بنیاد پر ہمارے مندرجہ ذیل مطالبات ہیں،

۱: مدارس کے خلاف اس گھناؤنی سازش کے تیار کرنے والوں اور اس کو روبہ عمل لانے والے مجرموں کو قرار واقعی سزا دی جائے

۲: مرکزی و ریاستی حکومتیں صاف طور پر اعلان کر دیں کہ یہ دینی مدارس انسانیت اور تہذیب و شرافت کے پاسبان ہیں، ان کا دہشت گردی سے کوئی سروکار نہیں اور آئندہ کے لئے ایسی تمام کارروائیوں کا سدباب کیا جائے جو ان دینی مدارس کے وقار کو مجروح کرتی ہوں۔

۳: حکومت ان تمام متعین اور معلوم مجرمین کو سزا دے جو بابری مسجد کی شہادت اور مسلمانوں کے خلاف فسادات بھڑکانے، خون کی ہولی کھیلنے اور فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کے مجرم ہیں۔ جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ بار بار کی انکی تفتیش

کے بعد ان کو ان مدارس میں کوئی مجرم نہ مل سکا، مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے اگر ہمارے ان مطالبات کو پورا نہ کیا تو ان کے خلاف ہماری تحریک چلتی رہے گی۔

جہاں تک ہمارے عوام کا تعلق ہے ان سے ہماری مندرجہ ذیل اپیل ہے:

۱: مسلمانوں کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ ان کے خلاف پورے ملک میں فرقہ وارانہ منافرت پھیلائی جارہی ہے اور کھلی اور چھپی فسطائی طاقتیں ان کے وجود کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کو اشتعال دلاکر اور ان کے جذبات بھڑکا کر ان کو پولیس اور فوج کی گولیوں کو نشانہ بنانے کی مسلسل منصوبہ بندی کی جارہی ہے۔

اس صورتِ حال میں مسلمانوں کو ہوشیار رہنا ہے اور اپنے اندر شعور کی پختگی اور بالغ نظری پیدا کرنا ہے، اپنے اتحاد کو کسی حال میں پارہ پارہ نہیں ہونے دینا ہے اور اپنے دین اور سنت رسول صلے اللہ علیہ وسلم پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے اپنی دینی قیادت کا ساتھ دینا اور اس کی اطاعت کرنا ہے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ ہمارا متفق علیہ ملی ادارہ ہے ہمیں اس کی آواز پر لبیک کہنا ہے اور نظم واجتماعیت کو قائم رکھتے ہوئے اس کی بات ماننا ہے۔

۲: دینی مدارس اسلامی، ملی تشخص کے محافظ و پاسبان ہیں ان ہی مدارس سے آپ کو علما، فضلا، داعی، مبلغ، مفسر و محدّث، مفتی و قاضی، امام و خطیب اور ملی قائدین ملتے رہے ہیں، اگر ان پر حملہ ہوتا ہے اور ان کی عزت پر آنچ آتی ہے اور ان کا وقار مجروح ہوتا ہے۔ تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ پوری ملت کی آبرو اور عزت پر حملہ کیا جاتا ہے جس کو ملت کبھی گوارا نہیں کرے گی، لہٰذا تمام مسلم خواص وعوام، تمام تنظیموں اور اداروں کے ذمہ دار مرکزی حکومت سے خاص طور پر اور ریاستی حکومتوں سے عام طور پر مطالبہ کریں کہ آئندہ ایسے کسی واقعہ کو نہ دہرایا جائے اور لاکھوں کی تعداد میں صدر جمہوریہ، وزیر اعظم اور وزیر داخلہ کو اس مضمون کے خطوط اور تار بھیجیں کہ:

"ہم اپنے دینی مدارس اور اداروں کی کردارکشی اوران میں پولیس اور فورس کی مداخلت کو سختی سے مسترد کرتے ہیں اور اس کا مطالبہ کرتے ہیں کہ ایسی فرقہ وارانہ اور ظالمانہ پالیسی بنانے والوں اور اس کا نفاذ کرنے والوں کو سخت سزا دی جائے اور دینی مدارس کی شاندار تاریخ آزادی کی جدوجہد میں علماء کی قربانیوں اور مدارس کے پرسکون ماحول کی قدر کی جائے" اور آئندہ کے لئے اس قسم کی ہر کارروائی پر مکمل روک لگائی جائے"۔

دوسری طرف وہ اپنی اپنی سطح پر اجتماعات کرکے اور اس قرارداد کو پاس کرکے اخبارات اور ذمہ داران حکومت کو ارسال کریں۔

۳۔ ہم اپنے عوام سے تیسری اور آخری بات یہ کہتے ہیں کہ فرقہ پرست طاقتوں سے ہوشیار رہیں اور ملک کے پرامن شہریوں سے کبھی بھی اشتعال کی بات نہ کریں اور اپنے ہندو بھائیوں کو اس کا اطمینان دلائیں کہ ہماری لڑائی آپ سے نہیں ہے ہم اور آپ ایک کشتی کے سوار ہیں، ہماری لڑائی ان طاقتوں سے ہے جنھوں نے ظلم کو شیوہ بنالیا ہے اور جن کے ظلم وجرائم کے نتیجہ میں اللہ کا عذاب کبھی زلزلہ اور کبھی طاعون کی شکل رونما ہوتا ہے، اس لیے ہماری اپیل ملک کے تمام پرامن شہریوں سے بھی ہے کہ وہ ہمارے اور اپنے مشترک کاز کے لیے ہمارے ساتھ شریک ہوں۔

اعتکاف سنت

رمضان المبارک کے آخری عشرے میں جو اعتکاف کیا جاتا ہے وہ اعتکاف مسنون ہے۔ اس اعتکاف کا وقت بیسواں روزہ ختم ہونے کے وقت غروب آفتاب سے شروع ہوتا ہے اور عید کا چاند ہونے تک باقی رہتا ہے۔

رمضان شریف کے عشرۂ اخیر کا یہ اعتکاف سنت موکدہ علی الکفایۃ ہے۔ یعنی ایک بستی یا محلے میں کوئی ایک شخص اعتکاف کرلے تو تمام اہل محلہ کی طرف سے سنت ادا ہوجائے گی۔ لیکن اگر سارے محلہ میں سے کسی ایک نے بھی اعتکاف نہ کیا تو سارے محلے والوں پر ترک سنت کا گناہ ہوگا۔ (شامی)

اہل محلہ کی ذمہ داری

اس سے واضح ہوگیا کہ یہ ہر محلے والوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ پہلے سے یہ تحقیق کریں کہ ہماری مسجد میں کوئی شخص اعتکاف میں بیٹھ رہا ہے یا نہیں؟ اگر کوئی آدمی نہ بیٹھ رہا ہو تو فکر کر کے کسی کو بٹھائیں۔

اگر محلے والوں میں سے کوئی شخص بھی کسی مجبوری کی وجہ سے اعتکاف میں بیٹھنے کے لیے تیار نہ ہو، تو کسی دوسرے محلے کے آدمی کو اپنی مسجد میں اعتکاف کرنے کے لیے تیار کرلیں۔ دوسرے محلہ کے آدمی کے بیٹھنے سے بھی اس محلے والوں کی سنت انشاء اللہ ادا ہوجائے گی۔ (فتاوی دارالعلوم دیوبند ص۱۲ ج۲)

اعتکاف کا رکن اعظم یہ ہے کہ انسان اعتکاف کے دوران مسجد کی حدود میں رہے اور حوائج ضروریہ کے سوا (جن کی تفصیل آگے آرہی ہے) ایک لمحہ کے لیے بھی مسجد کی حدود

سے باہر نہ نکلے، کیوں کہ اگر معتکف ایک لمحے کے لیے بھی شرعی ضرورت کے بغیر حدودِ مسجد سے باہر چلا جائے تو اس سے اعتکاف ٹوٹ جاتا ہے۔

حدودِ مسجد کا مطلب

بہت سے لوگ حدودِ مسجد کا مطلب نہیں سمجھتے اور اس بنا پر ان کا اعتکاف ٹوٹ جاتا ہے۔ اس لیے خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ حدودِ مسجد کا کیا مطلب ہے؟

عام بول چال میں تو مسجد کے پورے احاطے کو مسجد ہی کہتے ہیں لیکن شرعی اعتبار سے یہ پورا احاطہ مسجد ہونا ضروری نہیں بلکہ شرعاً صرف وہ حصہ مسجد ہوتا ہے جسے بانی مسجد نے مسجد قرار دے کر وقف کیا ہو۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ زمین کے کسی حصے کا مسجد ہونا اور چیز ہے اور مسجد کی ضروریات کے لیے وقف ہونا اور چیز۔ شرعاً مسجد صرف اتنے حصہ کو کہا جائے گا جسے بنانے والے نے مسجد قرار دیا ہو، یعنی نماز پڑھنے کے سوا اس سے کچھ اور مقصود نہ ہو لیکن تقریباً ہر مسجد میں کچھ حصہ ایسا ہوتا ہے جو شرعاً مسجد نہیں ہوتا۔ لیکن مسجد کی ضروریات کیلئے وقف ہوتا ہے۔ مثلاً وضو خانہ، استنجاء کی جگہ، نماز جنازہ پڑھنے کی جگہ، امام کا حجرہ اور گودام وغیرہ۔

اس حصے پر شرعاً مسجد کے احکام جاری نہیں ہوتے۔ چنانچہ ان تمام حصوں میں جنابت کی حالت میں جانا بھی جائز ہے جب کہ اصل مسجد میں جنبی کا داخل ہونا جائز نہیں ہے۔ اس ضروریات مسجد والے حصہ میں معتکف کا جانا بالکل جائز نہیں ہے۔ بلکہ اگر معتکف اس حصے میں شرعی عذر کے بغیر ایک لمحہ کے لیے بھی چلا جائے تو اس سے اعتکاف ٹوٹ جاتا ہے۔

پھر بعض مساجد میں تو ضروریات مسجد والا حصہ اصل مسجد سے بالکل الگ اور ممتاز ہوتا ہے جس کی پہچان مشکل نہیں ہوتی۔ لیکن بعض مساجد میں یہ حصہ اصل مسجد سے اس طرح متصل ہوتا ہے کہ ہر شخص اسے پہچان نہیں سکتا۔ اور جب تک بانی مسجد صراحۃً نہ بتائے کہ یہ حصہ مسجد نہیں ہے اس وقت تک اس کا پتہ نہیں چلتا۔

لہٰذا جب کسی شخص کا کسی مسجد میں اعتکاف کرنے کا ارادہ ہو تو اسے سب سے پہلا کام یہ کرنا چاہئے کہ مسجد کے بانی یا اس کے متولی سے مسجد کی ٹھیک ٹھیک حدود معلوم کرے مسجد والوں کو چاہئے کہ وہ مسجد کی حدود کو حتی الامکان واضح اور ممتاز رکھیں اور بہتر یہ ہے کہ ہر مسجد میں ایک نقشہ مرتب کر کے لٹکا دیا جائے جس میں مسجد کی حدود واضح کر دی گئی ہوں۔ ورنہ کم از کم بیسویں روزے کو جب معتکفین مسجد میں جمع ہو جائیں تو انھیں زبانی طور پر سمجھا دیا جائے کہ مسجد کی حدود کہاں سے کہاں تک ہیں ؟

جب مسجد کی حدود معلوم ہو جائیں تو اس کے بعد اعتکاف کے دوران شرعی ضرورت کے بغیر ان حدود سے ایک لمحہ کے لیے بھی باہر نہ نکلیں ورنہ اعتکاف ٹوٹ جائے گا۔

شرعی ضرورت کے لیے نکلنا

شرعی ضرورت سے مراد یہاں وہ ضروریات ہیں جنکی بنا پر مسجد سے نکلنا شریعت نے معتکف کے لیے جائز قرار دیا ہے اور اس سے اعتکاف نہیں ٹوٹتا۔ یہ ضروریات مندرجہ ذیل ہیں :

① پیشاب یا پاخانے کی ضرورت۔

② غسل جنابت جب کہ مسجد میں غسل ممکن نہ ہو۔

③ وضو، جب کہ مسجد میں رہتے ہوئے وضو کرنا ممکن نہ ہو۔

④ کھانے پینے کی اشیاء باہر سے لانا، جب کہ کوئی اور شخص لانے والا موجود نہ ہو۔

⑤ مؤذن کے لیے اذان دینے کے مقصد سے باہر جانا۔

⑥ جس مسجد میں اعتکاف کیا جائے اگر اس میں جمعہ کی نماز نہ ہوتی ہو تو جمعہ کی نماز کے لیے مسجد میں جانا۔

⑦ مسجد کے گرنے وغیرہ کی صورت میں دوسری مسجد میں منتقل ہونا، ان ضروریات کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے باہر جانا معتکف کے لیے جائز نہیں، اب ان تمام ضروریات کی کچھ تفصیل عرض کی جاتی ہے۔

قضائے حاجت

① معتکف قضائے حاجت یعنی پیشاب، پاخانے کی ضرورت سے مسجد سے باہر نکل سکتا ہے، جہاں تک پیشاب کا تعلق ہے، اس کے لیے مسجد کے قریب ترین جس جگہ پیشاب کرنا ممکن ہو، وہاں جانا چاہیے، لیکن پاخانے کے لیے جانے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر مسجد کے ساتھ کوئی بیت الخلاء بنا ہوا ہے۔ اور وہاں قضائے حاجت کرنا ممکن ہے تو اسی میں قضائے حاجت کرنا چاہیے، کہیں اور جانا درست نہیں لیکن اگر کسی شخص کے لیے اپنے گھر کے سوا کسی اور جگہ قضائے حاجت طبعًا ممکن نہ ہو یا سخت دشوار ہو تو اس کے لیے جائز ہے کہ اس غرض کے لیے اپنے گھر چلا جائے۔ خواہ مسجد کے قریب بیت الخلاء موجود ہو۔

لیکن جس شخص کو یہ مجبوری نہ ہو، اسے مسجد کا بیت الخلاء ہی استعمال کرنا چاہیے اگر ایسا شخص مسجد کا بیت الخلاء چھوڑ کر اپنے گھر چلا جائے تو بعض علماء کے نزدیک اس کا اعتکاف ٹوٹ جائے گا۔

② لیکن اگر مسجد کا کوئی بیت الخلاء ہو یا اس میں قضائے حاجت ممکن نہ ہو یا سخت دشوار ہو، تو قضائے حاجت کے لیے اپنے گھر جانا جائز ہے خواہ وہ گھر کتنی دور ہو۔ (ایضًا)

③ اگر کسی شخص کے دو گھر ہوں تو اس کو چاہیے کہ قریب والے مکان میں جا کر قضائے حاجت کرے، دور والے گھر میں جانے سے بعض علماء کے نزدیک اعتکاف ٹوٹ جائے گا۔ (شامی۔ عالمگیری)

④ اگر بیت الخلاء مشغول ہو تو خالی ہونے کے انتظار میں ٹھہرنا جائز ہے لیکن ضرورت سے فارغ ہونے کے بعد ایک لمحے کے لیے بھی ٹھہرنا جائز نہیں ہے اگر ٹھہر گیا تو اعتکاف ٹوٹ جائے گا۔ (برجندی ص۲۳۴)

⑤ بیت الخلاء کو جاتے وقت یا وہاں سے آتے وقت راستے میں یا گھر میں سلام کرنا، سلام کا جواب دینا، یا مختصر بات چیت کرلینا جائز ہے۔ بشرطیکہ اس

بات چیت کے لیے ٹھہرنا نہ پڑے۔

۴ بیت الخلاء کو جاتے یا وہاں سے آتے وقت تیز چلنا ضروری نہیں آہستہ آہستہ چلنا بھی جائز ہے۔ (عالمگیریہ)

۵ قضائے حاجت کے لیے جاتے وقت کسی شخص کے ٹھہرانے سے ٹھہرنا نہ چاہیئے، بلکہ چلتے چلتے اسے بتا دینا چاہیئے کہ میں اعتکاف میں ہوں، اس لیے ٹھہر نہیں سکتا۔ اگر کسی کے ٹھہرانے سے کچھ دیر ٹھہر گیا تو اس سے اعتکاف ٹوٹ جائے گا۔ یہاں تک کہ اگر راستے میں کسی قرض خواہ نے روک لیا تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس سے بھی اعتکاف ٹوٹ جائے گا، اگرچہ صاحبین کے نزدیک ایسی مجبوری سے اعتکاف نہیں ٹوٹتا، اور امام سرخسی رہ نے سہولت کی بناء پر صاحبین کے قول کی طرف رجحان ظاہر کیا ہے۔ (مبسوط سرخسی رہ ص ۱۲۳ ج ۳)

۶ جب بیت الخلاء جانے کے لیے نکلا ہو تو بیڑی سگریٹ پینا جائز ہے بشرطیکہ اس غرض سے ٹھہرنا نہ پڑے۔

۷ جب کوئی شخص قضائے حاجت کے لیے اپنے گھر گیا ہو تو قضائے حاجت کے بعد وہاں وضو کرنا جائز ہے۔ (مجمع الانہر ص ۲۵۶ ج ۱)

معتکف کا غسل

معتکف کو صرف احتلام ہو جانے کی صورت میں غسل جنابت کے لیے مسجد سے باہر جانا جائز ہے۔ اس میں بھی یہ تفصیل ہے کہ اگر مسجد کے اندر رہتے ہوئے غسل کرنا ممکن ہو۔ مثلاً کسی بڑے برتن میں بیٹھ کر اس میں غسل کر سکتا ہو کہ پانی مسجد میں نہ گرے تو باہر جانا جائز نہیں۔ لیکن اگر صورت یہ ہے کہ ممکن نہ ہو یا سخت دشوار ہو، تو غسل جنابت کے لیے باہر جا سکتا ہے۔ (فتح القدیر ج۲ ص۱۱) اور اس میں بھی یہی تفصیل ہے کہ اگر مسجد کا کوئی غسل خانہ موجود ہے تو اس میں جا کر غسل کریں لیکن اگر مسجد کا کوئی غسل خانہ نہیں ہے یا اس میں غسل کرنا کسی وجہ سے ممکن نہیں یا سخت دشوار ہے تو اپنے گھر جا کر بھی غسل کر سکتے ہیں۔

غسل جنابت کے سوا کسی اور غسل کے لیے مسجد سے نکلنا جائز نہیں جمعہ کے غسل

یا ٹھنڈک کی غرض سے مسجد سے باہر نکلے گا تو اعتکاف ٹوٹ جائے گا' البتہ جمعہ کا غسل ہو یا ٹھنڈک کے لیے نہانا ہو تو اس کے لیے ایسی صورت اختیار کی جاسکتی ہے جس سے پانی مسجد میں نہ گرے۔ مثلاً کسی ٹب میں بیٹھ کر نہالیں' یا مسجد کے کنارے پر اس طرح غسل کرنا ممکن ہو کہ پانی مسجد سے باہر گرے تو ایسا بھی کرسکتے ہیں۔

معتکف کا وضو

۱: اگر مسجد میں وضو کرنے کی ایسی جگہ موجود ہے کہ معتکف خود تو مسجد میں رہے لیکن وضو کا پانی مسجد سے باہر گرے تو وضو کے لیے مسجد سے باہر جانا جائز نہیں۔ چنانچہ ایسی صورت میں معتکف کو وضو خانے تک جانا بھی جائز نہیں ہے۔

۲: لیکن اگر کسی مسجد میں ایسی کوئی صورت ممکن نہ ہو تو وضو کے لیے مسجد سے باہر وضو خانے یا وضو خانہ موجود نہ ہو تو کسی اور قریبی جگہ جانا جائز ہے۔ (شامی)

اور یہ حکم ہر قسم کے وضو کا ہے خواہ وہ فرض نماز کے لیے کیا جارہا ہو' یا نفلی عبادت کے لیے۔

۳: جن صورتوں میں معتکف کے لیے وضو کی غرض سے باہر نکلنا جائز ہے' ان میں وضو کے ساتھ مسواک کرنا' صابن لگانا اور تولیہ سے اعضاء خشک کرنا بھی جائز ہے لیکن وضو کے بعد ایک لمحہ کے لیے بھی ٹھہرنا جائز نہیں اور نہ ہی راستہ میں رکنا جائز ہے۔

کھانے کی ضرورت

اگر کسی آدمی کو ایسا آدمی میسر ہو' جو اس کے لیے مسجد میں کھانا پانی لاسکے تو اس کے لیے کھانا لانے کی غرض سے مسجد سے باہر جانا جائز نہیں' لیکن اگر کسی شخص کو ایسا کوئی آدمی میسر نہیں ہے تو وہ کھانا لانے کے لیے مسجد سے باہر جاسکتا ہے (البحر الرائق ص۳۲۶ ج۲) لیکن کھانا مسجد میں لاکر ہی کھانا چاہیے۔ (کفایۃ المفتی ج۴ ص۲۳۲)

اعتکاف کا ٹوٹ جانا

مندرجہ ذیل چیزوں سے اعتکاف ٹوٹ جاتا ہے۔

① جن ضروریات کا پیچھے ذکر کیا گیا ہے ان کے سوا کسی

مقصد سے اگر کوئی معتکف حدودِ مسجد سے باہر نکل جائے خواہ یہ باہر نکلنا ایک ہی لمحہ کے لیے ہو تو اس سے اعتکاف ٹوٹ جاتا ہے۔ (ہدایہ)

(۲) اسی طرح اگر کوئی معتکف شرعی ضرورت سے باہر نکلے لیکن ضرورت سے فارغ ہونے کے بعد ایک لمحہ کے لیے بھی باہر ٹھہر جائے تو اس سے بھی اعتکاف ٹوٹ جاتا ہے۔ (شامی)

(۳) بلا ضرورت مسجد سے باہر نکلنا خواہ جان بوجھ کر یا بھول کر یا غلطی سے، بہرصورت اس سے اعتکاف ٹوٹ جاتا ہے۔ البتہ اگر بھول کر یا غلطی سے باہر نکلا ہے تو اس سے اعتکاف توڑنے کا گناہ نہیں ہوگا۔ (شامی)

(۴) کوئی شخص احاطہ مسجد کے کسی حصہ کو مسجد سمجھ کر اس میں چلا گیا، حالانکہ درحقیقت وہ حصہ مسجد میں شامل نہیں تھا تو اس سے بھی اعتکاف ٹوٹ گیا، اسی لیے شروع میں عرض کیا گیا ہے کہ اعتکاف میں بیٹھنے سے پہلے حدودِ مسجد اچھی طرح معلوم کرلینی چاہئیں۔

(۵) اعتکاف کے لیے چونکہ روزہ شرط ہے اس لیے روزہ توڑ دینے سے بھی اعتکاف ٹوٹ جاتا ہے خواہ وہ روزہ کسی عذر سے توڑا ہو، یا بلا عذر جان بوجھ کر توڑا ہو، یا غلطی سے ٹوٹا ہو، ہرصورت میں اعتکاف ٹوٹ جاتا ہے، غلطی سے روزہ ٹوٹنے کا مطلب یہ ہے کہ روزہ تو یاد تھا لیکن بے اختیار کوئی عمل ایسا ہوگیا جو روزے کے منافی تھا، مثلاً صبح صادق طلوع ہونے کے بعد تک کھاتے رہے یا غروب آفتاب سے پہلے یہ سمجھ کر روزہ افطار کرلیا کہ افطار کا وقت ہوچکا ہے یا روزہ یاد ہونے کے باوجود کلی کرتے وقت غلطی سے پانی حلق میں چلا گیا تو ان تمام صورتوں میں روزہ بھی جاتا رہا اور اعتکاف بھی ٹوٹ گیا۔

(۶) جماع کرنے سے بھی اعتکاف ٹوٹ جاتا ہے خواہ یہ جماع جان بوجھ کر کرے یا سہواً، دن میں کرے یا رات میں، مسجد میں کرے، یا مسجد سے باہر، اس سے

انزال ہو یا نہ ہو، ہر صورت میں اعتکاف ٹوٹ جاتا ہے۔ (ہدایہ)

● بوس وکنار اعتکاف کی حالت میں ناجائز ہے اور اگر اس سے انزال ہوجائے تو اس سے اعتکاف ٹوٹ جاتا ہے لیکن اگر انزال نہ ہو تو ناجائز ہونے کے باوجود اعتکاف نہیں ٹوٹتا۔ (ہدایہ)

ن صورتوں میں اعتکاف توڑنا جائز ہے ؟

مندرجہ ذیل صورتوں میں اعتکاف توڑنا جائز ہے :

● اعتکاف کے دوران کوئی ایسی بیماری پیدا ہوگئی جس کا علاج مسجد سے باہر نکلے بغیر ممکن نہیں تو اعتکاف توڑنا جائز ہے۔ (شامی)

● کسی ڈوبتے یا جلتے ہوئے آدمی کو بچانے یا آگ بجھانے کے لیے بھی اعتکاف توڑکر باہر نکل آنا جائز ہے۔ (ایضاً)

● ماں باپ یا بیوی بچوں میں سے کسی کی سخت بیماری کی وجہ سے بھی اعتکاف توڑنا جائز ہے۔

● کوئی شخص زبردستی باہر نکال کرلے جائے مثلاً حکومت کی طرف سے گرفتاری کا وارنٹ آجائے تو بھی اعتکاف توڑنا جائز ہے۔ (شامی)

● اگر کوئی جنازہ آجائے اور نماز پڑھنے والا اور نہ ہو، تب بھی اعتکاف توڑنا جائز ہے۔ (فتح القدیر ص۱۱۱ ج۲)

● ان تمام صورتوں میں باہر نکلنے سے گناہ تو نہیں ہوگا لیکن اعتکاف ٹوٹ جائے گا۔ (البحر الرائق ص۳۲۶ ج۲)

...ستکاف ٹوٹنے کا حکم

مذکورہ بالا وجوہ میں سے جس وجہ سے بھی اعتکاف مسنون ٹوٹا ہو۔ اس کا یہ حکم ہے کہ جس ...ن میں اعتکاف ٹوٹا ہے صرف اس دن کی قضا واجب ہوگی، پورے دس دن کی قضا واجب ...یں۔ (شامی)

اور اس ایک دن کی قضا کا طریقہ یہ ہے کہ اگر اسی رمضان میں وقت باقی ہو، تو اسی رمضان میں کسی دن غروب آفتاب سے اگلے دن غروب آفتاب تک قضا کی نیت سے اعتکاف کرلیں اور اگر اس رمضان میں وقت باقی نہ ہو یا کسی وجہ سے اس میں اعتکاف ممکن نہ ہو تو رمضان کے علاوہ کسی بھی دن روزہ رکھ کر ایک دن کے لیے اعتکاف کیا جا سکتا ہے۔ اور اگلے رمضان میں قضا کرے تو بھی قضا صحیح ہو جائے گی۔ لیکن زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، اس لیے جلد از جلد قضا کرنی چاہیے۔

۱۲۔ اعتکاف مسنون ٹوٹ جانے کے بعد مسجد سے باہر نکلنا ضروری نہیں، بلکہ عشرۂ اخیر کے باقی ماندہ میں نفل کی نیت سے اعتکاف جاری رکھا جا سکتا ہے اس طرح سنت موکدہ تو ادا نہیں ہوگی لیکن نفلی اعتکاف کا ثواب ملے گا اور اگر اعتکاف کسی غیر اختیاری بھول چوک کی وجہ سے ٹوٹا ہے۔ تو عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ عشرۂ اخیر کے مسنون اعتکاف کا ثواب بھی اپنے کرم سے عطا فرما دیں۔ اس لیے اعتکاف ٹوٹنے کی صورت میں بہتر یہی ہے کہ عشرۂ اخیرہ ختم ہونے تک اعتکاف جاری رکھیں۔ اگر کوئی شخص اس کے بعد اعتکاف جاری نہ رکھے تو یہ بھی جائز ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ جس دن سے اعتکاف ٹوٹا ہے اس دن باہر چلا جائے اور اگلے دن بہ نیت نفل پھر اعتکاف شروع کر دے۔

مُباحاتِ اعتکاف

اعتکاف کی حالت میں مندرجہ ذیل کام بلا کراہت جائز ہیں:

- کھانا، پینا
- سونا
- ضروری خرید و فروخت کرنا بشرطیکہ سودا مسجد میں نہ لایا جائے اور خرید و فروخت ضروریاتِ زندگی کے لیے ہو۔ لیکن مسجد کو باقاعدہ طور پر تجارت گاہ بنانا جائز نہیں۔ (قاضیخان)

- حجامت کرانا (لیکن بال مسجد میں نہ گریں۔
- بات چیت کرنا (لیکن فضول گوئی سے پرہیز ضروری ہے)۔ (شامی)
- نکاح یا کوئی اور عقد کرنا۔ (بحر ص۳۲۷ ج۲)
- کپڑے بدلنا، خوشبو لگانا، سر میں تیل لگانا، (خلاصۃ الفتاوی ص۲۶۹ ج۱)
- مسجد میں کسی مریض کا معائنہ کرنا اور نسخہ لکھنا یا دوا بتا دینا (فتاوی دارالعلوم جدید ص۵۰ ج۷)
- قرآن کریم یا دینی علوم کی تعلیم دینا۔ [شامی ص۱۸۱ ج۲]
- کپڑے دھونا اور کپڑے سینا۔ [مصنف ابن ابی شیبہ عن عطاء ص۹۳ ج۳]

البتہ کپڑے دھوتے وقت پانی مسجد سے باہر گرے اور خود مسجد میں رہیں۔ یہی حکم برتن دھونے کا بھی ہے۔

- ضرورت کے وقت مسجد میں ریح خارج کرنا۔ [شامی]

مکروہات اعتکاف

اعتکاف کی حالت میں مندرجہ ذیل امور مکروہ ہیں:

① بالکل خاموشی اختیار کرنا۔ کیوں کہ شریعت میں بالکل خاموش رہنا کوئی عبادت نہیں، اگر خاموشی کو عبادت سمجھ کر کرے تو بدعت کا گناہ ہوگا، البتہ جہاں ضرورت ہو وہاں بولنے سے پرہیز نہیں کرنا چاہیے۔

② فضول اور بلا ضرورت باتیں کرنا بھی مکروہ ہے ضرورت کے مطابق تھوڑی بہت گفتگو جائز ہے لیکن مسجد کو فضول گوئی کی جگہ بنانے سے احتراز لازمی ہے۔ [منحۃ الخالق]

③ سامان تجارت مسجد میں لاکر بیچنا بھی مکروہ ہے۔

④ اعتکاف کے لیے مسجد کی اتنی جگہ گھیر لینا جس سے دوسرے معتکفین یا نمازیوں کو تکلیف پہنچے۔

⑤ اجرت پر کتابت کرنا یا کپڑے سینا یا تعلیم دینا بھی معتکف کے لیے فقہاء نے مکروہ لکھا ہے۔ [بحر ص۳۲۰ ج۲]

روزنامہ جنگ لاہور ۴ر دسمبر ۹۴ء کے مطابق گورنر پنجاب چودھری الطاف حسین نے دینی مدارس کی کارکردگی پر کڑی نکتہ چینی کی ہے اور فرقہ وارانہ کردار کے حامل مدارس کی بندش کا عندیہ دیا ہے۔ اسی طرح بعض اخباری اطلاعات کے مطابق وفاقی وزارت داخلہ نے ملک میں نئے دینی مدارس کی رجسٹریشن اور پرانے مدارس کی رجسٹریشن کی تجدید کے لئے وزارت داخلہ سے پیشگی اجازت کی شرط عائد کر دی ہے اور متعلقہ حکام کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ اس اجازت کے بغیر کسی نئے دینی مدرسہ کو رجسٹرڈ نہ کیا جائے اور نہ ہی پہلے سے قائم کسی مدرسہ کی رجسٹریشن کی تجدید کی جائے۔ اس کے ساتھ ہی بہاولپور پولیس کے حوالہ سے یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ حکام بالا کی ہدایت پر پولیس دینی مدارس کا سروے کر رہی ہے تاکہ اس الزام کی حقیقت معلوم کی جا سکے کہ بعض مدارس میں بچوں سے جبری بیگار لی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں گذشتہ دنوں گوجرانوالہ میں وزیر اعظم پاکستان کے ایک مشیر نے کسی مدرسہ کے بارے میں اخبارات میں شائع ہونے والی اس رپورٹ کا ذکر کیا ہے کہ وہاں طلبہ کو زنجیروں سے باندھ کر قرآن کریم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان کے بقول وزیر اعظم نے اس سلسلہ میں انکوائری کی ہدایت جاری کر دی ہیں۔ اس کے علاوہ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے بارے میں بھی یہ خبر شائع ہو چکی ہے کہ اس نے پاکستان کے دینی مدارس میں طلبہ پر مظالم اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے حوالے سے تحقیقات کا آغاز کر دیا ہے۔ دینی مدارس کے بارے میں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر اس تحقیقاتی مہم کا پس منظر کیا ہے اور یہ سب کچھ کن مقاصد کے لیے کیا جا رہا ہے؟ اس سوال کا جائزہ لینے سے

پہلے ضروری ہے کہ دینی مدارس کے موجودہ نظام پر ایک نظر ڈال لی جائے تاکہ اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے دینی مدارس کے خلاف اس مہم کے مقاصد کو صحیح طور پر سامنے لایا جا سکے۔

پاکستان، بنگلہ دیش اور بھارت کے طول و عرض میں لاکھوں کی تعداد میں پھیلے ہوئے مدارس و مکاتب کا موجودہ نظام، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی ناکامی کے بعد پیدا ہونے والے حالات کا نتیجہ ہے۔ اس سے قبل پورے برصغیر میں درس نظامی کا یہی نصاب تعلیمی اداروں میں رائج تھا جو مغل بادشاہت کے دور میں اس وقت کی ضروریات اور تقاضوں کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا تھا اور جو اب بھی ہمارے دینی مدارس میں بدستور رائج چلا آرہا ہے۔

فارسی اس دور میں سرکاری زبان تھی اور عدالتوں میں فقہ حنفی رائج تھا۔ اس لیے درس نظامی کا یہ نصاب اس دور کی دفتری اور عدالتی ضروریات کو پورا کرتا تھا اور دینی تقاضوں کی تکمیل بھی اس سے ہو جاتی تھی۔ اس لئے اکثر و بیشتر مدارس کا نصاب یہی تھا اور تقریباً تمام مدارس سرکار کے تعاون سے بلکہ سرکار کی بخشی ہوئی زمینوں اور جاگیروں کے باعث تعلیمی خدمات سرانجام دیتے چلے آرہے تھے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی ناکامی کے بعد جب دہلی کا اقتدار ایسٹ انڈیا کمپنی سے براہ راست تاج برطانیہ کو منتقل ہوا اور باقاعدہ انگریزی حکومت قائم ہو گئی تو سرکاری زبان فارسی کے بجائے انگریزی کر دی گئی اور عدالتی نظام سے فقہ حنفی کو خارج کر کے برطانوی قوانین نافذ کر دیئے گئے جس سے ہماری تعلیمی ضروریات دو حصوں میں منقسم ہو گئیں۔ دفتری اور عدالتی نظام میں شرکت کے لئے انگریزی تعلیم ناگزیر ہو گئی اور دینی و قومی ضروریات کے لئے درس نظامی کے سابقہ نظام کو برقرار رکھنا ضروری سمجھا گیا، جب کہ مدارس و مکاتب کا سابقہ نظام ختم کر دیا گیا، علماء کی ایک بڑی تعداد جنگ آزادی میں کام آگئی باقی ماندہ میں سے ایک کھیپ کالا پانی اور دیگر جیلوں کی نذر ہو گئی۔ اور پیچھے رہ جانے والے لوگ شکست کے اثرات کو سمیٹتے ہوئے مستقبل کے بارے میں سوچنے میں مصروف

ہو گئے۔ مدارس و مکاتب کے لئے مغل حکمرانوں کی عطا کردہ جاگیریں ضبط کر لی گئیں اور اس طرح ۱۸۵۷ء سے پہلے کا تعلیمی نظام مکمل طور پر تتر بتر ہو کر رہ گیا۔

نئے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے تعلیمی ضروریات کے دو حصوں میں تقسیم ہو جانے کے بعد اہل دانش نے مستقبل کی طرف توجہ دی۔ سرسید احمد خان مرحوم نے ایک محاذ سنبھال لیا اور دفتری و عدالتی نظام میں مسلمانوں کو شریک رکھنے کے لئے انگریزی تعلیم کی ترویج کو اپنا مشن بنالیا، جب کہ دینی و قومی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے دینی تعلیم کا محاذ فطری طور پر علماء کرام کے حصہ میں آیا اور اس سلسلہ میں سبقت اور پیش قدمی کا اعزاز مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اور ان کے رفقاء کو حاصل ہوا۔ سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء نے علی گڑھ میں انگریزی تعلیم کے کالج کا آغاز کیا اور مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ نے دیوبند میں مدرسہ عربیہ کی بنیاد رکھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ سرسید احمد خان اور مولانا محمد قاسم نانوتوی دونوں ایک ہی استاذ مولانا مملوک علی نانوتوی رحمہ کے شاگرد تھے اور دونوں نے مختلف سمتوں پر تعلیمی سفر کا آغاز کیا، جو آگے چل کر دو مستقل تعلیمی نظاموں کی شکل اختیار کر گئے۔ ابتداء میں سرسید احمد خان مرحوم کے انگریزی کالج اور مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ کے مدرسہ عربیہ دونوں کی بنیاد عوامی چندہ پر اور امداد باہمی کے طریق کار پر تھی، لیکن بعد میں کالج اور اسکول کے نظام کو سرکاری سرپرستی حاصل ہو گئی اور رفتہ رفتہ پورا نظام سرکاری تحویل میں آکر مصارف و اخراجات کے جھنجھٹ سے آزاد ہو گیا، جب کہ دینی مدارس سرکاری سرپرستی سے آزاد رہے جس کی وجہ سے انہیں اپنے اخراجات و ضروریات کے لیے ہر دور میں عوامی چندہ پر انحصار کرنا پڑا، اور آج بھی یہ صورت حال بدستور قائم ہے۔

دینی مدارس کے اس آزادانہ اور متوازی نظام کے بنیادی مقاصد درج ذیل ہیں:

- قرآن و سنت، عربی زبان اور دیگر اسلامی علوم کی حفاظت اور مسلم معاشرہ کا ان سے تعلق برقرار رکھنا۔
- مساجد و مدارس کے نظام کو قائم رکھنا اور ان کے لئے ائمہ، خطباء اور مدرسین کی فراہمی۔

- یورپ کی نظریاتی اور تہذیبی یلغار کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی طرز معاشرت اور عقائد کی حفاظت۔
- جدید عقلیت کے پیدا کردہ اعتقادی و نظریاتی فتنوں سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنا۔

ان مقاصد کے حصول کے لئے ضروری تھا کہ یہ مدارس سرکار کے اثر سے آزاد رہیں اور ایسا تعلیمی نصاب و نظام اختیار کریں کہ اس کے تیار کردہ افراد صرف ان کے مقاصد کے خانہ میں فٹ ہوسکیں۔ اس بات کو زیادہ بہتر طور پر واضح کرنے کے لیے ایک واقعہ بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں جو میں نے مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ کے خطیب حضرت مولانا مفتی عبدالواحد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی سُنا۔ ان کی روایت کے مطابق یہ اس دور کا واقعہ ہے جب دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مولانا محمد قاسم نانوتوی رح کے فرزند مولانا حافظ محمد احمد رح تھے، اس دور میں دارالعلوم کے فارغ التحصیل کچھ نوجوان حیدرآباد دکن کی ریاست میں ملازمتوں پر فائز ہوئے اور کارکردگی اور صلاحیت کے لحاظ سے دوسرے ملازمین سے بہتر ثابت ہوئے۔ مولانا حافظ محمد احمد رح کے دورۂ حیدرآباد کے موقع پر نظام حیدرآباد نے ایک ملاقات میں ان سے اس بات کا ذکر کیا اور خواہش ظاہر کی کہ اگر دارالعلوم دیوبند کے فضلاء ہر سال سارے کے سارے حیدرآباد بھجوا دیئے جائیں تو نظام حیدرآباد انہیں ملازمتیں دیں گے اور دارالعلوم کے سالانہ اخراجات کا بار نظام خود اٹھائیں گے مولانا حافظ محمد احمد رح نے دیوبند واپسی پر یہ پیش کش دارالعلوم کے صدر مدرس شیخ الہند مولانا محمود حسن رح کے سامنے بیان کی اور ان سے مشورہ طلب کیا۔ مولانا محمود حسن رح نے خود کوئی مشورہ دینے کی بجائے حافظ محمد احمد رح کو دارالعلوم کے سرپرست حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رح کی خدمت میں بھیج دیا جو اس وقت بقید حیات تھے۔ انھوں نے مولانا حافظ محمد احمد رح سے نظام حیدرآباد کی پیش کش کے بارے میں سن کر جو جواب دیا وہ حضرت مولانا مفتی عبدالواحد صاحب کے الفاظ میں یوں تھا۔

" بھاڑ میں جائے حیدرآباد کی ریاست! ہم اس ریاست کو چلانے کیلئے

طلبہ کو نہیں پڑھا رہے، ہم تو اس لیے پڑھاتے ہیں کہ مسجدیں اور قرآن کے مکاتب آباد رہیں، اور مسلمانوں کو نمازیں اور قرآن کریم پڑھانے والے ائمہ اور استاذ ملتے رہیں۔"

یہی وجہ ہے کہ دینی مدارس میں انگریزی تعلیم کا داخلہ بند رہا اور علماء اور دینی طلبہ کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے سے سختی کے ساتھ منع کیا جاتا رہا، کیوں کہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے افراد لازماً سرکاری ملازمت کو ترجیح دیتے اور دینی مدارس سے فارغ ہونے والوں کی ایک بڑی کھیپ بھی اسی طرف منتقل ہوجاتی جس سے دینی مدارس کے قیام کا بنیادی مقصد فوت ہوجاتا۔ جب کہ دینی مدارس کے نظام کا آغاز کرنے والوں کے ذہن میں سب سے بڑا مقصد یہ تھا، کہ ایسی کھیپ تیار ہو جو قرآن پاک کے مکاتب کو آباد رکھے، اس لیے حکمت عملی کے تحت عملاً ایسا طریقہ اختیار کیا گیا کہ دینی مدارس کے فارغ التحصیل حضرات مسجد و مدرسہ کے سوا کسی دوسری جگہ نہ کھپ سکیں۔ چنانچہ اس مقصد کے حوالے سے یہ حکمت عملی کامیاب رہی۔ اس کے نتیجہ میں برصغیر کے طول و عرض میں دینی مدارس و مکاتب کا جال بچھ گیا اور مسجدیں ائمہ و خطباء کی کھیپ بھی فراہم ہوتی رہی۔

دینی مدارس کے منتظمین نے ان مقاصد کے حصول کے لئے کیا کیا جتن کئے؟ یہ ایک الگ داستان ہے جس کی تفصیلات کی اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے تاہم اس قدر عرض کرنا ضروری ہے کہ انہوں نے سہولتوں کی زندگی ترک کرکے فقر و فاقہ اور تنگی و ترشی کی زندگی اختیار کی، لوگوں سے صدقات و خیرات مانگ کر مدارس کو آباد رکھا، بلکہ کچھ عرصہ پہلے تک تو محلہ کے ایک ایک گھر سے روٹیاں مانگنے کا سلسلہ بھی قائم رہا، اسلیے یہ بات بلا جھجک کہی جاسکتی ہے کہ علماء کے اس طبقہ نے اپنی "عزت نفس" تک کی قربانی دے کر معاشرہ میں قرآن و حدیث کی تعلیم اور اسلامی عقائد و معاشرت کو برقرار رکھا، ورنہ عالم اسباب میں اگر یہ مدارس نہ ہوتے تو اسپین کی طرح برصغیر پاک و ہند میں بھی (نعوذ باللہ) اسلام ایک قصہ پارینہ بن چکا ہوتا۔ صدقہ و خیرات، گھر گھر سے مانگی ہوئی روٹیوں اور عام لوگوں کے چندوں کی بنیاد پر قائم ہونے والا دینی مدارس کا یہ نظام برطانوی استعمار

کی نظریاتی، فکری اور تہذیبی یلغاروں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے لیے ایک مضبوط حصار ثابت ہوا اور اس نظام نے یہ صرف برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش کے مسلمانوں کے عقائد وافکار، معاشرت اور اسلامی علوم و فنون کی حفاظت کی بلکہ تحریک آزادی اور تحریک پاکستان کو نظریاتی راہ نماؤں اور کارکنوں کی کھیپ بھی فراہم کی جس میں مولانا محمود حسن رح، مولانا عبیداللہ سندھی رح، مولانا حسین احمد مدنی رح، مولانا شبیر احمد عثمانی رح، مولانا عبدالحامد بدایونی رح، مولانا سید محمد داؤد غزنوی رح، سید عطاء اللہ شاہ بخاری رح اور ان کے ہزاروں رفقاء بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

دور غلامی میں دینی مدارس کی حکمت عملی دفاعی تھی جس کے لئے انھیں بہت سے تحفظات اختیار کرنے پڑے۔ اور اگر وہ ان تحفظات کے بارے میں سختی اختیار نہ کرتے تو اپنے بنیادی مقاصد کی طرف اس قدر کامیابی کے ساتھ پیش رفت نہ کر پاتے لیکن قیام پاکستان کے بعد صورت حال خاصی تبدیل ہوگئی اور آزادی کے حوالے سے نئے تقاضے اور ضروریات سامنے آگئیں جن کے بارے میں دینی مدارس کی تمام تر مجبوریوں اور مشکلات کے باوجود بہرحال یہ کہنا پڑتا ہے کہ نئی ضروریات اور تقاضوں کو اپنے مقاصد میں شامل کرنے کے لئے وہ ابھی تک تیار نہیں ہوئے جس کے نقصانات قومی سطح پر بہت دیر تک محسوس کیے جاتے رہیں گے۔

قیام پاکستان کے بعد چاہئے تو یہ تھا کہ مساجد و مدارس کے لیے رجال کار کی فراہمی اور اسلامی علوم کی ترویج و تحفظ کی ذمہ داری ریاستی نظام تعلیم کے سپرد کر دی جاتی اور دینی مدارس کے الگ نظام کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی، لیکن ریاستی نظام تعلیم نے اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے انکار کر دیا بلکہ ریاستی نظام تعلیم نے تو قیام پاکستان کے بعد آزادی اور ایک اسلامی ریاست کے مقاصد کے حوالے سے اس قدر مایوس کیا کہ آزاد قوموں کی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ریاستی نظام تعلیم کی ذمہ داری تھی کہ وہ :

○ پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلامی نظریاتی ریاست کی حیثیت دینے اور ایک نظامی

اسلامی معاشرہ کے قیام کے لیے فوج، بیوروکریسی، عدلیہ اور دیگر قومی شعبوں اسلامی تعلیم وتربیت سے بہرہ ور افراد کار مہیا کرتا۔

- معاشرہ کے عام افراد کو قرآن وسنت کی ضروری تعلیم سے آراستہ کرنے کا اہتمام کرتا۔
- مساجد اور دینی مکاتب کا نظام چلانے کے لیے ائمہ اور مدرسین کی فراہمی کی ذمہ داری قبول کرتا۔
- اسلامی تعلیمات واحکام کو عالمی برادری کے سامنے نئے انداز اور اسلوب سے پیش کرنے کے لئے اسکالرز تیار کرتا اور انھیں جدید علوم اور فلسفہ کے چیلنج کا سامنا کرنے کی تربیت دیتا۔

لیکن ریاستی نظام تعلیم نے نہ صرف یہ کہ ان ذمہ داریوں کے قبول کرنے سے انکار کردیا بلکہ عملاً یہ نظام سیکولر اور اسلام مخالف عناصر کی کمین گاہ ثابت ہوا اور پاکستان میں اسلامی احکام وتعلیمات کی ترویج کو روکنے اور اس کی اسلامی حیثیت کو غیر موثر بنانے میں اس نظام تعلیم نے مضبوط مورچے کا کام دیا۔ جب کہ اس کے برعکس دینی مدارس نے جو ذمہ داریاں ۱۸۵۷ء کے بعد قبول کی تھیں، ان پر وہ اب بھی پوری دل جمعی کے ساتھ گامزن ہیں اور ان کے طریق کار اور دائرۂ عمل میں کوئی فرق نمودار نہیں ہوا بلکہ اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے کہ اسلامی علوم کی حفاظت وترویج اور مساجد ومدارس کے لیے ائمہ واساتذہ کی فراہمی کے لیے دینی مدارس کے کردار کا تسلسل کسی خلا اور تعطل کے بغیر بدستور قائم ہے تو ریاستی نظام تعلیم کے ساتھ تقابل کے تناظر میں دینی مدارس کا یہ کردار بڑے سے بڑے قومی اعزاز کا مستحق ہے کیوں کہ آج بھی ان دو مقاصد کے حوالے سے معاشرہ کی ضروریات یہی دینی مدارس پوری کر رہے ہیں اور اگر دینی مدارس اپنا یہ کردار چھوڑ دیں تو مساجد ومدارس کے لیے ائمہ واساتذہ کی فراہمی اور اسلامی علوم کی ترویج وحفاظت کے شعبہ میں جو خلا واقع ہوگا وہ کسی باشعور شہری کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

دینی مدارس کے موجودہ کردار اور خدمات کے بارے میں عام طور پر شکایات کا اظہار

کیا جاتا ہے اور شکوہ کرنے والوں میں ہم بھی شامل ہیں، لیکن ان شکایات اور دینی مدارس کی مشکلات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ صحیح صورت حال سامنے آسکے۔

دینی مدارس سے سب سے بڑی شکایت یہ کی جاتی ہے کہ ان کے نصاب میں آج کے علوم شامل نہیں ہیں اور وہ اپنے طلبہ کو انگریزی، ریاضی، سائنس، انجینیرنگ اور دیگر عصری علوم کی تعلیم نہیں دیتے۔ یہ شکایت ایسی ہے جسے نہ تو پوری طرح قبول کیا جاسکتا ہے اور نہ مسترد کیا جاسکتا ہے، کیوں کہ جہاں تک عصری علوم کی مکمل تعلیم کا سوال ہے وہ نہ تو دینی نصاب کے ساتھ پوری طرح شامل کی جاسکتی ہے اور نہ ایسا کرنا ضروری ہی ہے شامل اس لیے نہیں کی جاسکتی کہ مستند اور پختہ عالم دین کا مقام حاصل کرنے کے لیے فارسی، عربی، صرف ونحو، فقہ واصول فقہ، معانی وادب اور منطق وفلسفہ جیسے ضروری علوم کا ایک مکمل نصاب ہے جسے پوری طرح پڑھے بغیر کوئی شخص "عالم دین" کے منصب پر فائز نہیں ہو سکتا اور یہ نصاب اس قدر بھاری بھرکم ہے کہ اس کے ساتھ کسی دوسرے علم یا فن کے مکمل نصاب کو شامل کرنا ممکن نہیں ہے۔ اور اگر اس نصاب میں کمی کی جائے تو دینی علوم میں مہارت کا پہلو تشنہ رہ جاتا ہے۔ اور ضروری اس لیے نہیں ہے کہ یہ تخصصات اور اسپشلائزیشن کا دور ہے۔ اب ہر شعبہ کے لئے الگ ماہرین تیار ہوتے ہیں اور کسی ایک شعبہ کے ماہر کے لئے ضروری نہیں کہ وہ دوسرے شعبہ کی مہارت بھی رکھتا ہو مثلاً کسی انجینئر کے لیے قطعی طور پر یہ ضروری نہیں کہ وہ میڈیکل سائنس کے علم سے بہرہ ور ہو اور کسی ڈاکٹر کے لیے ضروری نہیں کہ اس نے انجینئرنگ کا علم بھی حاصل کر رکھا ہو اسی طرح کسی عالم دین کے لیے بھی یہ ضروری نہیں کہ وہ میڈیکل سائنس، انجینئرنگ یا کسی شعبہ کی مہارت بھی رکھتا ہو۔ تاہم ایک فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ جہاں تک کسی شعبہ میں پوری مہارت اور مکمل تعلیم کا تعلق ہے وہ تو کسی دوسرے شعبہ کے فرد کے لئے ضروری نہیں ہے لیکن بنیادی اور جنرل معلومات ہر شعبہ کے بارے میں حاصل ہونی چاہئیں اور اس کی اہمیت وضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے جس طرح ہم کہتے ہیں کہ کسی ڈاکٹر یا انجینئر کے لیے دین کا مکمل عالم ہونا ضروری نہیں مگر دین کی

بنیادی معلومات وسائل سے آگاہی ان کے لیے لازمی ہے تاکہ وہ اپنے شعبہ میں دینی احکام کے دائرہ کو ملحوظ رکھ سکیں، اسی طرح ایک عالم دین کے لیے ڈاکٹر یا انجینئر ہونا ضروری نہیں البتہ ان شعبوں کے بارے میں بنیادی معلومات علماء کو ضروری طور پر حاصل ہونی چاہئیں تاکہ وہ ان شعبوں کے افراد کی دینی راہ نمائی صحیح طور پر کر سکیں اسی طرح انگریزی آج کی بین الاقوامی زبان ہے، اسلام اور عالم اسلام کے خلاف صف آرا عالمی میڈیا کی زبان ہے اور پاکستان کی دفتری اور عدالتی زبان ہے۔ اس لئے عربی کے ساتھ انگریزی زبان سے کماحقہ بہرہ ور ہونا علماء کے لیے آج کے دور میں ضروری ہے۔ اس بنا پر ہم دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں کسی بنیادی تبدیلی یا تخفیف کی حمایت تو نہیں کریں گے البتہ اس میں انگریزی زبان اور میڈیکل سائنس، جنرل سائنس، انجینئرنگ اور دیگر عصری علوم کے بارے میں بنیادی معلومات کی حد تک نصاب کے اضافے کو ضروری سمجھتے ہیں اور دینی مدارس کو اس طرف ضرور توجہ دینی چاہیئے۔

اس سلسلہ میں دینی مدارس کی مشکلات کو سامنے رکھنا بھی ضروری ہے۔ مثلاً انکی ایک بنیادی مشکل یہ ہے کہ جو طلبہ انگریزی یا دیگر عصری علوم سے آراستہ ہو جاتے ہیں اور سرکاری اسناد حاصل کر لیتے ہیں ان کی اکثریت مساجد یا دینی مدارس کے بجائے ملازمت کے لیے سرکاری اداروں کا رخ کرتی ہے جس کی وجہ سے مساجد و مدارس کو ضرورت اور معیار کے مطابق ائمہ، خطباء اور مدرس میسر نہیں آتے۔ ظاہر بات ہے کہ مساجد و مدارس میں مشاہروں اور دیگر سہولتوں کا مروجہ معیار کسی طرح بھی اس درجہ کا نہیں ہے کہ کوئی خطیب، امام یا مدرس اطمینان کے ساتھ ایک عام آدمی جیسی زندگی بسر کر سکے۔ پھر یہاں ملازمت کا تحفظ بھی نہیں ہے، اس لیے جسے سرکاری ملازمت میں جانے کا راستہ مل جاتا ہے وہ لازماً ادھر کا رخ کرے گا اور مساجد و مدارس کے لیے رجال کار کے فقدان اور خلاء کا مسئلہ پریشان کن صورت اختیار کر جائے گا۔ اس موقع پر حضرت مولانا مفتی محمود صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے ساتھ ایک گفتگو کا حوالہ دینا شاید نامناسب نہ ہو۔ یہ اس دور کی بات ہے جب جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے وفاقی شرعی عدالت کے

قیام کے بعد ضلع اور تحصیل کی سطح پر شرعی قاضی مقرر کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور قاضی کورس کے لیے آرڈی ننس کے نفاذ کی تیاری ہو رہی تھی۔ حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ راولپنڈی کینٹ کے ملٹری ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس سلسلہ میں اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ مجھے پریشانی یہ تھی کہ پاکستان بھر میں ضلع اور تحصیل کی سطح پر مقرر کرنے کے لیے اس قدر تربیت یافتہ قاضی کہاں سے آئیں گے؟ اگرچہ اس زمانے میں بعض دینی اداروں نے قاضیوں کی تربیت کے لئے چار ماہ یا چھ ماہ اور ایک سال کے کورس شروع کر رکھے تھے لیکن میں ان سے مطمئن نہیں تھا کہ قاضی بہرحال قاضی ہوتا ہے اور سال، چھ ماہ کا کورس کسی شخص کو قاضی نہیں بنا سکتا۔ اور اگر ہم نے پاکستان میں قاضی کورس کا آغاز اس طرح کے نیم قاضیوں سے کیا تو اسلام کے عدالتی نظام کا پہلا تاثر ہی اپنے نتائج کے لحاظ سے نقصان کا باعث بن سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے مولانا مفتی محمودؒ سے سوال کیا کہ حضرت! یہ قاضی کہاں سے آئیں گے؟ مفتی صاحب نے جواب دیا کہ جن مدرسین نے دینی مدارس میں ہدایہ کی سطح تک کتابیں چار پانچ سال پڑھائی ہیں وہ نظام قضا کے مختصر کورس کے بعد قضا کا منصب سنبھال سکتے ہیں ...
میں نے عرض کیا کہ میں اسے تسلیم کرتا ہوں لیکن پہلے یہ دیکھ لیجئے کہ ضلع اور تحصیل کی سطح پر قاضی مقرر کرنے کے لئے پاکستان کے اضلاع اور تحصیلوں کی تعداد کے مطابق اس سطح کے مدرسین مل جائیں گے یا نہیں اور اگر ہمارے پاس اتنی تعداد میں اس معیار کے مدرسین مل بھی جائیں تو انہیں عدالتوں میں بھیج کر دینی مدارس میں ہدایہ کی سطح کی کتابیں کون پڑھائے گا؟ اس سوال کا جواب حضرت مفتی محمود صاحبؒ نے اپنے مخصوص انداز میں ٹال دیا۔ لیکن میں نے ان کے چہرے کی سلوٹوں سے اندازہ لگالیا کہ اس سوال نے خود انہیں بھی پریشان کر دیا ہے۔

دینی مدارس کو ابھی تک اپنے وجود کے تحفظ اور اپنے کردار کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے تحفظات کی فضا کا سامنا ہے اور وہ اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اپنی تیار کردہ کھیپ دوسرے شعبوں کے حوالے کر کے اپنے کام کو جاری رکھ سکیں۔ اس لئے اگر دینی مدارس

اپنے تیار کردہ افراد کو مسجد و مدرسہ تک محدود رکھنے کے لیے کچھ تحفظات اختیار کیے ہوئے ہیں تو ان کی اس مشکل کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ پھر ایک اور پہلو سے بھی اس مسئلہ کا جائزہ لینا مناسب ہوگا۔ وہ یہ کہ اس وقت پاکستان بھر میں مساجد میں امامت و خطابت کے فرائض سرانجام دینے والے افراد میں مستند و غیر مستند کا تناسب کیا ہے؟ اگر اس کا غیر جانبدارانہ سروے کیا جائے تو غیر مستند ائمہ و خطباء کا تناسب مستند حضرات سے کہیں زیادہ ہوگا اور ہمارے یہاں مذہبی معاملات میں خرابیوں کی ایک بڑی وجہ یہ ہے، جس کی طرف اکثر حضرات کی توجہ نہیں ہے اور جو اہل دانش اس کا ادراک رکھتے ہیں وہ کسی فتوے کی زد میں آجانے کے خوف سے اس کا اظہار نہیں کرتے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے جس کو تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے اور اسلامی نظریاتی ریاست ہونے کے ناطے سے اسٹیٹ کی ذمہ داری ہے کہ جس طرح دوسرے شعبوں میں ان کوالیفائیڈ افراد کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے کوالیفائیڈ افراد کی فراہمی پر زور دیا جاتا ہے، امامت و خطابت اور دینی تعلیم کے شعبہ میں بھی ان کوالیفائڈ افراد کا تناسب کم سے کم کرنے اور بالآخر اسے ختم کرنے کی پالیسی اختیار کی جائے اور جس طرح ملک میں خواندگی کا تناسب بہتر بنانے کے لیے پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور ایک معقول بجٹ اس کام کے لئے مخصوص کیا جاتا ہے، دینی شعبہ میں کوالیفائیڈ افراد کا تناسب بڑھانے کے لیے دینی مدارس کی حوصلہ افزائی کی جائے اور قومی تعلیمی بجٹ میں ان کے لئے معقول حصہ مختص کیا جائے۔

دینی مدارس سے دوسری شکایت یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے مختلف شعبوں بالخصوص عدلیہ میں مطلوبہ معیار کے رجال کار کی فراہمی کو دینی مدارس کے نظام نے اپنے مقاصد میں شامل نہیں کیا۔ یہ کام اگرچہ اصلاً ریاستی نظام تعلیم کا تھا لیکن ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ریاستی نظام تعلیم نے اس سمت سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی اور اس کے بعد اس خلاء کو پر کرنے کے لیے لوگوں کی نظریں بہرحال دینی مدارس کی طرف اٹھتی ہیں۔ اگر دینی مدارس اپنے نصاب تعلیم کا ازسرنو جائزہ لے کر

اسلام کو بطور نظام زندگی دوسرے مروجہ نظاموں کے ساتھ تقابل کے ساتھ پڑھانے کا اہتمام کرتے اور اجتماعی زندگی سے تعلق رکھنے والے حدیث و فقہ کے ابواب کو ضروری اہمیت کے ساتھ پڑھایا جاتا تو دینی مدارس سے فارغ ہونے والے علماء کرام اسلامی نظام کے نفاذ کی جدوجہد کے تربیت یافتہ اور شعوری کارکن ثابت ہوتے اور اس کے ساتھ اگر تجارت، عدالت، انتظامیہ اور دیگر شعبوں کے افراد کے لیے ہلکے پھلکے کورسز تیار کر کے انھیں دینی مدارس کے تعلیمی دائرہ میں شریک کرلیا جاتا تو اسلامی نظام کے لیے رجال کار کی فراہمی کی ایک اچھی بنیاد مل سکتی تھی، لیکن ایسا نہیں ہوا اور اس کے نتائج آج معاشرہ میں فکری انتشار اور اخلاقی انارکی کی صورت میں سب کے سامنے ہیں۔

دینی مدارس سے تیسری شکایت اسلام کے بارے میں مغربی لابیوں اور ورلڈ میڈیا کے منفی پروپگنڈہ کی صورت میں سامنے آنے والے چیلنج کو نظر انداز کرنے کی ہے۔ آج اقوام متحدہ کے چارٹر، جینوا انسانی حقوق کمیشن کی قرار دادوں اور بنیادی حقوق کے مغربی تصورات کے حوالہ سے اسلامی احکام اور قوانین کا مذاق اڑایا جارہا ہے۔ جرائم کی شرعی سزاؤں کو انسانی حقوق کے منافی قرار دیا جارہا ہے۔ ارتداد اور توہینِ رسالت ؐ پر قدغن کے بارے میں اسلامی قوانین کو آزادی رائے کے بنیادی حق سے متصادم کیا جارہا ہے اور دنیا میں کسی بھی جگہ اسلامی معاشرہ کے قیام کو قرون وسطیٰ کے ظالمانہ دور کی واپسی سے تعبیر کیا جارہا ہے۔ اس چیلنج کو سامنا کرنے اور آج کی زبان میں اسلام کو انسانی حقوق کے علمبردار اور محافظ نظام کے طور پر پیش کرنے کے لیے لوگوں کی نظریں دینی مدارس اور اداروں کی طرف اٹھتی ہیں اور عام مسلمان یہ توقع کرتا ہے کہ جس طرح دینی مدارس کے نظام نے برطانوی استعمار کے دور میں اعتقادی اور معاشرتی فتنوں کا دل جمعی سے مقابلہ کیا تھا آج بھی وہ مغربی فلسفہ کی نئی اور تازہ دم یلغار کے سامنے خم ٹھونک کر میدان میں آئے گا مگر چند استثناؤں کو چھوڑ کر دینی مدارس میں اس چیلنج کے ادراک کی فضاء ہی سرے سے موجود نہیں جو بلاشبہ ایک بہت بڑا المیہ ہے۔

دینی مدارس سے چوتھی شکایت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے اساتذہ اور طلبہ کو گفتگو

اور مباحثہ کے نئے اسلوب اور ہتھیاروں سے روشناس نہیں کرایا، فتویٰ اور مناظرہ کی زبان قصہ پارینہ بن چکی ہے مگر دینی مدارس بلکہ ہمارے منبر و محراب پر بھی ابھی تک اسی زبان کا سکہ چلتا ہے۔ اخبارات پڑھنے والے اور ٹی وی دیکھنے والوں کے لیے ہماری زبان اور اسلوب بیان اجنبی ہو چکے ہیں مگر ہم کوئی پروا کیے بغیر اسی ڈگر پر قائم ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر و بیشتر دینی مجالس میں تعلیم یافتہ لوگوں کا تناسب دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے۔ آج کی زبان منطق و استدلال کی زبان ہے، مشاہدات کی زبان ہے، کسی بھی مسئلہ کو اس کے پس منظر اور نتائج کے ساتھ پیش کرنے کی زبان ہے اور انسانی حقوق کے حوالے سے گفتگو کی زبان ہے، مگر دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کی اکثریت اس زبان سے نا آشنا ہے اور ستم بالائے ستم کہ اچھا بولنے اور اچھا لکھنے والوں کا تناسب جو دینی حلقوں میں پہلے ہی بہت کم تھا، مزید کم ہوتا جا رہا ہے۔ انگلش اور عربی تو رہی ایک طرف، اردو زبان میں اپنے مافی الضمیر کو اچھی تحریر کی صورت میں پیش کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ ایک پختہ کار عالم دین نے شکایت کی کہ فلاں قومی اخبار کو میں نے درجنوں مضامین بھجوائے ہیں، ان میں سے ایک بھی شائع نہیں ہوا۔ میں نے اس اخبار کے ایڈیٹر سے بات کی تو انھوں نے جواب دیا کہ جو مضمون ہمیں پورے کا پورا از سر نو لکھنا پڑے، اسے شائع کرنے کا تکلف ہم کس طرح کر سکتے ہیں۔

دینی مدارس سے پانچویں شکایت یہ ہے کہ دینی اور اخلاقی تربیت کا جو ماحول کچھ عرصہ پہلے تک ان مدارس میں قائم رہا ہے وہ ختم ہوتا جا رہا ہے اور گنتی کے چند اداروں کے سوا دینی مدارس کی اکثریت ایسی ہے جن میں طلبہ کی فکری، دینی اور اخلاقی تربیت کا نظام موجود نہیں ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مدارس سے فارغ ہونے والے فضلاء کی اکثریت کے ذہنوں میں مشنری جذبہ کے طور پر کوئی واضح اور متعین مقصد زندگی نہیں ہوتا، اور اگر کسی کے ذہن میں کوئی مقصد ہو بھی تو اس کے مطابق اس کی تربیت نہیں ہوتی اور اس کے نقصانات بھی قدم قدم پر سامنے آ رہے ہیں۔

دینی مدارس سے چھٹی شکایت یہ ہے کہ ان کا باہمی ربط و مشاورت کا نظام انتہائی

کمزور ہے۔ پہلے تو بالکل نہیں تھا مگر کچھ عرصہ سے تمام مذہبی مکاتب فکر کے مدارس نے اپنے اپنے وفاق کر لیے ہیں جو اگرچہ فرقہ وارانہ بنیادوں پر ہیں لیکن اپنے اپنے مکتب فکر کی حد تک انھوں نے باہمی ربط کا ایک نظام قائم کر لیا ہے جس سے امتحانات کی صورت حال بہتر ہوئی ہے اور کچھ دیگر فوائد بھی سامنے آئے ہیں لیکن معاشرہ میں دینی مدارس کی کارکردگی اور اثرات کا دائرہ جس قدر وسیع ہے اس کے مطابق موجودہ ربط و نظم قطعی طور پر ناکافی ہے جس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ مدارس کے قیام میں کوئی منصوبہ بندی اور ترجیحات نہیں ہیں۔ جہاں جس کا دل چاہتا ہے ضروریات اور تقاضوں کو ملحوظ رکھے بغیر کسی بھی معیار اور سائز کا دینی ادارہ قائم کر لیتا ہے اور چونکہ اوپر چیکنگ کا کوئی نظم موجود نہیں ہے۔ اس لیے کارکردگی اور اخراجات کا دائرہ شخص واحد یا زیادہ سے زیادہ اسکے منظور نظر چند افراد تک محدود رہتا ہے۔ ان خودرو دینی مدارس میں ایک بڑی تعداد ایسے اداروں کی ہے جو تعلیمی اداروں کی بجائے "مذہبی دکانیں" کہلانے کے زیادہ حق دار ہیں اور ان میں مالی بدعنوانیوں کا سلسلہ دراز ہوتا جارہا ہے۔ ضیاء الحق مرحوم کے دور میں سرکاری زکوٰۃ کا ایک حصہ دینی مدارس کے لئے مخصوص کیا گیا تو اس کے حصول کے لیے دنوں میں کئی مدرسے وجود میں آگئے اور پھر سرکاری زکوٰۃ کی رقم حاصل کرنے کے لیے رشوت، سفارشات اور بدعنوانیوں کے جو دروازے کھلے انھوں نے دینی اداروں کو بھی دیگر سرکاری محکموں کی صف میں لاکھڑا کیا۔ اس سلسلہ میں دینی مدارس کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک حصہ میں وہ معیاری دینی ادارے ہیں جنھوں نے سرکاری زکوٰۃ کی وصولی سے گریز کیا اور اپنی چادر کے دائرے میں پاؤں پھیلانے کے باوقار طریق کار پر گامزن رہے۔ دوسرے نمبر پر وہ دینی مدارس ہیں جو اپنی کارکردگی اور معاملات میں دیانت اور اعتماد کے معیار پر پورے اترتے ہیں اور انہوں نے سرکاری زکوٰۃ وصول کر کے اسے صحیح مصرف پر صرف کیا۔ اور تیسرے نمبر پر وہ مدارس ہیں جنھوں نے سرکاری زکوٰۃ وصول اور خرچ کرنے میں کسی دینی اور اخلاقی معیار کی پابندی کا تکلف گوارا نہیں کیا۔ بدقسمتی سے سرکاری ریکارڈ میں تیسری قسم کے مدارس کی فہرست زیادہ لمبی ہے اور دینی مدارس کے مجموعی نظام کے بارے میں سرکاری حلقوں کی رائے

قائم ہونے میں یہی فہرست بنیاد بن رہی ہے۔ پھر چند بڑے اور معیاری دینی مدارس کو چھوڑ کر اکثر و بیشتر دینی مدارس نے عوامی چندہ کے حصول کے لیے جو طریقے کچھ عرصہ سے اختیار کر لیے ہیں انھوں نے چندہ دینے والے اصحاب خیر کو پریشان کر دیا ہے اور اس سے مدارس کی نیک نامی اور اعتماد مجروح ہو رہا ہے۔ کراچی، فیصل آباد اور گوجرانوالہ جیسے کاروباری شہروں میں رمضان المبارک کے دوران مساجد اور دکانوں پر دینی مدارس کے سفیروں کی جو یلغار ہوتی ہے اور لوگوں کی توجہ زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کے لیے گفتگو کا جو اسلوب اختیار کیا جاتا ہے، اس سے دینی اداروں کے اعتماد اور وقار کا گراف تیزی کے ساتھ نیچے جا رہا ہے۔ اس میں کوئی مبالغہ کی بات نہیں کہ کاروباری شہروں میں بہت سے دکاندار رمضان المبارک کے دوران سفیروں کی یلغار کے خوف سے خود اپنی دکانوں پر بیٹھنے سے کترانے لگے ہیں اور مساجد میں نمازوں کے بعد کھڑے ہو کر اپیل کرنے والے سفیروں کو اب نمازیوں نے ٹوکنا شروع کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پریشان کن صورت حال پاکستان سے باہر لندن میں دیکھنے میں آتی ہے، جہاں پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش کے مدارس کے سفراء نماز کے بعد کھڑے ہو کر اپنے مدرسے کے لیے اپیل کرتے ہیں اور پھر دروازے پر رومال بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں جہاں نمازی گذرتے ہوئے پاؤنڈ اور سکے پھینکتے جاتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ میرے جیسے حساس دینی کارکن کی نظریں شرم سے زمین پر گڑ جاتی ہیں۔ ابھی چند ماہ قبل جنگ لندن میں ایک مسلم نوجوان کا مراسلہ شائع ہوا جس میں اس نے بتایا کہ برطانیہ میں پلنے بڑھنے والے مسلم نوجوانوں کی اکثریت مساجد میں اس لیے نہیں آتی کہ ایک تو ائمہ اور خطباء کی زبان ان کی سمجھ میں نہیں آتی، دوسرے جن موضوعات پر وہ گفتگو کرتے ہیں ان سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں ہے، تیسرے ہر نماز کے بعد کسی نہ کسی مدرسہ کا سفیر چندہ کے لیے کھڑا ہوتا ہے اور ان کے پاس ہر آدمی کو دینے کے لیے اتنے پیسے نہیں ہوتے۔ یہ صورت حال برطانیہ کی مساجد کی ہے جو ہزاروں میل دور اور اکثر مدارس کے سفراء کی دسترس سے باہر ہے۔ جب وہاں کا یہ حال ہے تو اپنے ملک کی مساجد کا کیا حال ہو سکتا ہے؟ اور قیاس کرنے کی ضرورت کیا ہے، سارا منظر تو ہم رمضان المبارک میں اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

یہ بات نہیں کہ لوگ دینی مدارس سے تعاون نہیں کرتے' اس لیے مدارس کو مجبوراً ایسے طریقے اختیار کرنا پڑتے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے' کیوں کہ بیسیوں ایسے اداروں کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں جن کا سالانہ بجٹ لاکھوں سے متجاوز ہے اور بعض کا کروڑوں کی حدود میں قدم رکھ رہا ہے وہ مدارس نہ سرکاری امداد لیتے ہیں اور نہ ہی ان کے سفیر اس طرح چندہ کے لیے گھومتے پھرتے ہیں' مگر ان کا بجٹ صاحب خیر مسلمانوں کے تعاون سے باوقار طریقہ سے فراہم ہوجاتا ہے۔

یہ ہے دینی مدارس کا ماضی اور حال جسے اب پاکستان کی وزارت داخلہ اور اس سے بڑھ کر بین الاقوامی سطح پر ایمنسٹی انٹرنیشنل اپنی تحقیقات اور سروے کی بنیاد بنا کر دنیا کو ان کی منفی تصویر دکھانے کے درپے ہے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کا تو یہ نظریاتی محاذ ہے' وہ مغربی حکومتوں اور لابیوں کی نمائندہ ہے جن کا موقف یہ ہے کہ اسلام آج کے دور میں بطور "نظام زندگی" قابل عمل نہیں ہے اور اسلامی احکام و قوانین انسانی حقوق کے منافی ہیں۔ اس لیے عالم اسلام میں دینی بیداری کی تحریکات کو ناکام بنانا ضروری ہے' ورنہ قرون وسطیٰ کا وحشیانہ دور پھر واپس آسکتا ہے جس سے ویسٹرن اور تہذیب و ترقی سب کچھ کا خاتمہ ہوجائے گا۔ اس لیے مغربی حکومتیں اور ان کے مفاد میں کام کرنے والی لابیاں عالم اسلام میں دینی بیداری کے کے سرچشموں کو بند کرنا چاہتی ہیں۔ ان کی نظر میں پاکستان دنیا کا سب سے بڑا بنیاد پرست مسلمان ملک ہے اور پاکستان کی بنیاد پرستی کا سرچشمہ دینی مدارس ہیں۔ اس لیے دینی مدارس کو غیر موثر بنانا اور عوام کے ساتھ ان کے اعتماد کے رشتے کو ختم کرنا ضروری ہے۔ اسی بنیاد پر علماء کرام اور دینی مدارس کی کردارکشی اور انھیں منتشر رکھنے پر کروڑوں ڈالر خرچ کئے جارہے ہیں۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل اسی مہم کو لے کر آگے بڑھنا چاہتی ہے اور پاکستان کے غیر معیاری اور برائے نام دینی مدارس کو بنیاد بنا کر ایک رپورٹ دنیا کے سامنے لانے کی کوشش کررہی ہے جس میں دکھایا جائے گا کہ پاکستان کے دینی مدارس میں طلبہ کو آج کے تقاضوں سے بے خبر رکھا جاتا ہے' انھیں مارا جاتا ہے' زنجیروں سے باندھا جاتا ہے' ان سے جبری بیگار لی جاتی ہے' ان کی خوراک' رہائش اور صفائی کا معیار ناقص ہے' انھیں ان مدارس میں آزادی رائے اور دیگر بنیادی حقوق حاصل نہیں ہیں' انھیں جان بوجھ کر ناقص رکھا جارہا ہے تاکہ وہ قومی زندگی

کے کسی شعبے میں کھپ نہ سکیں۔ ان کے نام پر چندہ کر کے مدارس کے منتظمین کھا پی جاتے ہیں اور طلبہ کو انتہائی تنگی کی حالت میں رکھ کر خود عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں اور ان مدارس میں طلبہ کو اسلحہ کی ٹریننگ دے کر دہشت گرد بنایا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی اس رپورٹ کا حصہ ہوگا جو اگلے سال جون تک منظر عام پر آرہی ہے اور اس کے لیے بطور خاص ایسے غیر معیاری مدارس کو سروے کی بنیاد بنایا جا رہا ہے جہاں یہ سب کچھ ہوتا ہے تاکہ رپورٹ پر "غیر حقیقت پسندانہ" اور "خلاف واقعہ" ہونے کا الزام عائد نہ کیا جا سکے۔ اس سروے مہم میں ایمنسٹی انٹرنیشنل کی کوئی ٹیم معیاری دینی مدارس میں نہیں جائے گی اور نہ ہی رپورٹ میں ان کا تذکرہ ہوگا۔ پاکستان کی وزارت داخلہ اور دیگر محکمے اس مہم میں ایمنسٹی انٹرنیشنل کے معاون ہیں اور دینی مدارس کے خلاف اس مہم میں ان کے مقاصد بھی اس سے مختلف نہیں ہیں۔

کسی بھی طبقہ کی کمزوریاں ہمیشہ اس کے خلاف دشمن کا ہتھیار بنتی ہیں اور دینی مدارس کے نظام سے نالاں قوتوں نے اس کے خلاف ان کمزوریوں کو ہتھیار بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے اس لیے دینی مدارس کو اور دینی مدارس کے وفاقوں کو خود احتسابی کا ایک مضبوط نظام قائم کرنا ہوگا اور اپنی کمزوریوں کو خود اپنے ہاتھوں دور کرنے کا اہتمام کرنا ہوگا ورنہ یہ کمزوریاں ان کے خلاف صرف مغربی لابیوں کی پروپیگنڈہ مہم کا ہتھیار نہیں ہوں گی بلکہ ان مدارس پر ریاستی کنٹرول کی مہم میں بھی معاون ثابت ہوں گی۔ اس لئے ہم دینی مدارس کے ارباب حل وعقد کی خدمت میں عرض کریں گے کہ :

- تمام مکاتب فکر کے دینی مدارس کے الگ الگ وفاق اپنا وجود اور نظم قائم رکھتے ہوئے ایک مشترکہ بورڈ قائم کریں اور مشترکہ معاملات کو اس بورڈ کے ذریعہ کنٹرول کیا جائے۔
- درس نظامی کے موجودہ نصاب کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں انگریزی زبان اور عصری علوم کو بنیادی معلومات کی حد تک ضرور شامل کیا جائے۔
- گفتگو اور مباحثہ کے جدید اسلوب اور انگریزی اور اردو میں صحافتی زبان سے

طلبہ کو متعارف کرایا جائے۔

- اسلام کو بطور نظام حیات پڑھایا جائے اور دیگر نظام ہائے حیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ کرا کے نظام شریعت کی اہمیت و ضرورت کو ان کے ذہنوں میں اجاگر کیا جائے۔
- مدارس کی درجہ بندی کر کے ہر علاقہ میں وہاں کی ضروریات کے مطابق مدارس کے قیام کے لیے قومی سطح پر منصوبہ بندی کی جائے۔
- اباحت مطلقہ (فری سوسائٹی) کے مغربی تصور اور انسانی حقوق کے مغربی فلسفہ کے پس منظر اور نتائج سے طلبہ کو آگاہ کیا جائے۔
- دینی، اخلاقی اور روحانی تربیت کا بطور خاص اہتمام کیا جائے اور دینی مقاصد کے حصول کے لیے ان میں مشنری جذبہ اجاگر کیا جائے۔
- مالی امداد کے حصول کے لیے باوقار اور آبرومندانہ طریق کار کی پابندی اور غیر معیاری طریقوں کی حوصلہ شکنی کی جائے اور اس سلسلہ میں وفاقوں کی سطح پر ضابطہ اخلاق طے کر کے مدارس سے اس کی پابندی کرائی جائے۔
- اساتذہ کے مشاہروں اور طلبہ کی رہائش، خوراک اور صفائی کے معیار کو بہتر بنایا جائے اور کام کو پھیلانے کے بجائے تھوڑے اور معیاری کام کو اصول قرار دیا جائے۔
- مسلم معاشرہ میں دینی مدارس کی اہمیت، خدمات اور کردار کے حوالہ سے معیاری مضامین کی انگلش اور اردو میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر اشاعت کا اہتمام کیا جائے۔

ہمیں امید ہے کہ دینی مدارس کے ارباب حل وعقد ان گزارشات پر ہمدردانہ غور فرما کر اصلاح احوال کی ضروری تدابیر اختیار کریں گے تاکہ دینی مدارس کا یہ نظام ماضی کی طرح مستقبل میں بھی اسلامی علوم کی حفاظت اور اسلامی معاشرہ کی تشکیل میں مفید اور مؤثر کردار ادا کر سکیں۔

وہ علم جس کی مسلمان کو ضرورت ہے وہ علم جس کی ضروری بہت اشاعت ہے
وہ علم جس سے نگہبانئ شریعت ہے وہ علم لازمی جس علم کی حمایت ہے
وہ علم جس سے شریعت کے راز کھل جائیں
وہ علم جس سے حقیقت مجاز کھل جائیں

*

وہ علم کیا ہے کہ جس سے ہو آدمی انساں وہ علم کیا ہے جو ہے ہادی رہِ عرفاں
وہ علم کیا ہے منور ہو جس سے دل کا مکاں وہ علم کیا ہے ملے جس سے لذتِ ایماں
وہ علم کیا ہے کہ جو کاشف حقائق ہو
وہ علم کیا ہے کہ جو موضع دقائق ہو

*

وہ علم کیا ہے تھے جبرئیلؑ جس کے نامہ رساں وہ علم کیا ہے جو ہے کاشف رموزِ نہاں
وہ علم کیا ہے جو اسلام کا ہے پشتیباں وہ علم کیا ہے کہ جو مغفرت کا ہے ساماں
وہ علم کیا ہے کہ جس سے ہو دو جہاں کی سیر
وہ علم کیا ہے کہ جو خیر ہے سراپا خیر

*

وہ علم جس کا مدینہ تھا خوشنا گلزار — وہ علم جس کے صحابہ تھے طالب انوار
وہ علم جس کے معلم تھے احمد مختار — وہ علم جس کے ائمہ تھے دل سے حامی کار
وہ علم جس سے دلِ مردہ زندہ ہو جائے
خدا کا دل سے ہر ایک شخص بندہ ہو جائے

*

وہ علم جس سے خدا کی لقا میسر ہو — وہ علم جس سے بشر کو بقا میسر ہو
وہ علم جس سے رضائے خدا میسر ہو — وہ علم جس سے رہِ مصطفیٰ میسر ہو
وہ علم ہے کہ جسے لائے تھے رسول اللہ
تھے محو جس کی اشاعت میں احمدؐ ذیجاہ

*

اسی کی فرض اشاعت ہے ہر زمانے میں — اسی کی فرض حمایت ہے ہر زمانے میں
اسی کی ہم کو ضرورت ہے ہر زمانے میں — اسی سے ہم کو ہدایت ہے ہر زمانے میں
حدیث و فقہ و کتابِ خدا میں ہے وہ علم
انھیں اصول ثلٰثہ میں ہے چھپا وہ علم

مَلفُوظات

فرمایا — کہ باعتبار سورۃ آخری سورۃ اِذَا جَآءَ ہے جس کو سورۂ نصر اور سورۂ فتح بھی کہتے ہیں۔ اس سورۃ میں معناً آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے وصال کی خبر ہے۔ یعنی جب ہر طرح کی نصرت ہماری طرف سے آپ کو پہنچ گئی اور مقصدِ بعثت انجام پا گیا تو اب ہمارے پاس آجائیے۔

ایک مرید نے عرض کیا کہ بعض اعمال برائے رفعِ حاجات دینی و دنیوی جو احادیث میں آئے ہیں۔ مثلاً نماز (حاجت) یا دعائیں، وہ اعمال اس زمانے میں (فوراً) اپنی تاثیر کیوں نہیں دکھاتے — ارشاد فرمایا کہ علماء نے اس کا جواب تین طریقے سے دیا ہے۔

۱: شرائطِ قبولیت مفقود ہیں۔ جب شرط نہ پائی گئی تو مشروط بھی فوت ہوا۔

۲: ان احادیث میں یہ آیا ہے کہ یہ اس دعاء کا یہ خاصہ ہے یہ نہیں ہے کہ ضرور ایسا ہی ہو جائے گا۔ (کبھی کبھی مصلحت کے ماتحت اس دعا کو قبول نہیں بھی فرماتے) اگر (سائل کی مرضی کے مطابق) ہر دعاء قبول کر لی جائے تو ایک محذورِ عظیم لازم آئے گا۔ مثلاً ایک شخص دعاء کر کے آب و بارش چاہتا ہے۔ دوسرا اپنی کسی وقتی مصلحت کی وجہ سے بارش نہیں چاہتا ہے۔ اسی پر اور باتوں کو قیاس کر لو۔

۳: تیسرا جواب یہ ہے اور یہی تحقیقی جواب ہے کہ کثرت ظلمات گناہ کے سبب سے نورانیت دعا اپنا کھلا ہوا نتیجہ اور فائدہ برآمد نہیں کر رہی ہے۔

دیکھو موسم بارش میں اگر اندر خشک جگہ میں بھی سامان رکھا ہو تو اس میں (دیکھو نہ کچھ) نمی

اور تری کا اثر آجاتا ہے۔ یبوست، چنداں اپنا کام نہیں کرتی اور موسم گرما میں اس کے برعکس ہے ـــــــ اسی طرح جب فضا ظلمات معاصی سے پُر ہوتی ہے تو استجابت دعا کم ہوتی ہے، یا ہوتی ہے مگر مفہوم نہیں ہوتی، یا کبھی اللہ تعالیٰ قدرے دعا قبول کرلیتا ہے۔

فرمایا ـــــــ کچھ عرصہ ہوا ایک شیعی درگاہ سلطان المشائخؒ میں وارد ہوا شہر کے فضلاء، علماء، فقراء اور عوام وخواص درگاہ میں حاضر ہوتے ہی ہیں اس نے شہر کے بعض فضلاء سے سوال کیا کہ ایک نومسلم ہے وہ بعد قبولِ اسلام آخر کس مذہب ومسلک کو اختیار کرے اور وہ کیسے جانے کہ کون سا مذہب حق ہے؟ اگر طلب علم کرے تو ایک مدت درکار ہے اور انجام کے لحاظ سے خطرات ہیں، بعض نے اس کا جواب کچھ دیا، بعض نے کچھ ایک جواب یہ دیا گیا کہ فریقین کی متفق علیہ اور مختار باتوں کو اختیار کرکے تحصیل علم کرتا رہے اور تحصیلِ علم کے بعد جس کے راستے کو اچھا جانے اس پر چلے ـــــــ آخر یہ مسئلہ بندے کے سپرد کیا گیا، جب لوگ میرے پاس آئے تو اس (نووارد) شخص کو بھی اپنے ہمراہ لائے ـــــــ میں نے کہا کہ وہ نومسلم چھ باتوں سے جان لے کہ (مسلمانوں میں) مذہب حق کون سا ہے۔ اول یہ دیکھے کہ مکہ جہاں خانۂ خدا ہے وہاں کونسا طریقہ جاری ہے اور کون سا طریقہ ناپید ہے، دوسرے مدینہ میں کون سا مسلک ومذہب ہے؟ تیسرے قرآن کس کو محفوظ ہوتا ہے۔ اور کس کو نہیں، چوتھے بعد نبوت، ولایت کس فرقے میں جاری ہے، پانچویں عید وجمعہ (کا اہتمام) کہاں ہے، چھٹے ہندوستان میں جہاد فی سبیل اللہ کس نے رائج کیا اور یہ سلطان محمود غزنوی رح اور شہاب الدین غوری رح کون تھے؟

سیّد احمد (شہیدؒ) کے بارے میں جو کہ حضرت کے بڑے خلفاء میں سے ہیں اور جن کا ذکر خیر اس سے پہلے بھی آچکا ہے۔ بعض حاضرین مجلس نے عرض کیا کہ ان کو جو حضرت والا کے ساتھ فنائیت وعشق ہے اس کی وجہ سے ہم کو بھی ان سے بہت محبت پیدا ہو گئی ہے ـــــــ ارشاد فرمایا کہ ہاں وہ بندے سے خالص محبت رکھتے ہیں ـــــــ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے ـــــــ یہ خالص محبت ہونا اختیاری بات نہیں ہے چنانچہ ایک شاعر نے کہا ہے ؎

یا دل بکہ باید داد، یا دل زکہ باید ستد
دل دادن ودل بردن ایں امر خدا داد است

ارشاد فرمایا ـــــ کہ میں جس زمانے میں دلی کہنہ میں رہتا تھا ــــ کوچہ انبیاء میں ایک سید کے گھر ایک پوربی باندی رہتی تھی جو بالکل جاہل تھی اور نماز کی بھی پابند نہ تھی چونکہ وہ عمر رسیدہ ہوگئی تھی اور گھر کے تمام صاحبزادوں پر اپنا حق رکھتی تھی۔ اس لیے وہ لوگ اس کی بڑی خدمت اور دیکھ بھال کرتے تھے۔ جب اس کا آخری وقت ہوا تو وہ ایک آواز پوربی لہجے میں بلند کرتی تھی جس کا مطلب، مفہوم کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، علماء وصلحاء کو بلا کر دریافت کیا گیا، کچھ نہ معلوم ہوا۔ آخر میرے چچا شاہ اہل اللہ رح کے بلانے کی نوبت آئی، سو وہ تشریف لے گئے، انھوں نے معلوم کر لیا کہ اس کی زبان سے لَاتَخَافِی۔ لَاتَحْزَنِی (اے عورت مت خوف کر مت غمگین ہو) نکل رہا ہے، چچا صاحب نے اس کے تیمار داروں سے فرمایا کہ اس سے دریافت کرو کہ یہ الفاظ کس وجہ سے کہہ رہی ہے۔ بڑی کوشش کے بعد اس نے جواب دیا کہ ایک جماعت (فرشتوں کی) آئی ہوئی ہے اس کی زبان سے یہ الفاظ نکل رہے ہیں (جو میری زبان پر آگئے) پھر آپ نے دریافت کرایا کہ کیا تو ان الفاظ کا مطلب سمجھ رہی ہے؟ اس نے کہا مجھے تو بس اتنا محسوس ہو رہا ہے کہ یہ جماعت مجھے تسلی دے رہی ہے۔ پھر چچا صاحب نے فرمایا کہ اس سے دریافت کرو کس عمل کی وجہ سے یہ تسلی دیجا رہی ہے؟ اس نے کچھ دیر کے بعد کہا کہ یہ حضرات کہہ رہے ہیں کہ تیرے پاس اور اعمال خیر تو نہیں ہیں البتہ تو ایک دن موسم گرما میں گھی لینے کے لیے بازار گئی تھی ـــــ جب تو نے گھی لاکر گھر میں جوش دیا تو اس میں سے ایک روپیہ نکلا۔ اول تو نے چاہا کہ اس روپئے کو چپکے سے اپنے پاس رکھ لے، اپنے کام میں لائے اس لیے کہ کسی کو اس راز کی خبر نہ تھی، پھر یہ خیال کرکے کہ حق تعالےٰ تو دیکھ رہا ہے تو نے وہ روپیہ دکاندار کو لوٹا دیا، تیرا یہ عمل اللہ کے یہاں پسند ہوا، اسی کی وجہ سے ہم تجھ کو بشارت دے رہے ہیں۔

فرمایا ـــــ پسر محمد علی خاں (فاروقی) ارکاٹ نے ترجمہ تحفہ اثناعشریہ

لہ گوپامئو ضلع ہردوئی کے فاروقی خاندان نے مدراس میں اپنی حکومت قائم کی تھی (بقیہ اگلے صفحہ پر)

عربی زبان میں مولوی اسلمی[1] (مدراسی) سے کرا کے ملک عرب میں بھیجا ہے میرے پاس بھی ایک نسخہ بھیجنے کا قصد تھا مگر وہ بھیج نہ سکے۔

فرمایا ــــــــــ کہ تحفہ اثنا عشریہ[2] کی تاریخِ تصنیف ایک شخص نے یوں کہی ہے

تحفہ را ایک فن مداں کہ درو　　　سوئے ہر معرفت سراغ آمد
سوئے لفظ و معانیش بنگر　　　ہست دریا کہ در ایاغ آمد
بسکہ نورِ ہدایت است و یقیں　　　سالِ تصنیف او چراغ آمد

برسبیل تذکرہ فرمایا کہ ایک شاعر نے (بندے کے متعلق) یوں کہا ہے۔

جامع[3] علم و عمل یشیخ الوری عبد العزیز
آنکہ او اندر جوانی کارِ پیراں می کند

(بقیہ حاشیہ) محمد علی خاں غالباً اس حکومت کے بانی ہیں۔ مولانا محمد ابرار حسین فاروقی گوپا موی ایم اے علیگ جواہر زواہر میں تحریر فرماتے ہیں "تحفہ اثنا عشریہ" نے کافی شہرت حاصل کی جس کا عربی میں بھی ترجمہ ہوا تھا جس کو نواب والاجاہ اول والئی مدراس کے صاحبزادے اور جانشین نواب عمدۃ الامراء والاجاہ ثانی نے عرب ممالک کے لیے کرایا تھا یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ ترجمہ طبع ہوا یا نہیں ص۹۰)۔

[1] مولوی اسلمی مدارسی کا نام محمد سعید ہے نہایت فاضل تھے۔ ملک العلماء مدراس کے ارشد تلامذہ میں سے تھے ۱۲۷۲ھ میں انتقال ہوا (ترجمہ تذکرۃ العلماء ہند مطبوعہ کراچی ص۱۱)

[2] ان تینوں شعروں کا مفہوم و مطلب یہ ہے..... تحفہ اثنا عشریہ کو صرف ایک فن کی کتاب نہ سمجھو اس میں ہر علم و معرفت کی رہنمائی موجود ہے... اس کے الفاظ و معانی پر نگاہ کرو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوزے میں دریا کو بند کر دیا گیا ہے چونکہ یہ کتاب نور ہدایت و یقین ہے اس لیے اس کی تاریخ تصنیف لفظ چراغ سے نکلتی ہے۔ ۱۲۰۴ھ

[3] (ترجمہ) جامع علم و عمل شاہ عبد العزیز رہ وہ ہیں جو جوانی کے اندر عمر رسیدہ علماء کا کام انجام دے رہے ہیں چونکہ وہ صاحب معنوی سے استمداد کرتے ہیں اس لیے تفسیر قرآن کرتے وقت ٹھاٹھیں مارنے والا سمندر معلوم ہوتے ہیں (اس قطعہ سے معلوم ہوا کہ آپ نے تفسیر فتح العزیز جوانی کے زمانے میں لکھی تھی۔

بسکہ استعداد دارد از سحاب معنوی
بحر مواج است چوں تفسیر قرآں می کند

فرمایا ——— ہر جانور کا بچہ جلد دوڑنے لگتا ہے اور آدمی کا بچہ بعد دو سال کے چلتا ہے اور وہ بھی ضعف اور آہستگی کے ساتھ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ آدمی کا سر اس کے قد کے تناسب سے بڑا ہوتا ہے برخلاف دوسرے حیوانات کے کہ ان کا سر انکے قد و قامت کے لحاظ سے چھوٹا ہوتا ہے آدمی کو یہ بڑا سر اس لیے دیا گیا ہے کہ اس میں قوت فکریہ زیادہ چاہیے، تاکہ جمیع امورات کو انجام دے سکے۔

(اسی بات کے ساتھ یہ بھی فرمایا) ایک بات یہ بھی غور کرنے کی ہے کہ اگر کوئی چیز داہنے ہاتھ پر رکھی جائے تو بوجھل معلوم ہوتی ہے، برخلاف بائیں ہاتھ کے کہ اسی وزن کی چیز اس پر ہلکی معلوم ہوتی ہے۔ آخر اس کا کیا سبب ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ داہنا ہاتھ بہت سے کام انجام دیتا ہے اس پر ایک چیز رکھ کر اس کو گویا مقید کر دیا گیا بایاں ہاتھ زیادہ تر بے کار و معطل رہتا ہے اسی وجہ سے وہ چیز اس کو گراں نہیں معلوم ہوتی۔

ارشاد فرمایا کہ ——— بعض امور تجربے کے بعد معلوم ہوتے ہیں، مثلاً یہ کہ مطالعہ کتب (عربیہ) وہ شخص اچھی طرح کر سکتا ہے جس کو علم نحو خوب یاد ہو، اور مناظرے میں وہ غالب رہتا ہے جو اصول خوب یاد رکھتا ہو اور گھر میں تنہا بیٹھ کر فکر وہ اچھی طرح کر سکتا ہے جو منطق میں ماہر ہو۔

ارشاد فرمایا کہ ——— حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں چار بُری عادتیں اپنے اندر رکھتا ہوں، اگر آپ فرمائیں تو ان میں سے ایک کو چھوڑ دوں چاروں کا چھوڑنا مشکل ہے۔ دریافت فرمایا وہ کون کون سی بری عادتیں ہیں۔ عرض کیا، چوری، زنا، دروغ گوئی اور شراب۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ (چوری وغیرہ کی) سزاؤں کا حال تجھ کو معلوم ہے اس نے عرض کیا، جی ہاں! معلوم ہے۔ فرمایا کہ بس جھوٹ چھوڑ دے، اس نے قبول کیا۔ پھر جب کسی حرکت کا ارادہ کرتا تھا وہ جھوٹ نہ بولنے کا اقرار اور فعل بد کی سزا کو یاد کرتا تھا اور باز رہتا تھا

پھر اس نے کہا حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے ہر چہار طرف سے مقید کر دیا۔

ایک مرید نے دریافت کیا کہ حضرت عائشہ رضؓ یا فاطمہؓ نے کبھی عورتوں کی امامت کی ہے فرمایا نہیں ـــــ بلکہ یہی وجہ کراہت امامتِ نساء کی ہے اکہ ان جیسی تقدس مآب خواتین نے بھی عورتوں کی امامت نہیں کی، مگر عہد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسا ضرور ہوتا تھا کہ اگر کسی کو مسجد میں نماز با جماعت نہیں ملتی تو وہ شخص اپنے گھر آکر اہل وعیال کے ہمراہ نماز باجماعت ادا کر لیتا تھا۔

فرمایا کہ ـــــ بعض اطباء علاج بالخاصیۃ ـــــ جس کو ٹوٹکہ کہتے ہیں ـــــ کرتے ہیں چنانچہ مجھے نقرس (رانگن) کا مرض تھا اچھا نہیں ہوتا تھا، ایک کتاب میں دیکھا کہ ایسے بچے کے سر کے بال، جو چالیس دن سے زیادہ اور چھ ماہ سے کم عمر کا ہو... ... موضع درد پر باندھیں، درد جاتا رہے گا، میں نے ایسا ہی کیا، مرض جاتا رہا۔

ارشاد فرمایا کہ ـــــ حضرت ابوحنیفہؒ، حضرت جعفر صادق رحؒ سے اکثر اور حضرت محمد باقر رحؒ اور حضرت زین العابدین رحؒ سے کمتر روایت کرتے ہیں، اور زید شہید رحؒ سے بھی بہت روایت کرتے ہیں ـــــ ان کے شاگرد بہت ہیں جیسے فضیل بن عیاض رحؒ اور عبداللہ بن مبارک رحؒ وغیرہما اور ان کا مذہب اسہل ہے پھر حضرت ابوحنیفہ رحؒ کے تقویٰ اور کرامت کے واقعات بیان فرمائے۔

ارشاد فرمایا کہ ـــــ حضرت علی رضؓ کے انیس صاحبزادے تھے۔ پانچ صاحبزادے حضرت حسین رضؓ کے ہمراہ شہید ہوئے اور حضرت حسن رضؓ کے نو صاحبزادے تھے جن میں قاسم لاولد تھے، دوسرے صاحبزادوں میں سے اکثر کی اولاد کا سلسلہ اب تک باقی ہے۔

فرمایا کہ ـــــ اللہ تعالیٰ نے اسلاف کی عمروں میں اور ان کے اوقات میں بڑی برکت دی تھی ـــــ چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطی مصری شافعی رحؒ جو کہ صاحب تصانیف کثیرہ تھے ان کے اوقات کا حساب لگایا گیا ہے۔ پندرہ ۱۵ سال نکالنے کے بعد کہ وہ ان کے بچپن کا اور تحصیلِ علوم کا زمانہ ہے روزانہ بارہ ۱۲ ورق ان کی تصانیف کے بیٹھتے ہیں... ...کب حج بیت اللہ کیا ہوگا اور کب درس علوم اور تدریس وغیرہ کا مشغلہ رکھا ہوگا؟

فرمایا کہ ——— والد ماجد رہ نے ہر ایک فن میں ایک ماہر شخص تیار کیا تھا اور ہر فن کے طالب کو اس فن کے ماہر کے سپرد کر دیتے تھے ——— خود معارف گوئی اور معارف نویسی میں مشغول رہتے تھے اور درس حدیث دیتے تھے (بعض مضامین) بعد مراقبہ اور کشف کے ذریعے معلوم کر لینے کے بعد تحریر فرماتے تھے ——— بیمار کم ہوتے تھے ——— عمر شریف ۸۱ سال چار ماہ کی ہوئی۔ ۴ر شوال المکرم کو پیدا ہوئے تھے اور ۲۹ر محرم الحرام کو بوقت ظہر وفات پائی ——— (اس کے بعد غالباً دوبارہ معلوم کر کے جامع ملفوظات نے وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ) آپ کی تاریخ تولد ۴ر شوال ۱۳۱۴ھ روز چہارشنبہ ہے ——— تاریخ وفات..... اویود امام اعظم دین ——— ہے

فرمایا کہ ——— اگر آدمی کردار کا سچا اور پکا ہو تو بڑی اچھی بات ہے ——— کتب سلوک میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک چور تھا اس نے اپنے گروہ سے یہ عہد کیا تھا کہ میں سوائے بادشاہ کے گھر کے کسی کے یہاں چوری نہیں کروں گا۔ چنانچہ ایک رات موقع پا کر بام بادشاہ پر چڑھ گیا، دیکھا کہ بادشاہ جاگ رہا ہے اور اپنی بیوی سے لڑکی کی شادی کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے، درمیان گفتگو میں بادشاہ نے کہا کہ میں گرد و نواح کے بادشاہوں میں اس لڑکی کا رشتہ نہیں کروں گا۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ کسی ایسے شخص سے اس کی شادی کروں جو صالح ہو اور دین کا بادشاہ ہو۔ بیوی نے کہا کہ آپ کس طرح پہچانیں گے کہ یہ دین کا بادشاہ ہے۔ جواب دیا کہ جو شخص ایک سال تک تکبیر اولیٰ فوت کئے بغیر نماز با جماعت پڑھے گا، وہ بلاشبہ صالح ہوگا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کو کوئی شرعی عذر ہو اور اس کی وجہ سے کبھی تکبیر اولیٰ رہ جائے۔

اس چور نے جب یہ سنا تو چوری چھوڑ چھاڑ کر ایک مسجد ڈیرا ڈال لیا، اور سال بھر تک اس کی تکبیر اولیٰ فوت نہیں ہوئی ——— اب سوائے اس کے کوئی ایسا نہ تھا کہ اس کی تکبیر اولیٰ سال بھر تک فوت نہ ہوئی ہو۔ (ایک سال گزرنے پر بعد تحقیقات) بادشاہ اس مسجد کی طرف گیا، سلام و کلام اور تعظیم و تکریم کے بعد بادشاہ نے اس شخص سے دریافت کیا کہ آپ کے پیر و مرشد کون ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ میرے پیر و مرشد تو سرکار ہی ہیں

اور پورا قصہ بیان کیا ———— پھر بادشاہ کے کہنے کے باوجود، اس کی لڑکی سے اپنی شادی کرنا منظور نہیں کیا۔

پھر ارشاد فرمایا کہ نیت ہمیشہ ڈانوا ڈول رہا کرتی ہے، اسی بناء پر بزرگوں نے کہا ہے کہ عملِ خیر میں مشغول رہنا چاہیئے۔ انشاء اللہ تعالیٰ کبھی نہ کبھی نیت درست ہو ہی جائے گی۔

میں مسلمانوں کو کام کی اور ضرورت کی باتیں کہتا ہوں لیکن وہ نہیں مانتے الٹا مجھے ملعون کرتے ہیں۔ مجھے دیکھو میں سولہ برس کا تھا کہ گھر بار چھوڑ کر نکل آیا۔ مانا کہ میرا خاندان بہت بڑا نہیں تھا اور نہ ہمارے یہاں دولت کی فراوانی تھی لیکن آخر میری ماں تھی میری بہنیں تھیں اور ان کی محبت میرے دل میں جاگزیں تھی۔ لیکن اسلام سے مجھے اتنی محبت تھی کہ میں کسی محبت کو بھی خاطر میں نہ لایا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ ماں کے چھوڑنے سے مجھے کس قدر ذہنی کوفت ہوئی

اسلام کی اس شیفتگی کا نتیجہ تھا کہ جو بھی مجھے اسلام کی بات سمجھاتا اور وہ بات میرے دل میں بیٹھ جاتی، تو میں اس کا گرویدہ ہو جاتا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے مجھے اسلام سکھایا اور ان کے واسطے سے میں شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کو سمجھا اور میں دینِ اسلام کی حکمت سے آگاہ ہوا۔ اب اگر میں موجودہ طبقہ کے خلاف کوئی بات کہتا ہوں، تو اسے یہ سمجھنا کہ میں مذہب کے خلاف ہوں کس قدر غلط ہے۔ میں نے دنیا کی عزیز ترین متاع یعنی والدہ کی محبت پر مذہب کو مقدم جانا اور آج عمر بھر کی مصائب اور تکالیف کے باوجود مجھے اپنے مسلمان ہونے پر فخر ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آج جب کہ مجھے اپنی زندگی کا آخری کنارہ نظر آرہا ہے کوئی بات ایسی کہوں جس سے خدانہ کرے اسلام کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

(مولانا سندھیؒ)

تقلید کی اہمیت

مولانا مفتی شبیر احمد قاسمی مدرسہ شاہی مراد آباد

الحمد للّٰہ الذی وفقنا ان نتبع مسالک ائمۃ الھدی وصلی اللّٰہ تعالیٰ علی شمس الھدایۃ والتقی۔

یارب صل وسلم دائما ابدا علی حبیبک خیر الخلق کلھم۔

اس رسالہ (مقالہ) کا اصل مقصد عدول عن المذہب کے مسئلہ کو واضح کرنا ہے مگر مسئلہ اس وقت تک اچھی طرح واضح نہ ہوگا جب تک اس کی تمام شرائط ولوازمات بھی ساتھ ساتھ واضح نہ ہو جائیں۔ لہٰذا مسئلہ کی نزاکت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم اس رسالہ (مقالہ) میں چار امور پر اہمیت کے ساتھ بحث کریں گے اور چاروں کو الگ الگ باب پر مستقل بحث کرکے واضح کریں گے۔

(۱) مسئلہ تقلید (۲) مسئلہ تلفیق (۳) مسئلہ ضرورت وحاجت (۴) مسئلہ عدول عن المذہب۔ اور ہر باب کے مسائل کو اسی باب کے تحت ترتیب وار دلائل اور حوالوں کے ساتھ واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

باب اول مسئلہ تقلید

عدول عن المذہب اور مسلک غیر کے جزئی مسائل کے اختیار کرنے کے سلسلہ میں بحث کا دار ومدار ایک مجتہد کے مسلک کی تقلید اور پابندی کی اہمیت کے ثبوت پر ہے اور جب تک مجتہد واحد کے مذہب کی پابندی کی اہمیت سامنے نہیں آئے گی اس وقت تک مسلک غیر کے اختیار کرنے کے شرائط واضح نہیں ہو پائیں گے اس لیے اس مسئلہ پر بحث کرنے سے پہلے مجتہد واحد اور ایک امام کے مسلک کی پابندی اور تقلید سے متعلق بطور تمہید سات باتوں کی وضاحت کی جارہی ہے۔ (۱) تقلید کی ضرورت (۲) اقسام نصوص (۳) تقلید مطلق

(۴) صحابہ کی تقلید (۵) تقلید شخصی (۶) مقلد کی قسمیں (۷) مقلد محقق کا تفرد۔

(۱) تقلید کی ضرورت

تمام امت مسلمہ پر اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت فرض ہے اور مطاع بالذات خداوند تعالیٰ کی ذات واحد ہے اور ایک عام آدمی کے دائرہ امکان میں یہ بات نہیں آسکتی ہے کہ وہ براہ راست اللہ سے ہم کلام ہو کر اس کی مرضی معلوم کرسکیں اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ پیغمبر سے براہ راست رجوع کرکے حکم الٰہی کا علم حاصل کرسکے اس لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کا راستہ صرف اور صرف یہی ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم اور احادیث رسول کی طرف رجوع کیا جائے اور قرآن کریم اور احادیث رسول کی طرف رجوع کے لیے قرآن وحدیث کی نصوص کے اقسام کو سمجھنا لازم ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ جس نص سے متعلق بحث کی جارہی ہے وہ کس قسم اور کس درجہ کی ہے۔

(۲) اقسام نصوص

قرآن کریم اور احادیث شریفہ کی نصوص کل چار قسموں پر ہیں (۱) قطعی الثبوت، قطعی الدلالت (۲) قطعی الثبوت ظنی الدلالت (۳) ظنی الثبوت قطعی الدلالت (۴) ظنی الثبوت ظنی الدلالت۔ اور اس کو فقہاء نے ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

بیان ذلك ان الادلة السمعية اربعة الاول قطعی الثبوت والدلالة کنصوص القرآن المفسرة او المحکمة والسنة المتواترة التی مفهومها قطعی والثانی قطعی الثبوت ظنی الدلالة کالآیات المؤولة الثالث عکسه کاخبار الآحاد التی مفهومها قطعی الرابع ظنیها کاخبار الآحاد التی مفهومها ظنی فبالاول یثبت

اس کی وضاحت یوں ہے کہ ادلہ سمعیہ چار ہیں (۱) قطعی الثبوت، قطعی الدلالت جیسا کہ قرآن کریم کی نصوص مفسرہ اور نصوص محکمہ اور وہ احادیث متواترہ جن کا مفہوم قطعی ہو (۲) قطعی الثبوت ظنی الدلالت جیسا کہ وہ آیات قرآنیہ جن میں تاویل کی گنجائش ہوتی ہے (۳) اس کے برعکس ہے وہ اخبار احاد جن کی دلالت قطعی ہونے کی وجہ سے تاویل کی گنجائش نہ ہو (۴) ظنی الثبوت ظنی الدلالة جیسا کہ وہ اخبار

الفرض والحرام وبالثانی والثالث الواجب وکراھۃ التحریم وبالرابع السنۃ او المستحب الخ[1]

اما جن کا مفہوم ظنی ہونے کی وجہ سے تاویل کی گنجائش ہو، اول سے فرضیت اور حرمت ثابت ہوتی ہے ثانی اور ثالث سے واجب اور کراہت تحریمی ثابت ہوتی ہے اور رابع سے سنت، مستحب ثابت ہوتا ہے۔

اب نصوص کی چار قسموں میں سے ہر ایک کی اجمالی تفصیل ذیل میں درج کی جارہی ہے۔

① قطعی الثبوت قطعی الدلالت

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن وحدیث کی وہ نصوص جن کا ثبوت قطعی ہو، اور دلالت بھی قطعی ہو اور قطعی الثبوت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن سے ثابت ہو یا احادیث متواترہ سے ثابت ہو، اور قطعی الدلالت کا مطلب یہ ہے کہ اس نص سے جو حکم ثابت ہو رہا ہے اس میں کسی قسم کی تاویل کی گنجائش نہ ہو اور اس نص کے ذریعہ سے کسی شئی کے کرنے کا حکم کیا جائے تو اس کا کرنا فرض ہوگا اور اگر ترک کرنے کا حکم کیا جائے اور اس کے اختیار کرنے سے منع کیا جائے تو اس نص سے اس شئی کی حرمت ثابت ہوگی۔ اور ایسے نصوص کا منکر کافر ہوجاتا ہے جیسا کہ آیت کریمہ:

من شھد منکم الشھر فلیصمه الآیۃ[2] — جس شخص کی زندگی میں رمضان کا مہینہ آجائے وہ رمضان کا روزہ ضرور رکھ لے۔

یہ آیت قرآن سے ثابت ہونے کی وجہ سے قطعی الثبوت ہے اور فلیصمه سے فرضیت صوم میں تاویل کی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے قطعی الدلالت ہے۔

حرمت علیکم المیتۃ والدم ولحم — تم پر مردار خون اور خنزیر کا گوشت حرام

---

[1] شامی کراچی ج۱ ص۹۶، العرف الشذی ص۲۶، طحطاوی علی المراقی ص۱۳، حاشیہ شرح نقایہ ص۳، تاتارخانیہ ص۳۲۔ [2] سورۂ بقرہ آیت ۱۸۵۔

الخنزیر الآیة [۱] کردیا گیا۔

یہ آیت قرآن سے ثابت ہونے کی وجہ سے قطعی الثبوت ہے اور مذکورہ اشیاء کی حرمت میں تاویل کی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے قطعی الدلالت ہے اور اسی طرح بہت سی احادیث شریفہ بھی قطعی الثبوت قطعی الدلالت ہیں، جیسا کہ پانچ نمازوں کا ثبوت اور نماز کے اوقات خمسہ کا ثبوت یہ احادیث تواتر سے ثابت ہیں۔ اس لیے قطعی الثبوت ہیں اور پانچ وقت نماز کے فرض ہونے میں تاویل کی گنجائش نہ ہونے کی وجہ قطعی الدلالة ہیں اور اس موضوع کی روایات کتب حدیث میں کافی طویل بھی آئی ہیں اور مختصر بھی اور ہم یہاں پر مختصر سی ایک حدیث امامت جبرئیلؑ سے متعلق اور ایک حدیث پانچ نمازوں کی فرضیت سے متعلق اور حدیث کذب علی النبیؐ سے متعلق نقل کرتے ہیں:

(۱) نزل جبرئيل فامني فصليت معه ثم صليت معه ثم صليت معه ثم صليت معه ثم صليت معه يحسب باصابعه خمس صلوات. [۲]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت جبرئیل امین نے تشریف لاکر میری امامت فرمائی، تو میں نے ان کے ساتھ نماز پڑھی اس کے بعد پھر دوسری نماز پڑھی، پھر تیسری نماز پڑھی، پھر چوتھی نماز پڑھی، پھر پانچویں نماز پڑھی، حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلیوں سے پانچ نمازیں شمار فرمائیں۔

(۲) قال يا محمد انهن خمس صلوات كل يوم وليلة (الحديث)[۳] وفي البخاري لايبدل القول لدي (الحديث)

(لیلۃ الاسریٰ میں آخری مرتبہ میں) اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ اے محمد یہ نمازیں دن اور رات میں پانچ ہی ہوں گی، اور بخاری شریف میں اس کا اضافہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

---

[۱] سورہ مائدہ آیت ۳۔ [۲] بخاری شریف ص ۷۵/۱ج، مسلم شریف ص ۲۲۱/۱ج، ترمذی شریف ص ۳۸/۱ج، طحاوی شریف ص ۸۷/۱ج، ابو داؤد شریف ص ۵۶/۱ج۔
[۳] بخاری شریف ص ۵۱/۱ج، مسلم شریف ص ۹۱/۱ج، ترمذی شریف ص ۵۱/۱ج، ابو داؤد شریف ص ۵۶/۱ج

کہ ہمارے یہاں قول میں تبدیلی نہیں ہوتی۔

(۳) من کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار۔[1] جو شخص مجھ پر جھوٹ باندھے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

(۲) قطعی الثبوت ظنی الدلالۃ

یہ ایسی نص ہے جس کا ثبوت قرآن سے ہو مگر اس میں تاویل اور مختلف معنی مرادی نکالنے کا امکان ہو تو اس کا ثبوت چونکہ قرآن سے ہے اس لیے قطعی الثبوت ہے اور اس کے معنی مرادی میں مختلف جہتوں کا احتمال ہوتا ہے اسی لیے اس کی دلالت قطعی نہیں ہے بلکہ ظنی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

المطلقٰت یتربصن بانفسھن ثلٰثۃ قروء الایۃ[2] مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین قروء تک روکے رکھیں۔

اس آیۃ کریمہ میں لفظ قروء دو احتمال رکھتا ہے۔

۱۔ قروء سے حیض مراد ہے جیسا کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ نے یہی مراد لیا ہے۔ نیز حضرت امام احمد بن حنبل رح کا راجح قول بھی یہی ہے مگر حضرت امام شافعی رح اور امام مالک رح نے لفظ قروء سے طہر مراد لیا ہے[3]

لہٰذا آیت کے اس لفظ میں تاویل کی گنجائش ہونے کی وجہ سے ائمہ مجتہدین کے درمیان معنی مرادی کے متعین کرنے میں اختلاف واقع ہوگیا ہے....... اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد:

اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاءً فَتَيَمَّمُوْا الایۃ[4]

---

[1] مسلم شریف ص ۷ ج ۱، نزھۃ الفکر ص ۱۱، [2] سورۂ بقرہ آیت ۲۲۸،
[3] اوجز المسالک ص ۲۰۵ ج ۴، عمدۃ القاری ص ۳۰۲ ج ۲۰، حاشیہ شرح بخاری ص ۸۰۲ ج ۲۔
[4] سورہ مائدہ آیت ۶

یہ آیت کریمہ نص قرآنی ہونے کی وجہ سے قطعی الثبوت ہے لیکن اس کے معنی مرادی میں تاویل کی گنجائش ہونے کی وجہ سے ائمہ میں اختلاف ہوگیا، چنانچہ حضرات حنفیہ لمستم سے جماع مراد لیتے ہیں اور حضرات ائمہ ثلاثہ، امام کسائی اور حمزہ کی قراۃ اَوْ لَمَسْتُمُ النِّسَآءَ کے مطابق لمس بالید مراد لیتے ہیں اور امام شافعی رہ کا مفتی بہ قول یہی ہے کہ لَمَسْتُمْ سے لمس بالید مراد ہے، اس لیے ان حضرات کے نزدیک مس مرأۃ (عورت کا چھونا) ناقض وضو ہے اور حنفیہ کے نزدیک چونکہ جماع مراد ہے اس لیے مس مرأۃ ناقض وضو نہیں ہے۔ لہٰذا معنی مرادی میں تاویل کی گنجائش ہونے کی وجہ سے ظنی الدلالت ہے، اسی طرح مسح علی الخفین کی روایت بے شمار صحابہ سے تواتر کے ساتھ مروی ہے لہٰذا تواتر اسانید کی وجہ سے حدیث شریف قطعی الثبوت ہے مگر اس کے معنی مرادی میں تاویل کی گنجائش ہے اس لیے شیعہ امامیہ اور خوارج نے یہ کہا ہے کہ مسح علی الخفین مطلقاً جائز نہیں ہے اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا موزوں پر مسح کرنا سورۂ مائدہ کے نزول سے پہلے کا واقعہ ہے اور ابن رشد مالکی رہ نے بدایۃ المجتہد[1] میں امام مالک کا قول نقل کیا ہے کہ مسح علی الخفین صرف مسافر کے لیے جائز ہے مقیم کے لیے جائز نہیں ہے مگر حضرت امام ابوحنیفہ رہ، امام شافعی رہ، امام احمد بن حنبل رہ اور جمہور فقہاء کے نزدیک مسح علی الخفین مسافر اور مقیم دونوں کے لیے جائز ہے۔ امام ترمذی رہ[2] نے مسح علی الخفین کی روایت کو انیس[3] صحابہ سے نقل فرمایا ہے، لہٰذا یہ حدیث شریف تواتر سے ثابت ہونے کی وجہ سے قطعی الثبوت ہے اور تاویل کی گنجائش ہونے کی وجہ سے ظنی الدلالت ہے۔

(۳) **ظنی الثبوت قطعی الدلالۃ** یہ ایسی نص ہے جو خبر واحد یا خبر مشہور سے ثابت ہو اور اس کے معنی مرادی میں تاویل کی گنجائش نہ ہو اور تمام امت نے متفق ہو کر اس کے ایک معنی مراد لیے ہوں جیسا کہ حدیث شریف میں حضور پاک صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

الا لا یحج بعد ھٰذا العام مشرک — آگاہ ہو جاؤ کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک

---

[1] بدایۃ المجتہد ص ۱۸ج ۱ ایضاً الطحاوی ص ۳۳/۱ج ۱ [2] ترمذی مع العرف الشذی ص ۳۱ج ۱ [3] تحفۃ الفکر ۴

ولا یطوف بالبیت عریان[1] حج نہیں کر سکتا اور نہ ہی بیت اللہ شریف کا طواف ننگے ہو کر کیا جاسکتا ہے۔

یہ حدیث شریف تواتر سند سے مروی نہ ہونے کی وجہ سے ظنی الثبوت ہے مگر اس کے معنی مرادی میں تاویل کی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے قطعی الدلالت ہے۔ ۹ھ میں حضرت صدیق اکبرؓ کی امارت کے تحت حج کے موقع پر اس اعلان کے بعد مشرک کے لیے حج کرنا اور ننگے ہو کر بیت اللہ کا طواف کرنا ہمیشہ کے لیے حرام ہو گیا ہے اور اس کی حرمت میں امت میں سے کسی کا اختلاف نہیں ہے اور اسی طرح صدقہ فطر کی روایت ہے:

عن بن عمر قال فرض رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم صدقۃ الفطر علی الذکر والانثیٰ والحر والمملوک (الحدیث)[2] حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ہر مرد اور عورت اور ہر آزاد و غلام پر صدقہ فطر فرض فرمایا ہے۔

اور یہاں فرض سے واجب مراد ہے اور یہ حدیث شریف خبر متواتر نہ ہونے کی وجہ سے ظنی الثبوت ہے اور صدقہ فطر کے وجوب پر تاویل کی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے قطعی الدلالت ہے۔

④ **ظنی الثبوت ظنی الدلالۃ** یہ ایسی نص ہے جو خبر واحد سے ثابت ہو اور اس کے معنی مرادی میں تاویل کی بھی گنجائش ہو جیسا کہ جمعہ سے پہلے چار رکعت سنت کی روایت ہے۔ حضرات حنفیہ اس کو سنت موکدہ کہتے ہیں اور یہ روایت حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ کے اثر سے ثابت ہے:

عن عبد اللّٰہ بن مسعود انہ کان یصلی قبل الجمعۃ اربعًا وبعدھا اربعًا۔ (الحدیث)[3] حضرت عبد اللہ ابن مسعود سے مروی ہے کہ وہ چار رکعت جمعہ سے پہلے پڑھتے تھے، اور چار رکعت جمعہ کے بعد پڑھتے تھے۔

---

[1] نسائی شریف صفحہ ۲۹/۲، [2] ترمذی شریف صفحہ ۱۴۶/۱، [3] ایضاً صفحہ ۱۱۷/۱۶

یہ حضرت عبداللہ ابن مسعود کا اثر ہے اور ابن ماجہ شریف[1] میں یہ حدیث شریف حضرت ابن عباس رضؓ سے مرفوعاً مروی ہے لیکن سند کمزور ہے۔ یہ حدیث شریف ظنی الثبوت ہے اور تاویل کی گنجائش ہونے کی وجہ سے ظنی الدلالۃ بھی ہے۔ اس لیے حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھنا سنت ہے اور امام مالک رح، امام شافعی رح امام احمد بن حنبل رح کے نزدیک یہ چار رکعتیں سنت نہیں ہیں[2]

اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضؓ کی روایت ہے،

اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا صلوٰۃ الا المکتوبۃ (الحدیث)[3]

یہ حدیث شریف خبر واحد ہونے کی وجہ سے ظنی الثبوت ہے اور تاویل کی گنجائش ہونے کی وجہ سے اس کی دلالت بھی ظنی ہے۔ لہٰذا جماعت شروع ہو جانے کے بعد سنن پڑھنا ———— مکروہ تحریمی یا حرام نہ ہوگا بلکہ صرف مکروہ تنزیہی ہو سکتا ہے اور فجر کی سنت تو حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک بلا کراہت جائز ہے۔

اوپر کی تفصیل سے نصوص شرعیہ کی چاروں قسموں کی حیثیت معلوم ہو گئی کہ ان میں سے پہلی قسم پر عمل کرنے کے لیے کسی عالم کو دوسرے کی تقلید کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ وہ قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہے اس میں کسی انسان کو تاویل کی گنجائش نہیں ہے بلکہ اس کی عبارت النص پر عمل کرنا سب پر فرض ہے لیکن اس کے علاوہ بقیہ تینوں قسموں پر ہر شخص کا کسی امام اور مجتہد کی رائے کے بغیر عمل کرنا بہت دشوار ہے جیسا کہ آیت کریمہ، اَلْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ الایۃ میں قروء سے کیا مراد ہے اس کو متعین کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے اسلئے

---

[1] ابن ماجہ ص۸۰۔ [2] بذل المجہود ص۱۹۶/۲۔ ایضاح الطحاوی ص۳۳۶/۲۔

[3] ترمذی شریف ص۱۹۶/۱۔

یہ لفظ اپنے لغوی معنی کے اعتبار سے مشترک ہے اس کے معنی حیض کے بھی آتے ہیں طہر کے بھی آتے ہیں۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیت کریمہ میں کون سے معنی مراد ہیں اس کو متعین کرنا امام، مجتہد ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ اسی طریقے سے ابو داؤد شریف باب المخابرہ کے تحت حضرت جابر رض سے یہ حدیث شریف مروی ہے:

من لم یذر المخابرة فلیؤذن بحرب من الله ورسوله[1] (الحدیث)	جو شخص مزارعت اور بٹائی کا معاملہ ترک نہ کرے وہ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کا اعلان کردے۔

اس حدیث شریف کے ظاہر سے مطلقاً مزارعت کی حرمت معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ مزارعت کی بہت سی قسمیں ہیں ان میں سے کئی قسمیں جائز ہیں اور کچھ صورتیں ناجائز بھی ہیں۔ لیکن کون سی صورت جائز اور کون سی ناجائز ہے۔ اس کی تعیین کیا ہر کس و ناکس کر سکتا ہے؟ یہ عالم مجتہد کا کام ہے، غیر مجتہد تو اس حدیث شریف کو دیکھ کر مزارعت کی ساری قسموں کو ناجائز کہہ دے گا۔ مسلم شریف کتاب المزارعت کے تحت حضرت عبداللہ ابن عمر رض کی روایت ہے:

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم عامل اهل خيبر بشرط ما يخرج منها من زرع او ثمر[2] (الحدیث)	حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل خیبر سے مزارعت اور مساقات کا معاملہ اس طرح کیا ہے کہ کھیتی اور باغات کی پیداوار کی ایک خاص مقدار حضور ص کو دیا کریں گے۔

اس حدیث شریف سے مزارعت اور بٹائی کے معاملہ کا جائز ہونا واضح ہوتا ہے۔ اسی طرح حضرت عبادہ ابن صامت رض کی روایت ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لاصلوٰة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب[3] (الحدیث)

---

[1] ابو داؤد شریف ص ۲۴۳ ج ۲، [2] مسلم شریف ص ۱۴ ج ۲، [3] بخاری شریف ص ۱۰۴ ج ۱، ترمذی ص ۳۴ ج ۱۔

اس حدیث شریف کے ظاہر کا تقاضہ یہ ہے کہ امام، مقتدی، منفرد سب پر سورۂ فاتحہ
کا پڑھنا فرض ہے لیکن دوسری طرف حضرت جابر رض کی روایت ہے کہ حضور نے ارشاد
فرمایا، من کان لہٗ امام فقرأۃ الامام لہٗ قرأۃ [۱] (الحدیث) نیز حضرت ابوہریرہ
کی روایت، انما جعل الامام لیؤتم بہ فاذا قرأ فانصتوا [۲] (الحدیث)
حضرت جابر رض اور حضرت ابوہریرہ رض کی روایت کا تقاضا یہ ہے کہ مقتدی کے
اوپر کسی قسم کی قرأۃ لازم نہیں ہے بلکہ خاموش رہنا لازم ہے۔ تو کیا اس طرح
دو متعارض روایات کے معنی کو صحیح طور پر متعین کرنا غیر مجتہد کے بس کی بات ہو سکتی ہے
ہرگز نہیں! یہ صلاحیت اللہ تعالیٰ نے صرف مجتہد کے اندر رکھی ہے اس لیے غیر مجتہد
کو اوپر ذکر کردہ نصوص شرعیہ کی چاروں قسموں میں سے بعد کی تینوں قسموں میں کسی
مجتہد کی تقلید کا پابند ہو جانا لازم ہے۔ (جاری)

ضروری اعلان

جن حضرات پر ماہنامہ دارالعلوم کی بقایا رقم چلی آرہی
ہے وہ حضرات فوری طور پر بقیہ روپیہ بھیج کر اپنا
حساب صاف کرالیں اور ۹۵ء کے لئے اپنا زر تعاون
بھیج کر اپنی خریداری کی تجدید کرالیں۔ والسلام

ادارہ

---

۱ طحاوی شریف ص ۱۲۸/۱، ۲ ابن ماجہ ص ۶۱، ۳ طحاوی شریف ص ۱۲۸/۱

اللہ تعالیٰ کا بے حد وحساب شکر ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی نئی جامع مسجد پروگرام کے مطابق تعمیری مراحل طے کرتے ہوئے پائے تکمیل کے قریب پہونچ رہی ہے اور اب اس کے اندرونی حصوں کو دیواروں اور فرش کو سنگ مرمر سے مزید پختہ اور مزین کیا جارہا ہے، یہ کام چونکہ اہم بھی ہے اور بڑا بھی، اس پر رقم بھی کثیر خرچ ہوگی محبین ومخلصین کی رائے ہوئی کہ آئے دن رنگ وروغن کرانے کے خرچ سے بچنے کے لیے بہتر یہ ہے کہ ایک ہی مرتبہ اچھی رقم لگادی جائے، اسی احساس کے پیش نظر اتنا بڑا کام سرانجام دینے کا بوجھ اٹھالیا گیا ہے ہمیں امید ہے کہ تمام حضرات معاونین نے جس طرح خصوصی تعاون دے کر مسجد کو تکمیل کے قریب پہنچایا ہے، اسی طرح بلکہ مزید سرگرمی کے ساتھ دست تعاون بڑھاکر اس مرحلہ کو پائے تکمیل تک پہنچانے میں ادارہ کی مدد فرمائیں گے۔

یہ مسجد بین الاقوامی اہمیت کی حامل درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی جامع مسجد ہے جس میں نہ جانے کس کس دیار کے نیک لوگ آکر نماز ادا کریں گے خوش قسمت ہیں وہ مسلمان جن کی کچھ بھی رقم اس مسجد میں لگ جائے، اس لیے اپنی جانب سے اور گھر کے ہر فرد کی جانب سے اس کار خیر میں حصہ لے کر عنداللہ ماجور ہوں اور دوسرے احباب واقرباء کو بھی اس کی ترغیب دیں ——— اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمیں مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائیں اور دن دونی رات چوگنی ہمہ جہتی ترقیات سے نوازتے ہوئے تمام مصائب وآلام سے محفوظ رکھے ——— (آمین)

پتہ

ڈرافٹ وچیک کے لیے: دارالعلوم دیوبند اکاونٹ نمبر ۳۰۰۷۶ اسٹیٹ بینک آف انڈیا دیوبند

منی آرڈر کے لیے: حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند ۲۴۷۵۵۴

دار العلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دار العلوم

ماہ شوال المکرم سنہ ۱۴۱۶ھ مطابق ماہ مارچ سنہ ۱۹۹۶ء

جلد نمبر ۸۱	شمارہ نمبر ۳	فی شمارہ -/۶	سالانہ -/۶۰

نگراں	مدیر
حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب	حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی
مہتمم دار العلوم دیوبند	استاذ دار العلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دار العلوم - دیوبند، سہارنپور (یو پی)

سالانہ بدل اشتراک:
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۲۰۰ روپئے
پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۱۰۰
بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم -/۸۰
ہندوستان سے -/۶۰

PH. NO. 33428   COD - 01336   PIN - 247554

فہرست مضامین

ختم خریداری کی اطلاع

◯ یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہو گیا ہے، اس لئے وی، پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کردیں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔
- بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس الرحمٰن سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حبیب الرحمٰن قاسمی

حرفِ آغاز

خدائے رحیم وکریم کا ہزار ہزار شکر ہے کہ رمضان المبارک کی تعطیل گذار کر حسبِ معمول ۱۰ شوال المکرم سے دارالعلوم دیوبند کے نئے تعلیمی سال کا آغاز ہوگیا۔ امسال داخلہ کے امیدواروں کی تعداد ۲۵ سو کے قریب تھی۔ اتنی بڑی تعداد کے امتحان کا انتظام، جوابات کی جانچ پھر نتائج کا اعلان۔ ظاہر ہے کہ ایک دشوار کام ہے جس پر شب وروز کی مسلسل کاوش کے بغیر قابو پانا مشکل ہے۔ لیکن حضرات اساتذہ اور دفتر تعلیمات کے کارکنوں نے پوری تندہی کے ساتھ بعجلت ممکنہ ہفتہ عشرہ کے اندر سارے کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہونچا دیا اور داخلہ کی کارروائی مکمل کر کے ۲۷ شوال سے بخاری شریف کے درس سے باقاعدہ تعلیم کا آغاز کر دیا گیا۔

امتحانِ داخلہ کے نتیجہ میں جو باتیں سامنے آئی ہیں ان سے مدارسِ دینیہ کے ذمہ داروں کو مطلع کرنا ضروری ہے تاکہ موجودہ صورتِ حال کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے کی جد وجہد میں تمام مدارس رہیں اور حوصلہ افزا نتائج تک پہونچنے میں سارے تعلیمی اداروں کو ان کے وسائل کے مطابق حصہ دار بنایا جاسکے۔

صورتِ حال یہ ہے کہ امتحانات داخلہ کے لئے مرتب کئے گئے سوالات کے پرچے دارالعلوم دیوبند کے سالانہ امتحان کے معیار کے مقابلہ میں آسان ہوتے ہیں، ابتدائی درجات ہی میں نہیں بلکہ اونچی جماعتوں کے پرچوں میں یہ رعایت ملحوظ رکھی جاتی ہے۔

لیکن اس سہولت کے باوجود نتائج امید افزا نہیں رہے۔ سالِ ہفتم (موقوف علیہ) کے آٹھ سو امیدواروں میں سے صرف دو سو پچیس امیدوار کامیاب ہوئے، قریب قریب

یہی تناسب دوسری جماعتوں کے امیدواروں کا بھی ہے جس کے نتیجے میں پینتیس سو ۳۵۰۰ امیدواروں میں سے سات آٹھ سو کے درمیان کامیاب ہوسکے۔

صورت حال یہ رہی کہ اکثر مدارس کے امیدواروں میں ناکامی کا تناسب زیادہ رہا البتہ بعض مدارس کے امیدوار صد فی صد کامیاب ہوگئے۔ چونکہ امتحانِ داخلہ کی تمام کاپیاں کوڈ نمبر ڈال کر جانچ کے لئے حضرات ممتحنین کے سپرد کی جاتی ہیں، اس لئے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ شرکاءِ امتحان کے سلسلے میں فرق وامتیاز کا کوئی موقع اور گنجائش نہیں تھی اور یقیناً ناکام ہونے والے امیدوار اپنے ضعفِ استعداد ہی کی بنیاد پر ناکام رہے اور خود بعض مدارس کے اساتذہ نے اپنے ناکام امیدواروں کے بارے میں اس کی تصدیق بھی فرمائی کہ ناکام ہونے والے عام طور پر کمزور استعداد رکھتے تھے۔

امیدواروں کا یہ ضعف یقیناً ان کی بے توجہی اور محنت نہ کرنے ہی کا نتیجہ ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی ایک امرِ واقعہ ہے کہ استعداد کے باوجود بعض امیدوار تحریری امتحان کے تقاضوں کو پورا نہ کرنے کے سبب ناکام ہوگئے۔ خط کی بدنمائی، املاء کی غلطیاں، عبارت میں بے ربطی وغیرہ بھی ایسے امور ہیں جن کے سبب امیدوار پرچۂ جوابات میں اپنی صحیح استعداد کا مظاہرہ نہیں کر پاتے۔

اس لئے مدارسِ عربیہ کے اساتذۂ کرام اور ذمہ داروں سے خصوصی درخواست ہے کہ

۱۔ طلبۂ عزیز کی استعداد سازی پر زیادہ سے زیادہ توجہ فرمائیں۔ اسباق میں حاضری، نظام الاوقات کی پابندی، مطالعہ وتکرار کی نگرانی پر زور دیں۔

۲۔ نصابِ تعلیم کی تکمیل پر پوری توجہ فرمائیں اور دارالعلوم دیوبند کے نصاب کے مطابق طلبۂ عزیز کو دارالعلوم کے شایانِ شان بنانے کی سعیٔ بلیغ فرمائیں۔

۳۔ تحسینِ خط وتصحیحِ املا کی طرف سے بھی بے توجہی نہ برتی جائے۔ تحریری امتحان میں صحیح استعداد کا اظہار ان کے بغیر ممکن نہیں۔

۴۔ سوالات کے جواب لکھنے کا طریق بھی سکھایا جائے کہ مرتب اندازِ تحریر امیدوار

کی کامیابی میں بڑی حد تک معاون ہے۔

یہ بات بالکل درست ہے کہ تمام طلبہ ذہنی صلاحیت میں یکساں نہیں ہوتے، لیکن مسلسل محنت اور ذوق وشوق کے ساتھ اپنے آپ کو علم کے لئے وقف کر دینا ایک ایسا عمل ہے جو تجربہ کی بنیاد پر ناکام نہیں رہا۔ اس وقت مدارس عربیہ کو ایسی نازک صورت حال کا سامنا ہے کہ انھیں کامیاب مدرس دستیاب نہیں، جس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ طلبہ عزیز میں جہد وعمل اور محنت کی وہ کیفیت نہیں رہی جو علوم عربیہ حاصل کرنے والوں کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔

دارالعلوم دیوبند ہی مدارس عربیہ کا مرکز اور دینی تعلیم گاہوں میں مصروف کار علماء کرام اور ذمہ داروں کی مادر علمی ہے ہم سب مل کر موجودہ تعلیمی دینی انحطاط کو روکنے کی جد وجہد کریں گے تو انشاء اللہ بہت جلد اچھے نتائج حاصل ہوں گے۔

ہمارے یہی طلبہ عزیز مستقبل کے معمار اور ہماری دینی درسگاہوں کے اساسی ستون ہیں۔ ہندوستان اور بیرون ہند میں دعوت وتبلیغ اور اصلاح وارشاد کے تمام سلسلے انہی کے ذریعہ فروغ پائیں گے اور ہمارا علمی، دینی، ملی ومعاشرتی مستقبل انہی کے واسطے انشاء اللہ محفوظ ہوگا۔ اس لئے مستقبل کی ان اہم ذمہ داریوں کے لئے انھیں تیار کرنا ہمارے فرائض منصبی میں سے ہے۔ ہمیں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کو تابناک بنانے کے لئے ایک ایک طالب علم پر پوری طاقت صرف کر دینی چاہیئے۔

دینی تعلیم کے مستقبل کو تابناک بنانے کی جد وجہد میں بعض رفقاء کو شکایت بھی ہو جاتی ہے کہ ان کے امیدوار محض سفارش کی بنیاد پر نہیں لئے جاتے لیکن خداوند تعالیٰ کے فضل وکرم سے امید ہے کہ یہ شکایت مستقبل کی تعمیر کی جد وجہد میں مفید رہے گی انشاء اللہ تعالیٰ۔

قادیانی تفسیر میں

گمراہانہ تحریفات

اخلاق حسین قاسمی

انگلینڈ میں مقیم ایک صاحب علم دوست نے قادیانی تفسیر (بیان القرآن تصنیف مولانا محمد علی) کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ ایک مرزائی صاحب اس تفسیر کی عظمت اور اہمیت بیان کرتے ہوئے یہ پروپیگنڈہ کررہے ہیں کہ یہ وہ اہم تفسیر ہے جس سے مولانا ابوالکلام آزاد جیسے مشہور مفسر قرآن نے استفادہ کیا ہے۔

یہ مرزائی صاحب انوار ابوالکلام کتاب میں شامل مقالہ (پروفیسر اختر اورینوی قادیانی) کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔

اس سلسلہ میں مولانا ابوسلمان شاہ جہاں پوری (حال مقیم کراچی) نے بھی اس ناچیز کو اس طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا تھا۔

اہم بات یہ تھی کہ پروفیسر اختر اورینوی (قادیانی) کے دعوے کی تردید کی جاتی، انھوں نے انوار ابوالکلام میں شامل مقالہ میں دعویٰ کیا ہے کہ وہ غلام احمد قادیانی کی تفسیر سے نہ صرف متأثر تھے بلکہ ترجمان القرآن کی تحقیقات میں اس سے استفادہ کیا ہے۔

اب صورت یہ ہے کہ مولانا آزاد کے قرآنی افکار و خدمات پر ایک اہم تصنیف آگئی اور مذکورہ دعوے کا رد نہیں کیا گیا، اب اگر کسی مقالہ میں ایسا کیا بھی گیا تو اخبار اور رسالے کون محفوظ رکھتا ہے؟ بہرحال آپ کی تصنیف پر مبارکباد پیش کرتا ہوں، آپنے مولانا کی یہ اتنی اور ایسی عظیم الشان خدمت انجام دی ہے جو صرف آپ ہی انجام دے سکتے تھے۔

ابوسلمان شاہ جہاں پوری ۱۹؍۹؍۱۹۸۸ء

مولانا موصوف پاکستان میں مولانا آزاد پر جو بے مثال تحقیقی کام انجام دے رہے ہیں وہ نہ صرف قابلِ قدر ہے بلکہ اس ماحول میں حیرت انگیز بھی ہے۔ اور یہ مولانا مرحوم کی روحانی اور علمی کرامت ہے جس نے شاہ جہاں پوری صاحب کو اس کام کے لئے منتخب کرلیا ہے۔ شاہ جہاں پوری صاحب کے اس تبصرہ کے بعد انگلینڈ کے تازہ مکتوب نے اس معاملہ کی اہمیت اور زیادہ کر دی۔ اس لئے اس ناچیز نے قادیانی تفسیر کی تحریفات پر یہ سطریں تحریر کی ہیں۔

اس تفسیر پر مکمل تنقید کی ضرورت ہے۔ اس مضمون کے بعد امید ہے کہ دوسرے اہلِ علم بھی اس پر توجہ کریں گے۔

دارالعلوم دیوبند نے قادیانیت کی تردید کے لئے باقاعدہ جدوجہد شروع کر رکھی ہے جو دارالعلوم کے مشن کا اہم حصہ ہے۔ اس مشن کے تعلق سے بھی اس موضوع پر قلم اٹھانا ضروری ہے۔

مولوی محمد علی قادیانی کی اردو تفسیر "بیان القرآن" ۱۹۲۲ء میں طبع ہوکر سامنے آئی۔ اس لئے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ تفسیر مولانا آزاد کے سامنے رہی ہوگی، کیوں کہ ترجمان القرآن کی ترتیب و طباعت کی داستان رانچی کی چار سالہ اسارت (۱۹۱۶ء تا ۱۹۱۹ء) سے شروع ہوکر ۱۹۳۰ء تک پہونچتی ہے۔

مولانا قید و بند کے ہنگامی دور سے گذرتے رہے، مسودات ضبط ہوتے رہے اور کچھ ضائع ہوتے رہے اور مولانا پھر تکمیل میں مشغول ہو گئے۔ بالآخر ۲۰ جولائی ۱۹۳۰ء کو آخری سورت کی ترتیب سے فارغ ہو گئے۔ (ترجمان القرآن جلد اول ص ۶)

یہ قادیانی تفسیر اپنے مباحث لغوی اور تاریخی تحقیق، زبان و بیان، کسی لحاظ سے بھی اپنے اندر ایسی ندرت اور انفرادیت نہیں رکھتی کہ مولانا آزاد جیسا علمی انا میں مستغرق عالم اپنے آپ کو اس سے استفادہ پر مجبور پاتا، جبکہ محمد علی صاحب اکثر مقامات پر موقعہ و بے موقعہ مرزا غلام احمد قادیانی کی مجددیت کا تذکرہ کر کے ایک سنجیدہ ذہن قاری کا موڈ خراب کر دیتے ہیں۔ اور قرآن کُونُوا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (سچے لوگوں کا ساتھ دو)

کہتا ہے تو وہ مسلمانوں کو مرزا صاحب کی حمایت پر ابھارتے ہیں اور مخالفین مرزا پر غصہ کا اظہار کرتے ہیں اور کبھی ظلی نبوت کی تشریح و تائید میں وقت ضائع کرتے ہیں (جلد دوم ص ۱۰۱۷)

سورہ توبہ آیت ۳۳ کی تشریح کرتے ہوئے مرزا صاحب کی تعریف کو زبردستی عبارت میں داخل کیا ہے، لکھتے ہیں:

"اسی آیت قرآنی کا خلاصہ ہے جو اس صدی کے مجدد نے اپنے ساتھیوں سے یہ اقرار لیا ہے میں دین کو دنیا پر مقدم کروں گا" (جلد دوم ص ۸۳۳)

سورہ انفال آیت ۵۹ کی تشریح میں مرزا صاحب کے الہام کا تذکرہ کرتے ہیں:

"چنانچہ اس صدی کے مجدد حضرت مرزا غلام احمد قادیانی کو آج سے کوئی چالیس سال پیشتر یہ الہام ہوا۔" بخرام کہ وقت تو نزدیک رسید وپائے محمدیاں برمنار بلند تر محکم افتاد" (جلد دوم ص ۸۲۳)

عربی زبان کی اہمیت بیان کرتے ہوئے سورہ یوسف کی آیت ۱ کے تحت مرزائے قادیانی کا نام کس طرح ٹھونسا ہے؟ لکھتے ہیں:

"عربی کے ام الالسنہ ہونے پر مفصل بحث کے لئے دیکھو کتاب ام الالسنہ جو خواجہ کمال الدین کی تصنیف ہے اور اس کی طرف اس زمانہ میں توجہ حضرت مرزا غلام احمد قادیانی نے دلائی ہے" (صفحہ ۹۶۸)

اس ٹھونسا ٹھونسی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کا اصل مقصد قرآن کی تشریح و توضیح نہیں بلکہ مرزائے قادیانی کے مجدد اور مصلح ہونے کا پروپیگنڈہ کرنا ہے۔

مذہبی اختلافات کے باب میں مولانا آزاد کی روش احتیاط و اعتدال پر چلتی رہی ہے۔ مولویانہ مناظرہ بازی کی روش اور ایک دوسرے کی تکفیر کے انتہا پسندانہ رویے سے مولانا ہمیشہ بےزار رہے، اس کے باوجود مولانا نے مرزا غلام احمد قادیانی کے عقائد و نظریات اور ان کی تاویلات کی غلطیوں کو دوسرے علماء حق سے کچھ زیادہ ہی وثوق و رسوخ کے ساتھ واضح کیا ہے۔ ذکر آزاد میں مولانا عبدالرزاق صاحب مرزا غلام احمد کے متعلق مولانا کے خیالات نقل کرتے ہیں:

"مجھے جہاں تک ان لوگوں کی کتابیں دیکھنے اور ان کی زبانی ان کے عقائد سننے کا اتفاق ہوا ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ گو ان کی تاویلات باطلہ سے ہمارے نزدیک قریب قریب انکار لازم آجاتا ہو لیکن انھیں ان کے التزام منطوق سے انکار رہے البتہ وہ تاویلات کرتے ہیں، ہمارے نزدیک وہ تمام تاویلات باطل ہیں اور بدع و ضلالت پر مبنی ہیں" (صفحہ ۱۶۵)

ترجمان القرآن کی ترتیب میں مولانا کے سامنے عربی کی قدیم و جدید تفاسیر اور اکابر علم کے فارسی اور اردو تراجم رہے ہیں۔ تاریخ کی تمام انگریزی اور اردو تاریخیں پیش نظر معلوم ہوتی ہیں۔ اور مولانا کا خداداد دینی فہم اور قرآنی ذوق بھرپور رہنمائی کرتا نظر آتا ہے۔ اس لئے مولانا کی وسعت نظر، ذوق مطالعہ اور علمی خودداری اور تفاسیر قرآن کے عربی ماخذوں سے بے خبر انسان ہی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ مولانا آزاد نے قادیانی تفسیر سے استفادہ کیا اور قادیانی اجتہادات کو قبول کیا۔

صرف ذوالقرنین کی تاریخی تحقیق میں قدیم نظریات سے ہٹ کر فارس کے حکمراں کی طرف جانے کے معاملہ کو دیکھ کر ایسی رائے قائم کرنا نہایت سطحی تاثر ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بائیبل کے اشارہ سے دونوں مصنفوں کا ذہن اس طرف منتقل ہوا۔ مگر محمد علی صاحب ذوالقرنین کے قرآنی اوصاف کا ٹھیک ٹھیک مصداق و محل متعین کرنے میں بالکل ناکام رہے۔ اور سرسری طور پر فارسی حکمراں دارائے اول کو ذوالقرنین قرار دیدیا۔ بائیبل نے دانیال نبی کے خواب کی تعبیر بتاتے ہوئے کہا تھا "وہ مینڈھا جسے تو نے دیکھا کہ اس کے دو سینگ ہیں سو وہ فارس کے بادشاہ ہیں (دانیال نبی ۲۰۸)

اس اشارہ کی روشنی میں قرآنی اشارات کے مطابق فارس کے بادشاہوں میں سے کسی بادشاہ کا تعین کرنا محقق کا اصلی کام تھا، جسے مولانا آزاد کے تحقیقی مطالعۂ مزاج نے انجام دیا اور تیس صفحات کی مفصل بحث و نظر میں ثابت کیا۔ قرآن کا ذوالقرنین سائرس ہے جو دارائے اوّل کا پوتا ہے۔ یہ تحقیق و بحث ایسی تشفی بخش اور فیصلہ کن ثابت ہوئی کہ بعد میں آنے والوں کے لئے اسے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

بعض جزوی بحثوں میں دو مصنفوں کے درمیان اگر فکری وحدت پائی جاتی ہے اور قرآن کریم کی تفسیر جیسے وسیع موضوع اور میدان میں ایسی وحدت یقینی ہے تو اس اشتراک واتفاق کے معنیٰ یہ نہیں ہوسکتے کہ اسے استفادہ کا نام دیا جائے اور بعد والے کو پہلے والے کا مقلد سمجھا جائے۔

چند مثالوں پر غور کیجئے۔

سجدۂ تعظیمی حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے بیٹوں کے سجدہ کو محمد علی صاحب خدا کے لئے سجدۂ تشکر قرار دیتے ہیں اور "خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا" کا ترجمہ کرتے ہیں "اور وہ اس کی خاطر سجدہ میں گر گئے"

مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی بھی اسی توجیہ کی طرف گئے، اور ترجمہ کیا "اور سب اس کے آگے بے اختیار سجدہ میں جھک گئے" (تفہیم ص۴۹۶)

مولانا آزاد نے جمہور مفسرین کی توجیہ اختیار کی اور اس سجدہ کو سجدۂ تعظیمی قرار دیا اور یہ لکھا کہ دنیا میں قدیم سے یہ دستور چلا آرہا ہے کہ حکمرانوں اور پیشواؤں کے آگے سجدہ کرتے ہیں۔ آگے لکھا۔ لیکن اسلام نے توحید کے اعتقاد اور عمل کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا وہ اس طرح کے رسوم کا متحمل نہیں۔ اسلام کہتا ہے کہ ہر جھکاؤ، ہر خمیدگی، ہر رکوع جو کسی قامت پر طاری ہوسکتا ہے وہ اللہ ہی کے لئے ہے (ترجمان دوم ص۲۴۶)

مولانا مودودی صاحب نے سجدہ تحیہ کی تردید میں جو زوردار بحث کی ہے کیا اس کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ مودودی صاحب نے محمد علی صاحب کی تفسیر سے استفادہ کیا ہے۔ کیونکہ محمد علی صاحب نے بھی اپنی توجیہ کو پُر زور دلائل سے ثابت کیا ہے۔

غزوۂ بدر غزوۂ بدر کے موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ابوسفیان کے تجارتی قافلے کے لئے مدینہ سے نکلے یا قریش کے حملہ آور لشکر سے مقابلہ کرنے کے لئے نکلے۔ یہ اختلافی بحث ہے۔ محمد علی صاحب نے دوسری توجیہ اختیار کی ہے اور اس پر قرآن کریم کی داخلی شہادت کے طور پر مختلف آیات نقل کی ہیں اور اس تاویل میں وہ مولانا شبلی کے مقلد ہیں۔ پھر یہی توجیہ مولانا آزاد اور مولانا مودودی

نے اختیار کی ہے۔ لیکن کیا یہ محمد علی صاحب کی پیروی ہے۔

اصل میں مولانا شبلی نعمانی نے سیرۃ النبی جلد اوّل تالیف (۱۹۱۱ء) میں اسی توجیہ پر زور دیا ہے اور انھیں کی تحقیق مولانا آزاد اور مولانا مودودی کے نزدیک صحیح ہے۔

دوسرے تمام مفسرین نے تجارتی قافلہ پر حملہ کی بات کو قرآن کریم کی صحیح مراد ثابت کرنے اور مولانا شبلی کی تردید پر دلائل پر دلائل دے کر اپنا دعویٰ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ (دیکھو سیرۃ المصطفیٰ مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی تالیف ۱۹۳۹ء)

اولادِ یعقوب اور نظرِ بد

برادرانِ یوسف کو حضرت یعقوبؑ نے پدرانہ شفقت کے سبب یہ نصیحت فرمائی کہ مصر کے اندر ایک دروازہ سے داخل نہ ہونا۔ اس احتیاطی نصیحت کی وجہ کیا تھی؟ عام طور پر مفسرین نے نظرِ بد لگنے کے اندیشہ کی طرف اسے منسوب کیا ہے۔

مولانا آزاد نے اس احتیاط کا تعلق سیاسی مصلحت سے قائم کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے جاسوسی کے الزام سے بچانے کے لئے یہ تدبیر بتائی۔ مولانا کے سامنے قدیم مفسرین کے اقوال میں سے ایک قول ہے جسے علاّمہ بغدادی نے روح المعانی میں نقل کیا ہے۔ اور اسی کے ساتھ بائیبل کی ایک روایت ہے۔ (تفصیل کے لئے اس بحث کا مستقل عنوان دیکھو۔)

اردو مصنفین میں مولوی محمد علی صاحب اس توجیہ کو اختیار کر چکے تھے اور ان کا استدلال بائیبل کی روایت ہی پر مبنی ہے۔

پھر مولانا آزاد کے بعد مولانا مودودی صاحب نے بھی تعبیر کے معمولی فرق کے ساتھ اسی توجیہ کو اختیار کیا ہے۔

لیکن اس جزوی وحدتِ فکر کو استفادہ اور تقلید کا نام دینا اگلے مصنّف کیساتھ کورانہ عقیدت مندی کا مظاہرہ ہے علمی تحقیق کا مظاہرہ نہیں۔

ترجمان القرآن کو غور وفکر کے ساتھ پڑھنے والا اس بات کو اچھی طرح سمجھتا ہے کہ تفسیر کے جتنے اہم مقامات ہیں ان کی تحقیق میں مولانا اپنی علمی انفرادیت قائم رکھتے ہیں،

البتہ متقدمین علماء میں سے کسی نہ کسی کا قول واثر مولانا کے سامنے ضرور ہوتا ہے۔ اِلّا ماشاء اللہ، کہیں کہیں مولانا پر قرآن کریم کی داخلی شہادت اور سیاق وسباق کی مناسبت کا القاء ہوجاتا ہے اور مولانا اس تحقیق واجتہاد میں منفرد نظر آتے ہیں۔

خواتینِ مصر کا مکر

مثال کے طور پر دیکھئے کہ خواتینِ مصر کے ہاتھ کاٹنے کے فعل کو بعض علماء نے فعل اختیاری کہا ہے اور بعض نے فعلِ اضطراری محمد علی صاحب قادیانی نے ان دونوں میں سے کسی ایک قول کو ترجیح نہیں دی، دونوں قول نقل کر دیئے۔ اور مولانا آزاد رحمہ نے فعل اختیاری قرار دیا اور اسے مصری خواتین کا مکر و فریب اور تریا چلتر کہا اور دلیل میں قرآن کی داخلی شہادت پیش کی۔

محمد علی صاحب کے یہاں وہ وثوق و پختگی نہیں جو مولانا آزاد کے یہاں نظر آتی ہے پھر اسے استفادہ و تاثر کا نام کیسے دیا جائے؟ (دیکھو بیان القرآن جلد دوم ص۹۸)

مولانا آزاد نے ترجمان القرآن میں وحی اصطلاحی اور وحی لغوی کے درمیان مختلف مقامات پر جو لطیف بحث کی ہے اور ہر قسم کے مغالطہ کو دور کیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں قادیانی تفسیر کی تحریفات ملاحظہ ہوں۔

غیر نبی کی وحی

فرعون کے قتل سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بچانے کے لئے خدا تعالیٰ نے ان کی والدہ (یوخا) کے دل میں بات ڈالی کہ اس بچہ کو صندوق میں رکھ کر دریا کے اندر ڈال دو۔ قرآن کریم نے کہا اذ اوحینا الیٰ امّک مَا یوحیٰ (طٰہٰ ۳۸) اس وقت کو اے موسیٰ! یاد کرو جب ہم نے تمہاری ماں کے دل میں وہ بات ڈالی جو اس وقت ڈالنی چاہیئے تھی کہ اس بچہ کو دریا میں ڈالدے۔

جمہور علماء کے نزدیک یہاں وحی کا لفظ لغوی مفہوم (اشارہ کرنا) میں استعمال ہوا ہے۔ وحی کا شرعی اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ خدا کے نبی ورسول کی طرف خدا کے احکام شریعت کا نازل ہونا تاکہ وہ ان کی تبلیغ وتعلیم کا فرض انجام دے۔

غیر نبی (ولی) کے دل میں خدا کی طرف سے جو بات ڈالی جاتی ہے علماء کے نزدیک اسے الہام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

قرآن نے وحی کے لفظ کو لغوی مفہوم میں شہد کی مکھی کی فطری ہدایت کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ واوحیٰ ربك الی النحل (النحل ۶۸) تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈالی کہ پہاڑوں میں گھر بنا۔

مولوی محمد علی نے دونوں جگہ وحی کا ترجمہ وحی کے لفظ سے کیا ہے۔ شہد کی مکھی کے معاملہ میں تو وہ مجبور تھے اس لئے تشریح کے اندر لکھا:

"گو یہ وحی اور رنگ کی ہے، شہد کی مکھی علم حاصل نہیں کرتی بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اس کی فطرت میں رکھدیا ہے اس کے مطابق مختلف پھلوں سے شیرینی حاصل کر کے ایک جگہ جمع کرتی ہے۔" (جلد دوم ۱۰۸۵)

لیکن ام موسیٰ کی وحی میں وہ اپنے قادیانی فکر کی تائید کرتے ہوئے یہ لکھتے ہیں:-

"اس سے معلوم ہوا کہ وحی الہیٰ غیر نبی کو بھی ایسی ہی یقینی ہوسکتی ہے جیسے نبی کو۔ اگر حضرت موسیٰ کی والدہ کو اس وحی کے من جانب اللہ ہونے کا یقین کامل نہ ہوتا تو وہ اپنے بچہ کو دریا میں نہ ڈالتیں"۔ (۱۲۳۶)

ایک نبی کو اپنی وحی پر جیسا یقین واعتماد ہوتا ہے کسی غیر نبی کو اپنے قلبی القاء و الہام پر ویسا یقین نہیں ہوتا۔ اگر موسیٰ کی ماں کو ویسا ہی یقین ہوتا تو وہ اس راز کو افشاء کرنے کے لئے بے تاب نہ ہوتیں۔ قرآن کریم نے بتایا۔ واصبح فؤاد ام موسیٰ فارغاً إن كانت لتبدی به لولا ان ربطنا علىٰ قلبها لتكون من المومنين (قصص ۱۰) موسیٰ کی ماں نے بچہ کو دریا میں ڈال تو دیا لیکن ماتا کی بے چینی کے سبب اس کا دل صبر سے خالی ہوگیا اور قریب تھا کہ وہ اس راز کو ظاہر کردیتیں اگر ہم نے ان کے دل سے رابطہ اور خاص رشتہ قائم نہ کیا ہوتا تاکہ وہ یقین واعتماد کرنے والوں میں سے ہو جائے۔

قرآن کریم نے ام موسیٰ کی یہ کیفیت قلبی اسی لئے بیان کی تاکہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ غیر نبی کا القاء و الہام (خواہ وہ خواب کی حالت میں ہو یا بیداری کی حالت میں) یقین کا درجہ نہیں رکھتا بلکہ ظن و خیال کا درجہ رکھتا ہے۔

چونکہ مرزا غلام احمد کے خیالی توہمات کو یقینی وحی کی حیثیت دیئے بغیر انکی نبوت

اور مجددیت کا عقیدہ قائم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے محمد علی صاحب نے اپنی طرف سے اُمِ موسیٰ کے القاء کو وحی الٰہی ثابت کرنے کی کوشش کی، کیونکہ اُمِ موسیٰ غیر نبی تھیں۔

کشف اور الہام چونکہ تصوف کی اصطلاحیں ہیں اس لئے اکابر صوفیاء نے علم کے ان ذرائع کو ظنی قرار دیا ہے، یقینی قرار نہیں دیا۔ اور اس مسئلہ میں انہی حضرات کا قول معتبر ہے۔ امام عبدالوہاب شعرانی نے کتاب الیواقیت والجواہر اہلِ استدلال اور اہلِ کشف کے نظریات میں تطبیق دینے کے لئے ۹۵۵ھ میں تالیف فرمائی۔ اور اس میں صوفیاء کے ترجمان کی حیثیت سے محی الدین ابن عربی قدس سرہٗ کی کتاب فتوحاتِ مکیہ کو سامنے رکھا۔

امام شعرانی سورۂ حشر آیت ۷ مَا آتَاکُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوہُ الخ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(ترجمہ) پیغمبر کی باتوں (وحی) کو قبول کرنا علی الاطلاق واجب ہے، اور الہام جو بغیر واسطہ نبی کے براہِ راست خدا سے حاصل ہو اس کے قبول کرنے کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ دلیل شرعی کے مطابق ہو۔ وجہ یہ ہے کہ نبی معصوم ہوتا ہے اور اس کا منصب ہی کلام الٰہی کا پہونچانا ہے، لوگوں کو شبہ میں ڈالنا اس کا کام نہیں ہے، بخلاف ولی کے۔ ولی الہام کے نام پر تلبیس شیطانی میں مبتلا ہو سکتا ہے، ہم پیغمبر کی طرف سے کسی مکر میں نہیں پڑ سکتے، ہاں خدا کی طرف سے ہمارا امتحان ہو سکتا ہے۔ خدا نے ارشاد فرمایا: وَمَکَرُوا مَکْرًا وَمَکَرْنَا مَکْرًا وَھُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ (النمل ۵۰) انھوں نے ایک تدبیر کی اور ہم نے بھی ان کی تدبیر کے توڑ کے لئے ایک تدبیر کی اور وہ بے خبر رہے۔

یہ صفت پیغمبر کے لئے جائز نہیں۔ پس جو شخص سلامت رہنا چاہتا ہے اسے چاہیئے کہ میزانِ شریعت کو ہاتھ سے نہ چھوڑے اور جو اسے براہِ راست (بطور الہام) خدا کی طرف سے ملے اسے شریعت کی میزان میں رکھ کر تولے۔ اگر پورا اترے تو قبول کرے ورنہ اسے رد کر دے۔ (الیواقیت ص۱۹۵)

ہم نے اوپر ادب کی رعایت سے مولانا تھانویؒ کا ترجمہ لکھا ہے اور مکر کا ترجمہ تدبیر کیا ہے، ورنہ اوپر والوں میں شاہ ولی اللہؒ نے بدسگالی، شاہ رفیع الدین نے

مکر کا ترجمہ مکر اور شاہ عبدالقادر صاحب نے مکر کا ترجمہ فریب کیا ہے۔

تصوف کی سب سے زیادہ قدیم و معتبر کتاب "منازل السائرین" ہے جو شیخ الاسلام ابو اسماعیل ہروی (وفات ۴۸۰ھ) کی تصنیف ہے اور اس کی مستند شرح مدارج السالکین ہے جو علامہ ابن تیمیہ کے شاگرد رشید علامہ ابن قیم نے لکھی ہے۔ اس شرح میں علامہ نے علمِ لدُنی کی تعریف میں لکھا ہے:

"علم لدُنی وہ علم ہے جو بغیر واسطہ نبی صرف الہام الٰہی سے براہِ راست حاصل ہوتا ہے جیسے حضرت خضر کا علم جو حضرت موسیٰ کے واسطے کے بغیر حاصل ہوا تھا۔

یہ علم ثمرہ ہے عبودیت، اتباعِ رسالت، صدق و اخلاص کا اور اس جد و جہد کا جو مشکوٰۃِ رسول یعنی کتاب و سُنت سے علم حاصل کرنے کے لئے کی جاتی ہے۔

پھر لکھتے ہیں:

"جو شخص حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کے قصہ سے یہ سمجھتا ہے کہ علم لدنی کے ہوتے ہوئے علمِ وحی کی ضرورت نہیں رہتی وہ اسلام سے خارج اور واجب القتل (یعنی مرتد) ہے۔

(مدارج جلد دوم ص۲۴۳)

اوپر امام شعرانی نے الہام الٰہی کے بارے میں یہ بڑی لطیف اور حقیقت افروز بات کہی ہے کہ کبھی الہام میں خداوندی ابتلاء کا پہلو بھی پوشیدہ ہوتا ہے، اسے ہم آزمائشی الہام کہہ سکتے ہیں۔

الہامِ الٰہی کی اس قسم کو سامنے رکھ کر حضراتِ صوفیہ کے ایک نہایت متنازع نظریہ کی معقول توجیہ کی جاسکتی ہے۔

حضرت امام شاہ ولی اللہ رحمہ نے فیوض الحرمین میں "تحقیق شریف" کے نام سے صوفیہ کا ایک حال ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

ان الاولیاء کثیرًا مایلہمون بانّ اللہ تعالیٰ اسقط عنہم التکلیف وانہ خیرھم فی الطّاعات ان شاؤا فعلوھا وان لم یشاؤا لم یفعلوھا۔

(فیوض مطبع احمدی ص۲۳)

اس کے بعد شاہ صاحب نے اپنے والد شاہ عبدالرحیم اور اپنے چچا شاہ ابوالرضا کے متعلق لکھا ہے کہ ان پر بھی اس قسم کا الہام ہوا مگر ان کے والد نے اس کے جواب میں خدا سے دعا کی کہ مجھ پر شرعی تکلیف قائم رہے۔ اور ان کا مسلک یہ تھا کہ کسی عاقل بالغ سے شرعی تکلیف ساقط نہیں ہوتی۔ اور شاہ ابوالرضا نے جواب دیا کہ الٰہی! تو نے جنت دینے اور دوزخ سے محفوظ رکھنے کا وعدہ فرمایا، یہ تیرا احسانِ عظیم ہے۔ مگر میری عبادت ہر غرض سے پاک ہے، جو ہر حال میں جاری رہے گی۔

مطلب یہ کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے اپنے مقرب بندوں کی آزمائش کے لئے ان پر یہ الہام ہوتا تھا کہ انھیں اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ شریعت کی پابندی کریں یا نہ کریں۔ اور وہ مقربینِ حق اس امتحان میں کامیاب ہو جاتے تھے اور اتباعِ شریعت پر قائم رہنے کی خدا تعالیٰ سے درخواست کرتے تھے۔

حضرت شاہ صاحب نے اس بحث میں اپنی طرف سے یہ توجیہ کی ہے کہ سقوطِ تکلیف میں تکلیف بمعنیٰ مشقت ہے نہ کہ بمعنیٰ ذمہ داری اور فرضیت۔ مطلب یہ کہ اولیاءِ حق کے لئے عبادت عادت بن جاتی ہے اور جس طرح انسان اپنی فطری ضروریات بلا تکلف انجام دیتا ہے اسی طرح اسے نماز روزہ میں زحمت کی بجائے رحمت محسوس ہوتی ہے۔

مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے اپنی مشہور کتاب تزکیۂ نفس میں الہامی علوم اور کشفی ادراک پر جو اعتراضات کئے ہیں اور فیوض الحرمین کی مذکورہ عبارت کو مثال میں پیش کیا ہے ان اعتراضات میں مذکورہ تشریح کے بعد کوئی وزن باقی نہیں رہتا۔ (بحث کا یہ موقع و محل نہیں)

قادیانی تفسیر کی باطل تاویلات

محمد علی صاحب کی قادیانی تفسیر میں تحقیق کا جو پست معیار نظر آتا ہے جس میں انھوں نے قرآنی الفاظ، روایاتِ حدیث اور آثارِ صحابہ کو نظر انداز کر کے اپنی تفسیر کو تفسیر بالرائے (بلکہ تحریف) بنا کر رکھ دیا ہے، اس کی چند مثالیں پیش ہیں۔

شاہی پیمانہ اور بن یامین

(۱) حضرت یوسف کے بھائی بن یامین کے سامان میں شاہی پیالہ رکھنے کا واقعہ مختلف فیہ ہے۔ محمد علی صاحب کی توجیہ یہ ہے کہ بن یامین کے سوتیلے بھائیوں نے یہ شرارت کی اور بن یامین کو چوری کے الزام میں پھنسوانے کے لئے انھوں نے یہ حرکت اختیار کی۔

جمہور علماء اس فعل کو حضرت یوسف کی طرف منسوب کرتے ہیں اور مولانا آزاد بھی جمہور کا ساتھ دیتے ہیں اور لکھتے ہیں:

"اور اس غرض سے کہ اپنی ایک نشانی اسے دیدیں، اس کے سامان میں اپنا چاندی کا پیالہ رکھ دیا"

آگے لکھتے ہیں کہ بن یامین کے سامان میں سے پیالہ برآمد ہونے کے بعد:

"جب حضرت یوسف نے یہ معاملہ سنا تو سمجھ گئے کہ اس حادثہ میں خدا کا ہاتھ کام کر رہا ہے"

محمد علی صاحب نے اس معاملہ میں حضرت یوسف کے تقدس پر لمبی چوڑی بحث کر کے اپنی تاویل کو درست ثابت کرنے کی کوشش کی ہے مگر قرآنی الفاظ اس کے متحمل نہیں۔

مولانا آزاد نے اس کی پابندی کی۔

محمد علی صاحب حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی جاتے رہنے کے قائل نہیں اور فَارْتَدَّ بَصِيرًا کے معنی لکھتے ہیں۔ "تو وہ یقین کرنے والا ہوا"

حالانکہ جمہور ترجمہ کرتے ہیں۔ "اس کی بینائی لوٹ آئی۔" یعنی حضرت یوسف کے کرتے سے اس کی آنکھیں پھر سے روشن ہوگئیں۔ (ترجمان)

حضرت یعقوب علیہ السلام کا گریہ

(۲) محمد علی صاحب نے غم فرزند میں حضرت یعقوب کے اس قدر رونے دھونے کو کہ آنکھیں سفید پڑ جائیں، ایک رسول کے مقام سے فروتر ثابت کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ مگر وہ سب تاویل بعید ہے۔

اور بصیر کو بصیرت سے لینا جمہور مفسرین کے خلاف ہے، جمہور بصارت سے لیتے ہیں۔ مولانا آزادؒ اسی طرف گئے ہیں۔

۳۔ ناسخ ومنسوخ

محمد علی قادیانی آیات قرآنی میں ناسخ ومنسوخ کے

بالکل قائل نہیں جو معتزلہ کا مسلک ہے۔ چنانچہ سورہ نحل آیت (۱۰۱) واذا بدلنا آیۃ مکان آیۃ الخ کا ترجمہ کرتے ہیں۔ اور جب ہم ایک پیغام کی جگہ دوسرا پیغام بھیجتے ہیں "مولانا آزاد نسخ آیات کے قائل ہیں، وہ یہ ترجمہ کرتے ہیں" اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت نازل کرتے ہیں" (جلد دوم ۳۴۴)

۴۔ حضرت لوط علیہ السلام کا سہارا

مولانا آزاد بلا وجہ سب سے الگ چلنے کا شوق نہیں رکھتے، بلکہ جمہور علماء کے ساتھ رہتے ہیں۔ اور محمد علی صاحب میں الگ چلنے کا شوق نظر آتا ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام کا قول ہے۔

قال لو ان بکم قوۃ او اوی الی رکن شدید (ھود ۸۰) کاش تمہارے مقابلہ کی مجھے طاقت ہوتی یا کوئی سہارا ہوتا جس کا آسرا پکڑ سکتا۔

یہ مولانا آزاد کا ترجمہ ہے اور جمہور علماء کے ترجمہ کے مطابق ہے۔ اس ترجمہ میں "رکنِ شدید" سے کوئی معاون اور مددگار مراد ہے جو دشمنوں کے مقابلہ میں حضرت لوط کا ساتھ دیتا۔

تفسیر کا ایک قول یہ ہے کہ اَوْ، بَلْ کے معنیٰ میں ہے اور رکنِ شدید سے خدا کی ذات مراد ہے اور مفہوم یہ ہے کہ۔ بلکہ میں خدا کی پناہ میں آتا ہوں۔

جمہور نے اَوْ کو اپنے اصل معنیٰ (عطف) پر ہی رکھا ہے۔ اس مفہوم میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت لوط ایک غیر قوم (بنی سدوم) میں نبی بنا کر بھیجے گئے تھے۔ اس قوم میں آپ کا کوئی رفیق و معاون نہ نکلا بلکہ آپ کی بیوی تک گمراہوں کے ساتھ رہی اور عذاب میں گرفتار ہوگئی۔

عالم اسباب میں ہر نبی کو معاونوں کی ضرورت پڑتی ہے، حضرت عیسیٰؑ نے کہا تھا مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ۔ اللہ کے کاموں میں میرا مددگار کون ہے؟ حضرت لوط کے اس حسرتناک فقرہ کا یہی مفہوم ہے۔

مولانا حفظ الرحمان نے قصص القرآن میں محمد علی صاحب کی توجیہ کو ترجیح دی ہے اور بخاری شریف کی مشہور حدیث سے استدلال کیا ہے (جیسا کہ محمد علی صاحب نے کیا ہے) لیکن اس

حدیث کا مطلب وہی صحیح ہے جو علامہ شبیر احمد عثمانی نے لکھا ہے۔ صاحب قصص کو سہو ہوگیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یرحم اللہ لوطاً لقد کان یاوی الیٰ رکن شدید. خدا لوط پر رحم کرے، بے شک وہ مضبوط و مستحکم پناہ حاصل کر رہے تھے یعنی خداوند قدوس کی، مگر اس وقت سخت گھبراہٹ اور بے حد ضیق کی وجہ سے اد خیال نہ گیا، بے ساختہ ظاہری اسباب پر نظر گئی حضرت لوط علیہ السلام کے بعد جو انبیاء مبعوث ہوئے وہ سب بڑے جتھے اور قبیلے والے تھے (حمائل ۲۹۸)

۵۔ معراج روحانی تھی

محمد علی صاحب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کے جسمانی ہونے کے قائل نہیں ہیں بلکہ اسے معراج روحانی مانتے ہیں (جلد دوم ۱۱۱۰) اور مولانا آزاد نے حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے حکیمانہ نظریات کی روشنی میں اس مسئلہ کو بڑی خوبی سے حل کیا ہے اور لکھا ہے کہ صحابہ کرام کے دونوں گروہ حق پر تھے، جو حضرات معراج کے جسمانی ہونے کے منکر تھے ان کا مطلب یہ تھا کہ یہ واقعہ مادی جسم کی نقل و حرکت جیسا نہیں تھا۔ اور جو حضرات اسے روحانی مانتے ہیں ان کے نزدیک یہ محض خواب کا واقعہ نہیں تھا، لکھتے ہیں:

"اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ کو نہ تو ایسا معاملہ قرار دے سکتے ہیں جیسا ہمیں جاگتے میں پیش آتا ہے، نہ ایسا جیسا سوتے میں دیکھا کرتے ہیں، وہ ان دونوں حالتوں سے ایک مختلف قسم کی حالت تھی اور ہماری تعبیرات میں اس کے لئے کوئی تعبیر نہیں"

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس درمیانی حالت کے لئے "عالم مثال" کی تعبیر ایجاد فرمائی۔ اور موت کے بعد پیش آنے اور زندگی سے پہلے پیش آنے والے حالات کی توجیہ اسی اصطلاح کی روشنی میں فرمائی۔

نماز کے ضروری مسائل

نماز کے وہ مسائل
جنھیں بعض نادان دوستوں نے حق و باطل کا معرکہ بنادیا ہے

حافظ محمد اقبال رنگونی ۔ مانچسٹر

قسط ۳

۱۸۔ خطبہ جمعہ کا مسئلہ

جمعہ کے دن نماز سے قبل جو خطبہ دیا جاتا ہے وہ ذکر اللہ ہے ۔ تذکیر نہیں وعظ و نصیحت نہیں ۔ قرآن کریم نے اسے فَاسْعَوْا اِلیٰ ذِکْرِ اللّٰہِ سے بیان کیا ہے (تفسیر ابن کثیر) حضرت ابوہریرہ رضؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جمعہ کے دن خطیب جب خطبہ دیتا ہے تو فرشتے اپنے رجسٹر لپیٹ دیتے ہیں اور اس ذکر کو سنتے ہیں ۔ طووا صحفھم ویستمعون الذکر (صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۱۲۷ صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۲۸۱) حضرت سمرہ بن جندب کہتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا احضروا الذکر وادنوا من الامام (سنن ابوداؤد جلد ۱ صفحہ ۱۵۸) صحابہ کرام عرب تھے اور عربی میں ہی یہ خطبہ ہوتا تھا مگر یہ حضرات جب ان ممالک میں پہونچے جہاں کی زبان عربی نہیں تھی تو وہاں بھی یہ خطبہ عربی میں ہی ہوتا رہا کیونکہ یہ ذکر ہے تذکیر نہیں کہ ان ممالک کی اپنی زبان میں ہو ۔ پھر اسلام نے جب پوری دنیا میں اپنا حلقہ پھیلایا تو وہاں بھی خطبہ

عربی زبان میں دیا جاتا رہا۔ پورے چودہ سو سالوں میں کوئی ایک مثال ایسی نہیں ملتی کہ خطیب نے اس ملک کی زبان میں جمعہ کا خطبہ دیا ہو۔ حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ اور آپ کے بعد بھی ہندوستان میں اسی پر عمل رہا۔ آپ خود تحریر فرماتے ہیں کہ :

"عربی بودن نیز بجہت عمل مستمر مسلمین در مشارق و مغارب باوجود آنکہ در بسیارے از اقالیم مخاطبان عجمے بودند" (المصفی شرح موطا امام مالک ص۱۵۴)

معروف غیر مقلد عالم مولانا محمد علی اعظم گڈھی لکھتے ہیں کہ میں نے کامل ڈیڑھ سال مولانا نذیر حسین دہلوی کی خدمت میں گذارے ہیں آپ کے صاحبزادے مولانا شریف حسین نے بھی کبھی جمعہ کا خطبہ اپنی زبان میں نہیں دیا۔ ہمیشہ عربی میں پڑھا۔ اس وقت کوئی جھگڑا نہ تھا اور اختلاف اس مسئلہ میں نہ تھا، خدا جانے اس کا موجد کون ہے۔ دہلی کے بزرگانِ دین جیسے شاہ ولی اللہ، مولانا شاہ عبدالعزیز، مولانا محمد اسماعیل شہید وغیرہم سے بھی غیر عربی میں پڑھنا ثابت نہیں بلکہ مصفیٰ میں تو شاہ صاحب نے تحریر فرمادیا ہے کہ اس کا پڑھنا عربی میں ہمیشہ سے مروج ہے۔ اور ایسا ہی جناب نواب سید محمد صدیق حسن نے بدور الاھلہ میں تحریر فرمایا ہے۔ (دیکھئے فتاویٰ اہل حدیث جلد ۲ ص۴۹)

غیر عربی میں خطبہ جمعہ کا سلسلہ سب سے پہلے ایک غیر مقلد عالم مولانا عبدالوہاب صاحب ملتانی (کراچی) نے شروع کیا آپ سے پہلے یہ نہ تھا۔ مولانا کے صاحبزادے مولانا عبدالستار امیر جماعت غرباء اہل حدیث لکھتے ہیں :

"مولانا عبدالوہاب مرحوم سے قبل اہل حدیث حضرات بھی احناف کی طرح خطبہ جمعہ عربی میں پڑھتے تھے۔ مولانا نے خطبہ جمعہ سامعین کی زبان میں جاری کیا۔" (تفسیر ستاری ص۱۵۲)

غیر مقلد علماء اگر مولانا عبدالوہاب صاحب مرحوم کی تقلید کرتے ہیں تو شوق سے کریں لیکن انھیں کم از کم دوسروں کو طعنہ دینے کا تو حق نہ ہونا چاہیے کہ یہ لوگ حدیث پر نہیں چلتے۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ پورے پچھلے کئی سو سالوں سے دونوں خطبے عربی میں دیئے

جاتے رہے ہیں۔ لیکن ہم یہاں یہ بھی لکھ رہے ہیں کہ آج کل غیر مقلد علماء نے کئی جگہ ایک خطبہ اردو یا انگریزی میں اور دوسرا خطبہ عربی میں دینا شروع کیا ہے۔ اگر خطبہ کا مقصد وعظ ونصیحت ہی ہے تو ان دونوں خطبوں میں یہ تفریق کیوں؟ کیا سامعین دوسرا خطبہ عربی سمجھ لیتے ہیں۔

خطبہ کے وقت دو رکعت پڑھنے کا مسئلہ

خطبہ جمعہ سے قبل دو رکعت تحیۃ المسجد کی ہوں یا اور نوافل یا چار سنتیں یہ سب جائز ہیں۔ جب خطیب خطبہ دینے کے لئے آکھڑا ہو تو پھر اس وقت خاموشی مطلوب ہے۔ اب نہ بات چیت کی جائے نہ نماز ہو۔ یہ خطبہ کا احترام ہے کہ اسے خاموشی اور ادب کے ساتھ سُنا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ خطبہ ہوتے وقت اگر کوئی کسی کو یہ کہتا ہے کہ چپ ہو جا تو اس کا یہ کہنا بھی لغو اور بُری بات ہے۔ اذا قلت لصاحبك یوم الجمعۃ والامام یخطب فقد لغوت (صحیح بخاری جلد۱ ص۱۲۸ صحیح مسلم جلد۱ ص۲۸۱) امام بخاریؒ اس حدیث پر یہ باب باندھتے ہیں باب الانصات یوم الجمعۃ والامام یخطب واذا قال لصاحبہ انصت فقد لغا۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے وقت کسی کو تحیۃ المسجد پڑھنے کے لئے کہا اور جب تک اس نے یہ نماز نہ پڑھ لی آپ خطبہ پڑھنے سے رُکے رہے ترك خطبۃ (صحیح مسلم جلد۱ ص۲۸۷) امسك عن الخطبۃ (المصنف لابن ابی شیبہ جلد۲ ص۱۳۷)

اس سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ تحیۃ المسجد اور خطبہ امام ایک وقت جمع نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ حضراتِ صحابہ کرام بلکہ فقہاءِ عظام اس وقت نماز پڑھنا پسند نہ کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان رضؓ کے دَور کا نقشہ حضرت ثعلبہؓ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ فکان الامام اذا خرج یوم الجمعۃ ترکنا الصلوٰۃ (المصنف لابن ابی شیبہ جلد۲ ص۱۱۱) حضرت علی مرتضیٰؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انہم کانوا یکرھون الصلوٰۃ والکلام بعد خروج الامام (ایضاً) امام نوویؒ نقل

کرتے ہیں کہ جمہور السلف من الصحابۃ والتابعین کا یہی مسلک ہے کہ خطبہ کے وقت نماز نہ پڑھے (نووی جلد ۱ صـ۲۸۶) اس کی پوری تفصیل آپ کو ہمارے رسالہ "خطبہ جمعہ کا احترام" میں ملے گی۔

نمازِ جنازہ جہراً پڑھنے کا مسئلہ

نمازِ جنازہ صورۃً نماز ہے حقیقۃً یہ دعا ہے اور قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق دعا میں جہر نہیں اخفاء چاہیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت ابو امامہؓ فرماتے ہیں کہ نمازِ جنازہ آہستہ ہو (سنن نسائی جلد ۱ صـ۲۸۱) مشہور عالم علامہ شوکانی جمہور سے نقل کرتے ہیں کہ نمازِ جنازہ آہستہ پڑھنا ہی چلا آرہا ہے۔ وذھب الجمھور الی انہ لا یستحب الجھر فی صلوٰۃ الجنازۃ (نیل الاوطار جلد ۴ صـ۱۰۳) جس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی نے سورہ فاتحہ اور سورت جہراً پڑھی تھی تو آپ خود فرماتے ہیں کہ میرا مقصد اس جہر سے یہ تھا کہ نمازِ جنازہ میں سورہ فاتحہ کا (بہ نیتِ دعا) پڑھنا جائز ہے۔ سنت ہے یہ ایک راہِ عمل ہے وتمسکوا بقول ابن عباس المتقدم لم اقرأ ای جھراً الا لتعلموا انہ سنۃ وبقولہ فی حدیث ابی امامۃ سراً فی نفسہ (ایضاً)

مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری لکھتے ہیں کہ:

"اس روایت سے (جنازہ) جہراً پڑھنا ثابت نہیں ہوتا بلکہ آہستہ پڑھنا ثابت ہوتا ہے۔ جمہور کا مذہب یہ ہے کہ نمازِ جنازہ میں فاتحہ اور سورت جہر سے پڑھنا مستحب نہیں ہے۔" (فتاویٰ نذیریہ جلد ۱ صـ۶۶۳)

آپ یہ بھی لکھتے ہیں:

"ان دونوں حدیثوں سے ثابت ہوا کہ نماز میں سورہ فاتحہ آہستہ پڑھنا چاہیئے اور یہی مذہب ہے جمہور کا" (کتاب الجنائز صـ۹۱)

علامہ ناصرالدین البانی کی تحقیق بھی یہی ہے؛

"نمازِ جنازہ سرّی طور پر (یعنی آہستہ) پڑھے"۔ (مختصر احکام الجنائز ص۱۴۲)

سب سے پہلے جس نے نمازِ جنازہ کو جہراً شروع کیا وہ مشہور غیر مقلد عالم مولانا عبدالوہاب صاحب امیر جماعت غرباء اہل حدیث تھے ان کے صاحبزادے مولانا عبدالستار صاحب لکھتے ہیں کہ "مولانا سے پہلے اہل حدیث بھی مثل احناف جنازہ آہستہ پڑھتے تھے۔ مولانا نے جہر سے جنازہ شروع کیا اور اس مُردہ سُنّت کو زندہ کیا۔ (ماخوذ از صلوات الرسول)

یہ سنت ہی کہاں ہے جس کے زندہ کرنے پر شہید کا سا ثواب ہوگا۔ اور پھر بتایا جائے کہ یہ سنّت کب مُردہ ہوئی تھی؟

جو احباب مولانا کی تقلید میں نمازِ جنازہ جہراً پڑھیں وہ شوق سے پڑھیں لیکن دوسروں کو تو مجبور نہ کریں اور انھیں مخالفِ حدیث چلنے والے نہ کہیں، نہ اس کا طعنہ دیں۔ جو لوگ آہستہ پڑھتے ہیں وہ چودہ سو سالوں سے پڑھتے چلے آرہے ہیں۔ اگر اس مسئلہ میں انھیں مخالفِ حدیث ہونے کا طعنہ دیا جائے تو پھر ساری اُمّت اس طعنہ کی زد میں آتی ہے صرف احناف نہیں۔

نمازِ جنازہ میں تکبیرات کا مسئلہ

نمازِ جنازہ میں چار تکبیریں ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ جنازہ پڑھائی تو چار تکبیریں کہیں۔ فکبّر اربعاً (صحیح بخاری جلد۱ ص۔۔، موطا امام مالک ص۸۵، مسند احمد جلد۲ ص۴۳۸) حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابوہریرہ، حضرت براء بن عازب، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت زید بن ثابت وغیرہم چار تکبیریں کہتے تھے (دیکھئے المصنف لابن ابی شیبہ جلد۲ ص۴۹۶)

بعض روایات میں چار سے زائد تکبیرات کہنے کا ذکر بھی ملتا ہے تاہم حضرت عمر فاروق کے دَور میں صحابہ کرامؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر معمولات کو دیکھتے ہوئے چار تکبیروں پر اتفاق فرمادیا۔ عن ابی وائل قال جمع عمر الناس فاستشارهم فی التکبیر علی الجنازة فقال بعضهم کبر رسول اللہ صَلَّی اللہ علیہ وسلم خمسًا وَ قال بعضهم کبر سبعًا وقال بعضهم

کبر اربعًا قال فجمعهم علی اربع تکبیرات (المصنف لابن ابی شیبہ جلد ۲ ص ۴۹۶، سنن کبری بیہقی جلد ۴ ص ۳۷)

مشہور تابعی حضرت ابراہیم نخعی (۹۶ھ) فرماتے ہیں کہ:

اختلف اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی التکبیر علی الجنازۃ ثم اتفقوا بعد علی اربع تکبیرات (ایضًا جلد ۲ ص ۴۹۶)

اس اجماع کے بعد اب پہلا اختلاف باقی نہ رہا، کسی مسئلے پر جب ایک دفعہ اجماع ہو جائے تو پھر اس میں اختلاف کرنا جائز نہیں رہتا۔ امام ترمذی لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر صحابہ کرام کا اسی پر عمل رہا۔

والعمل علی ھذا عند اکثر اھل العلم من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم وغیرھم یرون التکبیر علی الجنازۃ اربع تکبیرات وھو قول سفیان الثوری ومالک بن انس وابن المبارک والشافعی واحمد واسحٰق (جامع ترمذی جلد ۱ ص ۱۲۱)

نمازِ جنازہ میں سورہ فاتحہ کا مسئلہ

نمازِ جنازہ دعا ہے اس میں نماز کی طرح قرأت نہیں کی جاتی ہے۔ نمازِ جنازہ میں اگر کوئی سورہ فاتحہ پڑھنا چاہے تو وہ اسے بہ نیتِ دعا پڑھے۔ بہ نیتِ قرأت و تلاوت نہیں۔ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابو ہریرہؓ وغیرہم اور حضرات تابعین بھی نمازِ جنازہ میں قرأت کے قائل نہ تھے۔

قال ابن بطال وممن کان لا یقرأ فی الصلوٰۃ علی الجنازۃ وینکر عمر بن الخطاب وعلی بن ابی طالب وابن عمر وابو ھریرۃ ومن التابعین عطاء وطاؤس وسعید بن المسیب وابن سیرین وسعید بن جبیر والشعبی والحکم وبہ قال مجاھد وحماد والثوری (اوجز المسالک جلد ۲ ص ۴۵۵)

حضرت امام مالک حضرت نافع سے نقل کرتے ہیں کہ:

ان عبداللہ بن عمر کان لا یقرء فی الصلوٰۃ علی الجنازۃ (موطا امام مالک ص ۲۰)

حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ نمازِ جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنا مدینہ میں معمول نہیں ہے۔
وقال مالك قراءة الفاتحة ليست معمولاً بها في بلدنا في صلوٰة الجنازة
(اوجز ص۳۵۵ ج۲)

حضرت امام مالکؒ کے شاگرد رشید اور مالکی مسلک کے امام مذہب ابن القاسم سے پوچھا گیا کہ امام مالک کے نزدیک مُردہ پر کیا پڑھا جائے؟ انھوں نے فرمایا دعا پڑھی جائے، ان سے پوچھا گیا کہ امام مالک کے قول میں نمازِ جنازہ میں قرأت ہے یا نہیں؟ فرمایا نہیں۔ قلت فهل يقرأ على الجنازة في قول مالك قال لا (ماخوذ از رسول اکرم کا طریقہ نماز بحوالہ زاد المعاد)

حضرت امام ترمذیؒ لکھتے ہیں:

وقال بعض اهل العلم لا يقرأ في الصلوٰة على الجنازة انما هو الثناء على الله والصلوٰة على نبيه صلى الله عليه وسلم والدعاء للميت وهو قول الثوري وغيره من اهل الكوفة (جامع ترمذی جلد ص۱۲۲)

جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا تھا۔ حافظ ابن قیم لکھتے ہیں کہ "ولا يصح اسناده" (زاد المعاد جلد ۱ ص۱۴۱)

سو نمازِ جنازہ میں قرأت نہیں، ہاں سورہ فاتحہ بہ نیتِ دعا اور بہ نیتِ ثناء پڑھی جاسکتی ہے اور یہ جائز ہے۔

غائبانہ نمازِ جنازہ کا مسئلہ

نمازِ جنازہ ایک بار ہے بار بار نہیں (ہاں اگر اس کے ولی نے نمازِ جنازہ نہ پڑھی ہو تو اسکو حق ہے کہ دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھے) اگر کسی شخص کی اپنے ہاں (جہاں میت ہو) نمازِ جنازہ پڑھی گئی ہے تو فرضِ کفایہ ادا ہوچکا۔ کیونکہ نمازِ جنازہ حاضر میت پر ادا کی جاتی ہے کسی غائب میت پر نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک میں جن حضرات کا انتقال ہوا ان کی میت سامنے لائی جاتی تھی اور آپؐ ان کی نمازِ جنازہ پڑھاتے تھے۔ لیکن جن کا انتقال کسی غزوے میں یا کسی اور جگہ پر ہوا ان کی نمازِ جنازہ وہیں ادا کرلی جاتی تھی۔ ان حضرات کے لئے غائبانہ نمازِ جنازہ

کا ثبوت حدیث وسیر کی کسی کتاب میں نہیں ملتا۔

جہاں تک حبشہ کے بادشاہ حضرت نجاشی رضؓ کی غائبانہ نماز کا تعلق ہے تو پیش نظر رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی میں صرف یہی ایک واقعہ سامنے آیا اور آپؐ حضرت نجاشیؓ کی نماز جنازہ ادا کی۔ یہ اس لئے کہ حضرت نجاشیؓ نے ایک ایسے ملک میں انتقال کیا جہاں کے باشندے عیسائی تھے اور ان کی نماز جنازہ وہاں نہ ہوئی تھی۔ اس لئے آپؐ نے یہاں ان کی نماز ادا فرمائی۔ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ (۷۲۸ھ) لکھتے ہیں:

ان مات ببلد لم یصل علیہ، فیہ صلی علیہ صلوٰۃ الغائب کما صلی النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی النجاشی لانہ مات بین الکفار ولم یصل علیہ وان صلی علیہ حیث مات لم یصل علیہ صلوٰۃ الغائب لان الفرض قد سقط لصلوٰۃ المسلمین علیہ (زاد المعاد جلد ۱ ص ۱۴۵)

(ترجمہ) اگر وہ فوت ہوا ایسے شہر میں جہاں اس پر نماز جنازہ نہ پڑھی گئی اس کی نماز جنازہ غائبانہ پڑھی جائے گی جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کی نماز جنازہ غائبانہ پڑھائی وہ ایسی جگہ فوت ہوا تھا کہ وہاں اس کی نماز جنازہ نہ ہوئی تھی اور اگر اس پر وہاں جہاں وہ فوت ہوا نماز جنازہ پڑھی گئی تو اس پر غائبانہ نماز جنازہ نہ پڑھی جائے گی، کیونکہ پہلے لوگوں کے اس کی نماز جنازہ پڑھنے سے فرض کفایہ ادا ہو چکا۔

مفسر شہیر و مؤرخ کبیر حافظ ابن کثیر (۷۷۴ھ) لکھتے ہیں:

انما صلی علیہ لانہ یکتم ایمانہ من قومہ فلم یکن عندہ یوم مات من یصلی علیہ فلہٰذا صلی علیہ۔

(ترجمہ) حضرت نجاشی کی نماز جنازہ اس لئے ادا کی گئی کہ وہ ایمان لایا ہوا تھا جسے وہ اپنی قوم سے چھپاتا رہا اور وہاں کوئی نہ تھا جو اس کی نماز جنازہ پڑھائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لئے اس کی نماز جنازہ پڑھی۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ کسی ایسے شخص کی نماز جنازہ پڑھنا جس کی نماز جنازہ ادا ہی نہ کی گئی ہو اس کے لئے تو گنجائش ہے لیکن جس کی نماز جنازہ پڑھی جا چکی ہو اس کی غائبانہ

نمازِ جنازہ پڑھنا کہیں ثابت نہیں۔ حافظ ابن قیمؒ (ھ) لکھتے ہیں کہ :

فقد مات خلق کثیر من المسلمین وھم غیب فلم یصل علیہم (زاد المعاد جلد ۱ صفحہ ۱۴۱)

بے شمار مسلمان فوت ہوئے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے غائب تھے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نمازِ جنازہ (غائبانہ ادا نہیں فرمائی۔

شارحِ بخاری علامہ عینیؒ (۸۵۵ھ) لکھتے ہیں کہ :

ویدل ذلك ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم یصل علی غائب غیرہ وقد مات من الصحابۃ خلق کثیر وھم غائبون عنہ (عمدۃ القاری جلد صـــ)

(ترجمہ) اور اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سوا کسی اور کی نمازِ جنازہ غائبانہ نہ پڑھی حالانکہ آپ کے عہد میں بہت سے صحابہ کرام فوت ہوئے اور آپ سے غائب تھے۔

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت نجاشی کی نمازِ جنازہ ادا کرنا اس لئے بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر سے پردے اٹھا دیئے تھے اور آپ نے ان کی نمازِ جنازہ اس طرح ادا فرمائی جس طرح حاضر میت کی نمازِ جنازہ ادا کی جاتی ہے۔ شارحِ بخاری علامہ قسطلانی نے اسباب النزول للواحدی سے حضرت ابن عباسؓ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ اللہ نے نجاشی کی میت آپ پر کھول دی تھی یعنی حجابات اٹھ گئے تھے اور میت سامنے تھی۔

کشف للنبی صلی اللہ علیہ وسلم عن سریر النجاشی حتیٰ راٰہ وصلی علیہ (اوجز المسالک جلد ۲ صفحہ ۴۳۶)

حضرت علامہ شوکانی نیل الاوطار میں حضرت عمران بن حصینؓ سے نقل کرتے ہیں کہ :

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ان اخاکم النجاشی قد مات فقوموا فصلوا علیہ قال ...... فقاموا وصفوا خلفہ وھم لا یظنون الا ان جنازتہ بین یدیہ (نیل الاوطار جلد ۴ صفحہ ۵۸ کتاب التمہید لابن عبد البر صـــ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے بھائی نجاشی کا انتقال ہوا ہے اٹھو اور ان پر نمازِ جنازہ پڑھو۔ صحابہ کھڑے ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے

صفیں باندھ لیں اور وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ نجاشی کا جنازہ ان کے سامنے موجود ہے۔

مسند ابی عوانہ میں ہے:

فصلینا خلفه ونحن لا نرى الا ان الجنازة قد امنا (نیل الاوطار ص۸۹)

ہم نے آپ کے پیچھے نماز پڑھی اور ہم یہی دیکھتے تھے کہ جنازہ ہمارے سامنے رکھا ہے۔

سو حضرت نجاشی کی یہ نماز غائبانہ نہ تھی۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا جنازہ آپ کے سامنے حاضر کر دیا اور آپ نے حاضر میت پر نماز ادا فرمائی۔

علامہ ابن عبدالبر (۴۶۲ھ) کتاب التمہید میں لکھتے ہیں کہ:

"اکثر اہل علم اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص مانتے ہیں، نجاشی کی میت کو آپ کے سامنے حاضر کر دیا گیا تھا آپ نے اس کا مشاہدہ کیا اور اس کی نماز جنازہ پڑھائی یا ان کا جنازہ اس طرح آپ کے سامنے کر دیا گیا جس طرح اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو آپ کے سامنے ظاہر کر دیا تھا جب قریش نے آپ سے سوال کیا تھا۔ آپ دیکھتے جاتے تھے اور سوالات کے جوابات دیتے تھے۔"

علامہ شوکانی لکھتے ہیں کہ:

انه كشف له صلى الله عليه وسلم حتى رآه فيكون حكمه حكم الحاضر بين يدى الامام الذى لا يراه المؤتمون ولا خلاف فى جواز الصلوٰة على من كان كذٰلك ...... ان ذٰلك خاص للنجاشى لانه لم يثبت انه صلى الله عليه وسلم على ميت غائب غيره (نیل الاوطار جلد ۴ ص۸۹)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ میت کشفاً دکھائی گئی تھی آپ اسے دیکھ رہے تھے۔ پس یہاں غائب کا حکم حاضر کا حکم سمجھا گیا جو امام کے سامنے ہو گو اسے مقتدی نہ دیکھ پائیں۔ اور اس صورت حال میں اس کی نماز جنازہ جائز ہونے میں اختلاف نہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خاص نجاشی کے لئے تھا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی اور میت پر بھی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی ہو یہ آپ سے کہیں ثابت نہیں۔

رہی یہ بات کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاویہ بن معاویہ اللیثی کی نماز جنازہ غائبانہ ادا کی تو یہ صحیح نہیں۔ حافظ ابن قیم رح لکھتے ہیں:

وقد روی عنه انه صلی علیٰ معاویه بن معاویه وھو غائب ولکن لا یصح ان فی اسناده العلاء بن زیاد قال علی بن المدینی کان یضع الحدیث (زاد المعاد جلد ا صفحہ ۱۴۳)

افسوس ہے کہ غیر مقلدین اس قسم کے وضاع راویوں کی روایت سے ہر میّت کے لئے نمازِ جنازہ غائبانہ جائز کرتے ہیں ۔

۴۲- بیس ۲۰ رکعات تراویح کا مسئلہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نمازِ تہجد بہت محبوب تھی ، آپ ہمیشہ اسے ادا فرماتے تھے جب رمضان المبارک کا موقع آیا تو آپ نے قیام رمضان ایک الگ عبادت مقرر فرمائی ۔ آپ فرماتے ہیں شھر فرض اللہ علیکم صیامه وسننت لکم قیامه' (سنن ابن ماجہ ص ـــ) خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کی تین راتیں جماعت کے ساتھ نماز پڑھائی پھر آپ نے اس اندیشہ سے کہ کہیں یہ نماز امت پر فرض نہ ہو جائے آپ نے جماعت ترک کردی ۔ تاہم کسی صحیح روایت سے اس بات کی نشان دہی نہیں ہوتی کہ آپ نے ان تین راتوں میں کتنی رکعات ادا فرمائی تھیں ۔ اکابرین امت جیسے حافظ ابن تیمیہؒ ، علامہ سبکیؒ ، علامہ سیوطی وغیرہم لکھتے ہیں کہ آپ سے کوئی مقرر تعداد منقول نہیں ۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ سے آٹھ رکعات منقول ہیں ان کا یہ کہنا ہرگز درست نہیں ۔ مشہور غیر مقلد عالم نواب نورالحسن خاں بھوپالی اعتراف کرتے ہیں کہ آپ سے تراویح کی تعداد معیّن نہیں ہے ۔

وبالجملہ عدد معین در مرفوع نیامدہ (العرف الجاوی ص ۸۴)

سیدنا صدیق اکبرؓ کے دور میں بھی یہ مسئلہ اسی طرح رہا ۔ جب حضرت عمر فاروقؓ کا دور آیا تو آپ کے حکم سے مساجد میں تراویح کی نماز پھر سے جماعت کے ساتھ ادا کی گئی ، اور آپ نے بیس ۲۰ رکعات تراویح کا حکم فرمایا ۔ سب صحابہ نے اس سے اتفاق فرمایا اور صحابہ نے بیس ۲۰ رکعات تراویح ادا کیں ۔ کسی صحابی نے حضرت عمر کے اس فرمان سے اختلاف نہ کیا اور نہ یہ کہا کہ تراویح آٹھ رکعات ہیں اور نہ انھوں نے حضرت اُبی بن کعب کے پیچھے نماز ادا کرنے سے انکار کیا اور نہ کسی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرام آٹھ رکعت پڑھ کر چلے جاتے تھے ۔

اور حضرت اُبی بن کعب اکیلے بارہ رکعات پڑھتے تھے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ صحابہ کرام تراویح کے بارے میں منشائے نبوی سے واقف تھے پھر جب امیرالمومنین، الناطق بالصدق و الصواب سیدنا عمر بن الخطاب سے اس کی توثیق مل گئی تو صحابہ کرام اسکی تائید میں متفق رہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ چونکہ حاکم وقت تھے اسلئے انھوں نے اس کا حکم دیا اور سب صحابہ کو مجبوراً حاکم وقت کی بات ماننی پڑی۔ اگر وہ انکار کرتے تو اندیشۂ فساد تھا۔ ان کی یہ بات ہرگز ہرگز لائق تسلیم نہیں۔ اس عقیدہ سے صحابہ کرام کی دیانت سخت مجروح ہوتی ہے۔ ایسی باتیں کہنے والے اگر بڑے رافضی نہیں تو چھوٹے رافضی ضرور ہیں، جو اس عنوان سے حضرت عمر فاروق اور صحابہ کرام کی دیانت اور ایمان پر حملہ کرتے ہیں۔

حضرات صحابہ کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد مبارک سُن چکے تھے کہ:

علیکم بسنتی وسُنّۃ الخلفاء الراشدین المھدیین عضوا علیھا بالنواجذ (جامع ترمذی جلد ۲ صفحہ ۹) پھر بطور خاص ارشادِ گرامی فاقتدوا بالذین من بعدی ابوبکر و عمر (مشکوٰۃ صفحہ ۵۶۰ رواہ الترمذی جلد ۲) بھی ان کے سامنے تھا۔ وہ کیسے سوچ بھی سکتے تھے کہ حضرت عمرؓ منشائے نبوی کی کھلے طور پر مخالفت کریں گے اور اللہ تعالیٰ بھی مخالفِ سُنّت عمل کو اس قدر شرفِ قبولیت دے گا۔ ان حضرات کو پورا پورا اعتماد اور یقین تھا کہ حضرت عمر کبھی بھی منشائے نبوی کے خلاف نہیں کریں گے۔

حضرت عمر کے حکم سے حضرت اُبی کا عمل

یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر کے حکم سے حضرت اُبی بن کعبؓ نے تراویح کی بیس رکعات نماز پڑھائی تو کسی نے آپ پر اعتراض نہیں کیا۔ امام ابوداؤد نقل کرتے ہیں۔ ان عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ جمع الناس علی اُبی بن کعب فکان یصلّی لھم عشرین رکعۃ (سنن ابی داؤد صفحہ ۱۷)

۲۵۔ ایک سوال کا جواب

شیعہ حضرات کا یہ کہنا کہ حضرت عمرؓ نے بیس رکعت تراویح سے دین میں ایک نئی

بدعت نکالی صحیح نہیں۔ پھر انھیں یہ بھی تو بتلانا ہوگا کہ حضرت علی المرتضیٰ نے اپنے دورِ خلافت میں اسی پر کیوں عمل کیا۔ اگر یہ واقعی بدعت تھی تو حضرت علی رضؓ نے اسے اپنے دَور میں کیوں نہیں مٹایا؟ حضرت علی رضؓ کا اپنے دَور میں اس پر عمل کرنا واضح کرتا ہے کہ حضرت علی رضؓ نے بھی حضرت عمرؓ کے اس حکم کو منشاءِ نبوی سمجھا تھا اور اس کی حمایت کرتے ہوئے عملاً بیس رکعات تراویح ادا فرمائیں اور اس کا حکم فرمایا۔ عن ابن ابی الحسناء ان علیاً امر رجلاً یصلی بہم فی رمضان عشرین رکعۃ (المصنف لابن ابی شیبہ جلد ۲ ص ۱۶۳)

رہی یہ بات کہ غیر مقلد علماء اسے بدعتِ عمری کہہ کر بیس ۲۰ رکعات تراویح کا انکار کرتے ہیں تو انھیں غور کرنا چاہیئے کہ حضرت عمر رضؓ کا یہ حکم اور عمل اگر اپنے اندر ذرا بھی بدعت کا پہلو لئے ہوتا اور منشاءِ نبوی کے خلاف ہوتا تو کیا سب صحابہ کرام اس پر خاموش رہتے؟ ایک شخص حضرت عمر رضؓ کو دورانِ خطبہ ٹوک سکتا ہے اور کھلے عام سوال کر سکتا ہے تو کیا صحابہ کرام معاذ اللہ اتنے بے حس ہو گئے تھے کہ منشاءِ نبوی کی کھلی مخالفت کے ہوتے ہوئے خاموش رہے؟ ہمارے لئے تو یہ تصور بھی انتہائی المناک اور نہایت بھیانک ہے۔ سو سب صحابہ کرام کا حضرت عمر رضؓ کے حکم سے اتفاق کرنا بتلاتا ہے کہ یہ سب کے سب اسے سُنّت ہی سمجھتے رہے۔

بہتر ہوگا کہ ہم غیر مقلدوں کے شیخ الکل مولانا نذیر حسین صاحب مرحوم کے ایک بیان سے یہ مسئلہ واضح کر دیں۔ آپ ایک بحث میں لکھتے ہیں:

> "جب حضرت عثمان کی خلافت کا زمانہ ہوا اور آپنے لوگوں کی کثرت دیکھی تو آپنے خطبہ کی اذان سے پہلے ایک اور اذان صحابہ کرام کی موجودگی میں جاری کی اور کسی نے اس پر انکار نہیں کیا۔ اور جب یہ ہے تو اذان مذکورہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق خلفائے راشدین کی سُنّت میں داخل ہے۔ جو لوگ اس کو بدعت کہتے ہیں یہ ان کی غلط فہمی ہے۔" (فتاویٰ نذیریہ جلد ص فتاویٰ ثنائیہ جلد ۱ ص ۴۳۶)

جب خلیفہ ثالث جامع آیات القرآن حضرت عثمان بن عفان کے حکم اور آپ کے اس عمل کو سُنّت سمجھنا ضروری ہے اور بدعت کہنا زیادتی ہے تو خلیفہ ثانی ناطق الحق والصواب حضرت عمر بن الخطاب کا یہ حکم اور یہ بیان اور پھر صحابہ کرام کی تائید کیا سنّت سے باہر سمجھی جائے گی؟

اور کیا اسے بدعت عمری کہنا جائز ہو سکے گا؟ بات غلط فہمی کی ہو تو یہ غلط فہمی اسی اصول سے دور ہو جاتی ہے لیکن جب ضد اور تعصب ہی کسی جماعت کا وطیرہ بن جائے تو پھر صحابہ کرام بلکہ خلفاء عظام کی ذات بھی نشانۂ طعن بن جاتی ہے۔ (معاذ اللہ)

حضرت عمر فاروق کے اس حکم اور صحابہ کرام کے عمل کے بعد پورے تیرہ سو سالوں میں کہیں اس کے مخالف کوئی آواز نہ اٹھی۔ حضرت عطاء بن ابی رباح (۱۱۵ھ) اس وقت کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں۔ ادرکت الناس وھم یصلون ثلاثۃ وعشرین رکعۃ بالوتر (المصنف لابن ابی شیبہ جلد ۲ ص ۱۶۳)

حضرت امام شافعیؒ نے وہ دور دیکھا اور یہی دیکھا کہ سبھی سب بیسؒ رکعات تراویح ادا کرتے ہیں وھکذا ادرکت ببلدنا بمکۃ یصلون عشرین رکعۃ (جامع ترمذی جلد ۱ ص ۹۹) پورے تیرہ سو سالوں میں کوئی ایک مسجد ایسی نہیں ملتی جہاں رمضان میں آٹھ رکعات تراویح جماعت سے ادا کی گئی ہوں۔

ہندوستان میں انگریزی عملداری کے دنوں میں مشہور غیر مقلد عالم مولانا محمد حسین بٹالوی نے نہ معلوم کس مصلحت سے یہ طوفان اٹھایا کہ تراویح آٹھ رکعت سنت ہے اور بیسؒ پڑھنا بدعت ہے اور اس پر مضامین لکھے اور یہ نہ سوچا کہ ان کے اس فتوی سے پوری امت مجروح ہو رہی ہے اور سبھی سب معاذ اللہ بدعتی قرار پاتے ہیں۔ قریب تھا کہ مولانا بٹالوی کا یہ فتوی انتشار کا باعث بنتا۔ شیخ الکل مولانا نذیر حسین صاحب کے شاگرد رشید اور مشہور غیر مقلد عالم حضرت مولانا غلام رسول صاحب (قلعہ میاں سنگھ) اٹھے اور انھوں نے مولانا بٹالوی کے رد میں ایک رسالہ لکھا اور بتلایا کہ حضرت عمر کے دور سے لے کر ۱۲۹۰ھ تک پورے مشرق و مغرب میں تراویح کی بیسؒ رکعات ہی پڑھی گئی۔ آپ لکھتے ہیں:

"فعل صحابہ و تابعین و ائمہ اربعہ و فعل سواد اعظم مسلمین شرقاً و غرباً از عہد عمر فاروق تا ایں وقت ہمہ بست و سہ بخلاف ایں مفتی غالی کہ بدعت و مخالفت سنت میگوئید در راہ افراط می پوئید"

(ترجمہ) صحابہ کرام اور تابعین اور ائمہ اربعہ اور مسلمانوں کی بڑی جماعت کا عمل ہے جو حضرت عمرؓ کے دور سے لے کر اس وقت تک مشرق و مغرب میں جاری ہے کہ وہ ۲۳ رکعت (بیسؔ تراویح تین وتر) ہی پڑھتے رہے، بخلاف اس غالی مفتی کے کہ وہ اس کو بدعت اور مخالف سنّت کہتا ہے اور افراط کی راہ چلتا ہے۔ (رسالہ تراویح مع ترجمہ ینابیع صـ۲۸)

شیخ الکل کے شاگرد رشید فرماتے ہیں کہ ان کے اپنے دور تک پورے مشرق و مغرب میں تراویح کی بیسؔ رکعت ہی ہوا کرتی تھی۔ یہ مولانا محمد حسین بٹالوی تھے جنھوں نے یہ نعرہ بلند کیا کہ تراویح کی آٹھ رکعات ہیں۔ پھر صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انھوں نے بطور تعریض بیسؔ رکعات پڑھنے کو مشرکین کا انداز بتلایا کہ جس طرح مشرکین باپ دادا کی تقلید کرتے تھے یہ لوگ بھی بیسؔ رکعت پڑھ کر ان کی تقلید کرتے ہیں (معاذ اللہ)

مولانا مرحوم بڑے افسوس کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"ایں مفتی بسینہ زوری اعمال متبعان سُنّت را بدعت می گوید و سواد اعظم را از صحابہ و تابعین و ائمہ مجتہدین و علماء شرق و غرب از عہد عمر بن الخطاب تا امروز مخالف سنت قرار می دہد بلکہ سخن را بجائے رسانیدہ کہ تعریض بافعال مشرکین نمودہ ایں را تقلید آباء و اجداد عامل قرار دادہ" (ایضاً صـ۵۲)

(ترجمہ) یہ مفتی (مولانا محمد حسین بٹالوی) سینہ زوری کے ساتھ سنّت کی پیروی کرنے والوں کے عمل کو بدعت کہتا ہے اور حضرت عمرؓ کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک صحابہ کرام، تابعین، ائمہ مجتہدین اور مشرق و مغرب کے علماء کی بہت بڑی جماعت کو مخالفِ سُنّت قرار دیتا ہے بلکہ اس مفتی نے بات یہاں تک بڑھا دی ہے کہ ان حضرات کے فعل کو تعریض کرکے مشرکین کا فعل کہتا ہے اور ان کو اپنے باپ دادا کی تقلید کا عامل قرار دیتا ہے۔

مولانا غلام رسول صاحب مرحوم نے اس رسالہ میں یہ بات کھول دی ہے کہ تراویح کا بیسؔ رکعات ہونا پورے تیرہ سو سالوں سے متفق علیہ مسئلہ رہا ہے۔ مشرق و مغرب میں

کوئی ایک آواز اس کے خلاف نہیں اٹھی۔ غیر مقلد عالم مولانا محمد حسین بٹالوی تھے جنھوں نے آٹھ رکعات کی تبلیغ شروع کی اور اس کے لئے دلائل لائے۔ مولانا غلام رسول صاحب مرحوم نے نہایت عالمانہ طور پر اس کا رد کیا ہے اور بتلایا ہے کہ مولانا بٹالوی کا موقف غلط ہے۔ صحیح مذہب بیس ۲۰ رکعات ہی کا ہے اسی میں سلامتی ہے۔ آپ شروع رسالہ میں یہ بات لکھ آئے ہیں کہ:

روایتے چند از ثقات نقل کردہ می شود کہ سنت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ادا می شود و سنت خلفائے راشدین نیز مع زیادت اجر (ایضاً ص۲۳)

ثقہ راویوں سے چند روایات نقل کی جاتی ہیں کہ (بیس ۲۰ رکعات ادا کرنے سے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت ادا ہوتی ہے اور خلفائے راشدین کی سنت بھی۔ اور اس میں اجر بھی زیادہ ہے۔

حضرت مولانا مرحوم نے تراویح کی بیس ۲۰ رکعات کو سنت رسول، سنت خلفاء راشدین اور زیادتی اجر بتلا کر یہ بات واضح کردی کہ تراویح کی رکعات بیس ۲۰ ہیں۔ الفضل ما شهدت به اعداءهم۔

جو لوگ مولانا محمد حسین بٹالوی کی تقلید میں آٹھ رکعات پڑھتے ہیں وہ شوق سے پڑھیں لیکن بیس ۲۰ رکعت پڑھنے کو بدعت اور پڑھنے والوں کو مخالف حدیث اور بدعتی نہ کہیں۔ کیونکہ اس کی زد صرف احناف پر نہیں، ائمہ بلکہ صحابہ اور تابعین سب ہی اس فتوے کی زد میں آجاتے ہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمدُ لِلّٰہِ ربّ العالمین وصلّی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیّدنا ومولانا محمّد وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین۔

برادرانِ ملت! یہ مشکلات جن سے آج ہم آپ دوچار ہیں، ہماری تاریخ کا کوئی نیا باب نہیں ہے بلکہ امتِ مسلمہ کی تاریخ تو اس قسم کی ابتلاء اور آزمائشوں سے معمور ہے لیکن ہر دورِ ابتلاء اور ہر عہدِ مصیبت میں اسلام کا یہی پختہ عقیدہ اور نقطۂ نظر رہا کہ جس خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کی وہ عبادت کرتے ہیں وہ خدائے واحد حی لایموت لم یزل ولایزال ہے، اس نے جیسے سابقین کی مدد فرمائی ہے اسی طرح سے آج بھی اس کی رحمت ورافت اور مدد ونصرت کا سائبان سایہ فگن ہے اور اس کا دستِ قدرت آج بھی گرتے ہوؤں کو سنبھال رہا ہے۔

مشکلات اور نفرت و تعصب کے ان پیہم تھپیڑوں سے آپ کے اس یقین میں

کوئی تذبذب نہ آنا چاہیئے کہ یہ وطن آپ کا ہے اور آپ وطن کے ہیں، اس کو گلشن و گلزار بنانے کا فرض آپ پر اسی طرح عائد ہوتا ہے جس طرح وطنِ عزیز کو گلشن بنانا دوسروں کا فرض ہے اسی طرح آپ کا واجبی حق بھی ہے کہ وطنِ عزیز آپ کیلئے بھی گلشن ثابت ہو جس طرح دوسروں کے لئے ہے اور یہ بھی آپ کا قدرتی حق ہے کہ جرأت و استقلال کے ساتھ اپنے شہری حق کو حاصل کرنے کی سعی و کوشش کریں۔ کیونکہ فرض اور حق کا چولی دامن کا ساتھ ہے البتہ یہ ضروری ہے کہ دین و ملت کی طرح خدمتِ وطن بھی آپ کا فرض ہو اولوالعزمانہ جد و جہد آپ کا سرمایہ ہو۔ وسعتِ نظر اور عزمِ راسخ آپ کا طریقہ کار ہو تو ان شاء اللہ العزیز فتح و کامرانی خود آگے بڑھ کر آپ کا استقبال کرے گی۔

وطنِ عزیز میں ہمارا کردار

مجھے اس موقع پر اپنے اس خیال کے اظہار میں کوئی باک نہیں کہ موجودہ حالات میں جس تدبیر و حکمت کی ضرورت تھی افسوس کہ ہم نے نظر انداز کر دیا اور پُر جوش نعروں اور پُر شور تحریکوں سے متأثر ہو کر ادفع بالتی ھی احسن کے خدائی سبق کو فراموش کرکے طاقت و زور آزمائی کی راہ پر چل پڑے اور اپنے خیر اُمم ہونے کی حیثیت ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ؎

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے ایک ٹوٹا ہوا تارا

بزرگانِ محترم!

ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ اُمتِ مسلمہ خیر الامم ہے یہ عقیدہ یقیناً درست اور صحیح ہے خالقِ کائنات نے خود ہمارے اس منصبِ عظیم کو ان الفاظ میں فرمایا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ

عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ "۔

تم سب سے بہتر اُمت ہو جو تمام انسانوں کی نفع رسانی کے لئے پیدا کی گئی ہے اچھی بات کا حکم کرتے ہو اور بُری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

چونکہ کوئی بھی منصب اور عہدہ فرائض اور ذمہ داریوں سے عاری نہیں ہوتا اس لئے بارگاہِ الٰہی سے جب اس امت کے سر پر خیرالامم کا تاج رکھا گیا تو اسی کے ساتھ کچھ خاص ذمہ داریاں بھی سپرد کی گئیں انھیں ذمہ داریوں کے متعلق خلیفہ راشد حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ، نے اپنے اس بیان میں ارشاد فرمایا ہے۔ من سرہ ان یکونَ من تلك الاُمّة فلیوُد شرطہا۔ جسے پسند ہے کہ اس کا شمار خیر امت میں ہو اس پر ضروری ہے کہ اس کی شرطوں کو پورا کرے۔

وہ شرطیں حسب ذیل ہیں:

(۱) عالم انسانیت کی نفع رسانی یعنی سارے انسان ہمارے خیر و نفع سے بہرہ اندوز ہوں۔

(۲، ۳) اچھائیوں کا حکم کرنا اور بُرائیوں سے منع کرنا اور روکنا۔

(۴) خدائے واحد پر ایمان رکھنا۔

ہمارے اس منصب کا تقاضا اور مطالبہ ہے کہ بلا امتیاز من و تو اپنے پرائے سب کے کام آئیں، سب کو اپنی ذات سے راحت و نفع پہونچائیں۔ دُنیا ہمارے ساتھ کیا معاملہ کرتی ہے، یہ وہ جانے ہمارا تو بس یہی جذبہ ہونا چاہیئے کہ دامے، درمے، قدمے، سخنے جیسے بھی ممکن ہو ہماری حسنات و خیرات سے لوگ بہرہ ور ہوں ؎

ان کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہونچے

ہماری دوسری و تیسری ذمہ داری امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ معروف کا لفظ اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے چھوٹی بڑی تمام نیکیاں اس میں شامل ہیں۔ اسی طرح منکر کے معنیٰ میں بھی بڑی وسعت ہے جس کے اندر ہر بڑا چھوٹا گناہ شامل ہے۔ نفس و شیطان یہ دو طاقتیں شرور و منکرات کے پھیلانے میں مصروف کار ہیں۔ اگر

ان کے مقابلہ میں معروف کی اشاعت اور منکر سے رکاوٹ کا سلسلہ نہ قائم ہو تو یہ دنیا برائیوں سے بھر جائے۔ اس لئے نظام کائنات کو اعتدال پر رکھنے کی ضرورت ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا سلسلہ پوری قوت کے ساتھ جاری رہے۔

اس اُمتِ خیر کی چوتھی صفت وتؤمنون باللّٰہ سے بیان کی گئی ہے جس کا حاصل عقیدۂ توحید ہے یعنی خدا کے سوا کسی قوت کو کارساز، حاجت روا اور کسی کے ہاتھ میں نفع وضرر نہ سمجھا جائے۔ توحیدِ کامل کے اس تصور سے انسان ہر قسم کی غلامی اور عبودیت سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس لئے درحقیقت عقیدۂ توحید انسانی شرف وعظمت کا سنگِ بنیاد ہے۔

حالات کے رُخ کو پھیرنے اور صالح انقلاب لانے کا نسخۂ کیمیا درحقیقت یہی ہے، ہماری متاع گم شدہ یہی ہے، ہمارے اسلاف اور بزرگوں کے پاس یہی دولت گرانمایہ تھی ؎

گنوادی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمین پر آسماں نے ہم کو دے مارا

(۲) حالاتِ حاضرہ کا ایک اہم بلکہ سب سے اہم تقاضا عدل وانصاف کا قیام ہے، نظامِ عالم میں عدل وانصاف کی وہی حیثیت ہے جو ہمارے بدن میں ریڑھ کی ہڈی کی ہے۔ اگر عدل وانصاف ختم ہو جائے تو دنیا کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے اور دنیا جہنم کا نمونہ بن جائے جس کا مشاہدہ آج ہم خود کر رہے ہیں۔

دوسرے لوگوں کا اس معاملہ میں کیا رویہ ہے انھیں اس پر غور وفکر کی توفیق ہو یا نہ ہو، مگر ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے آپ کا فریضہ ہے کہ آپ خود اپنے ساتھ عدل وانصاف کریں، دوسروں کے ساتھ عدل وانصاف کریں، اور اس معاملہ میں اپنے پرائے، دوست دشمن کی تفریق کے بغیر سب کے ساتھ یکساں طور پر عدل وانصاف کا برتاؤ کریں۔

آپ اس زمین میں اللہ کے گواہ ہیں۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰامِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ (الآية)

(ترجمہ) اے مسلمانو! انصاف پر پوری مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے والے اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے رہو اگرچہ تمہیں خود اپنے خلاف یا اپنے والدین اور عزیزوں کے خلاف ہی گواہی دینی پڑے (جب بھی نہ جھجکو) اگر کوئی مالدار ہے یا محتاج ہے تو اللہ تم سے زیادہ ان پر مہربان ہے (یعنی تمہیں مالدار کی دولت یا محتاج کی محتاجی سے متاثر ہوکر عدل وانصاف کے دامن کو نہیں چھوڑنا چاہیے۔)

اگر کچھ لوگ مذہب کی بنیاد پر ہر طرح ناانصافیوں کو جائز سمجھ رہے ہیں اگر ان کی مذہبیت انھیں یہی تعلیم دے رہی ہے کہ غیر مذہب والوں کو انصاف سے محروم رکھیں تو وہ جانیں اور ان کا مذہب اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ بغیر کسی امتیاز کے سب کے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ کیا جائے۔ حتیٰ کہ جان اور دین کے دشمنوں کے ساتھ بھی جادۂ عدل وانصاف پر قائم رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔

سیر مبارکہ کا مشہور واقعہ ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چودہ سو اصحاب کے ساتھ بہ قصد عمرہ مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے مگر جب مکہ معظمہ کے قریب مقام حدیبیہ میں پہونچے تو مکہ کے ارباب اقتدار مشرکین قریش نے آپ کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اس وقت تک شہر مکہ مکرمہ پورے جزیرۂ عرب کے لیے انٹرنیشنل اور سب کے لئے آزاد و کھلا ہوا شہر مانا جاتا تھا ہر ایک کو حق تھا کہ جب چاہے حرم پاک میں داخل ہو اور کعبۃ اللہ کی زیارت، عمرہ، طواف کرے۔ مشرکین قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء کو مکہ معظمہ میں داخل ہونے سے روک کر صرف مسلمانوں پر ظلم نہیں کیا تھا بلکہ خود اپنے اصول اور عرب کے متفقہ دستور و آئین کی خلاف ورزی کی تھی۔ جس ظالم وجابر قوم کو خود اپنے اور پوری قوم کے مسلمہ دستور کا پاس ولحاظ نہ ہو۔ غور فرمائیے کہ آج کی مہذب سے مہذب قوم کی نفسیات بھی اس کے حق میں کیا ہوگی، کیا اس ظالم وجابر کے ظلم وجبر کے مقابلہ میں ظلم و جبر کو جائز نہیں سمجھا جائے گا۔ لیکن یاد رکھئے اور خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے ایسے

جذباتی اور اشتعال انگیز موقع پر بھی جادۂ عدل وانصاف سے سرمو انحراف کی اجازت نہیں ہے
قریشِ مکہ کے اس جابرانہ رویہ کے سلسلہ میں مسلمانوں کو ہدایت دی جاتی ہے۔
"ولا یجرمنکم شنآن قوم ان صدوکم عن المسجد الحرام ان تعتدوا۔
وتعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان "
اے مسلمانو! اس بناء پر کہ بعض لوگوں نے تم کو مسجدِ حرام (خانہ کعبہ) سے روک دیا
تھا تو یہ عداوت تم کو زیادتی کرنے کا باعث نہ ہو (کیونکہ ظلم کا جواب ظلم سے دیا جائے
تو سلسلۂ ظلم دراز ہو جائے گا اور تم غیر شعوری طور پر ظالموں کے معاون بن جاؤ گے
حالانکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے) اور نیکی و پرہیز گاری کے کاموں میں ایک دوسرے
کے مددگار بنو اور گناہ و زیادتی کے کاموں میں مددگار نہ بنو۔

خیال فرمائیے کہ اسلام کی تعلیم کیا ہے؟ انصاف ہر موقع پر انصاف۔ حتیٰ کہ مذہبی جذبات
کو پامال کرنے والی قوم کے حق میں بھی عدل وانصاف۔

(۳) عفو ودرگذر :- تیسری چیز جس کا ہمیں بطورِ خاص آج کے ماحول میں
لحاظ رکھنا ہے وہ عفو ودرگذر ہے، عدل کا مقتضاء یہ ہے کہ مجرموں کو ان کے جرم کی
پوری سزا دی جاسکتی ہے اسلام کی عدالت میں ان کے ساتھ کوئی رو رعایت نہیں ورنہ
معاشرہ اور حکومت کسی کا نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ لیکن ذاتی معاملات میں جس
کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی کی گئی ہے اس مظلوم کو حق دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو برابر کا
بدلہ لیلے اور چاہے تو معاف کردے۔ اور درگذر کے درجے کو بلند قرار دیا گیا ہے
فرمانِ الٰہی ہے:

"وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ ولئن صبرتم فھو
خیر للصّابرین"

اگر تم پر سختی کی گئی تو تم بھی ایسی ہی سختی کرو جیسی تمہارے ساتھ کی گئی۔ (یہ
عدل ہے) اور اگر تم صبر سے کام لو تو وہ صبر کرنے والوں کے لئے بہتر ہے (یہ درگذر
ہے جسے عدل کے مقابلہ میں بہتر کہا گیا ہے۔ رحمۃ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم نے عفو ودرگذر

کی بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے اور اُمتِ مسلمہ کو اسے اختیار کرنے کی ترغیب دی ہے۔ اور خود نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ یہی ہے کہ اپنی ذات کے لئے بھی کسی سے بدلہ نہیں لیتے تھے بلکہ معاف کر دیا کرتے تھے۔ ایک حدیث کے الفاظ ہیں:

لا یجزی بالسیئۃ السیئۃ ولکن یعفو ویصفح۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم برائی کا بدلہ برائی سے نہیں لیتے تھے بلکہ معاف کر دیتے اور درگزر سے کام لیتے تھے۔

احسان وسلوک

زندگی کے کاروبار اور انسانوں کی ضرورتوں میں ایک دوسرے کی عملی ہمدردی امداد واعانت اور احسان وسلوک پر انسانی معاشرہ قائم ہے۔ اگر یہ شریفانہ جذبہ نہ ہو تو معاشرتی مسرتوں کا خاتمہ ہو جائے۔ اس لئے اسلام میں احسان وسلوک کی بڑی اہمیت ہے۔ اور اس کے اثرات وثمرات نہایت دوررس ہیں۔

انسانی ضرورتوں کی طرح احسان وسلوک کی شکلیں بھی بے شمار ہیں ان کا احاطہ دشوار ہے۔ بس مختصر طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ دوسروں کی ہر قسم کی جائز امداد واعانت اور ہر وہ نیک کام جس سے دوسروں کی ضرورت پوری اور مشکل آسان ہو یا اس کو آرام وراحت اور خوشی ومسرت حاصل ہو اسلام کی اصطلاح میں احسان وسلوک ہے قرآن وحدیث میں احسان وسلوک کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ مساوات ومدارات اسلام سے پہلے خدا کی مخلوق رنگ، نسل، حسب ونسب، ملک ووطن، دولت ووجاہت اور صنعت وحرفت کے اعتبار سے ادنیٰ واعلیٰ طبقوں میں بٹی ہوئی تھی ذاتی استعداد وقابلیت کی کوئی قدر وقیمت نہ تھی ادنیٰ طبقوں پر ترقی کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند تھے ان کا مقصد زندگی بس اعلیٰ طبقوں کی خدمت تھا۔ اسلام نے ان سارے خودساختہ امتیازات کو ختم کر کے تقویٰ، حسن وعمل اور اخلاق وکردار کو عزت وشرف کا معیار قرار دیا۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ

عند اللّٰہ اتقاکم۔ بیشک تم میں خدا کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پاکباز ہے۔

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا:

ایھا الناس ان ربکم واحد وان اباکم واحد کلکم بنوا دم وادم من تراب ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ لوگو! تمہارا پروردگار ایک ہے تمہارا باپ بھی ایک ہے تم سب اولاد آدم ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سب سے پاکباز ہو۔

اس اعلان نے سارے انسانی خود ساختہ امتیازات کو مٹا کر آقا و غلام، مالک و مملوک، امیر و غریب، سب کو ایک سطح پر کھڑا کر دیا۔ حضرت سلمان فارسی، صہیب رومی، بلال حبشی رضوان اللہ علیہم جو مختلف نسلوں اور قوموں سے تعلق رکھتے تھے اور غلام تھے شرفاءِ قریش کے ہم پلّہ اور اپنے تقویٰ کی بنا پر ان میں سے بہتوں سے بہتر قرار پائے۔

غیروں کی صحبت و معاشرت کی بنا پر ہم نے انسانی مساوات کے اسلامی اصول کو تقریباً نظر انداز کر دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ قوم مسلم اپنے اس بھولے ہوئے سبق کو پھر سے یاد کرلے۔ دوسرے لوگ آج اس اسلامی اصول سے فائدہ اٹھا رہے ہیں یہ ہماری غفلت کا عالم ہے کہ اپنے گھر کی دولت کی بھی ہمیں خبر نہیں۔

سلف صالحین اور ہمارے بزرگوں نے انہی اخلاقی قوتوں سے دنیا کو اپنا گرویدہ اور بندۂ بے دام بنا لیا تھا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ سلطان شہاب الدین غوری کی فاتحانہ تلوار ایک متنفس کے دل کو بھی رام نہ کر سکی مگر بادشاہ کا ہم عصر ایک فقیر بے نوا جسے ہم خواجہ غریب نواز شیخ معین الدین چشتی اجمیری رح کے لقب سے جانتے پہچانتے ہیں جو شہاب الدین غوری کی مفتوحہ دلی میں نہیں پرتھوی راج کی ہندوانہ ریاست اجمیر میں فقیرانہ شان کے ساتھ پہونچتا ہے تو خواجہ غریب نواز کے کسی معتقد کی نہیں اسلام کے کسی حلقہ بگوش مؤرخ کی نہیں بلکہ اسلام اور

بی اسلام کے شدید مخالف پریچنگ آف اسلام کے مصنف مسٹر آرنلڈ کا بیان
ہے کہ صرف اس ایک سفر میں اسلام کے اس سچے نمونہ، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم
کے عاشق صادق، ہمدردی کے مجسمہ، اخلاقِ اسلامی کے پیکرِ جمیل کی فقیرانہ شان
اور ان کی غریب نوازیوں سے متاثر ہو کر سات سو خاندان شمعِ اسلام کے پروانے
بن گئے۔

عدل و انصاف، احسان و سلوک، مساوات و مدارات، عفو درگذر، ایک دوسرے
کی خیر خواہی و ہمدردی، باہمی اعتماد ہی درحقیقت جمہوریت کی روح ہے۔ جمہوریت
اگر اس روح سے محروم ہے تو وہ رحمت نہیں بلکہ آفت و مصیبت ہے۔ مسلمان اگر
اسلامی تعلیمات و اخلاق پر سچے دل سے عمل کریں تو اللہ تعالیٰ کے مقرب و مقبول بندے
بننے کے ساتھ قوم کے مربّی اور جمہوریت کے معمار بھی ثابت ہوں گے۔ کاش کہ مسلمان
اپنی حیثیت کو سمجھیں ؎

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

مذہبی تعلیم

اسلام نے تعلیم پر جس قدر توجہ دی ہے دنیا کے کسی اور مذہب میں اس کی
مثال نظر نہیں آتی ہے۔ ذرا خیال تو کیجئے جس مقدس اور پاک ذات گرامی صلی اللہ
علیہ وسلم کا ہم کلمہ پڑھتے ہیں، جس کی اُمّت میں ہونے پر ہمیں بجا طور پر فخر ہے
اس پر وحی کا آغاز " اقرأ باسم ربك الّذی خلق خلق الانسان من علق
اقرأ و ربك الاکرم الذی علّم بالقلم علّم الانسان مالم یعلم "
پڑھئے اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا جس نے انسان کو جمے ہوئے خون
سے پیدا کیا۔ پڑھئے آپ کا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم سے تعلیم دی۔ سکھایا
انسان کو جو وہ نہیں جانتا تھا۔ گویا علم اسلام کا نقطۂ آغاز ہے۔ اور تعلیم و اسلام

میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ خود خدائے علیم وخبیر نے سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی کہ مجھ سے علم کی زیادتی کو مانگئے۔ قل رب زدنی علماً۔ پھر تعلیم کتاب وسُنّت کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض نبوت میں شامل کیا گیا بُعِثتُ معلماً۔ سے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اسی ذمہ داری کو بیان فرمایا ہے۔ ان سب باتوں سے علم کی اہمیت وضرورت کا پتہ چلتا ہے۔

ہمارا یہ ملک دستوری اعتبار سے ایک سیکولر اسٹیٹ ہے، جس سے یہ توقع قطعاً بے محل اور غلط ہے کہ وہ ملک میں بسنے والے تمام فرقوں کی مذہبی تعلیم کا انتظام کرے گی۔ اس لئے لا محالہ مذہبی تعلیم کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر برداشت کرکے ہمیں آزاد اور زندہ قوموں کی طرح اپنی ملی حیات کا ثبوت پیش کرنا ہے اور اپنی نسلوں میں دین وایمان کو منتقل کرنا ہے۔

اسلام مذہبی تعلیم کو ہر مسلمان پر فرض قرار دیتا ہے "طَلَبُ العلم فریضة عَلیٰ کُلِّ مُسْلِمٍ" علم دین کا طلب کرنا ہر مسلمان پر ضروری ہے۔ جن اسلامی احکامات پر عمل کرنا فرض عین ہے ان کا علم حاصل کرنا، اسی طرح اہل وعیال کو سکھلانا بھی فرض عین ہے جس طرح ہر مسلمان پر لازم ہے کہ تقویٰ اور پاکیزگی کے ساتھ مضبوطی سے اسلام پر قائم رہیں اسی طرح ہر مسلمان پر یہ بھی لازم ہے کہ اپنے اہل وعیال میں بھی یہ استعداد اور صلاحیت پیدا کریں کہ وہ بھی اسی طرح اسلامی اعمال واخلاق کے خوگر ہوں اور ان کا قدم بھی صراطِ مستقیم پر جما رہے۔ چنانچہ جس طرح عام مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ

"اتقوا اللہ حق تقاتہ وَلَا تموتُنَّ اِلَّا وَاَنتم مُسلِمُون" اللہ تعالیٰ سے پورا پورا تقویٰ کرو اور زندگی کی آخری سانس تک اسلام پر ثابت قدم رہو اسی طرح ہر مسلمان کو یہ بھی حکم ہے کہ

"قوا انفسکم وَاھلیکم نَاراً" بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو جہنم کی آگ سے" نارِ جہنم سے اہل وعیال کو بچانے کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی تعلیمات

واحکامات (حرام وحلال، فرائض وواجبات) سے انھیں واقف کرایا جائے۔ دینی عبادات اور اسلامی اخلاق کا انھیں عادی اور خوگر بنایا جائے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پاک ہے:

الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ "تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ونگراں ہے اور ہر ایک سے اس کے ماتحتوں کے متعلق سوال کیا جائیگا"

قرآن وحدیث کے ان فرامین سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر مسلمان مرد وعورت کا شخصی وذاتی فریضہ ہے کہ وہ اپنے اہل وعیال کو ایسی تعلیم وتربیت دے جو اُخروی نجات کا ذریعہ بن سکے۔ اس لئے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی اس شرعی ومذہبی ذمہ داری کو محسوس کرے اور دوسرے مسلمانوں کو بھی یہ فرض یاد دلاکر انھیں آمادۂ عمل کرے۔

آج اسکولوں وکالجوں ہی میں نہیں بلکہ سرکاری ذرائعِ ابلاغ کے ذریعہ قومی تہذیب وثقافت اور قدیم کلچر کے عنوان سے ایک خاص فرقے کے مذہبی رسوم وروایات کی اس بڑے پیمانے پر تشہیر وترویج کی جارہی ہے کہ اگر ہم نے اپنے بچوں کی دینی تعلیم وتربیت کا معقول انتظام نہیں کیا تو اس کا قوی اندیشہ ہے کہ ہماری نئی نسل اپنے دین ومذہب، عقائد واعمال، تہذیب وروایات سے ناآشنا ہونے کی بناپر دوسروں کے رسوم ورواج کی دلدادہ ہو جائے۔ یہ ایک ایسا عمومی خطرہ ہے جس سے ملّتِ اسلامیہ آج دوچار ہے۔ اس سلسلے میں ہماری غفلت، سہل پسندی ولاپرواہی ہمارے دین وایمان، ہماری ملّی شناخت وکردار اور خود ہمارے وجود کی تباہی وبربادی کا پیش خیمہ ہوگی۔ اس لئے حالات کی ناموافقت، ماحول کی نامساعدت اور مخالف طاقتوں کی پیدا کردہ مشکلات کے باوجود اپنے اور اپنی اگلی نسلوں کے مذہبی کردار کے تحفّظ وبقاء کے لئے ہمیں خود مذہبی تعلیم کی کفالت اور ذمّہ داری قبول کرنی ہوگی، اس سلسلے کی ہماری معمولی سے معمولی جدوجہد بھی ہماری دُنیا وآخرت کی خوشحالی اور اجرِ عظیم کا ذریعہ بنےگی۔ نبی صادق ومصدوق صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "مَنْ سَلَکَ طریقاً یلتمسُ فیہ علماً

سهل الله له به طريقا الى الجنة وما اجتمع قوم في بيت من بيوت الله يتلون كتاب الله ويتدارسونه بينهم الا نزلت عليهم السكينة وغشيتهم الرحمة وحفتهم الملائكة " جو شخص بھی علمِ دین کی طلب کے لئے کوئی راہ وسبب اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کے لئے جنت کی راہ آسان کردے گا۔ اور جو جماعت کسی مسجد، مدرسہ وغیرہ میں کتاب الٰہی کی تلاوت وتعلیم کے لئے اکٹھا ہوتی ہے تو ان پر سکون ودلجمعی کا نزول ہوتا ہے اور رحمت خداوندی انھیں ڈھانپ لیتی ہے اور رحمت کے فرشتے انھیں اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں"۔

جمعیۃ علماء ہند اور بنیادی مذہبی تعلیم

مذہبی تعلیم کو اسی اہمیت، ضرورت اور افادیت کے پیشِ نظر ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد جیسے ہی ملک میں امن وامان کی فضا کچھ بحال ہوئی۔ جمعیۃ علماء ہند نے ۱۹۴۸ء میں دہلی میں کل ہند اجلاس طلب کرکے اس مسئلہ کی جانب خصوصی توجہ دی (جس میں حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ بھی شریک ہوئے) مرکزی اور صوبائی جمعیتوں نے اس بارے میں خاص اجلاس اور اہم تجویزیں منظور کیں اور ان کے رہنماؤں نے ان تجاویز کو تقریر وتحریر اور دوروں، کانفرنسوں کے ذریعہ عام مسلمانوں تک پہونچایا۔ پھر احمد آباد، کان پور، بجے پور وغیرہ میں بڑی بڑی تعلیمی کانفرنسیں کیں جن کے ذریعہ بنیادی دینی تعلیم کی اہمیت وضرورت کو اچھی طرح سے واضح کیا گیا۔

ان ابتدائی کوششوں کے بعد ۱۹۵۴ء میں آپ کے اسی شہر بمبئی میں مسلمانانِ ہند کے تمام مکاتب خیال کا کل ہند تعلیمی کنونشن بلایا گیا جو کہ آزادی کے بعد مسلمانوں کا پہلا کنونشن تھا جس میں ملک کے تمام مکاتب فکر کے اصحاب رائے علماء وفضلاء اور دانشوروں نے جمعیۃ علماء کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے شرکت کی اور اس مسئلہ کی اہمیت کے شایانِ شان ایک متفقہ لائحہ عمل طے کیا جس کے نتیجہ میں امت مسلمہ بڑی حد تک ابتدائی دینی تعلیم کی جانب متوجہ ہوگئی۔ گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ دینی تعلیم

کے اسلامی مکاتب کھل گئے۔ جمعیۃ علماء ہند کی تجویز پر مولانا محمد میاں صاحبؒ ناظم جمعیۃ علماء ہند نے دینی تعلیم کورس، اساتذہ کا تربیتی کورس اور نصاب تعلیم مرتب کیا جس میں دینی و دنیاوی دونوں شعبوں کی تعلیم کی رعایت ملحوظ رکھی گئی۔ یہ نصاب مقبول ہوا اور ملک کے بیشتر دینی مکاتب میں یہی پڑھایا جاتا ہے۔

تعلیمی بورڈ

ابتدائی دینی تعلیم کی تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے جمعیۃ علماء ہند نے "دینی تعلیمی بورڈ" کے نام سے ایک مستقل ادارہ بھی قائم کیا جو برسہا برس تک فعال و متحرک رہ کر اپنی خدمت کو انجام دیتا رہا مگر بعض ناگزیر حالات اور سرمایے کی وقت کے باعث یہ بورڈ معطل ہوگیا۔ جمعیۃ علماء ہند کے ارکان و خدام نے تعلیمی بورڈ کے اس طرح بند ہوجانے کو ملت کے لئے ایک خسارہ تصور کیا اور اسی وقت سے اس کوشش میں لگے رہے کہ کسی طرح بورڈ کا دوبارہ احیاء ہوجائے۔ اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ خدام جمعیۃ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوئے اور تعلیمی بورڈ کا دوبارہ احیاء پچھلے مہینوں ہوگیا ہے۔ ہمدردانِ جمعیۃ اور بہی خواہان ملت تعلیمی بورڈ کی ہر نوع کی زیادہ سے زیادہ امداد و اعانت فرماکر تعلیمی فرائض کو پورا کرنے میں تعاون فرمائیں۔

ملک میں اگرچہ دینی مکاتب ایک اچھی خاصی تعداد میں قائم ہیں مگر آج بھی بہت سے علاقے ایسے ہیں جہاں بچوں کی ابتدائی تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں ہے، علاوہ ازیں آبادی کی ضرورت کے تناسب سے مکاتب کی تعداد آج بھی کم ہے۔ اس لئے تعلیمی معاملہ میں مزید سرگرمی کی ضرورت ہے۔ مسلم اقلیت کی کامیابی یہی ہے کہ ان کے تعلیمی ادارے زیادہ سے زیادہ منظم اور بہتر کارگزار ہوں۔ ان کے مکاتب کا معیارِ تعلیم بلند، اور تربیت ایسی ہمہ گیر ہو کہ وہ پختہ مسلمان ہونے کے ساتھ سچے محب وطن اور با اخلاق شہری بن سکیں۔

"چراغ اور جلاؤ کہ روشنی کم ہے"

اعلیٰ مذہبی تعلیم

دینی مکاتب کے علاوہ مرکزی مقامات میں اعلیٰ دینی تعلیم کی درسگاہوں کا قیام بھی اُمّتِ مسلمہ کی ایک اجتماعی ضرورت ہے۔

پورے قرآن مجید کے معانی و مسائل کو سمجھنا تمام احادیث کے مطالب سمجھنا اور ان میں معتبر و غیر معتبر کی پہچان پیدا کرنا قرآن و سُنّت سے جو احکام نکلتے ہیں ان سب کا علم حاصل کرنا، صحابہ تابعین اور ائمہ مجتہدین کے آثار و اقوال سے واقف ہونا یہ اتنا بڑا اور وسیع الذیل کام ہے کہ پوری عمر اور سارا وقت خرچ کر کے بھی اسے پورے طور پر حاصل کر لینا کوئی آسان کام نہیں، نہ سب کے اندر ان سارے علوم کے حاصل کرنے کی استعداد و صلاحیت ہوتی ہے اور نہ سب کے پاس اس کے وسائل و ذرائع ہیں۔ اس لیے شریعت نے اس اعلیٰ درجہ کے علم کو فرضِ کفایہ قرار دیا ہے، کہ ضرورت کے مطابق افراد اس درجہ کا علم حاصل کر لیں تو باقی مسلمان سبکدوش ہوجائیں گے۔ آیتِ پاک:

"فلولا نفر من کل فرقۃ منہم طائفۃ لیتفقھوا فی الدّین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیہم لعلّھم یحذرون"

(سو کیوں نہ نکلا ہر فرقہ میں سے ان کا ایک حصّہ تاکہ سمجھ پیدا کریں دین میں اور تاکہ ڈرائیں اپنی قوم کو جبکہ لوٹ کر آئیں ان کی طرف تاکہ وہ (بُرے کاموں سے) بچتے رہیں) میں اسی اعلیٰ درجہ کے علم کے حصول کی تاکید کی گئی ہے۔

الحمدللہ اس طرح کی درسگاہیں اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں اور اپنے اپنے وسائل کے اعتبار سے مصروفِ عمل ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان درسگاہوں کے معیار کو مزید بلند کیا جائے اور ایسا نظامِ تعلیم و تربیت قائم کیا جائے کہ ان سے فارغ طلبہ واقعی طور پر تفقہ فی الدین کے حامل ہوں۔

مسلمانوں کے جن علاقوں میں اس قسم کے اعلیٰ درجہ کے مدرسے نہ ہوں ان

مقامات میں ان کے قیام کی کوشش کی جائے ۔ البتہ جہاں جہاں پہلے سے مدارس موجود ہوں وہاں بلاضرورت دوسرے مدرسے قائم نہ کئے جائیں کیونکہ اس سے باہمی تقابل وتسابق بلکہ بعض حالات میں تحاسد و تباغض تک نوبت پہونچ جاتی ہے جس کا انجام بہرحال نقصان دہ ہی ہوتا ہے۔

اندکے بتو گفتم و بدل ترسیدم کہ تو آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

عصری تعلیم اور اس کی ضرورت

اسلام کوئی ایسا مذہب نہیں ہے جو محض الٰہیات و مذہبیات تک ہی محدود ہو بلکہ وہ ایک جامع و منظم دین اور ایک مکمل نظامِ حیات ہے ۔ اس کی تعلیمات و ہدایات کا سورج انسانی معاشرے کے ہر شعبے اور ہر حصے پر روشنی بکھیرتا ہے ۔ اس کے دائرۂ علم سے کون و مکان کا کوئی موضوع باہر نہیں ہے ۔ وہ جس طرح نماز ، روزہ ، حج ، زکوٰۃ جیسے فرائض پر خدا کی رضا اور جنت کی بشارتیں سناتا ہے ، اسی طرح دیانت دار تاجر کو رفاقتِ انبیاء کی خوشخبری دیتا ہے ، وعدہ کے سچے صنعت کار کو اللہ کا محبوب گردانتا ہے ۔ اولاد کی صحیح پرورش پر رضائے الٰہی کی بارش برساتا ہے حتیٰ کہ خلوت کدہ میں جو لقمہ بیوی کے منہ میں رکھا جائے اسے انعام و اکرام کی نظر سے دیکھتا ہے ۔ اس کی دینیات صرف عقائد و عبادات میں محدود نہیں بلکہ جیسے نماز ، روزہ ، پاکی ، ناپاکی وغیرہ کے احکام دینیات کے ابواب ہیں بلکہ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ ۔ حقوق العباد ، حقوق اقارب و اعزہ ، اکلِ حلال ، تجارتی و صنعتی معاملات میں عمدہ کردار وغیرہ وغیرہ کے آداب بھی اسلام کے دینیات کے مفہوم میں داخل ہیں ۔

اسلامی معاشرہ میں جس طرح عالم و مفتی ، محدث و مفسر کی ضرورت ہے اسی طرح کاشتکار ، تاجر ، صنعت کار ، ڈاکٹر ، انجینئر وغیرہ کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ۔ اس لئے ہماری تعلیم کا دائرہ وسیع ہونا چاہیئے ، تاکہ ایک دیندار مسلمان رونقِ مسجد ہی نہیں بلکہ بزمِ دنیا میں صداقت و حق پرستی کا مینار اور دنیائے انسانیت کی نمائشگاہ میں شہداء اللہ فی الارض کا سچا مصداق بن سکے ۔ حکمائے اسلام نے ہر دور

میں دینی تعلیم و تربیت کی اہمیت و افادیت پر زور دینے کے ساتھ دنیوی تعلیم کی بھی ہمت افزائی کی ہے۔ جمعیۃ علماءِ ہند کے اولین میر کاروان حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ نے کوشش کر کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیمی رابطہ قائم فرمایا تھا، پھر جامعہ ملیہ دلی کی بنیاد بھی اسی جذبۂ خیر کے ساتھ رکھی تھی۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنی بعض کتابوں میں دینی و دنیوی علوم کا مقصد ایک قرار دیتے ہوئے دونوں پر یکساں زور دیا ہے۔ غرضیکہ ان علوم کی تحصیل جو مسلمانوں کے دینی و دنیوی فوائد کے لئے لازمی ہیں امتِ مسلمہ کا اجتماعی فریضہ ہے۔ آج کے ملکی حالات نے اس ضرورت میں مزید قوت و شدت پیدا کردی ہے کہ اسلامی درسگاہوں کے ساتھ ساتھ عصری علوم کے ادارے بھی قائم کئے جائیں۔ پرائمری تعلیم، سکنڈری تعلیم اور اعلیٰ تعلیم کے کالجوں اور اداروں کا ضرورت اور صلاحیت کے لحاظ سے انتظام کرنا چاہیئے، بالخصوص مڈیکل، کامرس، لاء ٹیکنیکل اور سائنس کے اداروں کی جانب پوری توجہ کی ضرورت ہے اور محض آرٹ کے اسکول کھول کر سہولت پسند اور بیکار نہیں بنانا چاہیئے اور کوشش کی جائے کہ ہماری تعلیمی کارکردگی نہ صرف بہتر رہے بلکہ دوسروں کے مقابلے میں امتیازی حیثیت کی حامل ہو۔ اس سے خود ہمارے اندر اعتماد و حوصلہ پیدا ہوگا اور دوسرے بھی متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ بچوں کو سخت محنت کا عادی بنایا جائے اور کاہل سُست اور آوارہ نہ بننے دیا جائے ان کالجوں کے نصاب میں ایک سبق خواہ وہ چالیس منٹ کا کیوں نہ ہو اسلامی عقائد و اعمال، سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تاریخِ اسلام کا ضرور رکھا جائے۔

اسی طرح ایسے مرکزی مقامات پر جہاں قومی سرکاری کالج۔ اور یونیورسٹیاں ہوں، اقامتی ہوسٹل تعمیر کئے جائیں اور ان کالجوں و یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ ادھر ادھر قیام کرنے کے بجائے ان ہوسٹلوں میں رہیں۔ جہاں نماز باجماعت کا انتظام ہو اور قرآن کی تفسیر کے علاوہ طلبہ کو فقہی مسائل، اسلامی مسائل و عقائد و اعمال اور سیرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے متعلق مضامین بذریعہ لکچر ذہن نشین کرائے جائیں یہ سلسلہ روزانہ کم از کم آدھ گھنٹہ چالیس منٹ تک جاری رہنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ان

ہوسٹلوں میں کوچنگ کلاسوں کے لئے پارٹ ٹائم اساتذہ کا انتظام کیا جائے تاکہ ان کی تعلیمی استعداد میں اضافہ ہو۔

جو اسکول و کالج پہلے سے مسلمانوں کے زیرِ انتظام چل رہے ہیں ان میں شروع ہی سے ٹیکنیکل اور پیشہ وارانہ تعلیم کا نظم کیا جائے اور ان اداروں سے تربیت یافتہ طلبہ کو ترغیب دی جائے اور انھیں اس کے مواقع فراہم کئے جائیں کہ ملازمت کی فکر میں دردر کی ٹھوکریں کھانے کے بجائے اپنا ذاتی کاروبار کریں۔ اس ملک میں جہاں قدم قدم پر ہمارے لئے رکاوٹیں کھڑی کی جارہی ہوں اور جذبہ مخاصمت سے ہم پر ترقی کی راہیں مسدود کیجاتی ہوں آگے بڑھنے اور اپنے مستقبل کو سنوارنے کا یہی طریقہ ہے۔

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل
ہم وہ نہیں ہیں جن کو زمانہ بنا گیا

ملت کے دینی و دنیوی فوائد اور ترقی کے لئے ہماری ہر مساعی عنداللہ مقبول و مشکور ہوں گی (انشاءاللہ تعالیٰ)

تعمیری پروگرام

ملتِ اسلامیہ ہند کے دینی شعور کو بیدار کرنے اور مستقبل کو روشن و تابناک بنانے کے لئے جمعیۃ علماءِ ہند اپنے ابتداءِ قیام ہی سے سرگرم عمل ہے اور حضرت شیخ الہند اور ان کے جانشین حضرات اکابر رحمہم اللہ کی تجویز کردہ پالیسی کے مطابق وہ جذباتی نعروں اور شعلہ بار اخباری بیانات کے بجائے سنجیدگی کے ساتھ تعمیر و ترقی کے کاموں کو زیادہ اہمیت دیتی ہے جسے آج بدقسمتی سے جذبات انگیز نعروں کے مقابلہ میں کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی جس کا خاص سبب یہ ہے کہ فرقہ پرستوں کی مسلسل چھیڑ چھاڑ اور اشتعال انگیزیاں، حکومت کا مسلمانوں کے ساتھ غیر منصفانہ رویہ اور خود بعض مسلم لیڈروں کی جذباتی سیاست سے متأثر ہوکر ہمارے اندر جذباتیت آگئی ہے۔ اسلئے پُرشور نعروں اور شعلہ بار تقریروں کے مقابلہ میں تعمیری کاموں کی اہمیت ہماری نظروں

میں گھٹ گئی، جبکہ اس وقت ضرورت ہے جوش سے زیادہ ہوش کی اور حرارت سے زیادہ روشنی کی۔

واقعات و تجربات کا فیصلہ ہے کہ عہدِ حاضر میں اُمّتِ مسلمہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ جوش و جذبات کے بجائے تدبیر و حکمت سے حالات کا مقابلہ کرے اور ٹکراؤ و صف آرائی کی سیاست میں الجھنے کے بجائے اپنی تعلیمی، اقتصادی، معاشی تعمیر و ترقی پر خصوصی توجہ دے۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر ہم اپنا وجود ہی نہیں بلکہ اپنی اہمیت بھی دوسروں سے منوا سکتے ہیں۔ جمعیۃ علماءِ ہند نے اس سلسلہ میں ایک تعمیری پروگرام مرتب کیا ہے۔ ہم ملّت کے باشعور اور دردمند لوگوں کو ایک بار پھر دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس تعمیری پروگرام کے تحت اجتماعی تعمیر و ترقی کی راہ ہموار کریں۔ بالخصوص جمعیۃ علماءِ ہند سے وابستہ افرادِ ملّت اس تعمیری پروگرام کو دلیلِ راہ بنا کر قوم و ملّت کی تعمیر و ترقی کے لئے آگے بڑھیں۔ امتِ مسلمہ کے اعمال و اخلاق کی اصلاح، ان میں اخوت و یگانگت پیدا کرنا اور افلاس و تنگدستی کی دلدل سے نکال کر معاشی رفاہیت کی طرف لے جانا اسلام کے اہم ترین مقاصد میں سے ہے۔ اس سلسلہ میں ہر مسلم آبادی کو امورِ خیر کے لئے ایک امدادی فنڈ قائم کرنا چاہیئے جس کے ذریعہ (۱) ذہین، محنتی، غریب طلبہ کو اسکالرشپ دی جائے (۲) بیواؤں، یتیموں اور نادار مفلس لوگوں کو سردی کے کپڑے اور حسبِ ضرورت دوسری امداد دی جائے (۳) غریب اور یتیم بچیوں کی شادی میں مدد کی جائے۔ (تعمیری پروگرام کا کتابچہ مرکزی دفتر سے مفت حاصل کیا جا سکتا ہے)

ضروری اطلاع

اپریل، مئی کا مشترکہ شمارہ مئی کے آخر میں آئے گا۔ قارئین حضرات نوٹ فرمالیں۔

(ادارہ)

جدید کتابیں — تعارف و تبصرہ

نام کتاب: ـــــــ اقوالِ سلف (چار حصے)
مؤلف: ـــ مولانا قمرالزماں صاحب صدرالمدرسین مدرسہ بیت المعارف الہ آباد (یوپی)
صفحات مجموعی ہر چہار جلد: ـــــــ سولہ سو چالیس (۱۶۴۰)
ناشر: ـــــــ مکتبہ دارالمعارف الہ آباد
قیمت مکمل سیٹ: ـــــــ دوسو سترہ روپے (۲۱۷/-)
ملنے کے پتے: ـ کتب خانہ عزیزیہ ۴۰۷ بخشی بازار الہ آباد (یوپی)
کتب خانہ رشیدیہ اردو بازار جامع مسجد دہلی۔ مکتبہ نعمانیہ و دارالکتاب دیوبند وغیرہ

زیرِ تبصرہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے سلف صالحین و بزرگانِ دین کے منتخب مقالات و ملفوظات کا مجموعہ ہے۔ کتاب کی ابتداء صاحب جوامع الکلم رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلماتِ طیبات سے کی گئی ہے۔ کتاب کے اس پہلے حصہ میں ۱۷۶ صحابہ کرام، تابعین عظام و مشائخ اسلام کے مختصر حالات و منتخب اقوال پیش کئے گئے ہیں۔

جلد دوم کا آغاز شیخ ابوتراب العسکر نخشبی خراسانی کے حالات و ملفوظات اور اختتام امام عبدالوہاب شعرانی کے تذکرہ و اقوال پر ہوا ہے اس حصے میں کل ۸۰ ارمشائخ کے احوال و اقوال کا انتخاب درج کیا گیا ہے۔

تیسری جلد حضرت خواجہ باقی باللہ سے شروع ہو کر حضرت شاہ میانجیو نور محمد جھنجھانوی قدس سرہما کے حالات و مقالات پر مکمل ہوئی ہے۔ یہ جلد کل ۵۵ بزرگوں کے اقوال پر مشتمل ہے۔

چوتھی جلد حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن گنج مرادآبادی کے ذکر سے شروع ہوئی ہے اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہما اللہ کے اقوالِ زرّیں پر اختتام پذیر ہوئی ہے۔ اس آخری جلد میں کل ۴۸ علماء و مشائخ کے مختصر تذکرے و اقوال درج ہیں۔ بلاشبہ یہ کتاب بزرگوں کے اقوال کا ایک دائرۃ المعارف و انسائیکلو پیڈیا ہے جس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہر بات مستند حوالے سے پیش کی گئی ہے۔ اور امت کی اصلاح و تربیت کے پہلو کو سامنے رکھ کر

ایسا جامع اور کارآمد انتخاب پیش کیا گیا ہے جس سے نہ صرف حضرت مؤلف کے علمی شغف کا بلکہ ان کے سوز دروں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہ عظیم کام محض کتابوں کے مطالعہ سے انجام نہیں دیا جاسکتا بلکہ اس کے لئے دل کی تڑپ کی بھی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت مؤلف کو پوری امت کی جانب سے جزائے خیر دے اور اس کتاب کو اپنی قبولیت سے نوازے۔

نام کتاب: ________ توضیح السنن جلد اول

مؤلف: ________ مولانا عبدالقیوم حقانی

صفحات: ________ چھ سو اکاون (۶۵۱)

کتابت و طباعت: ________ معیاری

تاریخ طباعت: ________ رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ فروری ۱۹۹۴ء

ناشر: ________ ادارہ العلم والتحقیق دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پاکستان

قیمت: ________ درج نہیں

ملنے کے پتے: موتمر المصنفین دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع نوشہرہ سرحد پاکستان مکتبہ مدنیہ ۱۹ اردو بازار لاہور۔ کتب خانہ رشیدیہ مدنیہ کلاتھ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی وغیرہ۔

مولانا عبدالقیوم حقانی تعلیم و تدریس کے ساتھ تصنیف و تحقیق کا ستھرا ذوق رکھتے ہیں اور اب تک متعدد اہم علمی و تحقیقی کتابیں تصنیف کر چکے ہیں، اب ان کی یہ جدید تالیف شائع ہوئی جو العلامہ المحدث الامام محمد بن سبحان علی النیموی رحمہ اللہ کی شاہکار تصنیف آثار السنن کی بزبان اردو مبسوط و مدلل شرح ہے جو ہر لحاظ سے مفید و نفع بخش ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ احادیث کی تشریح و توضیح کے ساتھ آثار السنن کے حاشیہ میں امام نیموی نے جو سندی مباحث کئے ہیں ان کی بھی تشریح کردی جاتی اور مولانا عبدالرحمن محدث مبارکپوری نے ابکار المنن میں امام نیموی کی تحقیقات پر جو نقد و جرح کی ہے اس کے جوابات بھی پیش کر دیئے جاتے تو کتاب کی افادیت میں چار چاند لگ جاتے۔ امید ہے کہ شارح محترم حسب وعدہ اس اہم خدمت کو بھی انجام دینے کی کوشش فرمائیں گے۔ یہ کتاب موجودہ حالت میں بھی طلبہ حدیث کیلئے نہایت مفید ہے۔ اور حدیث کی تفہیم و تحقیق کے لئے بہترین دلیل ہے۔

دارالعلوم کی نئی جامع مسجد

اللہ تعالیٰ کا بیحد وحساب شکر ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی نئی جامع مسجد بڑی تیزی سے اپنی تعمیری مراحل طے کرتے ہوئے پایۂ تکمیل کے قریب پہونچ رہی ہے اور اب اس کے اندرونی حصوں کو دیواروں اور فرش کو سنگ مرمر سے مزین کیا جا رہا ہے چونکہ اہم بھی ہے اور بڑا بھی اس پر رقم بھی کثیر خرچ ہوگی مخلصین کی رائے ہوئی کہ آئے دن رنگ وروغن کرانے کے خرچ سے بچنے کیلئے بہتر یہ ہے کہ ایک ہی مرتبہ اپنی رقم لگادی جائے، اسی احساس کے پیش نظر اس کا بڑا کام سرانجام دینے کا بوجھ اٹھالیا گیا ہے، ہمیں امید ہے کہ تمام حضرات معاونین نے جس طرح بہ خصوصی تعاون دیکر مسجد کو تکمیل کے قریب پہنچایا ہے، اسی طرح بلکہ مزید سرگرمی سے اپنا تعاون بڑھاکر اس مرحلہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ادارہ کی مدد فرمائینگے۔

یہ مسجد بین الاقوامی اہمیت کی حامل درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی جامع مسجد ہے جس میں رہتی دنیا تک اس دیار کے نیک لوگ آکر نماز ادا کریں گے خوش قسمت ہیں وہ مسلمان جنکی کچھ بھی رقم اس مسجد میں لگ جائے، اسلئے اپنی جانب سے اور گھر کے ہر فرد کی جانب سے اس کار خیر میں حصہ لیکر عنداللہ ماجور ہوں اور دوسرے احباب واقربا کو بھی اسکی ترغیب دیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمیں مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائیں اور دارین کی سعادت سے ہمکنار کرے ہمہ جہتی ترقیات سے نوازتے ہوئے تمام مصائب وآلام سے محفوظ رکھے۔ آمین

پتہ

ڈرافٹ وچیک کیلئے: "دارالعلوم دیوبند" اکاؤنٹ نمبر 0076 جی

اسٹیٹ بینک آف انڈیا دیوبند

منی آرڈر کیلئے: حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ پن کوڈ نمبر 247554

دار العلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دار العلوم

PH. NO. 22429
COD - 01336
PIN - 247554

ماہ ذی القعدہ ۱۴۱۵ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۹۵ء

نگراں
حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب
مہتمم دار العلوم دیوبند

مدیر
حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی
استاذ دار العلوم دیوبند

جلد نمبر ۸ — شمارہ ۴

سالانہ ۶۰/ ٭ فی شمارہ ۶/

ترسیل زر کا پتہ
دفتر ماہنامہ دار العلوم
دیوبند، سہارنپور، یوپی

سالانہ بدل اشتراک
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ۳۰۰/۰ روپے
پاکستان سے ہندوستانی رقم ۱۰۰/۰
بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ۸۰/۰
ہندوستان سے ۶۰/۰

فہرست مضامین

الحمدُ لِلّٰہِ وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلامُ علیٰ رَسُولِ اللّٰہِ وَعَلیٰ آلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَ مِنْ وَّالاہُ وَبَعدُ!

اللہ پاک نے اپنی بے پایاں رحمتوں سے اپنے بندوں کے لیے سال بھر کے جن دنوں کو خاص شرف وفضیلت سے نوازا ہے تاکہ وہ ان میں زیادہ سے زیادہ نیکیاں کما سکیں اور آخرت کی اپنی دائمی اور حقیقی زندگی کے لیے زیادہ سے زیادہ توشہ جمع کرسکیں عشرہ ذی الحجہ یعنی ذوالحجہ کے شروع کے دس دن بھی انہی میں سے ہیں۔

صحیح بخاری رح میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی دن ایسا نہیں جن میں کیا جانے والا نیک عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں ان دس دنوں سے زیادہ محبوب ہو" صحابہ رض نے عرض کیا کہ "اللہ کے رسول ص! کیا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کا عمل بھی ان دس دنوں میں کیے جانے والے عمل سے بڑھ کر نہیں؟" تو فرمایا کہ "جہاد فی سبیل اللہ بھی اس سے بڑھ کر نہیں، اِلّا یہ کہ کسی آدمی نے اپنی جان اور اپنے مال کو راہ خدا میں اس طرح کھپایا ہو کہ اس سے کچھ بھی واپس نہ لوٹا ہو۔

اور مسند امام احمد رح میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "کوئی بھی دن ایسا نہیں جن میں کیا جانے والا عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں ان دس دنوں میں کیے جانے والے عمل سے زیادہ بڑا اور زیادہ محبوب ہو بس تم ان دنوں میں تہلیل (یعنی لا الٰہ الا اللہ کہنا) تکبیر (یعنی اللہ اکبر کہنا) اور تحمید (یعنی الحمد للہ کہنے

کی کثرت کیا کرو" یعنی یہ اذکار و وظائف زیادہ سے زیادہ پڑھا کرو۔ اور صحیح ابن حبان میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ،
اَفْضَلُ الْاَیَّامِ یَوْمُ عَرَفَةَ یعنی سب سے افضل دن عرفہ (نویں ذی الحجہ) کا دن ہے۔

ان ایام کی دو خاص عبادتیں

ان دنوں کی اس سے بڑی اور کیا فضیلت ہو گی کہ وہ عبادتیں جو سال بھر کے دوسرے دنوں میں انجام نہیں دی جاسکتیں ۔ ان کی انجام دہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس زمانے کو منتخب فرمایا ہے۔ مثلاً حج ایک ایسی عبادت ہے جو ان دنوں کے علاوہ دوسرے دنوں میں انجام نہیں دی جاسکتی، اور دوسری عبادتوں کا یہ حال ہے کہ فرائض کے علاوہ جب چاہے نفلی عبادت کرسکتا ہے۔ مثلاً نماز پانچ وقت کی فرض ہے لیکن ان کے علاوہ جب چاہے نفلی نماز پڑھنے کی اجازت ہے، رمضان میں روزہ فرض ہے لیکن نفلی روزہ جب چاہے رکھیں، زکوٰۃ سال میں ایک مرتبہ فرض ہے، لیکن نفلی صدقہ جب چاہے ادا کر دے، لیکن دو عبادتیں ایسی ہیں کہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے وقت مقرر فرما دیا ہے، ان اوقات کے علاوہ دوسرے اوقات میں اگر ان عبادتوں کو ادا کیا جائے گا تو وہ عبادت ہی نہیں شمار ہوگی۔ ان میں سے ایک عبادت حج ہے، حج کے ارکان مثلاً عرفات میں جاکر ٹھہرنا، مزدلفہ میں رات گذارنا، جمرات کی رمی کرنا وغیرہ۔ یہ ارکان و اعمال ایسے ہیں کہ اگر انہی دنوں میں ان کو انجام دیا جائے تو عبادت ہے اور دنوں میں اگر کوئی شخص عرفات میں دس دن ٹھہرے تو یہ کوئی عبادت نہیں، دوسرے دنوں میں کوئی شخص مزدلفہ میں جاکر دس راتیں گذار لے تو یہ کوئی عبادت نہیں، جمرات سال بھر کے بارہ مہینے منیٰ میں کھڑے ہیں، لیکن عام دنوں میں کوئی شخص جاکر ان کو کنکریاں مار دے تو یہ کوئی عبادت نہیں تو حج جیسی اہم عبادت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان ہی دنوں کو مقرر فرما دیا کہ اگر بیت اللہ کا حج ان دنوں میں انجام دو گے تو عبادت ہوگی اور اس پر ثواب ملے گا۔

دوسری عبادت قربانی ہے۔ قربانی کے لیے اللہ تعالٰی نے ذالحجہ کے تین دن یعنی دس، گیارہ اور بارہ تاریخ مقرر فرما دیئے ہیں، اگر ان دنوں کے علاوہ اگر کوئی شخص قربانی کی عبادت کرنا چاہے تو نہیں کرسکتا البتہ اگر کوئی شخص صدقہ کرنا چاہے تو بکرا ذبح کرکے اس کا گوشت صدقہ کرسکتا ہے، لیکن یہ قربانی کی عبادت ان تین دنوں کے علاوہ کسی اور دن میں انجام نہیں پا سکتی۔ تو اللہ تبارک وتعالٰے نے اس زمانے کو یہ امتیاز بخشا ہے، اسی وجہ سے علماء کرام نے ان احادیث کی روشنی میں یہ لکھا ہے کہ رمضان المبارک کے بعد سب سے زیادہ فضیلت والے دن عشرہ ذی الحجہ کے دن ہیں، ان میں عبادتوں کا ثواب بڑھ جاتا ہے اور اللہ تعالٰے ان دنوں میں اپنی خصوصی رحمتیں نازل فرماتے ہیں، لیکن کچھ چیزیں خاص طور پہ شارع کی طرف سے ان دنوں میں مقرر کردی گئی ہیں۔

ان دنوں میں کرنے کے بعض اہم کام :

ان مبارک دنوں میں یوں تو ہر نیک عمل کی بڑی عظمت وفضیلت ہے۔ لیکن خاص کر چند اہم کام ایسے ہیں جو ان میں بطور خاص کرلے کے ہیں۔ اللہ تعالٰے ہم سب کو توفیق نصیب فرمائے۔ "آمین"

۱ : نفلی روزے رکھنا، ان دنوں کا اہم عمل، اور خاص عبادت ہے جس کا اہتمام ان دس دنوں میں خاص طور پر کرنا چاہیئے، کیوں کہ اللہ کے لیے روزہ رکھنا یہ ویسے بھی بہت بڑا عمل اور عظیم عبادت ہے جس کے بارہ میں حدیث قدسی میں فرمایا کہ اللہ پاک فرماتا ہے اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ (کہ روزہ خاص میرے لیے ہے اور اس کا بدلہ میں خود ہی دوں گا) لیکن نویں ذی الحجہ یعنی عرفہ کے دن کے روزے کی اہمیت اور عظمت وفضیلت تو اور بھی زیادہ ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "عرفہ (نویں ذی الحجہ) کے روزے سے ایک سال پہلے کے اور

ایک سال بعد کے گناہ معاف فرمادیئے جاتے ہیں"۔

صرف گناہ صغیرہ معاف ہوتے ہیں

یہاں یہ بات بھی عرض کردوں کہ بعض لوگ جو دین کا کما حقہ علم نہیں رکھتے تو اس قسم کی جو حدیثیں آتی ہیں کہ ایک سال پہلے کے گناہ معاف ہو گئے اور ایک سال آئندہ کے گناہ معاف ہو گئے تو بعض لوگوں کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ جب اللہ نے ایک سال پہلے کے گناہ تو معاف کرہی دیئے اور ایک سال آئندہ کے بھی گناہ معاف فرمادیئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سال بھر کے لیے چھٹی گئی جو چاہیں کریں۔ سب گناہ معاف ہیں توخوب سمجھ لیجیئے، جن اعمال کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ گناہوں کو معاف کرنے والے اعمال ہیں۔ مثلاً وضو کرنے میں ہر عضو کو دھوتے وقت اس عضو کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ نماز پڑھنے کے لیے جب انسان مسجد کی طرف چلتا ہے تو ہر ایک قدم پر ایک گنا معاف ہوتا ہے اور ایک درجہ بلند ہوتا ہے۔ رمضان کے روزوں کے بارے میں فرمایا کہ جس شخص نے رمضان کے روزے رکھے اس کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ یاد رکھئے اس قسم کی تمام احادیث میں گناہوں سے مراد گناہ صغیرہ ہوتے ہیں اور جہاں تک کبیرہ گناہوں کا تعلق ہے۔ اس کے بارے میں قانون یہ ہے کہ بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے، ویسے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے کسی کے کبیرہ گناہ بغیر توبہ کے بخش دیں، وہ الگ بات ہے لیکن قانون یہ ہے کہ جب تک توبہ نہیں کرلے گا معاف نہیں ہوں گے اور پھر توبہ سے بھی وہ گناہ کبیرہ معاف ہوتے ہیں جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہو اور اگر اس گناہ کا تعلق حقوق العباد سے ہے مثلاً کسی کا حق دبالیا ہے، کسی کا حق مارلیا ہے، کسی کی حق تلفی کرلی ہے اس کے بارے میں قانون یہ ہے کہ جب تک صاحب حق کو اس کا حق ادا نہ کردے یا اس سے معاف نہ کرالے اس وقت تک معاف نہیں ہوں گے۔ لہٰذا تمام فضیلت والی احادیث جن میں گناہوں کی معافی کا ذکر ہے وہ صغیرہ گناہوں کی معافی سے متعلق ہیں۔

۲ : توبہ استغفار کی کثرت

اسی طرح ان پاکیزہ دنوں میں توبہ واستغفار بھی خوب خوب کرنی چاہیے تاکہ رحمتوں بھرے ان دنوں میں اپنے گناہوں کی معافی مل سکے، اور حضرت حق جل جلالہٗ کا قرب اور ان کی رضا نصیب ہو سکے۔

توبہ واستغفار کے یہ الفاظ بہت اہم ہیں کیوں کہ مختصر بھی ہیں اور جامع بھی یعنی ...
اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِی لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ۔ لہٰذا ان الفاظ کا ہمیشہ اور خاص کر ان دنوں میں جتنا ہو سکے ورد رکھے۔ اور ان کے معانی کو ذہن میں رکھ کر پڑھے تو اور بھی لذت نصیب ہوگی۔

تکبیر تشریق

ان ایام میں تیسرا عمل تکبیر تشریق ہے جو عرفہ کے دن کی نماز فجر سے شروع ہو کر تیرہؔ تاریخ کی عصر تک جاری رہتی ہے اور یہ تکبیر ہر فرض نماز کے بعد ایک مرتبہ پڑھنا واجب ہے ...... تکبیر یہ ہے :
اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر، لا الٰہ الا اللّٰہ، واللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر، وللّٰہ الحمد۔ اور آہستہ آواز سے پڑھنا خلاف سنت ہے۔

گنگا الٹی بہنے لگی ہے

ہمارے یہاں ہر چیز میں الٹی گنگا بہنے لگی ہے کہ جن چیزوں کے بارے میں شریعت نے کہا ہے کہ آہستہ آواز سے کہو، ان چیزوں میں تو لوگ شور مچا کر بلند آواز سے پڑھتے ہیں۔ مثلاً دعا کرنا ہے۔ قرآن کریم میں دعا کے بارے میں فرمایا ہے :

"آہستہ اور تضرع کے ساتھ اپنے رب کو پکارو، اور آہستہ دعا کرو"

(سورۃ الاعراف ۵۵)

چنانچہ عام اوقات میں بلند آواز سے دعا کرنے کے بجائے آہستہ آواز سے دعا کرنا افضل ہے، البتہ جہاں زور سے دعا مانگنا سنت سے ثابت ہو، وہاں اسی طرح مانگنا افضل ہے۔ دعا میں تو لوگوں نے اپنی طرف سے شور مچانے کا طریقہ اختیار کرلیا اور جن چیزوں کے بارے میں شریعت نے کہا تھا کہ بلند آواز سے کہو، مثلاً یہ تکبیر تشریق۔ جو ہر نماز

کے بعد بلند آواز سے کہنا چاہئے، لیکن اس کے پڑھنے کے وقت آواز ہی نہیں نکلتی اور آہستہ سے پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔

تکبیر تشریق خواتین پر بھی واجب ہے

یہ تکبیر تشریق خواتین کے لیے بھی مشروع ہے۔ اس میں عام طور پر بڑی کوتاہی ہوتی ہے اور خواتین کو تکبیر پڑھنا یاد ہی نہیں رہتا۔ مرد حضرات تو چونکہ مسجد میں جماعت سے نماز ادا کرتے ہیں اور جب سلام کے بعد تکبیر تشریق کہی جاتی ہے تو یاد آجاتا ہے اور وہ کہہ لیتے ہیں، لیکن خواتین میں اس کا رواج بہت کم ہے اور عام طور پر خواتین اس کو نہیں پڑھتیں۔ اگرچہ خواتین پر واجب ہونے کے بارے میں علماء کے دو قول ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ خواتین پر واجب نہیں بلکہ مستحب ہے، لیکن صحیح قول کے مطابق عورتوں پر بھی ایک مرتبہ اس کا پڑھنا واجب ہے۔ (شامی ج ۲ ص ۱۷۹)۔

۴: قربانی دوسرے ایام میں نہیں ہوسکتی

چوتھا اور سب سے افضل عمل جو اللہ تعالیٰ نے ایام ذی الحجہ میں مقرر فرمایا ہے وہ قربانی کا عمل ہے اور جیسا کہ گذشتہ سطور میں عرض کیا گیا کہ یہ عمل سال کے دوسرے ایام میں انجام نہیں دیا جا سکتا۔ صرف ذی الحجہ کی دس، گیارہ اور بارہ تاریخ کو انجام دیا جا سکتا ہے، ان کے علاوہ دوسرے اوقات میں چاہے کتنے جانور ذبح کرلے لیکن قربانی نہیں ہوسکتی۔

قربانی کیا سبق دیتی ہے

قربانی کے معنی ہیں "اللہ کا تقرب حاصل کرنے کی چیز" اور یہ لفظ قربانی "قربان" سے نکلا ہے اور لفظ "قربان"۔ "قرب" سے نکلا ہے، تو قربان کے معنی یہ ہیں کہ "وہ چیز جس سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جائے" پس اس قربانی کے سارے عمل میں یہ سکھایا گیا ہے کہ ہمارے حکم کی اتباع کا نام دین ہے۔ جب ہمارا حکم آجائے تو اس کے بعد نہ عقلی گھوڑے دوڑانے کا موقع ہے نہ اس میں حکمتیں اور مصلحتیں تلاش کرنے کی گنجائش کا موقع باقی رہتا ہے۔ اور نہ اس میں چوں و چرا کرنے کا موقع ہے۔ ایک مومن کا کام یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے حکم آجائے تو اپنا سر جھکا دے اور اس حکم کی اتباع کرے۔

بیٹے کو ذبح کرنا عقل کے خلاف ہے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس حکم آگیا کہ بیٹے کو ذبح کردو، اور وہ حکم بھی خواب کے ذریعہ سے آیا، اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو وحی کے ذریعہ حکم نازل فرما دیتے کہ اپنے بیٹے کو ذبح کرو۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا، بلکہ خواب میں آپ کو یہ دکھایا کہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ اگر ہمارے جیسا تاویل کرنے والا کوئی ہوتا تو یہ کہہ دیتا کہ یہ تو خواب کی بات ہے اس پر عمل کرنے کی کیا ضرورت ہے مگر یہ بھی حقیقت میں ایک امتحان تھا کہ چوں کہ جب انبیاء علیہ السلام کا خواب وحی ہوتا ہے تو کیا وہ اس وحی پر عمل کرتے ہیں یا نہیں؟ اس لیے آپ کو یہ عمل خواب میں دکھایا گیا، اور جب آپ کو یہ معلوم ہوگیا کہ یہ اللہ کی طرف سے ایک حکم ہے کہ اپنے بیٹے کو ذبح کردو تو حضرت ابراہیم نے پلٹ کر اللہ تعالیٰ سے یہ نہیں پوچھا کہ یا اللہ! یہ حکم آخر کیوں دیا جارہا ہے؟ اس میں کیا حکمت اور مصلحت ہے؟ دنیا کا کوئی قانون اور کوئی نظام زندگی اس بات کو اچھا نہیں سمجھتا کہ باپ اپنے بیٹے کو ذبح کرے عقل کی کسی میزان پر اس حکم کو اتار کر دیکھئے تو کسی میزان پر یہ پورا اترتا نظر نہیں آتا۔

۵: نماز عید کی ادائیگی

اس طرح ان برگزیدہ دنوں میں کیا جانے والا پانچواں عظیم الشان اور پاکیزہ عمل نماز عید کی ادائیگی ہے جو اللہ پاک کے حضور جو کہ ہم سب کا اور اسی پوری کائنات کا خالق و مالک ہے اس کے حضور اجتماعی طور پر جھکنے اور سجدہ ریز ہونے کا ایک عظیم الشان اور بے مثل اور بے نظیر مظہر ہے اس میں شامل ہونا، اس عبادت سے مشرف ہونا، اور خطبہ عید سننا اور اس سے استفادہ کرنا ایک امر مطلوب و مامور ہے۔ اس لیے اس کا پورا اہتمام کرنا چاہئے اور نہا دھو کر خوشبو لگا کر اہتمام سے اس میں شامل ہونا چاہئے۔

عید کی اہمیت

نماز عید ایک عظیم الشان عبادت اور دین حق کا ایک بے مثل و بے نظیر پاکیزہ مظہر ہے اور مسلمانوں کی یہ دونوں عیدیں دو عظیم الشان عبادتوں کے ساتھ مرتبط ہیں، عید الفطر رمضان المبارک کے روزوں کے بعد ادا کی جاتی ہے، اور عید الاضحیٰ

حج بیت اللہ کے بعد، اور یہ دونوں عبادتیں دین حق کے ارکان خمسہ میں سے دو بنیادی رکن ہیں اور ایسی پاکیزہ اور جامع عبادتیں ہیں جو پوری روئے زمین پر مسلمانوں کے سوا اور کسی قوم کو نصیب نہیں۔ پس عید کی نماز دراصل اللہ پاک کے حضور اس کی اسی عنایت پر سجدۂ شکر بجالانا ہے، جو مسلمان اپنے خالق و مالک کے حضور میں پیش کرتا ہے۔

اسلام میں عیدیں صرف دو ہیں

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ اسلامی عید کوئی ایسا تہوار نہیں جس طرح کہ دوسری قوموں کے مختلف تہوار اور قومی دن ہوتے ہیں بلکہ یہ درحقیقت دو عظیم الشان اور پاکیزہ عبادتیں ہیں جن کی تعلیم دین حق نے فرمائی ہے اور عبادت انسان اپنی عقل و فکر سے مقرر نہیں کرسکتا، بلکہ اس کو صرف اسی طریقہ کے مطابق اور اسی طرح سے ادا کرنا اور بجا لانا ہوتا ہے جس طرح کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ برحق نے ارشاد فرمایا ہے اور دین حق کی تعلیماتِ مقدسہ میں سال بھر میں صرف دو ہی عیدوں کا حکم وارشاد فرمایا گیا ہے، یعنی عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ۔ تیسری کسی عید کا اسلام میں کوئی وجود نہیں، اسی لیے حدیث اور فقہ کی تمام کتابوں میں "عیدین" یعنی صرف دو ہی عیدوں کا ذکر ملتا ہے اور پس اب جو لوگوں نے دوسری کئی عیدیں مختلف ناموں سے بنالی ہیں وہ ان کی اپنی ایجاد و اختراع ہے۔ دین حق میں ان کا کوئی ثبوت و وجود نہیں۔ اس لیے ایسی تمام بدعات سے بچنا ضروری ہے کیوں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا صحیح حدیث میں یہ صریح ارشاد موجود ہے کہ "جس شخص نے ہمارے دین میں کسی ایسی نئی چیز کو شامل کرلیا جو اس اس میں ثابت نہیں، وہ مردود ہے"۔ یعنی وہ اس کے منہ پر ماردی جائے گی۔

والعیاذ باللہ العظیم الذی لا الٰہ غیرہٗ۔

ابتدائے اسلام میں متعہ کے اباحت کی حقیقت

مولانا محمد اقبال رنگونی اسلامک اکیڈمی مانچسٹر

ابتدائے اسلام میں جس قسم کے متعہ کی اجازت دی گئی تھی، وہ وہ متعہ ہرگز نہ تھا جس کی تفصیل شیعی کتابوں میں موجود ہے۔ کیوں کہ یہ متعہ تو صریح زنا ہے، جس کی اجازت نہ پہلے کسی قوم کے لیے تھی، اور نہ کبھی اس کے بعد کسی کے لیے ہوگی۔ زنا ایک ایسی خباثت ہے جس کو کسی شریعت نے پسندیدہ کیا روا بھی نہیں جانا بلکہ ہر شریعت نے عفت وعصمت کے تحفظ کے لیے ایسی برائیوں کا خاتمہ کرنے کے لیے سزائیں تجویز کی ہیں۔

شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ تحریر فرماتے ہیں:

"جو متعہ شروع اسلام میں جائز یعنی غیر ممنوع تھا، اس کی حقیقت صرف نکاح مؤقت کی تھی یعنی ایک مدت معینہ کے لیے گواہوں کے سامنے ولی کی اجازت سے کسی عورت سے نکاح کیا جائے، اور مدت معینہ گذر جانے کے بعد بلا طلاق کے مفارقت ہوجائے، لیکن مفارقت کے بعد استبراء رحم کے لیے ایک مرتبہ ایام ماہواری یعنی ایک حیض کا آنا ضروری ہے تاکہ دوسرے نطفہ کے ساتھ اختلاط سے محفوظ رہے ——— اس قسم کا نکاح ایک برزخی مقام ہے یعنی ان قیود و شرائط کے ساتھ نکاح مؤقت نکاح مطلق اور زنا محض کے درمیان ایک درمیانی درجہ ہے، نکاح متعہ کی اس صورت میں گواہوں کے سامنے ایجاب وقبول اور ولی کی اجازت ضروری ہے۔ اور مرد سے علیحدہ ہوجانے کے بعد اگر دوسرے مرد سے نکاح متعہ کرنا چاہے تو جب تک ایک حیض نہ آجائے اس وقت تک دوسرے سے نکاح متعہ

نہیں کرسکتی" (معارف القرآن ج ۲ ص ۵۱)

اس سے پتہ چلا کہ ابتدائے اسلام میں جو متعہ غیر ممنوع تھا اس کی حقیقت شیعی متعہ کی حیثیت سے بہت ہی مختلف ہے بلکہ ایک دوسرے کی ضد ہے۔

۱: یہ متعہ نکاح موقت تھا، شیعی اصطلاح والا متعہ نہ تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رض کہتے ہیں کہ:

فرخص لنا ذلك ان نتزوج المرأة۔ (صحیح البخاری جلد ۲ ص ۷۶۳)	پس ہم کو عورت سے نکاح (متعہ) کرنے کی رخصت دی۔
ثم رخص لنا ان ننكح المرأة۔ (صحیح البخاری جلد ۲ ص ۷۵۹)	پس ہم کو عورت کے ساتھ (نکاح) متعہ کرنے کی رخصت دی۔

حضرت سبرۃ رض کی روایت میں ہے کہ:

نهى عن نكاح المتعة (صحیح مسلم جلد ۱ ص ۴۵۲) منع فرمایا نکاح متعہ سے۔

حضرت امام بخاری رح، حضرت امام مسلم رح، حضرت امام ترمذی رح وغیرہ حضرات محدثین "باب نکاح المتعة" کا عنوان قائم کرکے اس کی صراحت بھی کرتے ہیں۔

اس حدیث میں لفظ تزویج اور نکاح اس بات پر دلالت کررہا ہے کہ یہ وہ متعہ ہرگز نہ تھا جو شیعہ کرتے ہیں بلکہ یہ نکاح مؤقت تھا۔

حضرت علامہ ابو الولید سلیمان باجی (۴۹۴ھ) لکھتے ہیں کہ:

المتعة المذكورة هى النكاح المؤقت۔ (منتقی شرح مؤطا جلد ۳ ص ۳۳۶)	مذکورہ متعہ یہ دراصل نکاح مؤقت تھا

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رح لکھتے ہیں کہ:

ان المتعة التى يا ثرها من يا ثرها من الصحابة انما كانت الى اجل اعنى النكاح المؤقت وهكذا وقع فى حديث سبرة عند ابن جرير بلفظ	صحابہ کرام رض میں جن سے متعہ کا ذکر ملتا ہے وہ درحقیقت نکاح موقت تھا۔ اور حضرت سبرۃ رض کی حدیث جو ابن جریر رح نے نقل کی ہے اس میں لفظ "تزوجتها" اس پر

تزوجتها........ کان هو النکاح المؤقت (فتح الملهم جلد ۳ ص۴۳۱) دلالت کرتا ہے .... یہ نکاح موقت ہی تھا۔

خلاصہ کلام یہ کہ اسلام کے ابتدائی دور میں جس متعہ کا ذکر ملتا ہے، اس سے مراد نکاح موقت ہے، اور علماء اہل سنت کی تصریح کے مطابق اس نکاح موقت میں نفقہ اور سکنیٰ بھی لازم تھا نہ کہ وہ متعہ جو شیعہ بیان کرتے ہیں۔ اور یہ بات پھر سے پیش نظر رکھ لیجئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نکاح مؤقت کو بھی حکم الٰہی کے تحت فرمایا تھا۔ چہ جائے کہ شیعی روایت والا متعہ جائز ہو۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن۔

۲: اس نکاح مؤقت کی مدت بھی بہت ہی کم رہی تھی۔ یعنی زیادہ دنوں تک اس کی اجازت نہ تھی۔ حضرت علامہ قرطبی رح (۲۳۵ھ) فرماتے ہیں کہ:

الروایات کلها متفقة علی ان زمن اباحت المتعة لم یطل۔ (فتح الباری جلد ۱۹ ص۲۰۸) تمام روایات اس بات پر متفق ہیں کہ متعہ (نکاح مؤقت کی اباحت کا زمانہ بہت تھوڑا تھا۔

یعنی تمام احادیث اس بات پر متفق ہیں کہ یہ نکاح مؤقت بہت کم دنوں کے لیے رہا۔ بعض روایات میں صرف تین دن کی اجازت منقول ہے۔ اس کے بعد بالآخر اس کی ابدی حرمت کا اعلان کر دیا گیا۔ اب کسی کو اس بات کا اختیار حاصل نہیں کہ پیغمبر کے حرام فرما دینے کے بعد اس کی حلت کا فتویٰ دے ورنہ ایک جدید نبوت کا اعلان ہوگا جس کی اسلام میں قطعاً گنجائش نہیں ہے۔

۳: یہ نکاح مؤقت ولی کی اجازت اور گواہوں کے روبرو ہوتا تھا یعنی چوری، چھپے یہ کام نہ ہوتا تھا بلکہ لوگوں کو اس کا علم ہوتا تھا کہ اس نے فلاں عورت کے ساتھ نکاح مؤقت کیا ہے۔ صرف متعہ کرنے والا بھی اس قسم کے اعلان کی جرأت کر سکتا ہے نہ کر سکے گا۔ کیوں کہ یہ زنا ہے اور زانی میں اتنی جرأت نہیں ہوتی شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رح لکھتے ہیں کہ:

کان هو النکاح المؤقت بحضرة الشهود یہ نکاح موقت تھا گواہوں کے سامنے ہوتا

كما يدل عليه حديث سليمان بن يسار عن ام عبد الله ابنة ابى خيثمة عن رجل من اصحاب النبى صلعم فى قصة عند ابن جرير وفيه فشارطها واشهدوا على ذلك عدولاً (فتح الملہم جلد ۲ ص۴۴۱)

تھا جیسا کہ اس پر سلمان بن یسار رض کی حدیث جو ام عبد اللہ بنت ابی خیثمہ سے مروی ہے دلالت کرتی ہے ایک شخص کے واقعہ میں جو صحابی رسول تھا (ابن جریر نے اشارہ کیا ہے) اور اسی حدیث میں ہے کہ اس عورت سے شرط کی گئی اور اس پر عادل گواہ قائم کئے تھے۔

حضرت مولانا ادریس صاحب کاندھلوی رح تحریر فرماتے ہیں کہ:

"نکاح متعہ کی اس صورت میں گواہوں کے سامنے ایجاب وقبول اور ولی کی اجازت ضروری ہے"۔ (معارف القرآن جلد ۲ ص۵۱)

حضرت ابن عطیہ رح فرماتے ہیں کہ:

وكانت المتعة ان يتزوج الرجل بشاهدين واذن الولى الى اجل مسمى۔ (تفسیر قرطبی جلد ۵ ص۱۳۲)

اور متعہ (نکاح مؤقت) یہ تھا کہ مرد دو گواہوں کے سامنے اور ولی کی اجازت سے وقت مقررہ تک ہوتا تھا۔

فقہاء کرام متعہ اور مؤقت نکاح کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

وعدم اشتراط للشهود فى المتعة وفى المؤقت الشهود۔ (فتح القدیر جلد ص۳۳)

متعہ (شیعی) میں گواہ شرط نہیں اور نکاح مؤقت میں گواہوں کی شرط ہے (یہ فرق ہے متعہ اور نکاح مؤقت میں)۔

مولانا محمد حسن اسرائیلی سنبھلی رح لکھتے ہیں کہ:

ان حضور الشهود غير مشروط فى المتعة وانما هو فى المؤقت وهذا هو الفرق بينهما (حاشیہ مسند الامام ص۳۳۶)

متعہ میں گواہوں کی شرط نہیں ہے لیکن نکاح مؤقت میں شرط ہے اور یہ ہے فرق ان دونوں کے درمیان۔

مندرجہ بالا حوالجات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ابتداء اسلام میں جو نکاح مؤقت ہوا کرتا تھا اس میں گواہ بھی ہوتے تھے اور ولی بھی ہوتا تھا لوگوں کو معلوم بھی تھا، مگر متعہ شیعی کہ جس میں نہ ولی کی ضرورت، نہ گواہوں کی ضرورت، نہ اعلان کی ضرورت۔ غور فرمائیے۔ دونوں میں فرق ہے یا نہیں ؟

اگر آپ علمائے اہل سنت کے ارشادات سے مطمئن نہ ہوں تو لیجئے شیعوں کے شیخ الطائفہ شیخ طوسی (۴۶۰ھ) سے بھی سن لیں اور ہمارے دلائل کی تائید کریں۔ معلی بن خنیس کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر سے پوچھا :

جعلت فداك كان المسلمون على عهد النبی صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم يتزوجون بغير بنية ؟ قال لا۔ (الاستبصار جلد ۳ ص۱۴۵)	میں آپ پر قربان جاؤں کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں یہ متعہ بغیر گواہوں کے ہوتا تھا۔ آپ نے فرمایا نہیں (یعنی گواہ ہوتے تھے)۔

شیخ الطائفہ لکھتے ہیں :

انهم ما تزوجوا الا بينة وذلك هو الافضل (ایضاً)	کہ وہ لوگ بغیر گواہوں کے نہ کرتے تھے۔ اور یہی افضل ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ابتداء اسلام میں جس نکاح مؤقت کی اجازت تھی، اس میں گواہ بھی ہوتے تھے، اور ان لوگوں نے گواہوں کے بغیر نکاح مؤقت بھی نہ کیا تھا۔ مگر ان سب کے باوجود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اس نکاح مؤقت کی حرمت کا بھی اعلان فرما دیا۔ کہاں نکاح مؤقت اور کہاں متعہ۔ آخر الذکر کی اجازت نہ تو پہلے تھی، نہ یہ طریقہ تھا اور نہ اس کی اجازت دی جا سکتی ہے۔

۴۔ نکاح مؤقت کی یہ اجازت بھی ایک اضطراری حالت کے ضمن میں تھی، نہ یہ کہ ہر شخص کو اس کی اجازت تھی۔ سیدنا حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہ جن کو سب سے زیادہ اپنے استدلال میں پیش کیا جاتا ہے۔ آیئے ان ہی سے معلوم کرلیں کہ یہ نکاح مؤقت بھی کس حالت کے لیے تھا، اور اس کی کیا نوعیت تھی ؟ جب

آپ کی طرف متعہ کے مطلق حلال ہونے کا انتساب کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ:

واللہ ما بہذا افتیت ولا ھذا اردت ولا احللت منہا الا ما احل اللہ من المیتۃ والدم ولحم الخنزیر...

خدائے پاک کی قسم میں نے یہ فتویٰ نہیں دیا اور نہ میرا یہ مطلب ہے۔ میں نے اس کے حلال کو جو بیان کیا ہے وہ ایسا ہی جیسے خدا نے مردار کا گوشت اور خون اور سور کا گوشت حلال کیا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ سے آپ کے غلام نے کہا کہ یہ اجازت تو انتہائی اضطراری اور عورتوں کی وجہ سے ہی تھی ؟ آپ نے فرمایا "نعم" ہاں۔ (صحیح البخاری ج۲ ص۷۶۶)

یعنی یہ صرف اضطراری حالت سے متعلق تھی ابن ابی عمرۃ رضؓ بھی کہتے ہیں کہ:

انہا کانت رخصۃ فی الاول الاسلام لمن اضطر الیہا کالمیتۃ والدم ولحم الخنزیر ثم احکم اللہ الدین ونھی عنہا۔

(صحیح مسلم جلد۱ ص۴۵۲)

ابتدا اسلام میں اس نکاح مؤقت کی رخصت تھی مگر اس کے لیے جو انتہائی مجبور ہو جیسے (حالت اضطراری میں) مردار کا گوشت، خون اور سور کا گوشت ہوتا ہے پھر اللہ نے دین کو محکم کر دیا اور اس سے (بھی) روک دیا۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ سیدنا ابن عباس رضؓ اس نکاح مؤقت کے مطلق حلال ہونے سے انکار کرتے ہیں، اور نہ آپ کا یہ مطلب ہے بلکہ آپ کے نزدیک اسکی اباحت صرف ایک اضطراری حالت کے پیش نظر تھی کہ جس طرح کوئی شخص انتہائی مجبوری کی حالت میں مردار، سور کا گوشت کھاتا ہے یا خون کھاتا پیتا ہے تو اس پر شریعت کی گرفت نہیں۔ لیکن اس کو حلال سمجھ کر ہی کھاتے رہنا یہ کسی کے نزدیک بھی جائز نہ تھا۔ یہ احکام ایک غیر اختیاری اور اضطراری حالت سے متعلق ہیں، نہ کہ اختیاری اور غیر اضطراری حالت سے متعلق۔ گویا حضرت ابن عباس رضؓ اس اباحت کے در پردہ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار فرما کر اسے مردار سور کے گوشت اور خون کیساتھ ملا رہے ہیں۔

لیکن سیدنا ابن عباس رض نے سیدنا حضرت علی المرتضیٰ اور دیگر اصحاب کرام کے ارشادات اور دلائل کے بعد اپنے اس قول سے بھی رجوع فرمالیا اور اس کی حرمت واضح کردی۔

۵ : نکاح مؤقت کی یہ اجازت بھی صرف حالت سفر سے متعلق تھی، اپنے شہر میں رہنے والے لوگوں کو اس کی ہرگز اجازت نہ تھی۔ حضرت امام طحاوی (۳۲۱ھ) کہتے ہیں کہ :

کل هولاء الذين رووا عن النبي صلى الله عليه وسلم اطلاقها اخبروا انها كانت في سفر وان النهي لحقها في ذالك السفر بعد ذالك فمنع منها وليس احد منهم يخبر انها كانت في حضر وكذلك روي عن ابن مسعود رض۔

(تفسیر قرطبی جلد ۵ ص ۱۳۱)

جن جن لوگوں نے حضورؐ سے متعہ کی اباحت کو نقل کیا ہے ان سب نے یہی کہا ہے کہ یہ وقتی اباحت صرف حالت سفر میں ملی تھی اور پھر اسی سفر میں اس کی ممانعت کا اعلان ہوا اور اس سے روک دیا گیا اور کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس نے کہا ہو کہ یہ اباحت حالت حضر (یعنی اپنے شہر میں بھی تھی جیسا کہ ابن مسعود کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ حالت سفر سے متعلق تھا۔

حضرت امام حازمی رح فرماتے ہیں :

وانما كان ذالك في اسفارهم ولم يبلغنا ان النبي صلى الله عليه وسلم اباحه لهم في بيوتهم ۔

(کتاب الاعتبار ص ۱۷۶)

اور یہ اباحت حالت سفر سے متعلق تھی۔ اور ایک روایت بھی ایسی نہیں ملی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے گھروں میں رہنے کی حالت میں بھی اس کی اباحت کی اجازت دی تھی (یعنی صرف حالت سفر میں ایسا ہوا)۔

احادیث کریمہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی ممانعت بھی آگئی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عورتوں سے الگ ہو جانے کا حکم فرما دیا۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ (۱) یہ معاملہ سفر سے متعلق تھا (۲) اور پھر حالت سفر میں اس کی حرمت واقع ہو چکی کیونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم الٰہی کے مطابق قیامت تک اس کی حرمت بیان کر دی ہے خواہ وہ حضر میں ہو خواہ سفر میں، ہر حالت میں ممنوع ہے۔

ایرانی صدر رفسنجانی نے یہ اجازت حالت سفر سے متعلق نہ دی بلکہ کھلے عام چھٹی دے دی کہ جو جہاں ہے وہیں متعہ کر سکتا ہے حالانکہ یہ وقتی اجازت سفر میں تھی اور وہ بھی ممنوع ہو گئی ایرانی صدر نے اس اعلان کے ذریعہ شریعت محمدیہ کے چہرے کو مسخ کرنے کی جو سازش کی ہے وہ حد درجہ لائق مذمت ہے۔

۴: نکاح مؤقت میں جدائی کے بعد اس بات پر بھی پابندی تھی کہ نکاح مؤقت کرنے والی جدائی کے بعد ایک مرتبہ ایام ماہواری تک کسی دوسرے سے نکاح مؤقت نہ کرے، تاکہ دوسرے مرد کے نطفہ کے ساتھ اختلاط سے محفوظ رہے۔

حضرت عمار رض کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباس رض سے پوچھا:

هل عليها عدة قال نعم حيضة۔　　کیا اس نکاح مؤقت کرنے والی عورت پر عدت ہے۔ آپ نے فرمایا، ہاں اس پر ایک حیض کا انتظار کرنا ہے۔

(تفسیر قرطبی جلد ۵ صـ ۱۳۲)

جس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر اس عورت کو حمل قرار پا گیا تو پھر یہ بچہ اس کے باپ کے نام سے پہچانا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ ولی اور گواہوں کا موجود رہنا ضروری تھا۔ تاکہ ان حالات میں وہ اس بات کی گواہی دے سکیں کہ یہ بچہ تیرا ہی ہے۔

مگر چہ شیعہ اثنا عشریہ کی اصطلاح میں جو متعہ ہے اس میں نہ گواہوں کی ضرورت نہ ولی کی۔ اور نہ اعلان کی۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر عورت کو حمل قرار پا گیا تو بچہ کا باپ کوئی نہیں؛ ایک عورت نو ماہ کے عرصہ میں نہ معلوم کتنے لوگوں سے متعہ کرے گی اس حالت میں کیا کوئی مرد اس نطفہ کی ذمہ داری لینا منظور کرے گا کہ یہ بچہ میرا ہی ہے؟

(بقیہ صـ ۔۔)

مولانا شمس تبریز خاں لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

ہندوستان عربوں کی نظر میں

ہندوستان کے متعلق عربی لٹریچر کے مطالعہ سے یہ تأثر ابھر کر سامنے آتا ہے، کہ عرب اس ملک کو بحیثیت مجموعی پسند کرتے تھے، اس کی جغرافیائی وسعت، پیداواری صلاحیت کے ساتھ اس کے فلسفہ وحکمت کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، ان کے بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنوبی اور مشرقی ایشیاء کے کسی ملک سے ان کا ایسا تعلق خاطر نہ تھا جیسا کہ ہندوستان سے تھا، اور اس میں کئی باتوں کا دخل تھا۔

ایک تو یہ کہ بحر عرب اور بحر ہند ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور جزیرہ نمائے عرب کے بعد ہندوستانی برصغیر SUB-CONTINENT ہی ایک سیاح اور مسافر کے سامنے آتا ہے، اس لئے عرب اپنے بحری سفر میں ناگزیر طور پر ہندوستانی ساحلوں پر لنگر انداز ہوتے ہوئے خلیج، بنگال پھر مشرق بعید اور چین جاتے تھے، قریبی پڑوسی ہونے کے ناتے ان کا ہندوستان سے قربت NEARRELY محسوس کرنا ایک قدرتی امر تھا۔

دوسرے ہندوستان کے موسموں کا اعتدال، اس کے باشندوں کی ذہنی وجسمانی طور پر عربوں سے یکسانیت، تجارتی سہولت اور یہاں کے علوم وفنون کی کشش نے عربوں کو ہندوستان سے بہت قریب کر دیا، اور انھوں نے ہندوستان کو ہر زاویئے سے دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی، مؤرخین نے اس کی تاریخ پر توجہ کی، جغرافیہ نویسوں اور سیاحوں نے جغرافی اور تمدنی معلومات بہم پہنچائیں، ادیبوں اور اہل نظر نے یہاں کے

علوم وفنون، مذہب وتہذیب اور حکمت وفلسفہ سے بحث کی اور ہندوستان سے اپنی پوری دلچسپی کا ثبوت دیا [۱]

ہندوستان سے متعلق قدیم ترین عربی لٹریچر

چونکہ اسلام سے پہلے ہی عرب وہند کے درمیان تجارت اور آمدورفت کا سلسلہ موجود تھا، اس لیے عربی شعروادب میں ہندوستان اور ہندوستانی چیزوں کا بہت پہلے سے تذکرہ ملتا ہے، جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں نے اپنی تاریخ کی ابتداء سے اب تک ہندوستان سے اپنی ہمہ جہت دلچسپی برابر برقرار رکھی ہے، اور اسے تحریری شکل بھی دی ہے۔

عرب جاہلیت کی ادبیات میں ہندوستان کا ذکر خیر طرح طرح سے کیا گیا ہے اہل عرب حسن ہندی سے اتنے متاثر ہوئے کہ اپنی عورتوں کے نام ہند رکھنے لگے، ہندوستانی تلواروں کو سیف ہند کہنے لگے، ہندوستان یا بواسطہ ذکر ہندوستانی اشیا کے ساتھ بھی قدیم عرب شعراء کے کلام میں جابجا ملتا ہے، مشک، کافور، عود ہندی، زنجبیل فلفل، قرنفل، ساج (ساگوان) قسط (کٹھ) وغیرہ کے نام بکثرت آتے ہیں۔

اسلام کی آمد کے بعد عرب وہند کے درمیان تعلقات میں مزید استواری اور بہتری پیدا ہوئی، اور متعدد احادیث میں حضرت آدمؑ کے نزول ہند کے ذکر سے ہندوستان سے مسلمانوں کو ایک ربط خاص پیدا ہوگیا، قاضی اطہر صاحب لکھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضؓ ہندوستان کے لوگوں اور یہاں کی خبروں سے اچھی طرح واقف تھے اور متعدد موقعہ پر آپؐ کی زبانِ مبارک پر اس کا ذکر آیا ہے [۲]

---

[۱] حضرت عمرؓ نے ایک بار ایک عرب مجاہد سے ہندوستان کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ بحرھادرّ وجبلھا یاقوت وشجرھا عطر (الاخبار الطوال، ابن قتیبہ دینوری ۳۲۷ (لیڈن) یعنی اس کا سمندر تمام تر موتی، اس کے پہاڑ یاقوت اور اس کے درخت سراپا عطر وخوشبو ہیں۔ [۲] عرب وہند عہد رسالت میں، از قاضی اطہر مبارکپوری ص۱۵۱ (دہلی ۱۹۶۵ء)۔

ہندوستان کی سب سے قدیم تاریخ "چچ نامہ" ہے جسے منہاج المالک، فتح نامہ اور تاریخ ہند وسندھ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ بعد کے تمام مؤرخین کا مرجع رہی ہے، اس کی قدامت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکا ہے۔ بعض مؤرخین اسے پہلی صدی ہجری کی تالیف بتاتے ہیں چودھری نبی احمد سندیلوی لکھتے ہیں: اس تاریخ کی بابت یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ ۱۱۱ھ سے بہت قبل مرتب کی گئی ہے۔ مترجم (محمد علی بن حامد بن ابوبکر کوفی پیدائش ۵۵۵ھ) نے ناصر الدین قباچہ کے عہد میں ۶۱۳ھ ۱۲۱۶ء اوچہ میں بیٹھ کر چاچ نامہ کا ترجمہ کیا۔[1]

قاضی اطہر صاحب لکھتے ہیں:

"السرور (سندھ) کے خطیب وقاضی اسماعیل بن علی ثقفی سندھی (مولود ۱۱۱ھ) کے آباء واجداد میں سے کسی عالم نے ایک کتاب "تاریخ السند والغزوات المسلمین علیہا وفتوحاتہم" عربی زبان میں لکھی تھی، شاید کشف الظنون میں تاریخ السند سے مراد یہی کتاب ہو، غالباً یہ کتاب تیسری صدی ہجری میں لکھی گئی تھی، مگر اس کا بھی صرف نام ہی نام باقی ہے، اس کا دوسرا نام منہاج الدین بھی تھا"[2]

ہندوستان کے ادیان و مذاہب پر سب سے پہلی کتاب "ملل الہند و ادیانہا" آٹھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں لکھی گئی، اس کے بعد پھر ہندوستانی علوم وفنون سے دلچسپی رکھنے والوں میں خاندان برامکہ سرفہرست ہے جس کے ایک ممتاز فرد یحییٰ بن خالد برمکی (م ۸۰۵ء) نے ہندوستان سے طبی جڑی بوٹیاں لانے اور ہندوؤں کے مذاہب قلم بند کرنے کے لیے ایک وفد بھی بھیجا تھا۔ مذکورہ بالا کتاب اسی وفد کے لیڈر نے مرتب کی تھی۔[3]

خراسان کے سامانی گورنر نصر بن احمد کے وزیر جیہانی نے المسالک والممالک میں

---

[1] تذکرہ مؤرخین، نبی احمد سندیلوی ص ۱۰۲ (بنارس ۱۹۳۶ء)، [2] اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ص ۱۸۱ (دہلی ۱۹۶۹ء)، ۹۳۹ء میں ڈاکٹر بوتا کی تحقیق کے ساتھ دہلی سے شائع ہوگئی ہے۔ [3] عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان، از پروفیسر خورشید احمد فارق ص ۱۵ (دہلی ۱۹۷۳ء)۔

ہندوستان کے متعلق بہت کچھ لکھا۔ عبداللہ بن محمد ایرانشہری (م ۲۹۲ھ - ۹۰۵ء) نے بھی ہندوستانی مذاہب پر تنقید لکھی تھی۔ جواب نایاب ہے۔ اسی طرح "عیون المسائل و الجوابات" ابوقاسم بلخی (م ۳۲۷ھ - ۹۰۹ء) اور شرائع الادیان" ابوزید بلخی (م ۹۳۴ء)" المقامات فی اصول الدیانات "المسعودی (م ۹۵۷ء)" مقالات اھل الملل والنحل" قاضی صاعداندلسی (م ۱۰۷۰ء) میں جواب نایاب ہیں، ہندوستانی مذہب و فلسفہ کے متعلق متفرق مواد ملتا ہے[1]

ہم یہاں مختصراً ہندوستان پر لکھنے والے چند عرب مصنفین کی کتابوں کا تعارف کراتے ہیں جن کی عرب و ہند تعلقات کے سلسلہ میں بڑی اہمیت ہے۔

جاحظ

(م ۲۵۵ھ) ۸۶۸ء) عربی کا صاحب طرز ادیب اور وسیع الاطلاع عالم تھا، بصرہ کا ہونے کی وجہ سے ہندوستانی اور مشرقی تاجروں کے ذریعہ اسے ان ممالک کی اچھی طرح واقفیت حاصل تھی جس کا نمونہ اس کا رسالہ "فخر السودان علی البیضان" (گوروں پر کالوں کی فضیلت) ہے۔ جس میں اس نے ہندوؤں کی خصوصیات بیان کی ہیں، ہندو بت پرستی سے متعلق اس نے ایک کتاب "الاسنام" بھی لکھی تھی[2] اس نے فخر السودان جیسے مختصر رسالے کے دو تین صفحات میں ہندوستان کے علوم وفنون، اور تہذیب و معاشرت وغیرہ پر جس اعتماد و بصیرت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے وہ اسی کا حصہ ہے[3]

ابن خردازبہ

(م ۳۰۰ھ تقریباً) نے جو عباسی دور میں ایران میں سرکاری خبر رسانی کا نگراں اور معتمد عباسی (م ۲۷۹ھ) کا مشیر تھا، عربی میں عالمی جغرافیہ کی قدیم ترین کتاب نویں صدی

---

[1] عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان از پروفیسر خورشید احمد فارق ص ۱۶ (دہلی ۱۹۷۳ء) [2] کتاب الحیوان ص ۔۔ [3] رسائل الجاحظ ص ۸۲، ۸۵ مصر ۱۳۲۴ھ۔

عیسوی کی ابتدا میں "الممالک والمسالک" کے نام سے لکھی، جو بعد کے جغرافیہ نویسوں یعقوبی، اصطخری، مسعودی اور ادریسی کا مرجع بنی۔ اس نے ہندوستان کے ساحلی شہروں کے ساتھ ہندوستان کی مختلف ذاتوں اور ان کے عقائد کا بھی بیان کیا ہے، سندھ وہند کے بحری و بری راستوں کے جغرافیے سے بھی خصوصی بحث کرتا ہے۔

سلیمان تاجر اور ابوزید سیرافی

سلیمان سیراف کا رہنے والا ایک تاجر و سیاح تھا، جو خلیج عرب سے لے کر چینی بندرگاہ کینٹن کا تجارتی سفر کرتا تھا، اس نے ۲۳۷ھ/۸۵۱ء میں اپنا سفرنامہ لکھا جس میں ساحلی شہروں ان کی حکومتوں اور جزیروں کے متعلق عام تمدنی معلومات فراہم کی ہیں خاص طور پر ہندوستان اور چین کی تہذیب و تمدن پر لکھا اور ان کا باہمی موازنہ کیا ہے۔ ۳۲ سال بعد ۲۶۲ھ میں ابوزید سیرافی نے سلیمان کی کتاب "سلسلۃ التاریخ" کا تکملہ لکھا، اور اس کتاب پر بہت قیمتی اضافہ کیا، اسے فرنچ مستشرق RAiR AUD نے فرنچ ترجمہ اور حواشی کے ساتھ ۱۸۴۵ء میں سلسلۃ التواریخ کے نام سے شائع کیا تھا۔

تاریخ یعقوبی

احمد بن ابی یعقوب (م ۲۸۷ھ) مشہور مؤرخ ہے اس نے اپنی کتاب کی فصل ملوک الہند میں ہندوستانی راجاؤں کا تعارف کرایا ہے، مگر ان کے حدود مملکت بتانے میں اس سے غلطی ہوئی ہے، ہندوستانی علوم وفنون پر اس نے اچھی بحث کی ہے[1]

اس کے بعد کے بڑے مؤرخین میں طبری، ابوالفداء، اور ابن اثیر وغیرہ نے ہندوستان کے سلسلے میں اسی پر اعتماد کیا ہے۔

---

[1] تاریخ الیعقوبی ص ۹۴/۱ (دارصادر بیروت)۔

الاعلاق النفیسہ لابن رستہ

اس کی یہ کتاب ۲۹۰ھ/۹۰۲ء کے قریب لکھی گئی، لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ سات ضخیم جلدوں میں تھی، جس کا آخری حصہ موجود رہ گیا ہے اس نے ہندوستان سے لے کر چین تک کے سمندروں کی کیفیت اور ان کے موسمی تغیرات پر تفصیل سے لکھا ہے، اور مذاہب ہند کی تفصیل دی ہے۔[۵]

مسالک الممالک، اصطخری

ابو اسحاق ابراہیم بن محمد اصطخری نے ہندوستان کا سفر ۳۴۰ھ میں کیا تھا، اس کی یہ جغرافی کتاب دسویں صدی عیسوی کے وسط میں لکھی گئی، اس نے عالم اسلام کو بیس اقلیموں میں تقسیم کر کے ان کا تعارف کرایا ہے، سندھ اور ہند کے بعض مشہور شہروں کے فاصلوں کے علاوہ تمدنی امور سے بھی بحث کی ہے اور راجستھان، گجرات اور مہاراشٹر میں مسلمانوں کی بستیوں کی موجودگی کی اطلاع دی ہے، اس نے ایشیا کے بہت سے ممالک کی سیاحت کے بعد ان کا مستند جغرافی نقشہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے جن میں ہندوستان بھی شامل ہے۔

اصطخری نے ابن حوقل بغدادی سے ہندوستان میں ملنے کا ذکر کیا ہے ابن حوقل بہت بڑا سیاح تھا جس نے ۳۳۱ھ سے ۳۵۸ھ تک یورپ، افریقہ اور ایشیا کی سیر کی تھی، اور ان براعظموں کا نقشہ پیش کرنے کی سعی کی تھی، اس نے ہندوستان کی نقشہ نویسی پر خصوصی توجہ کی تھی، اصطخری نے بھی جغرافی نقشے تیار کئے تھے۔

مروج الذہب للمسعودی

مسعودی (م ۳۴۶ھ) نے کتاب کا مکمل نسخہ ۳۴۵ھ/۹۵۶ء میں تیار کیا تھا، یہ ایک

۵؎ الاعلاق، لیڈن ۱۸۹۱ء۔

طرح کی دائرۃ المعارف ہے، مگر تاریخ وجغرافیہ اور فلکیات سے زیادہ اعتنا کیا ہے مسلمان اور یونانی جغرافیہ نگاروں کی معلومات کا خلاصہ پیش کر دیا ہے، اس کے مقدمے میں اقوامِ عالم کی اجمالی تاریخ آگئی ہے، اس نے سندھ، گجرات اور مہاراشٹر وغیرہ کی سیاحت کی تھی، اس لیے ہندوستانی تاریخ وجغرافیہ سے متعلق اس کے بیانات مستند حیثیت رکھتے ہیں، ایک مستند مؤرخ ہونے کی وجہ سے اس کی تاریخی تحقیقات کا پایہ بہت بلند ہے۔ ان تمام عربی تحریروں میں جو ہندوستان کی تاریخ و تمدن کے بارے میں لکھی گئی ہیں۔ اس کی تحریر بہت اہمیت اور فوقیت رکھتی ہے۔ اس نے اس کتاب کی پہلی جلد میں تفصیل اور بقیہ تین جلدوں میں اجمال کے ساتھ ہندوستان کے تعارف کی کوشش کی ہے [1]

اس نے اپنی دوسری تاریخ کتاب " التنبیہ والاشراف " بھی پہلی کتاب کی نظر ثانی کے وقت مرتب کی۔ اس میں ہندوستان کے مشہور دریا گنگا اور جمنا کے بارے میں بہت تحقیق سے لکھا ہے مگر ہندوستان کا ذکر سرسری ہے [2]

اس نے " اخبار الزمان " نامی اپنی ضخیم کتاب میں جس کا ایک حصہ مصر سے شائع ہوا تھا، بحر ہند کے جزیروں کا تعارف کرایا ہے، کتاب کا بیشتر حصہ نایاب ہے۔

احسن التقاسیم للمقدسی

محمد بن احمد بشاری مقدسی نے ۳۷۵ھ میں یہ کتاب مکمل کی جو عربی میں جغرافیہ کی اہم کتاب ہے، وہ ایک محتاط جغرافیہ نویس اور سیاح تھا، اس نے عالم اسلام کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کرنے کے ساتھ سندھ اور پنجاب سے متعلق بھی مفید معلومات فراہم کی ہیں اور اس کے لیے مستقل باب قائم کیا ہے اور تمام ضروری تفصیلات پیش کی ہیں۔ فتوحات سندھ وہند کی سابقہ کتابیں اس کے پیش نظر رہی ہیں، اس لیے اس نے اپنی کتاب میں ان سب کا ضروری عطر و خلاصہ تیار کرلیا ہے۔ منصورہ دیبل اور ملتان

---

[1] مروج الذہب ۱/۳۲-۳۴ (قاہرہ ۱۳۴۶ھ) [2] التنبیہ والاشراف (بیروت ۱۹۸۱)

کے بارے میں اس نے چشم دید معلومات ومشاہدات نقل کی ہیں، اس طرح اس کی کتاب اپنے موضوع پر سب سے مستند ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے[1]

فہرست ابن ندیم

محمد بن اسحاق الندیم (م ۳۸۵ھ) نے اپنی فہرست ۳۷۷ھ میں لکھنے کے بعد اپنی وفات تک اس میں اضافے کیے۔ اس میں اس نے ان تین درجن سے زائد ہندوستانی کتابوں کے عربی تراجم کا ذکر کیا ہے جو مختلف علوم وفنون سے متعلق تھیں اور برامکہ کے ذریعہ ترجمہ کی گئیں تھیں۔ اس طرح وہ کتابیں بھی گویا ہندوستانی اہل علم کے اشتراک وتعاون سے وجود میں آئیں۔

فہرست کے مرتب کے لکھنے کے مطابق ابن ندیم نے اپنی فہرست ۳۷۷ھ میں مرتب کی اور اس کے ایک سال کے بعد ۳۷۸ھ میں وفات پائی[2]

آثار البلاد واخبار العباد' قزوینی

زکریا بن محمد قزوینی کی کتاب "آثار البلاد" میں ہندوستان کے مختلف شہروں سے متعلق معلومات ملتی ہیں، مگر وہ بالواسطہ ہیں، اس نے بھی سندھ وملتان، گجرات اور بحر ہند کے متعلق معلومات خاص طور پر فراہم کی ہیں[3]

عجائب الہند' بزرگ بن شہریار :

بزرگ بن شہریار نے اپنا سفرنامہ ۳۰۰ھ میں لکھا، اس نے ہندوستان سے چین تک کے بحری راستے میں پڑنے والے ممالک کے عجائب وغرائب پر روشنی ڈالی ہے، اس میں اس نے صرف بحری عجائب ہی نہیں، تہذیبی عجائب سے بھی بحث کی ہے جو اس کے لیے

---

[1] احسن التقاسیم ۱۔ ۹، ۳ (لیڈن ۱۸۷۷ء)، [2] الفہرست (بیروت ۱۹۷۸ء)، [3] طبع بیروت (۱۹۷۰ء)۔

نامانوس تھے، جنوبی ہندوگجرات کے مذہب اور معاشرت سے خصوصی بحث کی ہے۔

نزہتہ المشتاق، ادریسی :

شریف ادریسی (ابوعبداللہ محمد) نے ۵۴۸ھ/۱۱۵۴ء میں اپنی کتاب مرتب کی، اس کی بیشتر معلومات سابق جغرافیہ نویسوں کی کتابوں سے ماخوذ ہیں اور ان میں غلطیاں بھی ہیں۔[1]

طبقات الامم، قاضی صاعد اندلسی :

قاضی صاعد بن احمد اندلسی (م ۴۶۲ھ/۱۰۷۰ء) کی یہ کتاب دراصل مختصر انسائیکلوپیڈیا ہے جو دنیا کی آٹھ مہذب اور علم دوست اقوام یعنی ہندوستانی، ایرانی، کلدانی، عبرانی یونانی، رومی، مصری اور اہل عرب کے فلسفہ و سائنس سے بحث کرتی ہے، مصنف چونکہ ایک ہمہ داں اور ہمہ گیر ذہن کا مالک تھا اس لیے اس نے اقوام عالم کی علمی خدمات پر ماہرانہ نگاہ ڈالی اور ان کی قدر و قیمت کا تعین کیا ہے۔

اس نے قدیم ہندوستان کی علمی و فکری سرگرمیوں کو قدر و تحسین کی نظر سے دیکھا ہے اور ہندوستان کے نجوم و فلکیات سے خاص بحث کی ہے۔[2]

فتوح البلدان، بلاذری :

احمد بن یحییٰ البلاذری وہ فاضل جغرافیہ نویس ہے جس نے پوری تحقیق کے ساتھ دنیا میں اسلام کی اولین فتوحات پر لکھا ہے۔ اس نے ہندوستان میں اسلامی فتوحات پر بھی تفصیل سے لکھا ہے۔[3]

---

[1] ہندوستان سے متعلق حصہ ڈاکٹر مقبول احمد نے وصف الہند وما یجاورہا کے نام سے علی گڑھ سے شائع کر دیا ہے۔ [2] طبقات الامم (اردو اعظم گڑھ ۱۹۲۸ء)۔

[3] فتوح البلدان (قاہرہ ۱۹۰۱ء) ص ۴۳۰ تا ۴۴۱۔

الملل والنحل : شہرستانی :

عبدالکریم شہرستانی (م ۵۴۹ ھ) کی یہ کتاب دنیا کے اقوام و ملل کے مذاہب و افکار اور علوم و فنون کی دائرۃ المعارف اور قاموس ہے مگر ہندو مآخذ سے براہ راست واقفیت نہ ہونے کے سبب ہندو مذہب کی تفصیلات کو سمجھنے میں اس سے متعدد غلطیاں ہوگئی ہیں۔

مسالک الابصار : عمری :

قاضی ابن فضل اللہ عمری دمشقی (م ۹۹ ء ھ / ۱۳۴۸ء) کی یہ کتاب بھی دائرۃ المعارف کے طرز پر ہے اور عالمی تاریخ و جغرافیہ سے بحث کرتی ہے، مصنف محمد بن تغلق (م ۷۵۲ھ) کا معاصر تھا، اس لیے اس نے اس بادشاہ سے ذاتی واقفیت رکھنے والوں سے مل کر اور دوسرے مستند ذرائع سے ہندوستان کے تاریخی، جغرافی، اقتصادی اور معاشرتی پہلوؤں سے تحقیقی بحث کی ہے جس سے محمد بن تغلق کے ہندوستان کا صحیح ریکارڈ سامنے آجاتا ہے، اور جو اپنے مواد کی صحت اور تحقیق کے سبب فارسی تاریخوں پر بھی فوقیت رکھتا ہے، اس نے ہندوستان کا جن اچھے الفاظ میں ذکر کیا ہے، ان سے اس کے تعلقِ خاطر اور ذاتی دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔[1]

ان کتابوں کے علاوہ دوسری بہت سی کتابوں میں ہندوستان کا ذکر موجود ہے مثلاً ادب وانشا کی کتابوں میں نویری (م ۷۳۲ھ) "نہایت الارب فی فنون الادب" میں بحر ہند کے بہت سے جزائر و مقامات اور دریاؤں کا ذکر موجود ہے۔

اسی طرح ابوالعباس احمد قلقشندی (م ۱۴۱۸ء) کی "صبح الاعشیٰ فی صناعۃ الانشاء" میں جو انشاپردازوں اور سرکاری دفاتر سے تعلق رکھنے والوں کی عام معلومات میں اضافہ

---

[1] اس کتاب کا ہندوستان سے متعلق حصہ دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر خورشید احمد فارق نے "حنوء جدید علیٰ تاریخ الهند" کے نام سے عربی میں اور تاریخ ہند پر نئی روشنی کے نام سے اردو میں ۱۹۶۱ء میں ندوۃ المصنفین نے دہلی سے شائع کیا تھا۔

کے لئے لکھی گئی تھی، ادبی دائرۃ المعارف کی حیثیت رکھتی ہے، ہندوستان اور اس کی مخصوص پیداواروں اور شہروں کا ذکر موجود ہے، اس نے دہلی کا بھی تفصیلی اور محمد بن تغلق تک مسلم دورِ حکومت کا اجمالی ذکر کیا ہے۔[1]

ابتدائی فتوحات ہند پر محمد بن عمر واقدی (م ۲۰۷ھ) کی "اخبار فتوح بلاد السند" اور ابوالحسن علی بن مدائنی (م ۲۲۵ھ) کی تین کتابوں "ثغر الہند" کتاب عمال الہند اور کتاب کرمان وسجستان ہی سے متعلق تھیں جن کے اب صرف اقتباسات ہی ملتے ہیں[2] طبری نے اپنی تاریخ میں ان سے فائدہ اٹھایا ہے۔

اسی طرح تاریخ وتذکرہ اور سیر وسوانح کی ہر مستند عربی کتاب میں ہندوستانی علماء وفضلاء کے حالات بھی ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ عرب اور مسلمان مصنفین نے ہندوستان کی علمی وثقافتی تاریخ سے برابر اعتناء کیا ہے، اور ایک تاریخی تسلسل کے ساتھ ہندوستان سے اپنی ہمہ جہت دلچسپی اور تعلق خاطر کا ثبوت دیا ہے۔

ابن القفطی کی تاریخ الحکماء، ابن ابی اصیبعہ کی طبقات الاطباء قاضی رشید بن زبیر کی کتاب الذخائر والتحف، علی بن طبری کی فردوس الحکمۃ، ابوبکر زکریا رازی کی الحاوی وغیرہ متعدد کتابوں میں ہندوستانی علوم وفنون اور تہذیب وثقافت سے متعلق بیش قیمت مواد موجود ہے، جس سے عربوں اور مسلمانوں کی ہندوستان سے متعلق دلچسپی اور گہری واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

---

[1] صبح الاعشیٰ ۵/۶۱ - ۹۰ (قاہرہ ۱۹۱۳ء)۔

[2] اسلامی ہند کی عظمت رفتہ، قاضی اطہر مبارکپوری ص ۱۲۰ - ۱۲۱ (دہلی ۱۹۶۹ء)۔

تبلیغ کے بارہ میں حضرت حکیم الامت تھانویؒ

حضرت حکیم الامتؒ نے تبلیغ کے بارہ میں اپنے مختلف مواعظ اور رسائل میں جو ارشادات فرمائے ہیں اور ہدایات دی ہیں ان کا بہت ہی مختصر خلاصہ اگر ذہن نشین ہو جائے تو تبلیغ کا فریضہ ادا کرنے والوں کے لیے انشاء اللہ مفید ہوگا۔

حضرت حکیم الامت رح نے دعوت کے مختلف درجات بیان فرمائے ہیں تاکہ جو شخص جس درجہ کا اہل ہو اسی درجہ کی ذمہ داری سے وہ سبکدوش ہونے کا اہتمام کرے۔ ہر شخص پر سب درجوں کا اہتمام ضروری نہیں۔

دعوت کے اقسام :

ایک دعوت عامہ ہے اور ایک دعوت خاصہ۔ پھر خاصہ کی دو قسمیں ہیں، حقیقی و حکمی تو اس طرح کل تین قسمیں ہوئیں۔

دعوت عامہ میں عام خطاب ہوتا ہے۔ یہ کام صرف مقتداء اور علماء کا ہے۔ جیسا کہ ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر سے معلوم ہو رہا ہے کہ یہ کام ایک خاص جماعت کا ہے ساری امت کا نہیں، دعوت عام اور وعظ کا اثر اسی وقت ہوتا ہے جب کہ مخاطب کے دل میں دعوت دینے والے کی وقعت ہو۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے کہ قل ھذہ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرة انا ومن اتبعنی یہاں من اتبعنی میں اطلاق ہے جتنے میرے متبع ہیں سب اللہ کی طرف بلاتے ہیں۔ اس عموم

وخصوص سے معلوم ہوا کہ دعوت کے مختلف درجات ہیں، ایک درجہ کا پہلی آیت میں ذکر ہے اور ایک کا دوسری میں۔

دعوت خاصہ حقیقی وحکمی :

حقیقی سے مراد وہ ہے جو حقیقی میں معین ہو۔

دعوت خاصہ ہر شخص کے ذمہ ہے، اور وہ وہ ہے جس میں اپنے اہل وعیال کو، دوست احباب کو، خود اپنے نفس اور جن جن پر طاقت ہو خطاب خاص کے ساتھ دعوت ہو، جیسا کہ حدیث میں ہے کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ "تم میں سے ہر ایک راعی (نگراں) ہے اور ہر ایک سے بازپرس ہوگی" قرآن کریم میں بھی فرمایا گیا ہے : یاایھا الذین امنوا قوا انفسکم واھلیکم نارا "اے ایمان والو! اپنے کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ" اس لیے یہ دعوت خاصہ تو ہر شخص پر ہے. اور ہر شخص کو بقدر استطاعت اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔

دعوت حکمی :

رہی تیسری قسم دعوت حکمی، وہ یہ ہے کہ عام دعوت وتبلیغ کرنے والوں کی اعانت کی جائے تاکہ وہ اپنی ضرورت وحاجت سے مستغنی اور بے فکر ہو کر اس خدمت کو انجام دے سکیں۔

تبلیغ کی مختلف قسمیں اور مدرسین اور طلبہ کے لیے ہدایت :

حضرت حکیم الامۃ تھانوی رح تبلیغ کی مختلف قسمیں بیان کرتے ہوئے مدرسین اور طلبہ کو ہدایت فرماتے ہیں :

"پس مدرسین وطلبہ تبلیغ کا ثواب سن کر پڑھنا پڑھانا نہ چھوڑ دیں بلکہ وہ اس میں نیت تبلیغ کرلیں۔ اور اگر تبلیغ کی قسمیں کر دی جائیں کہ ایک تبلیغ اصول

وعقائد کی ہے کفار کو، دوسری قسم تبلیغ فروع ہے مسلمانوں کو تیسری قسم ایک جماعت کو تبلیغ کے قابل بنانا پھر تو درس وتدریس کا تبلیغ میں داخل ہونا بالکل ظاہر ہے" (آداب التبلیغ)

دینی مدارس کے مدرین اور طلبہ کے لیے حضرت حکیم الامت تھانوی رہ کی یہ ہدایت ہر وقت پیش نظر رکھنے کے قابل ہے کہ درس وتدریس کا کام بھی حکمی تبلیغ میں داخل اور تبلیغ کے قابل مبلغین کو تیار کرنا ہے' اس حقیقت سے بے خبر ہونے کی وجہ سے ہی بعض لوگ درس وتدریس کے کام کو تبلیغ کے خلاف اور غیر ضروری کہنے اور سمجھنے لگ جاتے ہیں۔

ایک ضروری مجدِدانہ اصلاح :

حضرت حکیم الامت رہ نے اس غلو اور غلطی کی بھی مجددانہ اصلاح فرمائی ہے جو یکطرفہ ذہن سے کام لیتے ہوئے صرف اور صرف دین کے ایک ہی شعبہ میں کام کرنے پر زور دیتے ہیں، اور دین کے دوسرے تمام شعبوں میں صرف ایک ہی شعبہ کو اہمیت دینے کی عام لوگوں میں عادت پیدا ہو جاتی ہے جس میں وہ مشغول ہوتے ہیں۔ حالانکہ حسب استطاعت اور حسبِ موقع دین کے تمام ہی شعبوں میں کام کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ ہر شخص بیک وقت تمام خدمات انجام نہیں دے سکتا اور نہ ہی یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ تمام شعبوں میں خدمات انجام دیا کرے۔ ضروری بات صرف اتنی ہے کہ دین کے تمام شعبوں میں حسب استطاعت کام ہوتا رہے۔ چنانچہ کسی خاص شعبہ میں کسی ایک جماعت کے بقدر ضرورت خدمات انجام دینے سے یہ فرض کفایہ ادا ہو جاتا ہے اور ہر شخص یا ہر جماعت کو ایک ہی کام کی طرف کھینچنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

تقسیم کار کے اصول :

چنانچہ خود قرآن مجید سے تقسیم کار اور تقسیم خدمات کا ثبوت ملتا ہے۔ ارشاد

باری ہے : وماکان المؤمنون لینفروا کافة ، فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیتفقهوا فی الدین ولینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم لعلهم یحذرون۔
اس آیت کریمہ میں حق تعالیٰ نے سب کو یک لخت جہاد میں جانے پر عتاب فرمایا اور یہ ہدایت کی ہے کہ ایک جماعت جہاد میں جائے تو دوسری علم حاصل کرے اگرچہ آیت مذکورہ میں اس سے بحث نہیں کی گئی کہ ان میں راجح اور مرجوح کیا ہے مگر اتنی بات واضح ہے کہ ہر جماعت کو کسی ایک ہی کام پر نہیں لگ جانا چاہئے بلکہ تقسیم کار کے اصول پر عمل کرتے ہوئے مختلف شعبوں میں مختلف خدمات انجام دینی چاہئیں۔

اگر ہم اس حکیمانہ اور مجددانہ ہدایت پر عمل پیرا ہوں اور دین کے تمام شعبوں میں مل جل کر خدمات انجام دیں اور دین کے ہر شعبہ میں خدمت انجام دینے کو دین کی ہی خدمت تصور کریں تو پھر ان تمام شعبوں میں کام کرنے والوں میں کیسی ہم آہنگی اور موافقت و مرافقت پیدا ہو سکتی ہے۔ حق تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کی توفیق عنایت فرمائے (آمین)

افادۂ خاصہ، مدارس دینیہ کی ضرورت :

آیت کریمہ سے یہ بات بھی واضح ہو رہی ہے کہ جہادی مہم میں شرکت بلاشبہ مسلمانوں کے ذمہ فرض ہے اور اپنے شرائط کے ساتھ اس کا انجام دینا مسلمانوں پر بقدر استطاعت فرض علی الکفایہ ہے، لیکن ایسے حالات میں بھی اس فرض کفایہ کی ادائیگی کے ساتھ دوسری جانب تفقہ فی الدین، دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرنے کا کام بھی مسلسل جاری رہنا چاہئے اور اس کے تسلسل میں فرق نہیں آنا چاہئے۔

اہل علم سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ علوم دینیہ کے تمام شعبوں میں کمال اور مہارت کا حاصل کرنا پوری امت پر فرض کفایہ ہے اور تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ مدارسِ دینیہ کا موجودہ طرزِ خاص ہی اس کی تحصیل میں از بس مفید بلکہ اس طرز پر ہی اس کا حصول موقوف ہے۔ لہٰذا فرض کفایہ کے موقوف علیہ ہونے کی وجہ سے اس

نظم خاص کا باقی رکھنا اور اس کا تحفظ کرنا بھی فرض کفایہ میں داخل ہے ۔

حضرت حکیم الامت رہ فرماتے ہیں :

"اگر یہ پڑھنا پڑھانا نہ ہوتا تو تصنیف و تبلیغ وغیرہ ہی سب بے کار رہتے، کیوں کہ ناقص کی تبلیغ وغیرہ قابل اعتبار نہیں بلکہ اس طرح تو چند روز میں علم بالکل ہی معدوم ہو جائے گا"

دعا ہے کہ اللہ تعالے ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلنے اور اپنے دین کے تمام شعبوں میں خدمات انجام دینے کی توفیق نصیب فرمائیں ۔ (آمین)

بقیہ : ابتدائے اسلام میں

بہر حال ابتداء اسلام میں نکاح مؤقت کی اباحت کو بھی منسوخ کر دیا گیا ۔ اور قیامت تک کے لیے اس حرمت کا اعلان کر دیا گیا ۔ اس لیے اب اس صورت کی اجازت دینا بھی شرعی حکم کی صریح مخالفت کر کے فسق و فجور اور بے شرمی و بے حیائی کی راہ کھولنا ہے اور اسلام اس کا سخت مخالف ہے ۔

خلاصہ کلام یہ کہ سیدنا حضرت عبداللہ بن عباس رہ کے اس اباحت کے قول کو مذکورہ بالا تشریحات کے پیش نظر رکھا جائے ۔ پھر فیصلہ کریں کہ کیا سیدنا حضرت ابن عباس رہ اب بھی اس کا مباح ہونا تسلیم کرتے ہیں ۔ نہیں، ہرگز نہیں ۔ بلکہ قرآنی آیات کے پیش نظر...... سیدنا علی المرتضیٰ، سیدنا محمد بن حنفیہ اور دیگر صحابہ کرام رضہ سے بحث و مباحثہ کے بعد اپنے اس نکاح مؤقت کی اباحت والے قول سے بھی رجوع فرمایا تھا اور تائب ہونے کا اعلان کیا تھا ۔

اس صراحت کے بعد سیدنا حضرت ابن عباس رہ کو قائلین جواز میں گردانا صریح ظلم اور بہتان عظیم ہوگا ۔

○

مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی
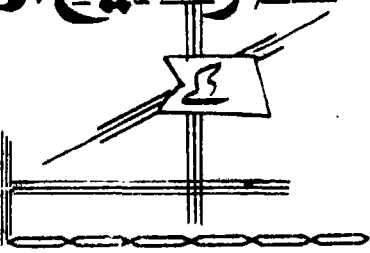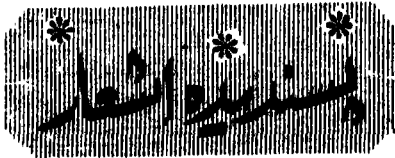
حضرت مدنی رحؒ اور دیگر علماء کرام وصوفیائے عظام منظوم کلام بھی کبھی کبھی پڑھا کرتے تھے اور تحریر بھی فرمایا کرتے تھے جو کہ ایک لحاظ سے سیرتِ نبی رحیم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہے، اس عنوان میں چند اشعار عربی، فارسی اور اردو کے درج کیے جاتے ہیں:

① حضرت مدنی نوّراللہ مرقدہٗ مندرجہ ذیل عربی رباعی زیادہ پڑھا کرتے تھے ؎

إنَّ الَّذِيْ أَنْتَ تَرْجُوْهُ وَتَأْمُلُهُ　　مِنَ الْبَرِيَّةِ مِسْكِيْنُ ابْنِ مِسْكِيْنِ

فَاسْتَرْزِقِ اللّٰهَ عَمَّا فِيْ خَزَائِنِهِ　　فَإِنَّ الْأَمْرَ بَيْنَ الْكَافِ وَالنُّوْنِ

ترجمہ: بے شک وہ آدمی جس سے تجھے امیدیں وابستہ ہیں وہ تو خود محتاج ہے۔ اور اس کا باپ بھی محتاج تھا، اس لیے اس اللہ تعالیٰ سے رزق مانگ جو اس کے خزانہ میں ہے کیوں کہ وہاں تو حکم کاف اور نون میں ہے، یعنی کُنْ فرمایا تو کام ہوگیا۔

② کبھی کبھی مندرجہ ذیل شعر بھی بڑے سوز وگداز کے ساتھ پڑھا کرتے تھے ؎

ذَهَبَ الَّذِيْنَ يُعَاشُ فِيْ أَكْنَافِهِمْ　　بَقِيَ الَّذِيْنَ حَيَاتُهُمْ لَا تَنْفَعُ

ترجمہ: وہ لوگ تو چلے گئے جن کے سایہ میں زندگی گذاری جاتی تھی اور وہ لوگ رہ گئے جن کی زندگی کچھ کارآمد نہیں۔

③ محی الدین ابن عربی رح کا مندرجہ ذیل شعر بھی تحریر فرمایا جو آپ نے ایشیائے کوچک کے سلطان عزالدین کے جواب میں تحریر فرمایا تھا ؎

أُرِيدُ أَرىٰ دِينَ النَّبِيِّ مُحَمَّدٍ   يُقَامُ وَدِينُ المُبْطِلِينَ يَزُولُ

ترجمہ: میری دلی خواہش ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین پھیل جائے اور باقی سب ختم ہو جائیں۔

④ فَلَيْتَكَ تَحْلُوْا وَالحَيٰوةُ مَرِيْرَةٌ   وَلَيْتَكَ تَرْضىٰ وَالأَنَامُ غِضَابُ

ترجمہ: کاش کہ آپ کی محبت کی مٹھاس مجھے حاصل ہو جاتی پھر چاہے زندگی کتنی تلخ ہوتی اور کاش کہ آپ مجھ سے راضی ہو جاتے خواہ ساری دنیا ناراض ہو جاتی۔

⑤ يظن النَّاسُ بِى خَيْرًا وَإِنِّى   لِشَرِّ النَّاسِ إِنْ لَمْ يَعْفُ عَنِّى

ترجمہ: لوگ مجھ پر نیکی کا گمان کرتے ہیں حالانکہ میں سب سے زیادہ گنہگار ہوں، اگر وہ اللہ تعالیٰ مجھ سے درگذر نہ فرمائے۔

⑥ إِذَا صَحَّ الوُدُّ مِنْهُ فَالكُلُّ هَيِّنٌ   وَكُلُّ مَا فَوْقَ التُّرَابِ تُرَابُ

ترجمہ: جب اس (اللہ تعالیٰ) کی طرف سے محبت صحیح ہو تو سب تکالیف پھر آسان ہیں، اور جو کچھ بھی مٹی پر ہے وہ سب کا سب مٹی ہونے والا ہے (سب کائنات فانی ہے صرف اللہ تعالیٰ باقی ہے اس لیے اسی کے ساتھ تعلق قائم رکھنا ضروری ہے۔

⑦ مولانا عبدالباری لکھنوی مرحوم کو اپنے مکاتیب گرامی میں چند اشعار درج فرمائے ہیں جن میں بعض عربی میں اور بعض فارسی میں ہیں ؎

وَالنَّفْسُ كَالطِّفْلِ ان تهمله شَبَّ عَلىٰ   حُبِّ الرِّضَاعِ وان تفطمه ينفطم

ترجمہ: اور نفس کی حالت تو اس شیر خوار بچے کی طرح ہے جو دودھ پیتا ہے۔ اگر اس کے دودھ کو بچپن (مدت پوری ہونے پر) ہی نہ چھڑا دیا گیا تو جوان ہونے پر دشواری ہوگی۔

⑧ ساشکر عمروًا ان تراخت منیتی ایادی لم تمنن وان ھی جلّت

فتی غیر محجوب الغنی عن صدیقه ولا مظهر الشکوی إذ النعل زلّت

رای خُلّتی من حیثُ یخفی مکانُھا فکانت قذی عینیه حتّی تجلّت

ترجمہ شعر۱ : جب تک میں زندہ ہوں عمرو کے احسانات کا شکریہ ادا کرتا رہوں گا اگرچہ اس کے احسانات بہت زیادہ ہیں۔

ترجمہ شعر۲ : یہ ایسا جوان تھا جو اپنے دوست پر اپنا مال نثار کرتا تھا اور اگر کبھی دوست سے کچھ لغزش ہو جاتی تو پھر بھی زبان سے شکوہ وشکایت کا اظہار نہ کرتا تھا۔

ترجمہ شعر۳ : اس نے میری دلی محبت کی وجہ سے میری ان تکالیف کو بھی بھانپ لیا تھا جو سب سے پوشیدہ تھیں، ان تکالیف کو جب تک اس نے دور نہ کر لیا ہوتا اس کی آنکھوں میں کھٹکتی رہتی تھیں۔

⑨ وَمَا المَالُ وَالبَنُونَ الا وَدَائِعُ وَلَابُدَّ یَومًا اَنْ تُرَدَّ الوَدَائِعُ

ترجمہ : اور مال اور اولاد تو (اللہ تعالیٰ کی) امانت ہیں، اور ایک نہ ایک دن امانتوں کو اصلی مالک کی طرف لوٹانا پڑتا ہے

⑩ اَمُرُّ عَلَی الدِّیَارِ دِیَارِ لَیلٰی اُقَبِّلُ ذَا الجِدَارِ وَ ذَا الجِدَارا

وَمَا حُبُّ الدِّیَارِ شَغَفنَ قَلبِیْ وَلٰکِنْ حُبُّ مَنْ سَکَنَ الدِّیَارا

ترجمہ : میرا گذر لیلے کے شہر پر ہوا تو میں نے گھر والوں اور اس گھر کی دیواروں کو بھی چوما۔ اگرچہ مجھے اس بستی سے کوئی محبت نہیں لیکن اس بستی کے مکین کی محبت نے میری نظر میں ان مکانوں اور دیواروں کو بھی محبوب بنا دیا ہے۔

فارسی زبان کے اشعار

① وصال وقرب چہ خواہی رضائے دوست طلب ٭ کہ حیف باشد از و غیر از یں تمنا ئے

یعنی : تو وصال وقرب کیا چاہتا ہے تجھے صرف اپنے محبوب کی رضامندی کی طلب

ہو، اس لیے اللہ تعالیٰ سے اس کے بغیر کچھ اور مانگنا یہ ناانصافی ہوگی۔

② جہاں اے برادر نماند بہ کس ‏ ‏ ‏ دل اندر جہاں آفریں بند و بس

یعنی، اے بھائی! یہ جہاں کسی کے کام نہیں آتا اس لیے اپنا دل صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ لگا لے اور بس۔

③ بجز تو شاہ دیگر نہ دارم بجز درے تو درے نہ دارم
اِلَیکَ اَسعیٰ وَمِنکَ ارجو وان سالت بہ کم سوالی

ترجمہ، اے بادشاہِ حقیقی میرا تیرے بغیر کوئی نہیں اور تیرے دروازے کے بغیر میرے لیے کوئی دروازہ نہیں، میں بوقت ضرورت تیری ہی طرف دوڑتا ہوں اور تجھ سے ہی ہر رحمت کی امید رکھتا ہوں خواہ کتنے ہی سوال کروں

④ حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ کے نام اپنے مکتوب میں فرمایا ؎

جز یاد دوست ہر چہ کنی عمر ضائع است ‏ ‏ ‏ جز سر عشق ہر چہ بخوانی بطالت است
سعدی بشوئے لوح دل از نقش غیر حق ‏ ‏ ‏ علمیکہ راہِ حق نہ نماید جہالت است

ترجمہ، اپنے محبوب حقیقی (اللہ تعالیٰ) کی یاد کے بغیر جو بھی کرے گا عمر برباد کرے گا محبوب حقیقی کے عشق کے بغیر جو بھی پڑھے گا وہ باطل ہے۔ سعدی اپنے دل کی تختی کو اللہ تعالیٰ کی یاد کے بغیر ہر چیز سے دھو ڈال جو علم اللہ تعالیٰ کا راستہ نہ دکھائے وہ تو جہالت ہے۔

⑤ اپنے اکابر کا سلوکِ طریقت بیان کرتے ہوئے فرمایا؛ "ہمارے اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ نے نہایت اعلیٰ اور اشرف طریقہ اختیار فرمایا، ان کا ظاہر نقشبندی (عمل کی پیروی) اور باطن چشتی سوز و گداز ہے ؎

بلبل نیم کہ نعرہ زنم درد سر کنم ‏ ‏ ‏ قمری نیم کہ طوق بہ گردن در آورم
پروانہ نیستم کہ بسوزم بگرد شمع ‏ ‏ ‏ شمعم کہ جاں گدازم و دم بر نیاورم

ترجمہ: میں بلبل نہیں کہ نعرے لگاکر سر درد ی کردوں، نہ قمری ہوں کہ گردن میں طوق ڈال دوں (ظاہری لباس وغیرہ کی نمائش کروں) پروانہ بھی نہیں کہ شمع کے

اردگرد چکر لگاتے ہوئے جاؤں بلکہ میں تو شمع ہوں خود گل ہی ہوں (دینِ حق کی روشنی پھیلاتے ہوئے) اور آواز تک نہیں نکالتی۔

⑥ اس نااہل خادم کو ایک گرامی نامہ کے شروع میں فرمایا ؎

شبِ تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل　　کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحلہا

اس نااہل نے عرض کیا تھا کہ کافی دنوں سے گرامی نامہ نہیں آیا، تو فرمایا کہ تجھے کیا پتہ ہے کس حال میں ہوں؟ پھر اسی کے ساتھ اردو زبان کا شعر بھی درج فرمادیا۔

کسی کے درد اور غم کو کسی کا ناز کیا جانے
گذرتی صید پر کیا ہے دلِ صیاد کیا جانے　(مکتوبات جلد ۳ ص۱۱۶)

⑦ از دروں شو آشنا و از بیروں بیگانہ باش　　ایں چنیں زیبا روش کمتر بود اندر جہاں

ترجمہ: اندر (دل) سے لگائے رکھ اور باہر سے بے گانہ رہ (تن بکار) ایسی خوبصورت زندگی اس دنیا میں بہت کم میسر ہوتی ہے۔

⑧ یابم او را نیابم جستجوئے می کنم　　بشنود یا نشنود من گفتگوئے میکنم

ترجمہ: میں اپنے (محبوب حقیقی کو) پاسکوں یا نہ پاسکوں تلاش کرتا رہوں گا وہ توجہ کرے یا نہ کرے میں دل کا حال بیان کرتا رہوں گا۔

⑨ مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد　　دگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

ترجمہ: میرے دل میں ایک ایسا درد ہے اگر اس کو بیان کروں تو زبان کے جلنے کا خطرہ ہے اور اگر اسے برداشت کروں تو ڈرتا ہوں کہ ہڈیوں کا گودہ بھی جل جائے گا۔

از مرتب یہ شعر بھی آپ نے جیل ہی سے مولانا حبیب الرحمان صاحب مرحوم کو لکھا کہ جو کچھ میرے خلاف ہو رہا ہے بہتر یہی ہے کہ صبر کرلیا جائے اور معاملہ اللہ کے سپرد رہے ؎

⑩ عشق چوں خام است بستہ ناموس و ننگ　　پختہ مغزانِ جنوں را کے حیا زنجیر است

ترجمہ: جو کچے عاشق ہیں وہ تو لوگوں کے تمسخر سے ڈرتے ہیں لیکن جو عشق میں پکے

ہیں ان کے لیے لوگوں کے طعنے اور استہزاء ہرگز رد کنے والا نہیں۔

⑪ من آں خاکم کہ ابر نو بہاری کند از لطف برمن قطرہ باری
اگر بروید از ہر مو زبانم! ادائے شکر لطفش کے توانم

ترجمہ: میں وہ مٹی ہوں کہ موسم بہار کا بادل مجھ پر اپنے لطف وکرم سے بارش برساتا ہے، اگر میرے بدن کے ہر بال کو زبان عطا ہو جائے اور وہ اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں کا شکر ادا کریں تب بھی پورا شکر ادا نہ ہو سکے گا۔

⑫ مباش درپئے آزار و ہرچہ خواہی کن کہ در شریعتِ ما جزیں گناہے نیست

ترجمہ: یعنی کسی کو بھی دکھ نہ دے (بلکہ رحمت بن) کہ ہماری شریعت میں اس کے سوا کوئی (بڑا) گناہ نہیں، ہمارا اللہ رحمان اور رحیم ہے، ہمارے محبوب ہادی رحمۃ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم ہیں، ہمارا دین پیغامِ امن (اسلام) ہے۔

اردو زبان کے اشعار

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ اکثر اوقات سحری کو مندرجہ ذیل شعر نہایت ہی سوز و گداز سے پڑھا کرتے تھے ؎

① جو چمن سے گذرے تو بادِ صبا تو یہ کہنا بلبلِ زار سے
کہ خزاں کے دن بھی ہیں سامنے نہ لگانا دل کو بہار سے

② پڑا فلک کو کبھی دل جلوں سے کام نہیں
جلا کے خاک نہ کر دوں تو داغ نام نہیں

③ بدنصیب قوم کی ایذا رسانی پر فرمایا: "ہم تو ایسی سب وشتم کے عادی ہوگئے ہیں سن کر کچھ تغیر نہیں ہوتا" ؎

رنج کا عادی ہو گر انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

۴ مرادآباد جیل سے ایک مسترشد کے خط کے جواب میں تحریر فرمایا ؎

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

یعنی جیل میں اللہ تعالیٰ کی یاد کا وقت زیادہ ملتا ہے۔

۵ مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی نور اللہ مرقدہٗ نے مرادآباد کی قید کا کچھ پس منظر آپ کو تحریر فرمایا، تو آپ نے جواب میں جو گرامی نامہ جیل ہی سے مولانا کے نام تحریر فرمایا اس میں یہ تحریر فرمایا ؎

نہ مرتے مرتے محبت سے منہ پھیرا میں نے
جفائیں سیکڑوں جھیلیں وفا پر اپنی نازاں ہوں

اپنے شیخ شیخ الہند مولانا محمود حسن اسیر مالٹا نے جو امانت آپ کے سپرد کی تھی اس کو ہر حال میں ادا کیا اور ہر تکلیف برداشت کی۔ (نور اللہ مرقدہٗ)

۶ عشق میں ان کے کوہِ غم سر پہ لیا جو ہو سو ہو
عیش و نشاطِ زندگی چھوڑ دیا جو ہو سو ہو

۷ ؎ بابا رشتہ سب سے توڑ
بابا حق سے رشتہ جوڑ

۸ ؎ گر پائیں گے رقیب تو ٹکڑے اڑائیں گے
ہرگز نہ دیں گے اس بُتِ رعنا کے ہاتھ میں

۹ ؎ اے دل خدا کے سوا کوئی اور ہمارا محافظ نہیں
اور گردشِ روزگار کے ڈنک زہر کا کوئی منتر بھی نہیں۔

مولانا مفتی شبیر احمد صاحب مراد آباد

تقلید کی اہمیت

قسط ۳

مقلد محقق اور مفتی مجتہد

مقلد محقق یا مفتی مجتہد ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جس کو ایسی خداداد صلاحیت اور ملکہ من جانب اللہ عطا ہوا ہو، جس کی وجہ سے اپنے امام کے اصول کے مطابق اجتہاد کرکے جزئی مسائل کی تخریج اور استنباط پر دسترس حاصل ہو چکی ہو ایسے شخص پر بھی اپنے امام کی تقلید کی پابندی لازم ہے البتہ مقلد محقق یا مفتی مجتہد کو مقلد محض اور مفتی ناقل کے مقابلہ میں چار امور پر امتیاز حاصل ہے۔

۱: جن مسائل میں اپنے امام سے کوئی صراحت منقول نہیں ہے ان میں اپنے امام کے اصول و قواعد کے مطابق جزئی احکام کا استنباط کر سکتا ہے۔

۲: اپنے امام کی طرف سے جن مسائل میں ایک سے زائد اقوال منقول ہیں، ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے یا تطبیق دینے کا حق حاصل ہوتا ہے۔

۳: عموم بلویٰ اور ضرورت شدیدہ کے موقعہ پر کسی دوسرے امام کے قول پر فتویٰ دے سکتا ہے لیکن دوسرے امام کے قول پر فتویٰ دینے کے لیے تلفیق سے بچنے کی شرائط لازم ہے، تلفیق سے متعلق بحث آگے آرہی ہے۔

۴: ایسے شخص کو اگر اپنے امام کا کوئی قول ایسا نظر آئے جو غیر منسوخ صحیح اور صریح حدیث کے خلاف ہے اور اس کے معارض کوئی دوسری حدیث بھی نہیں ہے اور امام کے قول پر شرح صدر بھی نہ ہو تو امام کے قول کو چھوڑ کر اس حدیث پر عمل کرنے میں اپنا تفرد اختیار کرنے کی اجازت ہے۔

(مستفاد درس ترمذی ص ۱۲۳/۱)

علامہ زین الدین ابن نجیم مصری رح نے مقلد محقق کی تین شرطیں نقل فرمائی ہیں :

۱: ائمہ کے مذاہب پر اچھی طرح عبور حاصل ہو۔

۲: مجتہد مطلق کے اقوال کے درمیان امتیاز کرنے کی قدرت حاصل ہو۔

۳: ائمہ مجتہدین کے اقوال میں سے بعض کو بعض پر ترجیح دینے کی صلاحیت رکھتا ہو نیز ہر قول کے رجحان کو دلیل سے ثابت کرنا اور متعدد اقوال کے درمیان موازنہ کر کے راجح کو اختیار کرنا اور مرجوح کو ترک کرنا بھی مجتہد ہی کا وظیفہ ہے چاہے وہ مجتہد مقید ہی کیوں نہ ہو۔ [۱]

والمراد بالاھلیۃ ھنا ان یکون عارفا ممیزا بین الاقاویل لہٗ قدرۃ علی ترجیح بعضہا علی بعض[۲] الخ

اور یہاں اہلیت سے مراد یہ ہے کہ وہ ائمہ کے چند اقوال کے درمیان امتیاز کرنے اور معرفت رکھنے والا ہو اس کو بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دینے کی قدرت حاصل ہو۔

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ صحیح معنی میں مفتی اور منصب قضا کا اہل وہی ہو سکتا ہے جس کو علم حدیث اور اجتہاد میں بصیرت حاصل ہو، حضرت امام ابوحنیفہ رح کے اقوال و مسلک کا جاننے والا اور حافظ ہو۔

وقد سئل متی یحل برجل ان یفتی ویلی القضاء قال اذا کان بصیراً بالحدیث والرأی عارفا بقول ابی حنیفۃ رح حافظاً لہٗ ،[۳]

اور سوال کیا گیا کہ انسان کے لیے منصب قضا و افتاء پر فائز ہونا کب جائز ہو سکتا ہے۔ تو جواب دیا کہ جب حدیث شریف پر بصیرت اور اجتہاد پر قدرت حاصل ہو، امام ابوحنیفہ رح کے اقوال سے واقف اور ان کا حافظ ہو۔

---

[۱] امداد الفتاویٰ ص ۲۹۶/۴ ، [۲] البحر الرائق ص ۲۹۰/۶ ، [۳] البحر الرائق ص ۲۹۰/۶ ۔

علامہ شامی رہ منحۃ الخالق میں لکھتے ہیں کہ دلیل اور علت کو اچھا سمجھ کر مسئلہ تبلانے کا حق صرف مقلد محقق کو ہے اور مقلد محقق یا مفتی مجتہد وہی ہو سکتا ہے جو کتاب وسنت کا ایسا عالم ہو جو عدالت و دیانت داری سے متصف ہو اور اجتہاد ورائے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو اور اگر یہ صلاحیت نہیں ہے تو وہ فن حدیث کے راوی کے درجہ میں ہے اس کا صرف نقل کرنے کا حق ہے تصرف کا حق نہیں ہے۔

ان المفتی ینبغی ان یکون عدلا عالما بالکتب والسنۃ واجتہاد الرائ قال الا ان یفتی بشئ قد سمعہ فانہ یجوز وان لم یکن عالما بالکتاب والسنۃ لانہ حاک ماسمع من غیرہ فھو بمنزلۃ الراوی فی باب الاحادیث[1]

مفتی کے لیے مناسب ہے کہ وہ عادل کتاب وسنت کا جاننے والا ہو اور اجتہاد ورائے پر قادر ہو۔ فرمایا کہ جس مسئلہ کو سن رکھا ہے اسی پر فتویٰ دینا اس کے لیے جائز ہے اگرچہ وہ کتاب وسنت کا جاننے والا نہ ہو اس لیے کہ وہ تو دوسرے سے سنی ہوئی بات کو نقل کر رہا ہے چنانچہ ایسا مفتی باب حدیث میں راوی کے درجہ میں ہے۔

وقولہ ان مثل المحقق لہ ان یقول ذلک لانہ اھل للنظر فی الدلیل واما مثلنا فلا یجوز لہ العدول عن قول الامام اصلاً[2] الخ

اور محقق جیسوں کے لیے ایسی بات کرنے کی اجازت ہے کیوں کہ وہ دلیل میں غور وفکر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ہم جیسوں کے لیے تو امام کے قول سے بالکلیہ عدول کی اجازت نہیں۔

شیخ محقق ابن ہمام رہ فرماتے ہیں کہ صحیح معنی میں مفتی وہی ہوتا ہے جو کتاب و سنت اور ائمہ کے اقوال سے اچھی طرح واقف ہو اور حقیقت میں دلیل وعلت کے ساتھ فتویٰ دینے کا حق ایسے ہی مفتی مجتہد کو حاصل ہوتا ہے۔

واعلم ان ما ذکر فی القاضی ذکر فی — اور جاننا چاہیئے کہ جو شرطیں قاضی کے لیے

---

[1] منحۃ الخالق علی ہامش البحر ۲۶۹/۶۲۰، [2] منحۃ الخالق ص ۲۷۰/۶۲۰۔

المفتی فلا یفتی الا المجتہد وقد استقر رأی الاصولیین علی ان المفتی ھو المجتہد، لہ

ذکر کی گئی ہیں، رہی شرطیں مفتی کے لئے بھی ہیں۔ چنانچہ فتویٰ مجتہد حضرات ہی دیں گے اور اس بات پر تو اصولیین کا اجماع ہو چکا ہے کہ مفتی مجتہد ہی ہو سکتا ہے۔

مقلد محقق کا انتقال عن المذہب

مقلد محقق یا مفتی مجتہد ان تمام خصوصیات کا حامل ہونے کے باوجود اس کو یہ اختیار نہیں ہے کہ اپنے امام کی تقلید کو چھوڑ کر اپنی رائے اور اجتہاد پر عمل کرے یا اپنے امام کے مذہب کو چھوڑ کر دوسرے امام کے مذہب کی جانب منتقل ہو جائے مجتہد مطلق اور مجتہد منتسب اور مجتہد فی المسائل کے علاوہ ان سے نیچے کے درجات یعنی اصحاب تخریج، اصحاب ترجیح، اصحاب تمیز میں سے کسی کے لیے بھی باقاعدہ تقلید کرنے کے بعد انتقالِ مذہب جائز نہیں ہے۔ صاحب اعلاء السنن حضرت امام الحرمین امام غزالی رح علامہ ابن سمعانی، علامہ کیاہراسی کے حوالہ سے اس حکم کو ان الفاظ میں نقل فرماتے ہیں،

صرح امام الحرمین وابن السمعانی والغزالی والکیا ھراسی وغیرھم وقالوا فالظاھر القول بوجوب التقلید المعین فی ھذہ الزمان وبالمنع من الانتقال مطلقًا سواء کان عامیًا افقیھًا الخ لہ

اور امام الحرمین، ابن السمعانی، غزالی اور کیاہراسی وغیرہ نے صراحت کی ہے کہ ظاہر بات یہی ہے کہ اس زمانہ میں معین شخص کی تقلید واجب اور ضروری ہے۔ چنانچہ خواہ عامی ہو یا فقیہ اس کے لیے ایک مذہب سے دوسرے مذہب کی طرف عدول مطلق ممنوع ہے۔

لہ فتح القدیر ص ۲۵۶/۴ ، لہ مقدمہ اعلاء السنن ص ۲۲۸/۲

اور محقق شیخ ابن الہمام اور علامہ ابن نجیم مصری رہ نے اپنی اپنی کتابوں میں نقل فرمایا۔ ہے کہ ایک مذہب کو اختیار کرنے کے بعد اس کو چھوڑکر دوسرے مذہب میں منتقل ہوجانا بہت بڑا گناہ ہے اگرچہ مقلد محقق اپنے اجتہاد اور برہان کے ذریعہ سے منتقل ہو رہا ہو، لہٰذا جن کے اندر اجتہاد کی صلاحیت نہیں ہے ان کا اپنا مسلک بدلنا بطریق اولیٰ ناجائز اور مستوجب تعذیر ہوگا۔

وقالوا المنتقل من مذهب الى مذهب باجتهاد وبرهان اثم يستوجب التعذير فبلا اجتهاد وبرهان اولى۔[1]

اور فقہاء رہ نے فرمایا کہ ایک مذہب سے دوسرے مذہب کی طرف اجتہاد اور دلیل کے ذریعہ منتقل ہونے والا گنہ گار۔ اور مستحق تعذیر ہے تو جو شخص بلا دلیل واجتہاد کے منتقل ہورہا ہو وہ بدرجہ اولیٰ مستحق تعذیر اور گنہ گار ہوگا۔

مقلد محقق کا تفرد | مقلد محقق کے تفرد کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ میں اپنے امام کا کوئی قول صراحت کے ساتھ موجود ہو مگر عالم محقق کو اپنے امام کے قول کے مخالف کوئی حدیث نظر آجائے یا اپنے امام کے مختلف اقوال میں سے قول مرجوح کی دلیل مضبوط نظر آجائے یا دوسرے امام کے قول کی دلیل زیادہ قوی نظر آجائے اور اپنے امام کے قول کو چھوڑکر اس حدیث پر عمل کرنے یا قول مرجوح پر عمل کرلے یا دوسرے امام کے قول کو اختیار کرنے کی کوئی اہم ضرورت بھی نہیں ہے بلکہ صرف دلیل کو قوی سمجھ کر ہی تفرد اختیار کررہا ہے تو ایسی صورت میں اپنے امام کے قول کو چھوڑکر جانب مخالف کو اختیار کرلیتا ہے تو اس کو اصطلاح میں مقلد محقق کا تفرد کہا جاتا ہے اور عالم محقق کو اس طرح کا تفرد اور اسی کے مطابق عمل کرنے

---

[1] فتح القدیر ص۲۵۶ ج۶، البحر الرائق ص۲۶۶ ج۶، خلاصۃ التحقیق فی بیان حکم التقلید والتلفیق ص۲۳

کی گنجائش ہے ۔ مگر یہ حق محقق کے علاوہ کسی اور کو حاصل نہیں ہے اور اس طرح تفرد اختیار کر لینے کی وجہ سے اس کو امام کے مذہب سے خارج بھی نہیں سمجھا جائے گا اساطین امت نے اس کو ان الفاظ میں نقل فرمایا ہے ۔ :

ونظیر هذا ما نقله العلامة البیری فی اول شرحه علی الاشباه عن شرح الهدایة لابن الشحنة الکبیر والد شارح الوهبانیة وشیخ ابن الهمام ولفظه اذا صح الحدیث وکان علی خلاف المذهب عمل بالحدیث ویکون ذلك مذهبه ولا یخرج مقلده عن کونه حنفیا بالعمل به فقد صح عن ابی حنیفة رح انه قال اذا صح الحدیث فهو مذهبی وقد حکیٰ ذلك الامام ابن عبد البر عن ابی حنیفة وغیره من الائمة ونقله ایضًا الامام الشعرانی عن الائمة الاربعة قلت ولا یخفی ان ذلك لمن کان اهلا للنظر فی النصوص ومعرفة محکمها من منسوخها الخ[1]

اور اس کی نظیر وہ ہے جس کو علامہ بیری نے اشباہ کی شرح کے شروع میں شرح ہدایہ از ابن شحنۃ الکبیر والد شارح الوہبانیہ اور محقق ابن الہمام سے نقل کیا ہے جن کی عبارت یہ ہے کہ جب مذہب کے خلاف کوئی صحیح حدیث موجود ہو تو حدیث پر عمل کیا جائے گا اور یہی اس کا مذہب ہوگا نیز اس پر عمل کرنے کی وجہ سے مقلد دائرۂ حنفیت سے خارج نہیں ہوگا کیوں کہ امام ابوحنیفہ رح سے صحت کے ساتھ مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ جب حدیث صحیح موجود ہو تو وہی میرا مذہب ہے اور اس روایت کو امام ابن عبدالبر رح نے امام ابوحنیفہ رح اور دیگر ائمہ سے نقل فرمایا ہے ۔ نیز امام شعرانی رح نے اس کو ائمہ اربعہ سے نقل فرمایا ہے ۔ میں کہتا ہوں کہ یقیناً یہ اس شخص کے لیے ہے جسے نصوص میں غور و فکر کرنے کی اہلیت ہو اور نصوص میں سے منسوخ اور محکم کی معرفت حاصل ہو ۔

---

[1] شامی کراچی ج۱ ص۶۸ ، شرح عقود رسم المفتی ص۲۲ ، ۱ ۔

تفرد افضل نہیں مذکورہ تقریر سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ متقلد محقق کو دلائل پر غور کر کے اپنا تفرد اختیار کرنے کی اجازت ہے مگر تفرد کی صرف اجازت ہی ہے لازم نہیں ہے اور چونکہ عالم مجتہد کا اجتہاد اپنے امام اور ان کے تلامذہ جو مجتہد فی المذہب اور مجتہد منتسب ہیں ان کے اجتہاد پر ہرگز فائق نہیں ہو سکتا۔ اس لیے محقق کے لیے افضل اور اولیٰ یہی ہے کہ تفرد اختیار کر کے اپنے امام کے قول کے مطابق ہی عمل کرے اور اس بات کو اساطین علماء نے ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے ۔

ان اجتهادهم اقوى من اجتهاده (وقوله) واجتهاده لا يبلغ اجتهادهم[1]

کیوں کہ ان ائمہ کا اجتہاد محقق عالم کے اجتہاد سے زیادہ قوی اور بڑھا ہوا ہے۔ اس کا اجتہاد ان لوگوں کے اجتہاد کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا ہے۔

تفرد کے شرائط عالم محقق کے تفرد کی متعدد شرائط میں سے تین شرطیں بہت زیادہ اہم ہیں ان کی رعایت کیے بغیر تفرد جائز نہیں ہے ۔

۱۔ تفرد اختیار کرنے میں کسی قسم کا عناد وضد اور خواہش نفس کا دخل نہ ہو۔

۲۔ تفرد کا دائرہ عمل ائمہ اربعہ کے مذاہب کے درمیان محدود ہو اور چاروں ائمہ کے مذاہب اور اجماع کی مخالفت لازم نہ آرہی ہو ۔

۳۔ غیر منسوخ صحیح اور صریح حدیث کی وجہ سے تفرد اختیار کیا جائے ۔

لہٰذا اگر ان شرائط میں سے ایک شرط بھی فوت ہو جائے تو تفرد اختیار کرنا جائز نہ ہوگا ۔

نیز محقق کا تفرد اپنے مذہب کے مختلف اقوال میں سے کسی ایک قول کے موافق ہونا مناسب اور اولیٰ ہے اور کسی مسئلہ میں مذہب سے بالکلیہ خارج ہونا مناسب نہیں ہے۔ اساطین علماء نے اس حکم کو ان الفاظ میں نقل فرمایا ہے :

---

[1] شرح عقود رسم المفتی ص۶۵ ۔

واقول ایضا تقیید ذلك بما اذا وافق قولاً فی المذهب اذ لم یأذنوا فی الاجتهاد فیما خرج عن المذهب بالکلیة مما اتفق علیه ائمتنا لان اجتهادهم اقوی اجتهاده فالظاهر انهم راوا دلیلا ارجح مما راٰه حتی لم یعملوا به[۱]

اور میں کہتا ہوں کہ اس کو ایک اور قید کے ساتھ مقید کیا جائے وہ یہ کہ محقق کا تفرد مذہب کے کسی قول کے موافق ہو کیوں کہ جس مسئلہ پر ہمارے ائمہ متفق ہیں اس سے بالکلیہ خروج کر کے اجتہاد کرنے کی فقہاء نے اجازت نہیں دی ہے کیوں کہ ان ائمہ کرام کا اجتہاد بہر حال اس محقق کے اجتہاد سے زیادہ قوی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ان ائمہ نے محقق عالم کی دلیل سے زیادہ راجح دلیل پاکر اس پر ترک عمل سے کام کیا ہے۔

تفرد کے اقسام

تفرد کی مختلف قسموں میں سے چار قسموں پر واقفیت حاصل کرنا ہر صاحب علم کے لیے ضروری ہے۔

۱: محقق اپنے اجتہاد اور رائے سے ایسا تفرد اختیار کرے جس سے ائمہ اربعہ کی مخالفت اور خرق اجماع لازم آجائے تو ایسا تفرد بالاجماع ناجائز وحرام ہے جیسا کہ شیخ ابن تیمیہ رہ نے ایسے انتالیس مسائل میں تفرد اختیار فرمایا ہے مثلاً علامہ ابن تیمیہ رہ کے نزدیک جہنم فنا ہو جائے گی اور اس کے بعد تمام کفار جنت میں داخل ہو جائیں گے اور جنت ہی میں ہمیشہ رہیں گے[۲] ــــــ حالت حیض میں طواف کرنا جائز ہے[۳] ــــــ روضۂ اطہر کی زیارت کے لیے سفر کرنا جائز نہیں ہے[۴] اس بحث سے متعلق تفصیل آگے آرہی ہے۔

---

[۱] شرح عقود رسم المفتی ص۲۰، [۲] فتاوی حدیثیہ لابن حجر ہیثمی ص۸۶، [۳] حوالہ مذکورہ ص۸۶
[۴] العرف الشذی علی الترمذی ص۱۹۲، فتاوی حدیثیہ ص۸۶

۱۔ عموم بلویٰ یا ضرورت شدیدہ کی وجہ سے عامۃ المسلمین کی رعایت اور مصالح کے مطابق محقق اپنے امام کے قول ضعیف یا مذہب غیر پر فتویٰ صادر کرتا ہے تو یہ درحقیقت تفرد نہیں ہے بلکہ یہ فتویٰ اور اپنے مسلک کا مسئلہ ہے اس پر عمل کرنا تمام مقلدین کے لیے جائز ہے محقق کی ذات کے ساتھ خاص نہیں ہے جیساکہ مفقود الخبر کے مسئلہ میں حضرت امام ابوحنیفہ رح کے مسلک سے عدول کرکے حضرت امام مالکؒ کے مسلک پر فتویٰ دیا گیا ہے[1] اس کی تفصیل عدول عن المذہب کی بحث کے تحت آرہی ہے۔

۲۔ محقق اپنے مذہب کے مخالف دیگر ائمہ مذاہب میں سے کسی کے قول کے موافق حکم کو اختیار کرتا ہے اور اس کے اختیار کرنے میں عموم بلویٰ یا ضرورت شدیدہ وغیرہ کا کوئی عذر بھی نہیں ہے محض اپنی نظر میں غیر کا قول اقویٰ ہونے کی وجہ سے اس پر عمل کرتا ہے۔ ایسا تفرد اگرچہ عالم محقق کے لیے جائز ہے مگر غیر مناسب اور غیر اولیٰ ہے۔

ینبغی تقیید ذلك بما اذا وافق قولا فی المذھب اذلم یاذنوا فی الاجتھاد فیما خرج عن المذھب بالکلیۃ مما اتفق علیہ ائمتنا الخ[2]

اس کو ایک اور قید کے ساتھ مقید کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ جب محقق کا قول مذہب کے کسی قول کے موافق ہو کیوں کہ جس مسئلہ پر ہمارے ائمہ متفق ہیں۔ اس سے بالکلیہ خروج کرکے اجتہاد کرنے کی ان ائمہ نے اجازت نہیں دی ہے۔

۴۔ کسی مسئلہ کے متعلق اپنے مذہب میں متعدد اقوال موجود ہیں ان میں جو قول راجح اور مفتیٰ بہ ہے اس کو چھوڑ کر قول ضعیف اور قول غیر مفتیٰ بہ کو اس لیے اختیار کرنا کہ محقق کی نظر میں قول ضعیف کی دلیل قوی ہے اور قول ضعیف کو دلیل کی

---

[1] شامی کراچی ج۴ ص۲۹۵، [2] شرح عقود رسم المفتی ص۲۷،

روشنی میں اختیار کرنے میں محقق کو شرح صدر اور اطمینان حاصل ہے تو ایسی صورت میں عالم محقق کے لیے قول ضعیف پر ذاتی طور پر عمل کرنے میں تفرد اختیار کرنا بالاتفاق جائز ہے مگر مقلد محض کے لیے ایسے مسائل میں عالم محقق کی تقلید جائز نہیں ہے بلکہ اپنے امام کے قول راجح اور قول مفتی بہ پر عمل کرنا لازم ہے جیساکہ مسئلہ طلاق سکران میں حنفیہ کا قول راجح اور قول مفتی بہ یہی ہے کہ طلاق واقع ہوجائے گی۔

اور امام ابوالحسن کرخی رح اور امام طحاوی رح کا مسلک امام شافعی رح کے قول کے مطابق یہی ہے کہ طلاق واقع نہیں ہوگی۔

وطلاق السکران واقع اذا سکر من الخمر والنبیذ وھو مذھب اصحابنا وکان الشیخ ابوالحسن الکرخی رح یختار انہ لایقع شئ وھو قول الطحاوی[1]

جس کو شراب اور نبیذ سے سکر پیدا ہوا ہو اس کی طلاق واقع ہوجائے گی، اور یہی ہمارے اصحاب کا مذہب ہے، اور شیخ ابوالحسن کرخی رح عدم وقوعِ طلاق کو اختیار کرتے تھے اور یہی حضرت امام طحاوی رح کا قول ہے

اب مقلد محض کے لیے امام کرخی اور طحاوی رح کے قول کو اختیار کرکے قول مفتی بہ کو چھوڑ دینا جائز نہیں ہے اسی طرح بعد کے علماء محققین میں سے اگر کوئی امام کرخی رح کے قول کو اختیار کرتا ہے تو اس کو اس کا حق ہے اور اس میں اس کو متفرد کہا جائے گا مگر غیر مجتہد عالم اور مقلد محض نیز مفتی ناقل کے لیے اس محقق کے قول کو اختیار کرکے عدم وقوع طلاق پر فتوی دینا جائز نہ ہوگا[2] اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

---

[1] فتاوی تاتارخانیہ ص ۲۵۶ ج ۳، درمختار کراچی ص ۲۴۱ ج ۳۔
[2] احسن الفتاوی ص ۱۶۷ ج ۴

مقلد محض اور غیر مجتہد کا مقلد محقق کے تفرد کا اتباع

متعدد دلائل سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مقلد محقق کے لیے اپنے اجتہاد کے ذریعہ دلائل کے رجحان پر عمل کرنے میں تفرد اختیار کرنا جائز ہے یہ صرف عالم محقق کو ذاتی طور پر عمل کے لیے جائز ہے اور اس کی یہ تحقیق جو جمہور کی رائے اور قول مفتیٰ بہ کے خلاف ہے اس کی ذات تک محدود رہے گی متعدی نہیں ہوگی۔

واما فی حق العمل به لنفسه فالظاهر جوازه له (وقوله) یجوز له ان یعمل علیها وان کان مخالفاً بمذهبه لان المجتهد یلزمه اتباع ماادّی الیه اجتهاده الخ[1]

اور مقلد محقق کے لیے اپنے تفرد پر ذاتی طور سے عمل کرنے کی اجازت ہے۔ نیز اپنے مذہب کے مخالف ہونے کے باوجود اس قول پر عمل کرنا اس کے لیے جائز ہے کیوں کہ مجتہد کے لیے اپنے اجتہاد کردہ مسئلہ کا اتباع لازم اور ضروری ہے۔

اور کوئی کتنا ہی بڑا محقق کیوں نہ ہو اگر جمہور کی رائے اور اپنے امام کے قول راجح کے مخالف پہلو کو اختیار کرے گا، اگرچہ یہ عمل اس کے حق میں جائز ہے مگر عام مقلدین کے لئے اس کا اتباع جائز نہیں ہے بلکہ مسلک جمہور ہی واجب الاتباع ہوتا ہے اس لیے مقلد محض اور غیر مجتہد کے لیے عالم محقق کے تفرد کا اتباع کرنا جائز نہیں ہے[2] اسی وجہ سے محقق ابن ہمام رح کے تفردات کے متعلق ان کے تلمیذ خاص حضرت علامہ قاسم بن قطلوبغا فرماتے ہیں کہ ہمارے شیخ کے تفردات جو جمہور کی رائے اور مذہب مشہور کے خلاف ہیں وہ قابل اتباع نہیں۔

ولهذا قال العلامة قاسم فی حق — اسی وجہ سے علامہ قاسم نے اپنے شیخ

---

[1] شرح عقود رسم المفتی ص۱۰۔ [2] مستفاد احسن الفتاویٰ ص۱۶۷ ج۳۔

شیخہ خاتمۃ المحققین الکمال ابن الھمام لایعمل بابحاث شیخنا التی تخالف المذھب ۔[1]

خاتمۃ المحققین کمال ابن الہمام کے بارے میں فرمایا کہ ہمارے شیخ کے ان مسائل پر عمل نہ کیا جائے جو مذہب کے خلاف ہیں۔

(وقولہ) فان لہ اختیارات خالف فیھا المذھب فلا یتابع علیھا کما قالہ تلمیذہ العلامۃ قاسم ۔[2]

یقیناً ان کے کچھ ایسے تفردات ہیں، جن میں انھوں نے مذہب کی مخالفت کی ہے لہٰذا ان کی اتباع نہیں کی جائے گی جیسا کہ آپ کے شاگرد علامہ قاسم نے فرمایا ہے۔

اور مقلد غیر محقق اور مفتی غیر مجتہد کی ذمہ داری یہی ہے کہ وہ مسلک کے قول مشہور پر فتویٰ دیا کرے اگرچہ مسلک کا قول مشہور اس کو بظاہر ضعیف اور کمزور معلوم ہورہا ہو پھر بھی قول مشہور اور جمہور کی رائے کے مطابق فتویٰ دینا لازم ہے اور عالم کے تفرد کے مطابق فتویٰ دینا مقلد محض کے لیے روا نہیں ہے اساطین امت اس کو ان الفاظ میں نقل فرماتے ہیں:

وان کان مقلداً جاز لہ ان یفتی بالمشھور فی مذھبہ وان یحکم بہ وان لم یکن راجحاً عندہ مقلداً فی رجحان المحکوم بہ امامہ الذی یقلدہ کما یقلدہ فی الفتویٰ ۔[3]

اگر (مفتی غیر مجتہد) مقلد ہو تو اس کے لیے اپنے مذہب کے مشہور قول پر فتویٰ دینا جائز ہے اور (قاضی کو) اس پر فتویٰ دینا بھی جائز ہے اگرچہ اس کے نزدیک یہ قول راجح نہ ہو وہ مقلد ہے محکوم بہ کے رجحان میں اپنے اس امام کا جس کی اس نے تقلید کی ہے جس طرح کہ وہ فتویٰ میں اس کا مقلد ہے۔

◆ ◆ ◆ ◆

[1] شرح عقود رسم المفتی ص۶۸، شامی کراچی ص۲۷۶/۱ ۔ [2] شرح عقود رسم المفتی ص۲۲ ۔
[3] ؍؍ ؍؍ ص۱۰۳ ۔

از: مولانا محمد زاہد مدرس جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ ....

ایک چراغ اور بجھا
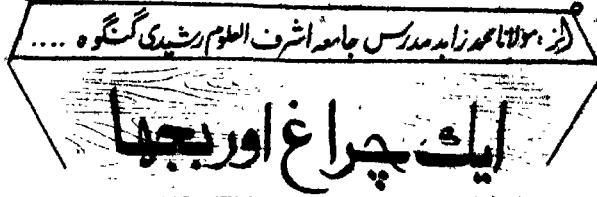
یعنی حضرت حکیم عبد الرشید محمود عرف حکیم ننو میاں

نبیرہ امام ربانی حضرت گنگوہی قدس سرہٗ ۲۱ر شوال ۱۴۱۵ھ ۲۳ر مارچ ۱۹۹۵ء یوم پنجشنبہ کو داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے مالک حقیقی کے دربار میں جا پہنچے

راقم السطور اپنے معمول کے مطابق جو بحمد للہ ۱۴۰۴ھ جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ میں تقرری کے بعد سے مسلسل جاری تھا' تقریباً ساڑھے دس بجے صبح حضرتؒ کی مجلس میں حاضر ہوا دیکھتا ہوں کہ حضرت حکیم صاحب خراٹے کی نیند سو رہے ہیں، پاس ہی کرسی پر آپ کے خادم فن طب کے شاگرد بیشتر اوقات کے حاضر باش مولوی خوشنود ربانی گنگوہی بیٹھے ہوئے ہیں' احقر نے معلوم کیا کہ حضرت نیند میں ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہاں۔ اتنے میں حضرت کا نواسا گھر سے نکلا تو مولوی خوشنود صاحب اس بچے کو لے کر دکان پر چلے گئے اور میں پانچ دس منٹ بیٹھ کر اور یہ سوچ کر کہ حضرت تو گہری نیند میں ہیں جلدی اٹھنا مشکل ہے' اٹھ کے مدرسہ چلا آیا' پانچ سات منٹ ہی گذرے تھے کہ پیچھے پیچھے اطلاع آپہنچی کہ حضرت حکیم صاحب تو واصل بحق ہوگئے فانا للہ وانا الیہ راجعون ورحمہ رحمۃ واسعۃ واسکنہ بحبوحۃ جنانہ واعلیٰ درجاتہ فی مسکن مماتہ۔ لگتا ایسا ہے کہ آپ کی یہ نیند نزعی کیفیت تھی جونہی جامعہ اشرف العلوم میں وصال کی اطلاع آئی' جامعہ کے مدرسین وطلبہ اور حضرت قاری شریف احمد صاحب دامت برکاتہم کے صاحب زادے جناب مولوی قاری عبید الرحمٰن صاحب فوراً حضرت کے مکان پر پہونچے۔ آپ کے متعلقین قاضی شبیہ الحسن عرف قاضی چھوٹے

اور جناب حکیم محمود صاحب اور حکیم جمیل احمد صاحب قاضی شارق بھائی عارف خاں وغیرہ کی طرف سے امکانی حد تک اطلاعات کا اہتمام کیا گیا بالخصوص جلال آباد، تھانہ بھون، سہارن پور اور دیوبند کے ارباب تعلق کو اطلاع کی گئی۔ چنانچہ سہارنپور سے مولانا وقار علی صاحب شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس صاحب اور صدر مدرس حضرت مولانا محمد عاقل صاحب دامت برکاتہما اور دیگر حضرات شریک جنازہ ہوئے۔ دیوبند سے دارالعلوم کے مہتمم جناب حضرت مولانا مرغوب الرحمان صاحب اور اساتذہ میں سے جناب مولانا عبدالخالق صاحب اور جناب حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب مدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، مولانا محمد راشد اعظمی، اور مولانا محمد سلمان بجنوری وغیرہم نے شرکت فرمائی اور مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد سے جناب مولانا عبدالرحیم صاحب وغیرہ اور تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ سے جناب مولانا نجم الحسن صاحب شریک جنازہ ہوئے۔

حضرت حکیم صاحب کی وصیت کے مطابق جامعہ اشرف العلوم رشیدی کے شیخ الحدیث جناب حضرت مولانا وسیم احمد صاحب زید مجدہم نے نماز جنازہ ادا کرائی فطوبیٰ للموصیٰ لہ ویالہ من شرف چونکہ گنگوہ اور اس کے نواح کے دیہات کے لوگوں کا حضرت حکیم صاحب سے روحانی اور جسمانی ہر معالجہ کا تعلق تھا، اور گرد و نواح آپ کے عقیدتمند تھے اور کثرت سے آپ کی مجلسوں میں آتے جاتے تھے اس لیے آس پاس کے دیہاتوں کے لوگ بھی اپنے ٹریکٹر، ٹرالیوں سے رات کا وقت ہونے کے باوجود شریک جنازہ ہوئے۔ شرکاء جنازہ کی تعداد کا تخمینہ دس ہزار بتایا جاتا ہے اور مجمع کو مائک سے کنٹرول کرنے کی نوبت آئی، نماز جنازہ سے فراغت کے بعد جم غفیر کے جلوس میں آپ کا جنازہ لے جایا گیا اور اپنے جد امجد امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کی قبر کے پاس آپ کی آخری آرام گاہ قرار پائی۔

حضرت حکیم صاحب نور اللہ مرقدہٗ ایک غیر معمولی شخصیت کے حامل تھے۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رح کے پوتے ہونے کی نسبت تو بجائے خود ایک سعادت عظمیٰ ہے تھا اس سے ہٹ کر ان کے علوم و معارف اور فن طب میں ان کی حذاقت کی

کی شہرت تھی اس کی وجہ سے وہ ہندہی میں نہیں بلکہ پاکستان، بنگلہ دیش، حجاز اور امریکہ، افریقہ تک کے مرجع تھے .... اور باہر سے آنیوالا شاذونادر ہی کوئی شخص ہوگا کہ جو گنگوہ آئے اور حکیم صاحب کی زیارت و ملاقات کا اشتیاق اس کے دل میں نہ ہو بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ گنگوہ میں آنے کو چاہنے کی طبیعت اور یہاں پہنچنے کا داعیہ جہاں مشہور جامعہ اشرف العلوم رشیدی اور یہاں کے بزرگوں کے مزارات ہیں وہیں ان میں سے ایک چیز حضرت حکیم صاحب کی ملاقات وزیارت بھی ہوتی تھی۔

حضرت حکیم صاحب مرحوم کو جامعہ اشرف العلوم رشیدی سے بھی بہت تعلق تھا چنانچہ جامعہ ہذا میں دورۂ حدیث کے افتتاح کے سال جو ۱۴۰۲ھ میں ہوا ہے بڑی مسرت سے تشریف لائے اور کئی سالوں تک ختم پر بھی تشریف لاتے رہے مگر چند سالوں سے بوجہ ضعف کے آنا موقوف ہوگیا تھا مگر جامعہ کے مہتمم حضرت مولانا قاری شریف احمد صاحب مدظلہٗ آپ کے یہاں برابر آتے جاتے تھے ______ عجلت میں یہ چند ٹوٹی پھوٹی سطور محض یادداشت کے لیے قلم بند کردی گئیں ورنہ حکیم صاحب کی جیسی شخصیت ہے اس کے لحاظ سے شخصیت شناس اور اصحاب قلم واہلیت کا ہی یہ حق بنتا ہے کہ وہ اس شخصیت پر کچھ لکھیں اور انشاء اللہ امید ہے کہ اپنے اپنے حساب سے ضرور لوگ لکھ رہے ہوں گے، حضرت حکیم صاحب کے خادم خاص جناب مولوی خوشنود ربانی گنگوہی بھی حضرت پر تفصیلی مضمون تحریر کرنے کا ارادہ کررہے ہیں اللہ ان کے لیے آسان کرے۔ آمین

جامعہ کے مؤقر استاذ تفسیر وحدیث جناب مولانا انور صاحب گنگوہی زید فضلہ وعلمہ نے حضرت حکیم صاحب کے لیے قطعۂ تاریخ وفات کہا ہے، جو نذر قارئین ہے:

آں حنیف قطب ربانی حکیم عبدالرشید — بحر علم وفن طبیب حاذق و مرد سعید

صرف کردہ عمر کل در وعظ و تذکیر انام — در فصاحت در بلاغت بود یک دُرِّ فرید

عاشقانش راز غم گریہ کناں بگذاشتہ — رفت روز پنجشنبہ بست ویک از ماہ عید

اشکہائے چشم انور رقم کردہ سن فوت — پاکستان محبوب کل نئو میاں جنت رسید

۱۴۱۵ھ

عیسوی سن وفاتش گر بخواہی ایں بگو

مرد صالح محترم نئو میاں جنت رسید

۱۹۹۵ء

دار العلوم دیوبند کا ترجمان
ماہنامہ
دار العلوم
PH. 110. 22429
COD - 01336
PIN - 247554
شمارہ ۶
ماہ محرم الحرام ۱۴۱۶ھ مطابق ماہ جون ۱۹۹۵ء
جلد
سالانہ -/6
فی شمارہ -/60
نگراں
حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
مہتمم دار العلوم دیوبند
مدیر
حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی
استاذ دار العلوم دیوبند
سالانہ بدل اشتراک
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ،
کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۴۰۰ روپئے
پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۱۰۰ "
بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم -/۸۰ "
ہندوستان سے -/۶۰ "
ترسیل زر کا پتہ
دفتر ماہنامہ دار العلوم دیوبند
سہارنپور ـــــ یوپی
یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے
تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی
مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔

فہرست مضامین

ختم خریداری کی اطلاع

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے اس لیے وی، پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کردیں۔
- ہندوستان اور پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔
- بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس الرحمٰن سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

حرفِ آغاز

حقیقت رجم پر ایک اجمالی نظر

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

جناب مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی استاذ جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ کی نئی تصنیف "حقیقت رجم کتاب وسنت کی روشنی میں" ایک دوست کے ذریعہ دیکھنے کو ملی۔ اس کتاب میں احادیث رسول، تعامل صحابہ، اقوال سلف صالحین اور اجماع امت کے برخلاف شادی شدہ زانی کی سزائے رجم کے مسئلہ میں خوارج ومعتزلہ گمراہ فرقوں کے ہوائے نفس کی تائید وتصویب کی گئی ہے۔ کتاب کیا ہے، تحریفات وتلبیسات کا ایک مجموعہ جس کے ذریعہ امت مسلمہ کے قلوب سے صحابہ کی عظمت اور سلفِ صالحین کی علمی ودینی وقعت کو ختم کرنے کی ایک ناروا کوشش کی گئی ہے۔

زیر نظر تحریر میں اسی کتاب کا اجمالی علمی جائزہ لیا گیا ہے۔

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین ....اما بعد

"اسلامی احکام ومسائل کا ثبوت قرآن مبین سے ہوتا ہے، یا رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت ثابتہ سے، یا پھر امت وسط وعدل کے اجماع سے۔ کسی مسئلہ سے متعلق ان مذکورہ مصادر میں صراحتاً اگر حکم معلوم نہ ہو سکے تو پھر ائمہ مجتہدین وسلف صالحین کے استنباطات وقیاسات کی جانب رجوع کیا جاتا ہے۔ شرعی مسائل ومعاملات کے بارے میں امت کے سواد اعظم کا یہی رویہ اسلام کی ابتدائی صدیوں سے معلوم ومتعارف چلا آرہا ہے جس سے اعراض وانحراف بلاشبہ شذوذ کی راہ ہے جس پر کتاب وسنت میں نہایت شدید

وعیدیں آئی ہیں۔

اس لیے اسلامی احکام میں وہی بحث و تحقیق معتبر اور قابل اعتماد ہوگی جو ان مصادر اربعہ سے ماخوذ و مؤید ہو، زانی محصن کی سزائے رجم بھی ایک خالص اسلامی قانون ہے جس پر غور و فکر، بحث و تحقیق، قرآن و سنت، اجماع امت اور قیاس مجتہدین ہی کی روشنی میں کی جائے گی اور ان مصادر شرعیہ سے ثبوت فراہم ہو جانے کے بعد اس کے آگے سر تسلیم خم کر دینا ہی ایک سچے پکے مسلمان کی شان ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عہد خیر و صداقت سے لے کر (بجز چند راہ صواب سے بھٹکے ہوئے فرقوں کے) پوری امت مسلمہ شادی شدہ زانی کے رجم پر متفق و متحد ہے۔ مشہور مفسر علامہ سید محمود آلوسیؒ اپنی محققانہ تفسیر روح المعانی میں لکھتے ہیں:

"وقد اجمع الصحابة رضی اللہ تعالیٰ عنہم ومن تقدم من السلف وعلماء الامة وائمة المسلمین علی ان المحصن یرجم بالحجارة حتی یموت، وانکار الخوارج ذلک باطل لانہم ان انکروا حجیة اجماع الصحابة رضی اللہ عنہم فجہل مرکب وان انکروا وقوعہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لانکار حجیة خبر الواحد فہو بعد بطلانہ بالدلیل، لیس مما نحن فیہ لان ثبوت الرجم عنہ علیہ الصلوٰة والسلام متواتر المعنیٰ کشجاعة علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ وجود حاتم والآحاد فی تفصیل صورة وخصوصیاتہ وہم کسائر المسلمین یوجبون العمل بالمتواتر معنیً کالمتواتر لفظاً الا ان انحرافہم عن الصحابة والمسلمین وترک التردد الی علماء المسلمین والرواة اوقعہم فی جہالات کثیرة لخفاء السمع عنہم والشہرة۔"[1]

---

[1] روح المعانی ص ۹۶، ج ۱۸۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور ہم سے پیشتر سلف صالحین، علماء امت اور ائمہ اسلام کا اس پر اجماع ہے کہ شادی شدہ زانی کو سنگسار کیا جائے گا یہاں تک کہ وہ مرجائے، خوارج کا اس مسئلہ سے انکار یکسر باطل ہے۔ کیوں کہ اگر وہ اجماع صحابہ کی حجیت کے منکر ہیں تو یہ جہل مرکب ہے۔ اور اگر وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے رجم کے ثبوت کا بایں وجہ انکار کرتے ہیں کہ یہ ثبوت خبر واحد سے ہے تو ان کا یہ موقف ہی باطل ہے۔ علاوہ ازیں مسئلہ زیر بحث کا تعلق خبر واحد سے نہیں ہے کیونکہ رجم کا ثبوت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے معنیً متواتر ہے جس طرح علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی شجاعت اور حاتم کی سخاوت کا ثبوت تواتر معنوی سے ہے اگرچہ ہر واقعہ کی صورتیں اور تفصیلات متواتر نہیں ہیں پھر عام مسلمانوں کی طرح خارجی بھی متواتر معنوی پر عمل اسی طرح ضروری سمجھتے ہیں جس طرح متواتر لفظی واجب العمل ہے، مگر صحابہ اور عام مسلمانوں سے خارجیوں کے الگ تھلگ رہنے اور علماء مسلمین و حدیث کے راویوں کے پاس آمد و رفت نہ رکھنے کی بنا پر وہ بہت سی جہالتوں میں جاگرے تھے۔ کیوں کہ حدیث اور دینی باتوں سے ان کے کان ناآشنا اور مشہور احادیث و مسائل کی شہرت ان پر مخفی رہ گئی تھی۔

علامہ آلوسی کے علاوہ محقق ابن ہمام حنفی مشہور فقیہ و شارح حدیث شیخ محی الدین نووی شافعی، امام موفق ابن قدامہ مقدسی حنبلی، حافظ ابوالولید ابن رشد مالکی، امام ابن حزم ظاہری وغیرہ محققین علماء کرام نے بھی اپنی اپنی تصانیف میں زانی محصن کے رجم پر اجماعِ امت کا ذکر کیا ہے۔ حوالے کے لیے دیکھئے علی الترتیب [1]

---

[1] فتح القدیر شرح ہدایہ ص ۱۲ ج ۵، شرح مسلم النووی ص ۶۵ ج ۲، المغنی ص ۱۲۵ ج ۷، بدایۃ المجتہد ص ۳۲۶ ج ۲، المحلی ص ۲۳۱ ج ۱۱۔

اس موقع پر یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ زانی محصن کے رجم پر نہ صرف امتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا اتفاق و اجماع ہے بلکہ اس مسئلہ کے بارے میں توراۃ کا بھی یہی فیصلہ ہے اور تورات کے وہ فیصلے جنھیں انجیل میں صریح الفاظ سے رد نہ کردیا گیا ہو وہ نصاریٰ کے یہاں بھی حجت ہوتے ہیں اور انجیل میں اس کی ممانعت ثابت نہیں اس لیے تورات کا یہ فیصلہ یہود و نصاریٰ دونوں فرقوں کے نزدیک اصولی طور پر حجت اور واجب العمل ہے۔

خود قرآن کریم نے توریت کے اس کو "حکم اللہ" قرار دے کر اس کی صداقت وحقانیت پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے "وکیف یحکمونک وعندھم التوراۃ فیہا حکم اللہ" (المائدہ) اور وہ آپ کو کیسے منصف بنا سکتے ہیں، حالانکہ ان کے پاس توریت ہے جس میں اللہ کا حکم موجود ہے، اہل علم جانتے ہیں کہ یہ آیت یہود کے مقدمۂ زنا کے متعلق نازل ہوئی تھی۔ موجودہ بائیبل میں بھی (اس کی تحریف کے باوجود) رجم کا حکم موجود ہے، کتاب استثناء میں ہے:

"واذا کانت فتاۃ عذراء مخطوبۃ لرجل فوجدھا رجل بالمدینۃ فاضطجع معہا فاخرجوھما کلیہما من المدینۃ وارجموھما بالحجارۃ حتی یموتا، الفتاۃ من اجل انہا لم تصرخ فی المدینۃ والرجل من اجل انہ اذل امرأۃ صاحبہ فینتزع الشر من المدینۃ"[1]

اگر کنواری لڑکی کسی کے رشتہ نکاح میں منسوب ہو اور کوئی دوسرا شخص اسے شہر میں پاکر اس کے ساتھ صحبت کرے، تو ان دونوں کو شہر سے باہر نکالو اور انھیں سنگسار کرو یہاں تک کہ دونوں مرجائیں۔ لڑکی اس لیے

---

[1] نظرۃ الی العقوبۃ فی الاسلام از فضیلۃ الاستاذ الشیخ ابوزھرہ، ملاحظہ ہو: کتاب المؤتمر الرابع لمجمع البحوث الاسلامیۃ رجب ۱۳۸۸ھ ص ۱۸۷۔

کہ اس نے شہر میں ہوتے ہوئے شور نہیں مچایا' اور مرد کو اس لیے کہ اس نے اپنے ساتھی کی بیوی کو بے حرمت کیا۔ پس شر و برائی کو اس طرح شہر سے دور کیا جائے۔

چوں کہ یہ مسئلہ خود نبی کریم الصادق والمصدوق صلے اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے حسب تصریح فقہاء و محدثین بطور تواتر معنوی کے ثابت ہے اس لیے اس باب میں اختلاف کی گنجائش ہی کہاں تھی۔ بایں وجہ ہم دیکھتے ہیں کہ عہد صحابہ سے امت اس پر متفق و متحد چلی آرہی ہے۔ خلیفہ راشد امیر المؤمنین عمر بن الخطابؓ نے رجم کے بارے میں خود رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی شہادت ہے کہ وہ سچی اور درست بات کہنے والے ہیں) اپنے یک خطبہ میں شریعت اسلامیہ کے قانون میں اس سزا کی اہمیت اور اس کے ناقابلِ تنسیخ ہونے کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

"ان اللّٰہ بعث محمدا صلی اللّٰہ علیہ وسلم بالحق وانزل علیہ الکتاب فکان مما انزل اللّٰہ اٰیۃ الرجم فقرأناھا و عقلناھا ووعیناھا رجم رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم و رجمنا بعدہ فاخشیٰ ان طال بالناس زمان ان یقول قائل واللّٰہ ما نجد اٰیۃ الرجم فی کتاب اللّٰہ فیضلوا بترک فریضۃ انزلھا اللّٰہ تعالیٰ' والرجم فی کتاب اللّٰہ حق علی من زنی اذا احصن من الرجال والنساء اذا قامت البینۃ او کان الحبل والاعتراف"[1]

لاریب اللہ عز اسمہٗ نے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو حق دے کر بھیجا اور آپ پر کتاب نازل کی اور اللہ تعالےٰ کی نازل کردہ آیات میں آیت رجم بھی تھی ہم نے اسے پڑھا' سمجھا اور یاد رکھا۔ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا

---

[1] الصحیح للبخاری ص ۱۰۰۹/۲۸ ۔

اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا، مجھے ڈر ہے کہ کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد کوئی کہنے والا کہے کہ ہم رجم کی آیت کتاب اللہ میں نہیں پاتے تو یہ لوگ اللہ کے ایک نازل کردہ فریضہ کے چھوڑ دینے سے گمراہ ہو جائیں گے۔ رجم اللہ کی کتاب میں حق ہے زانی پر جب کہ وہ محصن ہو خواہ اس جرم کا مرتکب مرد ہو یا عورت، جب کہ گواہی سے یا حمل و اقرار سے اس کا ثبوت موجود ہو۔[1]

حضرت فاروق اعظمؓ کے اس طویل خطبہ کا یہ ایک حصہ ہے جو موصوف نے اپنی خلافت کے آخری ایام میں حج سے واپسی پر حضرات صحابہ رضؓ کے بڑے مجمع میں دیا تھا حضرت فاروقؓ کے جملہ "والرجم فی کتاب اللہ حق" کا مطلب یہ ہے کہ آیت رجم جو قرآن میں نازل ہوئی تھی اس کی تلاوت منسوخ ہو گئی مگر حکم بحالہ باقی ہے اور ان کے الفاظ "رجم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ورجمنا بعدہٗ" سے تسلسل رجم کی وضاحت ہو رہی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا اور خلیفۂ اول حضرت صدیق اکبر رضؓ اور فاروق اعظم رضؓ کے زمانہ میں بھی رجم کا حکم جاری رہا۔ چنانچہ خادم رسول حضرت انس رضؓ بھی یہی تسلسل بیان کرتے ہیں "رجم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما وامرھما سنۃ" رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے رجم کیا اور ان کا حکم (وعمل) بھی سنت ہے۔

شیخین رضوان اللہ علیہما کے بعد خلیفہ ثالث حضرت عثمان غنیؓ، خلیفہ رابع حضرت علی مرتضیٰؓ اور دیگر ...... صحابۂ کرام رضوان اللہ عنہم سے بھی رجم کا قول و عمل صحیح روایات سے ثابت ہے[2] جس سے پتہ چلتا ہے کہ رجم پر عمل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

[1] رواہ ابویعلی ورجالہ ثقات، مجمع الزوائد ص ۲۶۴ ج ۶ ، [2] حضرت عثمان غنی رضؓ کی روایت کیلیے دیکھیے ترمذی ص ۲۱ ج ۲، نسائی ص ۱۵۶ ج ۲، مستدرک حاکم ص ۳۵۰ ج ۴ وغیرہ۔ حضرت علی رضؓ کے رجم کرنے کا واقعہ ملاحظہ ہو، بخاری ص ۱۰۰۸ ج ۲، مسند امام احمد ص ۱۲۱ ج ۱ اور حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت صحیح بخاری ص ۱۰۱۶ ج ۲، صحیح مسلم ص ۵۹ ج ۲ وغیرہ کتب صحاح میں موجود ہے۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

بعد حضرات صحابہ میں بطور توارث کے جاری وساری تھا۔ "وکفی بہم قدوۃ"۔

حضرات صحابہ وائمہ سلف سے اجماع وتوارث کے ثبوت کے بعد ایک مخلص مؤمن کے لیے مزید کسی دلیل وحجت کی ضرورت نہیں۔ پھر بھی مزید وضاحت اور تکمیل بحث کی غرض سے ان احادیث مرفوعہ کی نشاندہی بھی کی جاتی ہے جو کتب حدیث میں صحابہ کی ایک بڑی جماعت سے مروی ہیں۔ چوں کہ یہ مختصر تحریر ان احادیث کے حرف بہ حرف نقل کی متحمل نہیں ہے اس لیے اس موقعہ پر صرف ان کتابوں کے حوالے ذکر کیے جارہے ہیں جن میں روایات نقل کی گئی ہیں۔

اسماء صحابہ جنھوں نے زانی محصن کو رجم کرنیکا حکم یا عمل کیا ہے

۱: حضرت عمر بن خطاب، حضرت علی مرتضیٰ، عبداللہ بن ابی اوفیٰ، جابر بن عبداللہ ابوہریرہ، عائشہ صدیقہ، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، زید بن خالد رضی اللہ عنہم ان مذکورہ حضرات صحابہ کی احادیث صحیح بخاری میں موجود ہیں۔

۲: عبادہ بن صامت، سلمہ بن محبق، ابو برزہ، ہزال، جابر بن سمرہ، مجلاج، حضرت ابوبکر صدیق، بریدہ، ابو ذر غفاری، نصر بن دہر اسلمی، عمران بن الحصین، ابوبکرہ، ابوسعید الخدری، نعمان بن بشیر، براء بن عازب رضوان اللہ علیہم سے روایات مسند امام احمد ابن حنبل میں منقول ہیں۔

۳: ابی بن کعب، زید بن ثابت، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم سے مروی احادیث کی تخریج امام بیہقی نے السنن الکبریٰ میں کی ہے۔

۴: قبیصہ بن حریث، انس بن مالک، عجما، سہل بن سعد، عبداللہ بن حارث بن الجزء رضوان اللہ علیہم کی روایات علامہ ہیثمی کی مجمع الزوائد میں منقول ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) نیز حضرت ابوہریرہ اور حضرت زید بن خالد جہنی سے رجم کا فتویٰ مؤطا امام مالک ص ۳۴۹ اور دیگر کتب صحاح میں دیکھا جاسکتا ہے

۵۔ وائل بن حجر سے روایت جمع الفوائد میں ہے۔

۶۔ حضرت عثمان غنیؓ اور ابوامامہ بن سہل بن حنیف کی حدیث مشکوٰۃ المصابیح میں دیکھی جا سکتی ہے۔

چھ کتب حدیث سے بتیس حضرات صحابہ سے مروی روایات کا یہ اجمالی ذکر ہے مزید تلاش وجستجو سے دیگر اور صحابہ کی احادیث بھی مل سکتی ہیں، کیا ان احادیث کثیرہ کے باوجود بھی یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ رجم سے متعلق احادیث خبر احاد ہیں اس لیے ان کے ذریعہ کتاب اللہ کے حکم "الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد منھما مائۃ جلدۃ" (زانیہ اور زانی ان دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو) پر زیادتی از روئے اصول وقواعد درست نہیں ہے؟

کیوں کہ یہ احادیث تعدد طرق وکثرت اسناد کی بنا پر از روئے اصول فقہاء و محدثین تواتر معنوی کی حد میں داخل ہیں اور تواتر معنوی سے کتاب اللہ پر زیادتی فقہائے امصار کے نزدیک متفقہ طور پر صحیح و درست ہے۔ ان احادیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی اس شرعی سزا کا نفاذ اسلامی حکومت میں جاری رہا، اس لیے یہ کہنا کہ آیت پاک الزانیۃ والزانی فاجلدوا الخ سے نبی کریمؐ کا عمل منسوخ ہوگیا، ایک صریح مطالعہ یا شریعت کے قانون واصول سے ناواقفیت ہے۔

افسوس کہ اپنی مصروفیات اور خود جس مقصد کے لیے یہ تحریر قلم بند کی جارہی ہے اس بات کی اجازت نہیں دیتیں کہ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی جائے ورنہ بتایا جاتا کہ مولانا عنایت اللہ سبحانی نے اپنی تازہ تصنیف "حقیقت رجم" میں نہ صرف علمی دیانت وامانت کا گلا گھونٹا ہے بلکہ صریح تحریف وتلبیس کا سہارا لے کر ایک ایسے شرعی حکم کا انکار کیا ہے جو تواتر معنوی اور اجماع وتوارث سلف وخلف سے ثابت ہے اور اس طرح انھوں نے صحابۂ کرام، سلف صالحین، ائمہ مجتہدین، کبار محدثین کے طریقۂ مسلوکہ کو چھوڑ کر خوارج ومعتزلہ کی راہ اختیار کی ہے، جسے گمراہی نہ سمجھنا بجائے خود ایک گمراہی ہے

مزید براں سنبھالی صاحب نے اپنی اس تلبیس آمیز وضلالت انگیز کتاب میں صحابیٔ رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے تقدس وعظمت کا جس طرح عامیانہ مذاق اڑایا ہے اور ان کی شان میں جس قسم کے نازیبا بازاری الفاظ استعمال کیے ہیں انھیں دیکھ کر تو دل لرز اٹھتا ہے جس کی مثال یہود ونصاریٰ کے یہاں بھی اپنے رسولوں کے اصحاب کے بارے میں شاید تلاش وجستجو کے بعد بھی نہ ملے، رہا اپنی تائید میں سنبھالی صاحب کا محدث عصر علامہ انور شاہ کشمیری رہ وغیرہ اکابر دیوبند کا نام لینا، تو اس کے بارے میں حافظ شیرازی کا یہ مصرع حقیقت حال سمجھنے کے لیے کافی ہوگا۔

ع چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

بقیہ : وعظ......

اور مومن کا اصل مقام تو آخرت ہی ہے اس لیے ہمیشہ اپنے سامنے آخرت ہی ہونا چاہیئے اور دنیا تو چند روز ہے بہر صورت گذر ہی جائے گی۔ آخرت باقی رہنے والی چیز ہے۔ اسی فکر کی رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی ہے اور حکم بھی فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح صحیح دین سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق نصیب فرمائیں۔ آمین۔

اسلام کے ہیں ؟
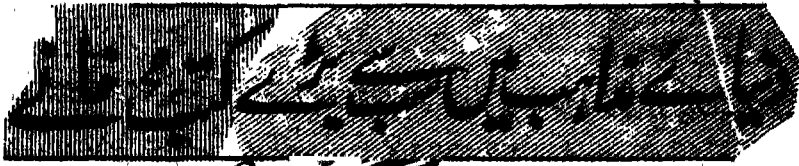
حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب ۔ ایم اے ۔ پی ایچ ڈی ۔ مانچسٹر

الحمد للّٰہ والسلام علی عبادہ الذین اصطفی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اما بعد ۔۔۔۔

دنیا کے مشہور مذاہب میں ہر ایک کچھ نہ کچھ آسمانی کتابوں کا دعوے دار ہے ۔ آسمانی کتابیں ہر ایک کے یہاں الٰہی ہدایت نامہ سمجھی جاتی ہیں ۔ ہر ایک کے عقیدے میں یہی وہ علمی خزانہ ہے جس سے ان کا مذہب آگے چلتا ہے ۔ پھران کتابوں پر ان امتوں کی ایک اپنی علمی تاریخ ہے ' اسے ان کے آداب ' عبادات اور رسم رواج کہتے ہیں ۔ سو ہر ایک کا علمی کتبخانہ ایک کتاب اور اس کے حاشیے کی چند کتابوں سے زیادہ نہیں ۔ تورات کے ساتھ تالمود ویدوں کے ساتھ اپنشد اور شاستر ۔ اوستا کے ساتھ ژند اور پاژند اور انجیل کے ساتھ اناجیل اربعہ ' رسولوں کے اعمال اور چند مکاشفات چلے ۔ ان سب میں مسلمانوں کا دینی علم بھاری رہا اور قرآن کریم کے ساتھ ساتھ اس علمی خزانہ کا علمی نقش چلا جس نے آگے جا کر کتب احادیث کی شکل اختیار کر لی اور امت اس پر مامور رہی کہ احادیث میں سنت کی تلاش کرے اور اس پر عمل پیرا ہو ۔

ہر مذہب کے اپنے علمی کتب خانے :

دنیا میں آپ کو ہر بڑی لائبریری میں RELIGION کی ایک شاخ ملے گی ۔ پھر اس میں ہر مذہب پر لکھی گئی کتابیں ملیں گی ، اور ہر مذہب کے اپنے علمی کتب خانے ہونگے اس پہلو سے اگر آپ دیکھیں تو صرف اسلام ایک ایسا دین ملے گا جس پر سب سے زیادہ کتابیں لکھی گئیں اور اس میں بھی اس کے ان پہلوؤں پر جن کا تعلق LAW اور

اس کے عدالتی نظام سے ہے یہاں تک کہ دین اسلام پر مستقل بڑی بڑی لائبریریاں قائم ہوئیں اور مسلمانوں نے قرون اولیٰ میں سائنس اور دیگر فنون کے جن جن گوشوں پر کام کیا وہ سب دستاویزات بھی ان علمی خزانوں کی رونق بنیں، اور مسلمانوں کے علمی کتبخانے دیگر سب قوموں کے کتب خانوں سے بڑھ گئے۔

علم اسلامی کے پھیلاؤ کی وجوہات:

اسلام میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی اور نبی کی آمد نہیں آپ خاتم النبیین ہیں، سو آپ کا دین (قرآن وسنت) قیامت تک کے لیے بنی نوع انسان کی رہنمائی کی قوت رکھتا ہے' اس عقیدہ کی وجہ سے مسلمانوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی جملہ روایات کو محفوظ کیا' انھیں آگے روایت کیا اور کتابوں میں لکھا.... اور دیکھتے دیکھتے قرآن کے گرد حدیث کی بہت سی کتابیں جمع ہوگئیں۔

دینی علوم میں ایک نئے علم کا اضافہ ہوا' پہلے انبیاء کے دور میں ان کی روایات محفوظ کرنے کا یہ طور نہ تھا جب ایک نبی کی تعلیمات ناپید ہوجاتیں تو اللہ تعالے اور نبی بھیج دیتے لیکن خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم کی آمد پر آپؐ اور آپ کے صحابہ کی تعلیم کا محفوظ کیا جانا ناگزیر تھا۔ اس ضرورت نے قرآن کریم کے ساتھ ساتھ علم حدیث کی ضرورت پیدا کی اور علم حدیث سے علم اسناد کا ایک نیا باب کھلا۔ پھر مراد حدیث معلوم کرنے اور اس سے صحیح نتائج حاصل کرنے کے لیے شرح حدیث کے ایک اور باب کا اضافہ ہوا' اور دیکھتے دیکھتے علم اسلام ہزاروں کتابوں تک جا پہنچا جس میں علم تفسیر' علم حدیث' اسماء الرجال اور شرح حدیث کے اچھلتے سمندر موج زن تھے۔

یہ ان مسائل کا تحفظ تھا' جو کتاب وسنت میں منصوص ملے' صحابہ کے فتاویٰ اور فیصلے بھی ان تمام ضروریات کو محیط نہ ہو سکتے تھے جو امت مسلمہ کو قیامت تک پیش آنے والی تھیں۔ سو ان سمندروں کی گہرائی میں اترنا' اور بطریق استنباط غیر منصوص مسائل کا حل دریافت کرنا' ان اصولوں کو منضبط اور منقح کرنا جن کے تحت قرآن وسنت سے ان نئے نئے مسائل کا استخراج کیا جا سکے از حد ضروری تھا۔ تابعین کرام' امام ابراہیم نخعی ؒ (۹۶ھ)، قاسم بن محمدؒ (۱۰۷ھ)، سالم بن عبداللہ (۱۰۶ھ)

حضرت سعید بن مسیب (۹۴ھ) جیسے بہت سے مجتہد ان گہرے سمندروں میں اترے اور لاکھوں نئے مسائل ان پرانے ماخذوں سے دریافت کیے لیکن اسلام کو اس کے پورے اصول و فروع کے ساتھ منضبط کرنے کا کام اور اسے بطور ایک ابدی قانونِ زندگی کے لیے مرتب کرنا ابھی باقی تھا۔

اس باب میں پہل حضرت امام ابوحنیفہ رح نے کی، پھر حضرت امام مالک رح، حضرت امام ثوری رح، حضرت امام زفر رح، حضرت امام ابویوسف رح، حضرت امام اوزاعی رح، حضرت امام لیث مصری رح، حضرت امام محمد رح، حضرت امام شافعی رح اور حضرت امام احمد رح اس میدان میں آگے بڑھے یہاں تک کہ فقہ اسلام کے کروڑوں نئے مسائل مرتب ہوگئے اور اسلامی لائبریریوں میں جب کتب فقہ کا اضافہ ہوا اور ان کی شروح دیکھ ماہرین قانون کے سامنے آئیں تو علوم اسلام دنیا کی سب سے بڑی مذہبی لائبریری بن گئے۔ ازہر [مصر] بغداد، قرطبہ، دمشق، مشہد اور دہلی کے اسلامی کتب خانے علم اسلام کا ایک تاریخی فطری پھیلاؤ تھے، علم اصول نے ان سب کو ایک نظام میں مرتبط کر رکھا تھا۔

اہل حدیث حضرات کا ہفت روزہ پرچہ "الاعتصام" لاہور اپنی ۱۳ر جنوری ۹۵ء کی اشاعت میں مجتہدین اور اجتہاد کو تسلیم کرنے کو اسلام کے جامع ضابطہ حیات ہونے کے لیے ایمانیات میں سے سمجھتا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ:

"عقیدے کو درست رکھنے کے لیے مجتہدین کے وجود اور اجتہاد پر ایمان رکھنا ضروری ہے بلکہ اس دین کے ناپید نہ ہونے کی ایک اہم دلیل یہ بھی ہے کہ مجتہدین کے ذریعہ اللہ نے اس دین کی حفاظت فرمائی۔" (ہفت روزہ الاعتصام لاہور ص۱۱)

موصوف یہ بھی لکھتے ہیں کہ اجتہاد کا دروازہ مجتہدین نے نہیں خدا نے کھولا ہے اور اسی راہ سے اسلام کو پورے بنی نوع انسان کے لیے ایک جامع اور مکمل ضابطہ حیات تسلیم کیا گیا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں کہ:

"اسلام تا قیامت اللہ تعالیٰ کا انسانیت کے نام آخری اور مکمل ضابطہ حیات ہے جو بصرف نظر از زمان و مکان اور رنگ و زبان سارے ہی انسانوں کے لیے

واحد راہِ نجات ہے اس ضابطۂ حیات کو ہر وقت اور ہر جگہ قابلِ عمل بنانے کے لیے اللہ نے اجتہاد کا دروازہ کھولا۔ اور اسی کو سارے انسانی مسائل کے بند قفلوں کو کھولنے کی شاہ کلید بنایا۔" (ص۱۱۲)

یہ وہ وجوہات ہیں جو علم اسلام کے وسیع پھیلاؤ کا موجب ہوئیں۔ آئیے ہم ان بڑے بڑے علماء کی زندگیوں اور ان کے علمی کارناموں کا بھی ایک جائزہ لیں جو علم اسلام کے ان وسیع اور عمیق سمندروں کے کامیاب شناور رہے اور اس خوبی اور حسن تدبیر سے وہ ان سمندروں میں اترے کہ ان کا اختلاف انھیں آپس میں نہ لڑا سکا، وہ اپنی پوری علمی کاوشوں کے باوجود دوسروں کی تضلیل وتفسیق سے پوری طرح بچے رہے، جو اختلاف سامنے آیا اسے ایک مجتہد کے اختلاف کا درجہ دیا جس میں مخطی بھی اللہ کے یہاں ایک اجر پاتا ہے وہ مختلف مسالک پر عمل پیرا ہونے کے باوجود فرقہ فرقہ نہ ہوئے اور بطور فرقہ ان سب کا ایک ہی ٹائیٹل رہا۔ اہل السنت والجماعت تہتر فرقوں میں، یہ سب ایک فرقہ تھے جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابہ کی جماعت کو ساتھ لے کر چلا ہے۔ یہ روافض وخوارج، معتزلہ اور کرامیہ اور مرجیہ کے خلاف تو بے شک ایک فرقہ تھے لیکن آپس میں بطور حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی یہ چار فرقے نہ بنے، چاروں ایک رہے۔ فروعات کی یہ چار راہیں انھیں چار فرقے نہ بنا سکیں۔

ان چاروں راہوں میں بڑے بڑے جبال العلم (علم کے پہاڑ) چلے اور ان گہرے سمندروں میں بڑے بڑے شناور اترے۔ حدیث وفقہ کی ضخیم کتابوں کو اگر گہری نظر سے دیکھیں اور ان کو ان کے باہمی اختلافی مسائل اتراہوا دیکھیں انھیں ایک دوسرے کے خلاف استدلال کرتے ملاحظہ کریں تو انھیں کہیں ایک دوسرے کے خلاف نفرت پیدا کرتے نہ دیکھیں گے نہ کہیں انہیں ایک دوسرے کی تفسیق وتضلیل کرتا پائیں گے۔ بخلاف ان ہمارے دور کے غیر مقلدین کے کہ ان میں دوسرے مذاہب کو ساتھ لے کر نکلنے اور انھیں اختلاف اجتہاد کا حق دینے کی کوئی ہمت نہیں، اور ان میں مسائل میں تطبیق پیدا کرنے کا اسلاف کا سا رنگ ہرگز نظر نہ آئیگا بس یہی معلوم ہوگا کہ صحابہ اور تابعین جس طرح ایک دوسرے کے اختلافات نہایت وسعت قلبی کے ساتھ برداشت کرتے تھے ان کے تنگ سینوں میں وہ وسعت ظرفی

سی درجے میں موجود نہیں، اور وہ فروعی مسائل کے امتیاز سے ایک علیحدہ فرقہ بنانا بھی جائز سمجھتے ہیں۔ اور ایک فرقہ بننے کو اپنی انتہائی کامیابی جانتے ہیں۔ ع

بریں عقل و دانش ببایدگریست

اہل علم اس بات سے واقف ہیں کہ سلف صالحین میں اس فرقے کا نام تک نہ تھا۔ لوگ یا عالم اور مجتہد ہوتے تھے یا پھر ان کے مقلدین تھے، غیر مقلدین کے طور پر کوئی تیسرا گروہ (جو نہ عالم لوگوں کا ہو نہ مقلدین کا) اس وقت موجود نہ تھا۔ اس دور کے غیر مقلدین جو نہ عالم ہوتے ہیں نہ مقلد، اپنے آپ کو محققین اور محدثین کہہ کر دن رات غلط بیانی کرتے ہیں۔ یہ گروہ قرون اولیٰ میں ہرگز موجود نہ تھا۔ اس لیے ان لوگوں کا اس دور میں اہل حدیث کے نام سے اپنا فرقہ وارانہ امتیاز پیدا کرنا اور اپنی علیحدہ مسجدیں بنانا یہ صرف بیسویں صدی عیسوی کی ایجاد ہے۔ اس سے قبل کہیں اس فرقے کی نہ علیحدہ کوئی جماعت تھی نہ کوئی مسجد، اور نہ کہیں عوام اس نام سے موسوم ہوتے تھے۔

مسالک اربعہ کی آپس میں رواداری اور ان غیر مقلدین کے یہاں مقلدین بالخصوص حنفیوں کی دل آزاری یہ وہ جوہری فرق ہے جو اہل حدیث کہلانے والے غیر مقلدین کو مذاہب اربعہ سے جدا کرتا ہے۔ یہ مسالک اربعہ آپس میں سے کسی کو گمراہ نہیں کہتے اور یہ غیر مقلدین کھلے بندوں مقلدین کی تضلیل کرتے ہیں، انھیں اہل حق میں سے نہیں سمجھتے اور محض اس لیے کہ یہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہیں پڑھتے، کہتے ہیں کہ اس طرح حنفیوں کی نماز نہیں ہوتی۔

مذاہب اربعہ کے ہزار سال کے ایسے اختلافات امت پر وہ بوجھ نہیں بنے جو یہ لوگ اپنی ستر سالہ تاریخ میں امت پر گرا نبار ہو گئے۔ مولانا محمد اسماعیل آف گوجرانوالہ (جو بلا تاریخ سابق اپنے لیے سلفی کا لقب اختیار کیے ہوئے ہیں) مولانا غلام اللہ خاں مرحوم، مولانا محمد طاہر پنج پیری اور مولانا عنایت اللہ شاہ بخاری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :

"مولوی حسین علی صاحب کے مریدوں میں توحید کی حمایت اور اہل توحید سے محبت تو ہے لیکن بعض کو سنت سے بہت زیادہ بغض ہے۔ مدرسہ دیوبند

میں اختلاف کے ساتھ جو چیز مشترکہ طور پر پائی جاتی ہے وہ اہل حدیث سے بغض ہے" (منقول از تعریفات نتائج التقلید ص۔)

یہ علماء غیر مقلدین کی زبان ہے وما تخفی صدورھم اکبر ان کے دلوں میں مسالک اربعہ کے خلاف جو بوجھ ہے وہ خدا ہی جانتا ہے۔ اب ان کے بالمقابل امام بخاری کو دیکھئے، آپ قرأت خلف الامام میں پوری امت میں متشدد سمجھے جاتے ہیں (واشار الیہ الترمذی فی جامعہ) آپ کے جلیل القدر استاد امام احمد بن حنبل رہ (بیشتر سعودی مشائخ ان کے مقلد ہیں) فرماتے ہیں کہ حدیث لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب اکیلے نمازی کے بارے میں ہے امام کے پیچھے نماز پڑھنے والے کے بارے میں نہیں، امام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہ پڑھنے سے بھی نماز ہو جاتی ہے ———— اب آپ کو امام بخاری کے یہاں یہ قول کہ امام احمد کو سنت سے بغض تھا یا یہ کہ وہ یہ فتوے دے کر گمراہ ہو گئے ہیں، کہیں نہ ملے گا۔ اسی طرح امام شافعی فاتحہ خلف الامام کو فرض سمجھتے تھے، مگر ان کے استاد امام محمد مرحوم کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھنے کے قائل تھے، انھوں نے بھی (امام شافعی رہ نے) اپنے استاد کے متعلق کبھی نہ کہا کہ انھیں سنت سے بغض تھا یا یہ کہ وہ دیدہ و دانستہ حدیث کے خلاف تلے ہوئے تھے۔ امام فی الحدیث سفیان ثوری جو محمد بن کثیر کے واسطہ سے حضرت امام بخاری رہ کے استاد ہیں، رکوع جاتے وقت رفع یدین نہ کرتے تھے۔ کما نص علیہ الترمذی ..... مگر امام بخاری رہ نے ان پر کہیں اس قسم کے ریمارک (REMARK) نہ کسے کہ انھیں سنت سے بغض تھا۔ اگر انصاف دنیا سے کہیں رخصت نہیں ہو گیا تو کیا کوئی انصاف پسند کہہ سکتا ہے کہ ہمارے کرم فرما مولانا محمد اسماعیل آف گوجرانوالہ محدثین کے مذہب پر نہیں اور انھیں دوسرے مسالک کو برداشت کرنا آتا ہے۔

تحقیقات حدیث میں اپنے سے اختلاف رکھنے والوں کے خلاف بغض کا یہ لاوا جو مولانا محمد اسماعیل اور ان کے ہم خیال لوگ دن، رات اگلتے ہیں، امت کے لیے ہرگز کوئی اتحاد کا پلیٹ فارم مہیا نہیں کر سکتا، اتحاد امت کی راہ آپ کو اسی رواداری میں ملے گی جو سواد اعظم اہل السنۃ والجماعۃ کے چاروں مذاہب نے آپس میں اختلاف کے باوجود قائم رکھی ایک دوسرے کے مسلک کو اجتہاد کا اختلاف مانا۔ کتاب وسنت سے بغض نہ گردانا اور ایک

دوسرے اماموں کو مجتہد کے درجے میں امام تسلیم کرتے رہے ...... کسی کے بارے میں نہ کہا کہ وہ تو مجتہد نہ تھا، مقلدین کسی مسلک کے بھی ہوں وہ دوسرے ائمہ کے اقوال واجتہادات کو برابر ذکر کرتے ہیں، اور ائمہ اربعہ کی علمی امامت سے ان حضرات میں سے کبھی کسی نے اختلاف نہیں کیا، کسی مسلک کے کسی مقلد نے جوش بیان میں کبھی کسی کے خلاف کوئی بات لکھ بھی دی تو بعد کے آنے والے علماء نے اس پر تنقید کی تاہم اس بات سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ ایسی باتیں متاخرین کو اپنے قدماء کے کلام میں دو چار سے زیادہ نہ ملیں گی۔

ہمارے یہاں یہ محدثین وفقہاء جو ہزار سال کے قریب پوری دنیائے اسلام پر چھائے رہے، اپنے اپنے مسلک کے مقتدر عالم سمجھے جاتے ہیں اور انہی کے فتوؤں اور انہی کی کتابوں پر اس راہ کے سالکین چلے، ان کے باہمی ربط وتعلق ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی وسعت، علمی عبقریت اور حضرت امام اعظمؒ کی زبردست قوت استدلال کو تسلیم کرنے میں آپ کو ان میں کوئی فرق یا فاصلہ نہ ملے گا۔

عصر حاضر کے اہل حدیث کہلانے والوں میں اگر کسی میں مسالک اربعہ کے ربط وتعلق اور قوت برداشت کی جھلک ملے گی تو وہ امرتسر کے حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی تھے اور اب یہ رنگ کسی میں باقی ہے تو وہ ان کے صاحب زادہ مولانا محمد داؤد غزنوی ہیں۔

مقلدین کا نظریہ تقلید علمی تلاش میں کبھی رکاوٹ نہیں بنا:

مقلدین کے یہاں پہلے علمی ماخذ ہمیشہ سے کتاب وسنت رہے ہیں کوئی فقہ اور کوئی اجتہاد کتاب وسنت کی برابری نہیں کرسکتا، ہاں سنت میں اگر کہیں متعارض روایات ملیں اور ان میں تقدیم وتاخیر بھی قطعی درجے میں معلوم نہ ہو تو ان مسائل میں صحابہ میں بھی ہو عالم اَعْلَمْ کی طرف رجوع کرتا نظر آتا ہے اور اسی طرح اسلام کی علمی تاریخ چلتی رہی۔

بایں ہمہ مقلدین میں سے کسی کے یہاں امام کا درجہ شارع کا نہیں سمجھا جاتا نہ کسی کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ مجھ سے آخرت میں یہ سوال ہوگا۔ کہ تم نے اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ یا فلاں امام کی فلاں بات کیوں نہیں مانی۔ یہ سب ائمہ علم ہیں جو محض اس لیے پیشوا مانے گئے ہیں۔

کہ یہ ہیں کتاب وسنت کے قریب کرنے والے اور کتاب وسنت کے سمندر میں اتر کر ان کے مسائل غیر منصوصہ کو دریافت کرنے والے تھے اور ہم ان مسائل میں ان کے پیرو ہیں۔

ان سب کے باوجود مقلدین کے یہاں علمی تلاش میں کبھی کوئی کمی روا نہیں رکھی گئی اور نہ کسی پر مزید تحصیل علم اور تحقیق کا دروازہ بند کیا گیا۔ یہ علامہ عینی رہ مقلد ہیں جو صحیح بخاری کی شرح لکھ رہے ہیں اور ایک ایک حدیث کی پڑتال کر رہے ہیں ایک ایک حدیث کی مراد معلوم کر رہے ہیں۔ اسی طرح حافظ ابن حجر شافعی مقلد ہیں مگر علم حدیث کے گہرے شناور ہیں اگر ان کا یہ عقیدہ ہوتا کہ امام شافعی رہ کی بات اعتماداً مان لینے کے بعد اب انھیں کوئی حدیث کی تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، تو آپ ہی بتلائیں انھوں نے فتح الباری کیوں لکھی؟ امام ابن ہمام رہ کو لیجئے، اس قدر اونچے محدث ہیں کہ اجتہاد کے درجے پر سرفراز نظر آتے ہیں مگر علم حدیث کے کس پائے کے محقق ہیں یہ کسی سے مخفی نہیں۔ امام نووی رہ کو دیکھئے۔ امام شافعی رہ کے پختہ مقلد ہیں مگر حدیث کے کتنے بڑے متبحر عالم ہیں یہ صورت حال بتلا رہی ہے کہ ائمہ اربعہ کی تقلید ان اعیان علم کو کتاب وسنت کی مزید تحقیقات سے کبھی روک نہیں سکی۔ انھیں جب کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے ائمہ کی بلا طلب دلیل پیروی کرتے ہیں تو اس سے مراد وہ خاص دلیل ہے جس کی بنا پر اس امام نے وہ بات کہی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اس مسئلہ پر اور دوسرے دلائل میں بھی کبھی نہیں اترتے یا ان دوسرے دلائل سے وہ اپنے تقلید کے موقف کی کہیں تائید نہیں کر پاتے۔ تقلید کوئی مرتبہ جہل کا نام نہیں کہ اب مقلدین کے آگے مزید تحقیقات کے دروازے بند سمجھے جائیں اگر ایسا ہوتا تو حافظ ابن حجر رہ شافعی۔ حافظ بدرالدین عینی رہ حنفی۔ حافظ ابن ہمامؒ حنفی اور حافظ جلال الدین سیوطی رہ شافعی کبھی حدیث وفقہ کی اتنی گہرائیوں میں نہ اترتے جو آج ان کی ضخیم کتابوں میں ملتی ہیں۔

الحمدللہ آج اسلامی کتب خانے اگر آباد ہیں تو انھیں مقلدین کی علمی تحقیقات سے جنھوں نے اولاً تو اپنے امام پر اعتماد کر کے مسائل غیر منصوصہ متعارضہ غیر معلومۃ التقدیم و التاخیر میں اس کے فیصلوں اور فتوؤں کو بلا طلب دلیل قبول کیا اور بعد ازاں حدیث وفقہ

مجتہدین کرام کے اجتہاد اور فقہ سے تو بھاگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں قرآن وحدیث کافی ہے کسی تیسری چیز کی ضرورت نہیں لیکن تیرھویں صدی ہجری کے قاضی شوکانی یمنی (۱۲۵۵ھ) کی فقہ سے بہت عقیدت رکھتے ہیں۔ غیر مقلدوں کے ہفت روزہ الاعتصام لاہور کی اشاعت میں ہے کہ:

" میں پاکستانی قانون دانوں اور قانون سازوں اور داعیان اسلام سے پرزور اپیل کروں گا کہ وہ یمنی زرخیز افکار اور تجربات سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں خاص طور پر شریعت کو قانونی روپ میں ڈھالنے کی یمنی کوششوں سے" (پرچہ مذکورہ ۱۳ جنوری ۹۵ء ص ۱۱)۔

تعجب ہے کہ یہاں کسی اہل حدیث عالم نے انگلی نہیں اٹھائی کہ مدنی افکار کے ہوتے ہوئے ہمیں یمنی افکار (اصول فقہ) سے استفادہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَار۔

جن حضرات کی مخلصانہ کوشش سے فقہ وحدیث کے علمی یہ چشمے امت میں جاری رہے اور ان میں ایک دوسرے کے لیے وسیع قوت برداشت تھی نامناسب نہ ہوگا کہ ہم ان کے کچھ اسمار گرامی بھی ذکر کر دیں جو ہمارے ان کتب خانوں کی وسعت کا موجب ہوئے پہلی چار صدیوں کے اکابر تمام مسالک کا مشترک سرمایۂ علمی ہیں اس لیے ہم ان کے بعد پانچویں صدی سے ہر مسلک کے کچھ اسماء کا ذکر کرتے ہیں اور یہ ہماری طرف سے ان اکابر اہل اسلام کو بلا امتیاز مسلک ایک نیازمندانہ خراج تحسین ہے۔

حضرات مالکیہ کے اکابر اہل علم جو اس امت کی علمی کشتی کو گھرے سمندروں میں کھیتے رہے اور باوجود اپنے ممتاز مسلک کے دیگر سب علماء کے ساتھ مل جل کر رہے اور انہیں اپنے ساتھ ایک دائرہ (اہل السنۃ والجماعۃ) میں رکھا اور سمجھا

۱: شیخ ابوالحسن علی ابن بطال البکری القرطبی (۴۴۹ھ)

۲: حافظ ابوعمر ویوسف بن عبداللہ ابن عبدالبر (۴۶۳ھ)

کے گہرے سمندروں سے علم وتحقیق کے مزید وہ جواہر جمع کیے جن سے انھیں اپنے تقلیدی مسائل پر مزید توثیق ملی، اور صحابہ کے اختلاف کو برداشت کرنے اور ائمہ اربعہ کی تقلید میں وسعت عمل کی وہ راہیں ملیں جس نے امت کو ان اختلافات کے باوجود اہل السنۃ والجماعۃ کی ایک لڑی میں پرو دے رکھا، اور مسالک اربعہ کے مقلدین آپس میں ہزاروں اختلافات کے باوجود علیٰحدہ علیٰحدہ فرقے نہ بنے۔ اس پس منظر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر دنیائے مذاہب میں اسلام کے کتب خانے باقی سب مذاہب کے مذہبی کتب خانوں سے بڑے ہیں تو اس کی وجہ علم اسلام کی استنباط واستخراج کی راہ سے وہ نادر تحقیقات ہیں جن کی مثال دنیا کے اور کسی مذہب میں نہ ملے گی۔

اسلامی کتب خانوں کی یہ تاریخ اور تفصیل جو ہم نے لکھی ہے یہ ان کتابوں کے علاوہ ہے جو اسلام کے دوسرے بڑے بڑے اہم عنوانات پر لکھی گئیں۔ علم تاریخ، علم ادب، فقہ النثر، نقد الشعر اور لغت کے بڑے بڑے ذخیرے ان کے علاوہ ہیں سیر کی کتابیں صحابہ پر لکھی گئی کتب سیرت، ائمہ مؤرخین اور فقہاء پر لکھے گئے تذکرے پھر معتزلہ وکرامیہ، روافض و خوارج، قادیانیوں اور عیسائیوں بہائیوں اور اسماعیلیوں پر لکھی گئی کتابیں مختصر اور مطول، ان کے علاوہ ہیں۔ ان سب علمی کاوشوں پر نظر کرتے ہوئے یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ مسالک اربعہ کے مقلدین صرف اپنے ابواب فقہیہ میں بند نہیں رہے مختلف علوم کی منجدھاروں میں انہوں نے وہ غوطے کھائے اور پھر اتنی کامیابی اور سرخ روئی سے یہ ان سمندروں پر تیرے کہ تقلید کسی مرتبہ جہل کا نام نہ رہا، یہ اس سڑک کا نام ہوگیا جو عہد صحابہ سے علم کے انھیں پیمانوں سے مسلسل چلی آرہی ہے جو اس وقت علماء کے پاس پڑھنے اور پڑھانے کے ہیں اور ہم ہر نماز میں خدا سے یہ دعا کرتے ہیں کہ "ہمیں انہی لوگوں کی راہ پر چلا جن پر تیرا انعام ہوا" اور یہ ظاہر ہے کہ یہ صرف انبیاء نہیں ان میں کئی دوسرے بھی ہیں جو ہمہ تن اللہ کے آگے جھکے ہوئے اور انابت کی دولت پائے ہوئے تھے قرآن کریم کا حکم وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ۔ [۳۱] انہی کے متعلق ہے۔

ہمیں اپنے غیر مقلد دوستوں سے اس باب میں اختلاف ہے کہ وہ پہلے دور کے

۳۔ علامہ ابوالولید الباجی المالکی (۴۹۴ھ)
۴۔ شیخ ابوالفضل قاضی عیاض بن موسیٰ سبتی (۵۴۴ھ)
۵۔ قاضی ابوبکر محمد بن عبداللہ ابن العربی (۵۴۶ھ)
۶۔ علامہ ابوالولید محمد بن احمد المعروف بابن رشد (۵۹۵ھ)
۷۔ امام عبداللہ محمد بن احمد انصاری القرطبی (۶۷۱ھ)
۸۔ علامہ ابواسحاق ابراہیم بن موسیٰ الشاطبی (۷۹۰ھ)
۹۔ علامہ ابوزید عبدالرحمان بن محمد ابن خلدون (۸۰۸ھ)
۱۰۔ علامہ محمد بن عبدالباقی بن یوسف الزرقانی (۱۱۲۲ھ)

حضرات شوافع کرام من مقلدی الامام الشافعیؒ (۲۰۴ھ)

۱۔ امام ابوبکر احمد بن الحسین البیہقی (۴۵۸ھ)
۲۔ علامہ ابوبکر احمد بن علی الخطیب البغدادی (۴۶۳ھ)
۳۔ امام محمد بن محمد ابوحامد الغزالی (۵۰۵ھ)
۴۔ امام محمد بن عمر بن الحسین المعروف بفخرالدین الرازی (۶۰۶ھ)
۵۔ حافظ زکی الدین ابومحمد عبدالعظیم بن عبدالقوی المنذری (۶۵۶ھ)
۶۔ امام محی الدین ابوزکریا یحییٰ بن شرف الدین النووی (۶۷۶ھ)
۷۔ امام حافظ اسماعیل بن عمر المعروف بابن کثیر (۷۷۴ھ)
۸۔ حافظ ابوذرعہ الدمشقی (۸۲۶ھ)
۹۔ حافظ شہاب الدین احمد بن علی المعروف بابن حجر (۸۵۲ھ)
۱۰۔ حافظ عبدالرحمان بن کمال الدین ابوبکر المعروف بجلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ)

حضرات حنابلہ کرام من مقلدی الامام احمد ابن حنبل الشیبانیؒ (۲۴۱ھ)

۱۔ قاضی ابویعلی حنبلی (۴۵۸ھ)
۲۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی (۵۶۱ھ)
۳۔ حافظ ابوالقاسم علی بن الحسن المعروف بابن عساکر (۵۷۱ھ)

۴: حافظ ابوالفرج عبدالرحمان بن علی الجوزیؒ (۵۹۷ھ)

۵: حافظ عبدالغنی بن عبدالواحد المقدسیؒ (۶۰۰ھ)

۶: حافظ امام موفق الدین ابن قدامہؒ (۶۲۰ھ)

۷: حافظ تقی الدین ابوالعباس احمد ابن تیمیہؒ (۷۲۸ھ)

۸: حافظ ابوعبداللہ شمس الدین الذہبیؒ (۷۴۸ھ)

۹: حافظ شمس الدین ابوعبداللہ بکر بن ایوب المعروف بابن القیم (۷۵۱ھ)

۱۰: حافظ زین الدین عبدالرحمان بن احمد المعروف بابن رجب (۷۹۵ھ)

حضرات السادۃ الحنفیۃ من مقلدی الامام الاعظم ابی حنیفۃ النعمان (۱۵۰ھ)

۱: حافظ ابوبکر محمد بن ابی سہل السرخسی (۴۸۳ھ)

۲: حافظ ابوبکر علاء الدین بن مسعود الکاسانی (۵۸۷ھ)

۳: امام ابوالحسن علی بن ابی بکر برہان الدین المرغینانی (۵۹۳ھ)

۴: حافظ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد بن مسعود النسفی (۷۱۰ھ)

۵: حافظ جمال الدین ابومحمد عبداللہ بن یوسف زیلعی (۷۶۲ھ)

۶: علامہ الشیخ ابراہیم الحلبی (۷۸۹ھ)

۷: حافظ امام بدرالدین محمود بن احمد العینی (۸۵۵ھ)

۸: امام کمال الدین محمد بن عبدالواحد المعروف بابن الہمام (۸۶۱ھ)

۹: حافظ زین الدین بن ابراہیم المعروف بابن نجیم (۹۷۰ھ)

۱۰: مجدد مأتہ دہم امام علی بن سلطان القاری (۱۰۱۴ھ)

دنیا میں سب سے زیادہ تعداد حنفیہ کرام کی ہے اس لیے نامناسب نہ ہوگا کہ ہم اس صف میں کھڑے دس اور بزرگوں کی نشاندہی بھی کردیں جو اس دور آخر میں اسی سلسلہ کے علم کے امین سمجھے گئے ہیں گو ہم انھیں ان چالیس بزرگوں میں ذکر نہیں کراتے۔

۱: ابوالاخلاص حسن بن عمار بن علی الشرنبلالیؒ (۱۰۶۹ھ)

۲: علامہ علاء الدین صاحب درمختار (۱۰۸۸ھ)

۳: حکیم الامت حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رہ (۱۱۷۶ھ)

۴: علامہ السید المرتضیٰ الحسنی الزبیدی رہ (۱۲۰۵ھ)

۵: حضرت الشیخ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رہ (۱۲۲۵ھ)

۶: حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رہ (۱۲۵۲ھ)

۷: علامہ محمود آلوسی صاحبِ روح المعانی (۱۲۷۰ھ)

۸: علامہ ابن عابدین الشامی رہ (۱۲۷۲ھ)

۹: حضرت علامہ طحطاوی رہ ( )

۱۰: علامہ زاہد الکوثری المصری (۱۳۷۱ھ)

یہ وہ حضرات ائمہ علم ہیں جو اپنے فقہی مسلک میں ممتاز ہوتے ہوئے دوسرے ائمہ علم کو برداشت کرکے چلے، ان کے دلائل پر ردّا اور قبولاً بحثیں تو کیں لیکن کبھی ان پر ضلال و گمراہی کی کمان نہ تانی، نہ یہ کبھی کہا کہ ان کی نماز نہیں ہوتی، نہ یہ کسی کو کہا کہ انھیں کتاب و سنت سے بغض اور چڑ ہے جو اختلاف بھی سامنے آئے اجتہادی اختلاف سمجھا اور اپنے صحیح ہونے کے دلائل ترجیح بیان کردیئے۔

ہم نے پہلے جو چالیس بڑے مسلمان ذکر کیے ہیں، یہ فقہ و حدیث کے گہرے سمندروں کے وہ کامیاب شناور ہیں جن کے بل بوتے اہل السنۃ والجماعۃ آج بھی آپس میں متحد اور ایک دائرہ میں منسلک سمجھے جاتے ہیں۔ جب فقہی اختلاف علیٰحدہ علیٰحدہ جماعت بندیوں میں لے آئے اور ان امتیازات پر مسجدیں علیٰحدہ علیٰحدہ بننے لگیں تو پھر یہ اختلافِ رحمت نہیں رہتا زحمت بن جاتا ہے۔

حضرات سادات حنفیہ کے جو اگلے دس اکابر ہم نے ذکر کیے ہیں وہ پہلے دس بزرگوں سے بھی زیادہ اعتدال کے ساتھ چلے ہیں۔ بارھویں صدی کے مجدد حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رہ اور زیادہ اعتدال کے ساتھ چلے اور ان کے گرد جو علماء اور تلامذہ جمع ہوئے انھوں نے مسالک اربعہ میں اور زیادہ برداشت اور رواداری کی فضا پیدا کی۔

ان کے بعد ہندوستان میں علماء دیوبند کی ایک ایسی صف نظر آتی ہے جو معارک قلم میں پورے برصغیر ہند و پاک، بنگلہ دیش اور برما میں اس اتحاد امت کے داعی رہے جو ان چالیس بڑے مسلمانوں کی ملی میراث اور علمی اساس تھی۔ نامناسب نہ ہوگا کہ ان میں سے بھی ہم یہاں دس اہل قلم کا ذکر کر دیں، جن پر دیوبند کی تاریخ بجا طور پر ناز کرتی ہے۔ یوں تو ان میں اور بھی بہت سے بزرگ اہل قلم گذرے لیکن ان میں جو حضرات امت کو اس دور میں کثیر علمی سرمایہ دے گئے ان میں یہ حضرات بہت ممتاز ہیں۔

۱۔ عمدۃ المحدثین حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رح (۱۳۴۶ھ)
۲۔ مجدد مائۃ چہاردہم حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رح (۱۳۶۲ھ)
۳۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیری رح (۱۳۵۲ھ)
۴۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا علامہ شبیر احمد عثمانی رح (۱۳۶۹ھ)
۵۔ محدث کبیر حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی ثم المدنی رح (۱۳۸۵ھ)
۶۔ رئیس المحدثین حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رح (۱۳۹۴ھ)
۷۔ شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رح (۱۳۹۴ھ)
۸۔ شیخ التفسیر والفقہ مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی رح (۱۳۹۶ھ)
۹۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی ثم المدنی رح (۱۴۰۲ھ)
۱۰۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رح (۱۴۰۳ھ)

علماء دیوبند کے ہم خیال طبقوں میں فرنگی محل کے علماء حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی رح (۱۳۰۵ھ) حضرت مولانا عین القضاۃ (   ) امام اہل سنت مولانا عبدالشکور لکھنوی رح (۱۳۸۱ھ) اور ندوہ کے اکابر میں حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رح (۱۳۷۳ھ) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم اور جمعیت علماء کے اکابر میں حضرت مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی رح (۱۳۸۲ھ) حضرت مولانا محمد میاں، اور علماء حیدرآباد دکن میں حضرت مولانا انوار اللہ فاروقی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور کئی دوسرے بھی متعدد اہل علم ہوتے ہیں مگر ہم ان سب کا تذکرہ یہاں نہیں کر رہے کہ (باقی صفحہ ... پر)

ماہ محرم کے فضائل اور عاشورہ کے روزہ کی فضیلت

ماثبت بالسنۃ فی ایام السنۃ ، ماخوذ ، محدث عبدالحق دہلوی رح

جامع الاصول کی احادیث

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ ماہِ رمضان کے روزے فرض ہونے سے پہلے عاشورہ کا روزہ رکھنے کا رواج تھا، لیکن جب ماہِ رمضان کے روزے فرض قرار دیئے گئے، تو سرورِ عالم نے ارشاد فرمایا' عاشورہ کا روزہ جس کا جی چاہے رکھے اور جس کا جی چاہے نہ رکھے۔

ایک روایت حضرت صدیقہ رض سے منسوب کر کے یہ بیان کی جاتی ہے کہ رسول اکرم نے عاشورہ کا روزہ رکھنے حکم دیا۔ (الحدیث)

حضرت عائشہ صدیقہ رض سے منسوب ایک روایت یہ ہے کہ ماہ رمضان کے روزے فرض ہونے سے پہلے لوگ عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے مگر رمضان کے روزوں کی فرضیت کے بعد رسول اللہ نے فرمایا' عاشورہ کا روزہ جس کا جی چاہے رکھے اور جس کا جی چاہے چھوڑ دے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رض سے مروی ہے کہ زمانہ جاہلیت میں قریش عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے' اور رسول اکرم بھی قبل نبوت یہ روزہ رکھا کرتے تھے یہاں تک کہ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں آپ نے دسویں محرم کو روزہ رکھا اور دوسروں کو بھی اس دن روزہ رکھنے کا حکم دیا اور یہ وہ دن تھا جس میں خانہ کعبہ پر غلاف چڑھایا جاتا تھا' لیکن جب رمضان کے روزے فرض کیے گئے تو آپ نے عاشورہ کا روزہ رکھنا ترک کر دیا' اور دسویں محرم کا روزہ اختیاری ہے جس کا جی چاہے رکھے اور جس کا جی چاہے نہ رکھے۔

(مسلم و بخاری)

یہی حدیث امام مالک' ابوداؤد اور ترمذی نے بھی لکھ کر آخر میں تحریر کیا ہے کہ جب

رمضان کے روزے فرض قرار دیئے گئے تو عاشورہ کا روزہ رکھنا یا نہ رکھنا فرض نہیں ہو سکتا۔

حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے رسول اللہؐ اور دوسرے مسلمانوں نے یہ روزہ قبل از فرضیت رمضان رکھا لیکن رمضان کے روزے فرض ہونے کے بعد رسول اللہؐ نے فرمایا، اللہ کے دنوں میں سے ماہ محرم کا دسواں دن بھی ہے۔ جس کا جی چاہے، اس دن روزہ رکھے۔ [ابوداؤد]

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی زبانی یہ روایت ہے کہ رسول اللہؐ کی خدمت میں ایک دن دسویں محرم کا تذکرہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا، روزہ عاشورہ وہ ہے جس میں لوگ بزمانہ جاہلیت روزہ رکھتے تھے۔ اب جس کا جی چاہے رکھے اور جس کا جی چاہے نہ رکھے۔ [بخاری و مسلم]

بخاری کی حدیث ہے کہ عاشورہ کا روزہ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے رکھا اور دوسروں کو اس دن روزہ رکھنے کا حکم دیا، لیکن جب ماہ رمضان کے روزے فرض قرار دیئے گئے تو آپ نے عاشورہ کا روزہ رکھنا ترک فرما دیا اور عبداللہ بن عمرؓ اتفاق پڑنے پر عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے[1]۔ مسلم میں اس حدیث سے متعلق لکھا ہے کہ جس کو پسند ہو عاشورہ کا روزہ رکھے اور جو ناپسند کرے وہ نہ رکھے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضہ کا بیان ہے کہ دسویں محرم کی یہودی بڑی تعظیم کرتے اور اسے عید کا دن مانتے تھے، اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا، اے مسلمانو! تم روزہ رکھو۔

ایک روایت ہے کہ خیبر[2] والے عاشورہ کا روزہ رکھتے اس دن عید مناتے، اپنی خواتین کو زیور اور اچھے لباس پہناتے، ان حالات کے پیش نظر رسول اکرمؐ نے فرمایا اے مسلمانو! تم عاشورہ کے دن روزہ رکھو۔ [بخاری و مسلم]

---

[1] چونکہ آپ اکثر و بیشتر ایام میں روزہ دار رہتے تھے آپ کے روزوں کے دنوں میں اتفاقاً اگر عشرہ محرم کا دن آجاتا تو اس دن بھی روزہ رکھ لیتے۔ از مترجم۔

[2] یہ خیبر والے یہودی تھے۔ از مترجم۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ نے مدینہ تشریف لاکر یہودیوں کو عاشورہ کا روزہ رکھتے ہوئے دیکھا تو ان سے دریافت فرمایا "یہ کیا بات ہے"؟ الخ یہودیوں نے جواباً کہا یہ وہ اچھا دن ہے جس میں اللہ نے حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کو ان کے دشمنوں سے چھٹکارا دلایا اور اس یوم نجات کے شکریہ میں حضرت موسےٰؑ نے روزہ رکھا یہ جواب سن کر آپ نے فرمایا، تمہاری بہ نسبت، حضرت موسےٰؑ کی پیروی کے ہم زیادہ مستحق ہیں، پھر آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے عاشورہ کا روزہ رکھ کر دوسرے مسلمانوں کو بھی اس دن روزہ رکھنے کے لیے فرمایا

ایک روایت ہے کہ خیبر کے باشندے یہودیوں سے جو مدینہ میں تھے رسول اکرمؐ نے دریافت کیا، عاشورہ کے دن تم کیوں روزہ رکھتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا، یہ وہ بڑا دن ہے جس میں اللہ نے حضرت موسےٰؑ اور ان کی قوم کو فرعون کے ظلم سے نجات دی، اسے اور اس کے گروہ کو دریا میں غرق کر دیا، اس پر حضرت موسےٰؑ نے اللہ کی شکر گذاری کے طور پر روزہ رکھا، اور یہ ماہ محرم کا دسواں دن تھا۔ اس لیے اب ہم اس عظمت کے پیش نظر اس دن روزہ رکھتے ہیں۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد)

حضرت جابر بن سمرہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ خود عاشورہ کا روزہ رکھتے ہم کو بھی اسی دن روزہ رکھنے کی رغبت دلاتے اور ہم سے قول و قرار لیتے تھے لیکن ماہ رمضان کے روزے فرض ہونے کے بعد آپ نے ہمیں عاشورہ کا روزہ رکھنے کا کوئی حکم نہیں دیا اور ممانعت بھی نہیں فرمائی، نیز ہم سے کوئی قول و قرار نہیں لیا۔ (مسلم)

حضرت علقمہ رضہ کا بیان ہے کہ اشعث بن قیس حضرت عبداللہ رضہ کے[1] پاس عاشورا کے دن آئے جو کھانا کھا رہے تھے، یہ دیکھ کر اشعث بن قیس نے کہا اے ابوعبدالرحمٰن! آج عاشورا کا دن ہے۔ اس پر حضرت عبداللہ نے جواباً کہا، رمضان کے روزوں کی فرضیت سے پہلے عاشورا کا روزہ رسول اللہؐ رکھا کرتے تھے لیکن رمضان کے روزے فرض ہونے

---

[1] ان حضرت عبداللہ کی کنیت ابوعبدالرحمٰن ہے۔

کے بعد آپ نے عاشورہ کا روزہ رکھنا ترک فرما دیا۔ اگر تم روزہ دار نہیں ہو تو لوگ کھانا کھاؤ۔
[بخاری و مسلم]

سلمہ بن اکوع کا بیان ہے کہ رسول اکرم نے ایک دن قبیلہ بنو اسلم کے ایک شخص سے فرمایا جاؤ اعلان کر دو کہ جس نے سحری کھائی ہو یا نہ کھائی وہ آج کے دن روزہ رکھے کیونکہ آج عاشورہ محرم ہے۔

ایک روایت میں یہ ہے کہ رسول اکرم نے قبیلہ بنو اسلم کے ایک آدمی سے فرمایا "اپنی قوم میں اعلان کر دو یا لوگوں کو مطلع کر دو" ان الفاظ کے رد و بدل میں خود راوی کو شک و شبہ ہے۔ [بخاری، مسلم، نسائی]

نیز عبدالرحمٰن بن سلمہ نے یہی روایت کی ہے جو ابو داؤد میں ہے۔

حضرت ربیع بنت معوذ رض کا بیان ہے کہ رسول اکرم نے ان دیہاتی انصاریوں کے پاس جو مدینہ کے اطراف رہا کرتے عاشورہ محرم کی صبح میں کہلا بھیجا 'آج جس نے روزہ رکھا ہو تو وہ پورا کرے اور جس نے نہ رکھا ہو وہ روزہ داروں کی مانند پورا دن گزارے اس حکم کے بعد ہم سب خود روزہ رکھتیں' اور چھوٹے بچوں کو بھی روزہ رکھواتی تھیں اور ہم عبادت وغیرہ کے لئے مسجد جاتی تھیں اگر کوئی بچہ کھانے کے لیے روتا تو اسے بہلانے کے لیے وہ اونی گڑیا جو ہم خود بناتی تھیں اس بچہ کو دے دیتی تھیں یہاں تک کہ افطار کا وقت آجاتا تھا۔ [بخاری و مسلم]

اسی طرح ایک اور روایت بھی ہے۔

قیس بن سعد بن عبادہ رض کا بیان ہے کہ عاشورہ کے دن ہم روزہ رکھتے اور روزہ نہ رکھنے کی صورت میں صدقۂ فطر دیا کرتے، لیکن ماہ رمضان کے روزے فرض ہونے اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم الٰہی آنے کے بعد رسول اللہ نے عاشورہ کا روزہ رکھنے یا ممانعت کا کوئی حکم صادر نہیں فرمایا، اور ہم لوگ عاشورہ کا روزہ رکھتے رہے۔
[نسائی]

محمد بن صیفی کا بیان ہے کہ رسول اکرم نے عاشورہ کے دن لوگوں سے دریافت

کیا کل تم میں سے کسی نے آج کچھ کھایا ہے؟ انہوں نے عرض کیا ہم میں سے بعض روزہ دار ہیں اور بعض بے روزہ، اس پر سرور عالم نے فرمایا تم سب لوگ روزہ پورا کرو، اور گرد و نواح کے باشندوں کو مطلع کردو کہ وہ باقی ماندہ دن یوں ہی پورا کریں۔

امام مالکؒ نے لکھا ہے "مجھے معلوم ہوا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حارث بن ہشامؓ کو کہلا بھیجا کہ کل عاشورا کے دن تم روزہ رکھو اور اپنے متعلقین کو حکم دو کہ وہ بھی روزہ رکھیں۔ [موطا]

عبداللہ بن ابی یزید کا بیان ہے کہ انہوں نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی زبانی سنا ہے کہ ان سے لوگوں نے عاشورہ کے روزہ کی بابت پوچھا انہوں نے جواب دیا مجھے معلوم ہے کہ رسول اللہ نے عاشورا کا روزہ رکھا اور عاشورا کے دن کو دوسرے دن پر افضل و برتر قرار دیا اور اسی طرح ماہ رمضان کو دوسرے مہینوں سے اعلےٰ و افضل فرمایا ہے۔

عبداللہ بن موسےٰؓ کا بیان ہے کہ رسول اکرمؐ عاشورہ کے روزہ کو دوسرے دنوں کے روزہ پر فضیلت دینے کی سعی فرماتے اور ماہ رمضان کو دوسرے مہینوں پر برتر قرار دیتے تھے۔

[بخاری و مسلم]

ابو قتادہؓ کا بیان ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا میرا گمان ہے کہ عاشورہ کا روزہ رکھنے کو اللہ تعالےٰ سال گذشتہ کے سیئات (جرائم خفیف) کا کفارہ بنا دے گا۔ [ترمذی]

ابن عباسؓ نے رسول اکرمؐ کا یہ ارشاد بھی بیان کیا کہ اگر میں سال آئندہ زندہ رہا تو نویں اور دسویں محرم کو روزہ رکھوں گا۔

نیز ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرمؐ نے عاشورا کا روزہ رکھ کر دوسرے مسلمانوں کو بھی اس دن روزہ رکھنے کے لیے فرمایا جس پر میں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ یہ وہ دن ہے جس کی یہودی مسیحی عزت کرتے اور اسے بڑا دن مانتے ہیں۔ اس پر ارشاد عالی ہوا، آئندہ سال انشاء اللہ دسویں محرم کا بھی روزہ رکھوں گا مگر آئندہ سال کا ماہ محرم آنے سے پہلے ہی رسول اللہؐ نے رحلت فرمائی۔ [ابوداؤد]

حکم بن اعرج کا بیان ہے کہ میں حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں اس وقت

پہنچا جب کہ وہ چادر لپیٹے چاہ زمزم سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے، میں نے ان سے کہا عاشورا کے روزے کی نسبت معلومات بہم پہنچایئے، جواب دیا محرم کا چاند دیکھ کر پہلی محرم کو کھاؤ پیو اور نویں محرم روزہ رکھو۔ میں نے پوچھا کہ سرورِ کائنات کیا اسی طرح روزہ رکھتے تھے؟ جواب دیا ہاں اسی طرح۔ [مسلم وابوداؤد]

رزین نے عطا کی زبانی بیان کیا کہ میں نے حضرت ابن عباس رض کو فرماتے سنا ہے یہود کی مخالفت کرتے ہوئے نویں اور دسویں محرم کو روزہ رکھا کرو۔

ام المومنین حضرت حفصہ رض کا بیان ہے کہ عاشورہ شوال کے دس دن اور ہر ماہ کے تین روزے اور نماز فجر سے پہلے کی دو رکعتیں یہ چار اعمال رسول اکرم ص نے کبھی ترک نہیں فرمائے۔ [نسائی]

افضل نماز حضرت ابوہریرہ رض نے رسول اکرم ص کا یہ ارشاد بیان کیا ہے کہ ماہ رمضان کے افضل ترین روزوں کے بعد ماہ محرم میں عاشورا کا روزہ ہے، اور پنج وقتہ افضل ترین نمازوں کے بعد صلوٰۃ اللیل (نماز تہجد) افضل ہے۔ [ترمذی، نسائی]

افضل روزہ ایک روایت ہے کہ راوی نے رسول اکرم ص سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! فرض نمازوں کے بعد کون سی نماز افضل ہے؟ ارشادِ عالی ہوا، تہجد کی نماز، پھر پوچھا رمضان کے روزوں کے بعد کون سا روزہ افضل ہے؟ ارشادِ گرامی ہوا، ماہ محرم کا روزہ۔ [مسلم، ابوداؤد]

حضرت علی رض کا بیان ہے ایک شخص نے مجھ سے پوچھا "ماہ رمضان کے بعد آپ کس ماہ میں مجھے روزہ رکھنے کا حکم دیتے ہیں؟" جواب دیا، اس مسئلہ کو ایک شخص نے رسول اکرم ص سے اس وقت دریافت کیا تھا جب کہ میں آپ کے پاس تھا، اس آدمی نے پوچھا تھا یا رسول اللہ! ماہ رمضان کے روزوں کے بعد مجھے کس مہینہ میں روزے رکھنے کا حکم ہے؟ ارشاد عالی ہوا تھا، ماہ رمضان کے روزوں کے بعد اگر تم روزہ رکھنا چاہتے ہو تو ماہ محرم کے روزے رکھو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وہ مہینہ ہے جس کے ایک دن اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کی توبہ قبول کی اور اسی دن ایک دوسری قوم کی بھی توبہ قبول فرمائے گا۔ [ترمذی]

احادیث مذکورہ بالا صحاح ستہ میں موجود اور جامع الاصول میں مرقوم ہیں۔

موضوع روایات

حضرت انس رض کا بیان ہے جس نے ماہ محرم میں جمعرات وجمعہ اور ہفتہ ان تین دن کا روزہ رکھا، اس کے نام دو سال کی عبادت لکھی گئی۔

حضرت ابن عباس رض سے رسول اکرم ص کا ارشاد بیان کیا ہے۔ آئندہ سال ہم نویں محرم کا روزہ رکھیں گے۔

ابن عباس رض سے یہ بھی مروی ہے کہ رسول اکرم ص نے فرمایا اگر ہم زندہ رہے تو یہودیوں کے عمل کے خلاف نویں محرم کا بھی روزہ رکھیں گے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رض نے سرور عالم ص کا یہ ارشاد بیان کیا کہ جس نے یوم زینت یعنی عاشورا کے دن روزہ رکھا گویا اس نے سال بھر کے فوت شدہ روزے حاصل کر لئے۔

ابو شیخ نے اپنی کتاب "الثواب" میں رسول اکرم ص کا یہ ارشاد تحریر کیا ہے کہ عاشورا کے دن حضرت نوح ع کوہ جودی پر اپنی کشتی سے اترے اور اس دن روزہ رکھا اور اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے اپنے ساتھیوں کو بھی اس دن روزہ رکھنے کا حکم دیا، نیز عاشورا کے دن ہی اللہ نے آدم علیہ السلام کی توبہ قبول کی اور حضرت یونس علیہ السلام کے شہر والوں کی بھی اسی دن توبہ قبول فرمائی۔ اسی دن اسرائیل کے لیے سمندر کو چیر دیا گیا۔ اسی دن حضرت ابراہیم اور عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود رض کا بیان ہے کہ رسول اللہ ص نے فرمایا عاشورا کے دن جس نے اپنے اہل وعیال پر روزی وسیع رکھی تو انشاء اللہ تمام سال اس کے لیے فراخی رہے گی۔

حضرت علی رض کا بیان ہے کہ تمام انسانوں کے سردار حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور رسول اکرم ص سید العرب ہیں۔ اور مشہور صحابی حضرت صہیب رض روم کے سردار ہیں سرزمین فارس کے سردار حضرت سلمان فارسی رض، اور ارض حبش کے سردار حضرت بلال رض ہیں یہاں

کا سردار طور سینا، اور درختوں کا سردار، درخت سدرۃ المنتہیٰ ہے، مہینوں کا سردار ماہ محرم اور ایام (دنوں) کا سردار جمعہ ہے۔ اسی طرح کلام کا سردار قرآن کریم اور قرآن کریم کا خلاصہ سورۂ بقرہ اور سورہ بقرہ کا مغز آیۃ الکرسی ہے۔ واضح رہے کہ آیۃ الکرسی میں پانچ خصوصی کلمہ ہیں اور ہر پانچ میں پچاس برکتیں ہیں (مسند فردوس از دیلمی) اور حضرت سے یہ منسوبہ روایت ضعیف ہے۔

افضلیت و برتری بندۂ ضعیف[1] کا بیان ہے کہ افضلیت و برتری سے متعلق اکثر احادیث میں ہے کہ افضل ترین مہینہ ماہ رمضان ہے۔

طبرانی نے حضرت ابن عباس رض کی زبانی یہ روایت لکھی ہے کہ رسول اکرم ص نے ارشاد فرمایا، میں تم سب کو مطلع کرتا ہوں کہ فرشتوں میں افضل حضرت جبرئیل ع ہیں، دنوں میں برتر جمعہ کا دن ہے۔ مہینوں میں افضلیت ماہ رمضان کو حاصل ہے، برتر شب لیلۃ القدر ہے۔ اور خواتین میں حضرت مریم ع برتر ہیں۔

اے اللہ تو جانتا ہے کہ اس برتری افضلیت اور سرداری میں کافی فرق ہے لوگو! اسے سمجھو اور غور و فکر کرو اور اللہ تعالیٰ ہی توفیق دیتا ہے۔

شیخ الفقہا و محدثین شیخ شہاب الدین ابن حجر ہیثمی مصری مفتی مکہ معظمہ نے اپنی تالیف "صواعق محرقہ" میں یوم عاشورا کے ضمن میں لکھا ہے، لوگو! اچھی طرح سمجھ لو کہ عاشورا کے دن حضرت حسین رض مصائب سے دوچار ہوئے اور آپ کی شہادت اللہ تعالیٰ کے نزدیک آپ کے مراتب و درجات کی رفعت کا ثبوت ہے اس شہادت کے ذریعہ اہلبیت اطہار کے درجات بلند کرنا بھی اللہ کے پیش نظر تھا۔ اس لیے عاشورا کے دن جو شخص مصائب کا تذکرہ کرے تو اسے لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجاآوری میں انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھنے میں مشغول رہے تاکہ اللہ تعالیٰ کے ثواب کا مستحق ہوسکے جیسا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

---

[1] مؤلف کتاب شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح۔

"اولئک علیہم صلوٰت من ربہم و رحمۃ و اولئک ہم المہتدون"
یہی وہ شخصیتیں ہیں جن پر منجانب پروردگار رحمت وکرم ہوتا ہے اور یہی ہدایت یافتہ ہیں۔

عاشورہ کے دن انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتے رہنے یا بڑی سے بڑی نیکی روزہ رکھنے کے علاوہ کسی اور کام میں مشغول نہ ہوں۔

خبردار، روافض کی بدعتوں میں مشغول نہ ہو، گریہ وزاری، آہ وبکا، سینہ کوبی، ماتم، غم والم کے ظاہری اظہار وغیرہ میں معروف ومشغول نہ ہو۔ کیوں کہ یہ مندرجہ بالا امور دراصل مسلمانوں کے اخلاق عالیہ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔

ماتم ونوحہ اگر ماتم ونوحہ کی اجازت ہوتی تو رسول اکرمؐ کی رحلت کا دن نوحہ وماتم کا زیادہ سزاوار اور مستحق آہ وبکا ہوتا۔ نیز خارجیوں کی بدعتوں سے احتراز کرو کیونکہ یہ اہل بیت سے تعصب کرتے ہیں اور جاہلوں کی بدعتوں سے بھی علیحدہ رہو کیوں کہ یہ تباہی کا بربادی سے، بدعت کا اسلام میں نئی رسموں سے اور بدی کا برائیوں سے مقابلہ کرتے ہیں۔ اور اسی تقابل پر خوشی ومسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ نیز دسویں محرم کو عید کا دن مانتے ہیں، اس دن زیب وزینت کرتے، خضاب وسرمہ لگاتے، نئے کپڑے پہنتے خوب خرچ کرتے، خلاف عادت، متفرق کھانے اور کھچڑے وغیرہ پکواتے ہیں اور یہ تمام کام ان کے اعتقاد کے مطابق قدیم دستور اور سنت ہوئے۔

حالانکہ ان تمام خرافات کو ترک کر دینا ہی سنت ہے اور مذکورہ بالا امور کی انجام دہی کے لیے قابل اعتماد روایت یا ثبوت نہیں پایا جاتا۔

بعض محدثین اور علماء سے عاشورا کے دن سرمہ لگانے، نہانے، مہندی لگانے، کھچڑا پکانے، نئے کپڑے زیب تن کرنے اور خوشی ومسرت کا اظہار کرنے کا مسئلہ پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا ان امور کی انجام دہی کے لیے رسول اکرمؐ کی کوئی حدیث نہیں۔ نیز کسی صحابیؓ سے کوئی روایت مروی نہیں۔ مسلمانوں کے کسی امام یا ائمہ اربعہ یا کسی اور دوسرے امام نے ان امور کو مستحب اور پسندیدہ قرار نہیں دیا اور حدیث کی کسی قابل اعتماد کتاب میں ان امور کے

انجام دہی کے لیے کوئی صحیح یا ضعیف حدیث نہیں ہے۔

موضوع احادیث

بعض لوگ کہتے ہیں کہ عاشورہ کے دن سرمہ لگانے سے سال بھر آنکھیں نہیں آتیں۔ عاشورا کے دن نہانے سے سال بھر بیماری نہیں آتی اور عاشورا کے دن اپنے بال بچوں پر فراخی کرنے والے کو اللہ سال بھر وسعت و فراخی دیتا ہے اور اسی طرح کی اور باتیں کہ اس دن کی نماز افضل و برتر ہے یا اس دن حضرت آدم ؑ کی توبہ قبول ہوئی۔ حضرت نوح ؑ کی کشتی اسی دن کوہ جودی پر ٹھہری اسی دن حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آتش نمرود سے نجات ملی۔ اسی دن حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کے وقت آسمان سے دُنبہ آکر فدیہ بنا، یا اسی دن یعقوب علیہ السلام کے پاس حضرت یوسف علیہ السلام لوٹ کر آئے۔ یہ تمام تر احادیث موضوع اور خود ساختہ ہیں۔

رہی بال بچوں پر دل کھول کر خرچ کرنے سے سال بھر تک فراخی کی حدیث اس کے بعض راوی ثقہ نہیں ہیں۔

خارجی جاہلوں نے عاشورا کے دن کو سرور و انبساط کا دن اس لیے بنالیا کیونکہ رافضیوں نے اسے ماتم کا دن مقرر کرلیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ دونوں خطا کار و خاطی ہیں، اور سنت نبوی کی مخالفت کرتے ہیں۔ یہ وہ عبارت ہے جسے حافظین حدیث نے بیان کیا ہے۔

حاکم نے صراحت کی ہے کہ عاشورہ کے دن سرمہ لگانا بدعت ہے اور لکھا ہے کہ "عاشورا کے دن پتھر کا سرمہ لگانے سے مدت العمر کبھی آنکھیں نہیں آتیں" یہ قول و روایت سراسر غلط اور تعجب خیز ہے۔

نیز امام ابن جوزی نے بھی اپنی کتاب موضوعات میں اس قسم کی روایات کو حاکم کی مستدرک کے فیصلے کے موافق غلط و بے معنی ہی تحریر کیا ہے۔ علاوہ ازیں دیگر محدثین نے کئی طریقوں سے ان مہمل اقوال کو بے سروپا بیان کیا ہے۔

علامہ مجدالدین فیروزآبادی مؤلف[1] القاموس نے حاکم کے حوالہ سے لکھا ہے

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے کتاب السعادۃ کے آخری اوراق۔ مؤلفہ علامہ مجدالدین۔

کہ روزہ کے سوائے دیگر اعمال، مثلاً یوم عاشورا کی فضیلت، اس دن دل کھول کر خرچ کرنا، خضاب، تیل اور سرمہ لگانا اور کھچڑا پکانا وغیرہ، یہ سب موضوع اور خود ساختہ روایات ہیں اور افترا پردازی ہے۔

نیز امام ابن قیم نے صراحت سے تحریر کیا ہے کہ عاشورا کے دن سرمہ، تیل اور خوشبو لگانے کی روایات دراصل جھوٹوں کی وضع کردہ ہیں اور خاص کر عاشورہ کے دن سرمہ لگانے کی روایت ان کی اپنی من گھڑت ہے اور اس کی اساس و بنیاد اس روایت کو بناتے ہیں کہ عاشورا کے دن لوگوں کو کھلانے پلانے سے رزق میں فراخی ہوتی ہے۔

حافظ الاسلام زین عراقی نے اپنی کتاب "امالی" میں امام بیہقی کی اسناد کے حوالہ سے رسول اکرم ؐ سے منسوب یہ حدیث لکھی ہے کہ عاشورا کے دن جو شخص اپنے بال بچوں وغیرہ کو خوب کھلائے پلائے تو اللہ سال بھر تک اس کی روزی میں وسعت وکشادگی کر دیتا ہے۔

پھر اس حدیث کے خاتمہ پر تحریر کیا ہے کہ اس حدیث کی اسناد نرم وکمزور ہیں تاہم ابن حبان کے نزدیک یہ حدیث حسن ہے اور حافظ ابوالفضل محمد بن ناصر نے دوسری اسناد کے تحت اس حدیث کو صحیح گردانا ہے حالانکہ اس کی اسناد کی اکثریت تعدادی سراسر غلط ہے۔

امام بیہقی نے کشادگی رزق کی حدیث کو ابن حبان کی رائے کے علاوہ بھی حدیث حسن لکھا ہے کیوں کہ صحابہ رضؓ کی زبانی مرفوعاً مروی ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ کشادگی رزق کی حدیث کے راوی اگرچہ ضعیف ہیں لیکن اگر ان کو باہم یکجا کر لیا جائے تو ان میں قوت پیدا ہو جاتی ہے۔

کشادگی رزق کی روایت کے حدیث ہونے سے امام ابن تیمیہ رحؒ نے انکار کیا ہے اور ان کا یہ انکار دراصل ان کا وہ وہم وشک ہے جو اوپر تحریر کیا گیا ہے۔ نیز امام احمدؒ نے اس حدیث کو صحیح بالذات نہیں مانا ہے اور کسی چیز کو صحیح بالذات نہ

ماننے سے اس کے حَسَنُ لغیرہ کی نفی لازم نہیں آتی۔ اور یہ وہ اصول ہے جسے علم فن حدیث میں حجت کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

شیخ محمد سخاوی نے اپنی کتاب "مقاصد حسنہ" میں یہ حدیث لکھی ہے کہ عاشورا کے دن جس نے پتھر کا سرمہ لگایا اس کی مدت العمر آنکھیں نہ آئیں گی۔ اس حدیث کو حاکم اور بیہقی نے شعب الایمان کی تیئیسویں فصل میں لکھا ہے۔ نیز دیلمی نے حضرت جبیرؓ کی روایت کو ضحاک کے ذریعہ ابن عباسؓ کی زبانی مرفوعاً تحریر کیا ہے۔ اس کے بعد حاکم نے لکھا ہے کہ یہ حدیث صرف موضوع وخود ساختہ ہی نہیں بلکہ منکر اور سراسر غلط ہے جیسا کہ اس کے موضوع ہونے کو ابن جوزی نے اپنی کتاب موضوعات میں قلم بند کیا ہے اور حضرت ابوہریرہؓ سے اس کی روایت اسی لیے ضعیف وکمزور ہے کہ اس کا ایک راوی احمد بن منصور شونیزی بھی ہے جو احادیث میں اپنی طرف سے الفاظ داخل کرتا ہے۔ "جس نے عاشورا کے دن اپنے بال بچوں وغیرہ کو خوب کھلایا پلایا، اسے اللہ پورے سال بھر خوب وسعت و فراخی دے گا۔ رسول اکرمؐ کی اس حدیث کو طبرانی نے فضائل وقات اور بیہقی نے شعب الایمان میں تحریر کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ یہ حدیث ابوالشیخ نے حضرت ابن مسعودؓ کے حوالہ سے بیان کی ہے

نیز فضائل اوقات میں یہ حدیث ابوسعید سے مروی ہونا تحریر ہے اور شعب الایمان میں اس حدیث کو ابوسعیدؓ، حضرت جابرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہونا قلم بند کیا گیا ہے اور اس حدیث کے آخر میں لکھا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے لیکن جب ایک کو دوسری حدیث سے ملائیں تو قوت کا فائدہ ہویدا ہوجاتا ہے۔

حافظ الاسلام زین عراقی نے اپنی کتاب امالی میں لکھا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث کے بعض راویوں کو حافظ ابن ناصر نے صحیح بتایا ہے۔

لیکن ابن جوزی نے اس حدیث کو موضوعات میں شمار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مذکورہ بالا حدیث کا ایک راوی سلیمان بن ابی عبداللہ ہے جو مجہول ہے اور اس سلیمان راوی کو ابن حبان نے ثقہ قرار دے کر اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

نیز یہ حدیث ایک دوسری حدیث کے ساتھ حضرت جابرؓ کے واسطہ سے مسلمان کہنے کی شرط پر عبداللہ ابن عبدالبر نے اپنی کتاب استیعاب میں درج کیا ہے اور جس کی روایت ابن ابی زبیر کی زبانی تحریر کی ہے اور یہ سند بہت زیادہ صحیح ہے۔

علاوہ ازیں یہی دارقطنی میں جید سند کے ساتھ حضرت عمرؓ سے بطریقہ موقوف بیان کی گئی ہے۔ اور یہی حدیث بیہقی نے اپنے شعب الایمان میں محمد بن منتشر کی سند سے قلمبند کی ہے۔

اس نوبت پر میں (شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ) کہتا ہوں کہ اس حدیث کی تصدیق کے بارے میں ہمارے استاد و شیخ نے بکثرت مواخذہ کیا ہے جس کا میں تذکرہ نہیں کرنا چاہتا۔

ابن جوزی نے اپنی موضوعات میں عقیلی کے قول کے بعد لکھا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث میں ہصیم بن شداخ راوی بالکل مجہول ہے لیکن ابن حبان نے اسے ضعیف و ثقہ تحریر کیا ہے۔

شیخ وقت و عالم مدینہ منورہ امام حافظ الشیخ علی بن محمد بن عراقی نے اپنی کتاب تنزیہ الشریعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ میں یہ حدیث لکھی ہے کہ جس نے یکم سے نویں محرم تک کا روزہ رکھا۔ اس کے لیے اللہ نے فضا میں چار میل مربع ایک قبہ بنا دیا جس کے چار دروازہ ہیں" اس کے بعد لکھا ہے کہ یہ حدیث ابونعیم نے حضرت انسؓ کی زبانی بیان کی ہے جس میں ایک راوی موسیٰ طویل بھی ہے اور موسیٰ طویل وہ آفت کا پرکالہ ہے جو حدیث گھڑتا ہے۔

۱۔ یہ حدیث کہ جس نے عاشورا کا روزہ رکھا اس کے لئے اللہ نے ان ساٹھ سال کی عبادت لکھ دی جس میں نماز روزے بھی ہیں۔

۲۔ جس نے عاشورا کا روزہ رکھا اسے اللہ تعالےٰ نے ہزار حاجیوں اور عمرہ کرنے والوں کا ثواب دیا۔

۳۔ جس نے عاشورا کا روزہ رکھا اسے اللہ تعالےٰ نے دس ہزار فرشتوں کی عبادت کا ثواب دیا۔

۴: عاشورہ کا روزہ رکھنے والے کو اللہ تعالیٰ دس ہزار شہیدوں کا ثواب دیتا ہے۔
۵: عاشورہ کا روزہ رکھنے والے کو اللہ سات آسمانوں کا ثواب عنایت کرتا ہے۔
۶: عشرہ محرم کے دن جس نے کسی بھوکے کو کھانا کھلایا تو گویا اس نے امت محمدیہ کے تمام فقیروں کو کھانا کھلاکر شکم سیر کیا۔
۷: جس نے عاشورا کے دن کسی یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کے ہر بال کے عوض ہاتھ پھیرنے والے کو جنت میں بلند مراتب دیئے جائیں گے۔
۸: عاشورا کے دن اللہ نے زمینوں اور آسمانوں کو پیدا کیا۔
۹: اللہ نے عاشورا کے دن لوح وقلم پیدا کیے۔
۱۰: عاشورا کے دن اللہ نے جبرئیل، فرشتوں، آدم اور حضرت ابراہیمؑ کو پیدا کیا۔
۱۱: عاشورا کے دن ہی اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو نار نمرود سے نجات دی۔
۱۲: عاشورا کے دن ہی اللہ نے دنبہ کی صورت میں حضرت اسماعیلؑ کا فدیہ دیا۔
۱۳: عاشورا کے دن فرعون کو اللہ نے دریائے نیل میں غرق کیا۔
۱۴: عاشورا کے روز اللہ نے حضرت ادریسؑ کو رفیع الدرجات بنایا۔
۱۵: عاشورا کے دن اللہ نے حضرت آدمؑ کی توبہ قبول کی۔
۱۶: عاشورا کے دن اللہ نے حضرت داؤدؑ کی بھول چوک معاف کی۔
۱۷: عاشورا کے دن ہی اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھا۔
۱۸: عاشورا کے دن ہی قیامت برپا ہوگی۔

یہ تمام مذکورہ بالا احادیث، موضوع اور خودساختہ ہیں جنہیں ابن جوزی نے حضرت ابن عباس رضؓ کی زبانی تحریر کیا ہے اور لکھا ہے ان حدیث کے راویوں میں ایک راوی حبیب بن حبیب بھی ہے جو آفت کا پرکالہ ہے اور جھوٹی احادیث گھڑتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ احادیث کہ اللہ نے بنی اسرائیل پر سال بھر میں عاشورا کا روزہ فرض کیا۔ اس لیے اے لوگو اس دسویں محرم کے دن روزہ رکھو اور اس روز اپنے بال بچوں ومتعلقین کو خوب کھلاؤ پلاؤ، کیوں کہ جس نے اپنے مال وزر وغیرہ کے ذریعہ عاشورا کے دن

اپنے متعلقین پر کشادگی کی تو اس پر اللہ تعالیٰ سال بھر تک کشادگی کرتا ہے۔ عاشورا کے دن روزہ رکھو کیوں کہ یہی وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی توبہ قبول کی۔

عاشورا ہی وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ادریسؑ کو بلند درجات عنایت کیے۔

اسی دن اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو آتش نمرود سے نجات دی۔

اور یہی وہ دن ہے جس میں اللہ نے حضرت نوحؑ کو کشتی پر سے اتارا۔

عاشورا ہی وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ پر توراۃ نازل فرمائی۔

اسی روز اللہ نے حضرت اسماعیلؑ کو ذبح کرنے کے بجائے دنبہ فدیہ دیا۔

اسی دن اللہ نے حضرت یوسفؑ کو جیل سے چھٹکارا دیا۔

اور اسی دن اللہ نے یعقوبؑ کو ان کی قوت بینائی واپس دی۔

اسی دن اللہ نے ایوبؑ سے بلائیں دور فرمائیں۔

یہی وہ دن ہے جس میں اللہ نے حضرت یونسؑ کو مچھلی کے پیٹ سے نکالا۔

اسی دن اللہ نے دریا کو چیر کر بنی اسرائیل کے لیے راستہ بنایا۔

اسی دن اللہ نے حضرت محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سب اگلے پچھلے گناہ معاف کیے۔

اسی دن حضرت موسےؑ نے دریائے نیل عبور کیا

یہی وہ دن ہے جس میں حضرت یونسؑ کی قوم کو توبہ کرنے کی توفیق ہوئی۔

اور جس نے عاشورا کا روزہ رکھا اس کے چالیس سال کے گناہوں کا کفارہ ہوگیا۔

یا یہ حدیث کہ سب سے پہلا دن عاشورا کا دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے یوم عاشورا پیدا کیا۔

عاشورا کا دن ہی وہ پہلا دن ہے جس دن اللہ تعالیٰ نے آسمان سے مینہ برسایا۔

جس نے عاشورا کا روزہ رکھا تو گویا اس نے پورے زمانہ روزہ رکھا۔

دسویں محرم ہی وہ دن ہے جس میں تمام انبیاء اور حضرت موسیٰؑ نے روزہ رکھا۔

جس نے دسویں محرم کی رات کو شب بیداری کی تو گویا اس نے ساتوں آسمانی مخلوق کے مماثل عبادت کی۔

جس نے عاشورا کے دن چار رکعات اس طرح پڑھیں کہ ہر رکعت میں سورہ الحمد ایک مرتبہ، سورہ اخلاص پچاس مرتبہ تلاوت کی تو اللہ نے اس کے ماضی و مستقبل کے پچاس پچاس سالہ گناہ معاف کر دیئے اور ملاء اعلیٰ (بلند ترین مقام اقتدار) میں اس کیلیے ایک ہزار نوری منبر بنا دیئے۔

عاشورا کے دن جس نے ایک گھونٹ شربت پلایا تو گویا اس نے ایک لمحہ کےلیے بھی اللہ کی نافرمانی نہیں کی۔

عاشورا کے دن جس نے اہل بیت کے مسکینوں کو پیٹ بھر کھلایا تو وہ پل صراط پر سے بجلی کی چمک کی طرح گزر جائے گا۔

عاشورا کے دن جس نے کچھ بھی خیرات کی تو گویا سال بھر اس نے کسی سائل کو اپنے در سے واپس نہیں کیا۔

عاشورا کے دن جس نے غسل کیا تو وہ مرض موت کے سوائے کبھی بیمار نہ ہوگا۔

عاشورا کے دن جس نے سرمہ لگایا تو پورے سال اس کی آنکھیں نہیں آئیں گی۔

عاشورا کے دن جس نے کسی یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا تو گویا اس نے دنیا جہاں کے تمام یتیموں کے ساتھ بھلائی کی۔

عاشورا کے دن جس نے کسی کی عیادت کی تو گویا اس نے تمام اولاد آدمؑ کے مریضوں کی عیادت کی۔

مذکورہ بالا احادیث کو ابن جوزی نے موضوعات میں لکھا ہے اور آخر میں تحریر کیا ہے کہ ان احادیث کے بیان کرنے والے راویوں کے نام درست ہیں اور یہ راوی بذات خود ثقہ ہیں۔ ان حالات کے پیش نظر یہ امر بالکل ظاہر ہے کہ بعض متاخرین نے خود ساختہ احادیث مرتب کرکے ان ثقہ راویوں کی اسناد سے منسوب کر دی ہیں۔

شہزادہ چارلس کی حقیقت پسندی

مسلمان حکمرانوں کے لئے تازیانہ عبرت

حافظ محمد اقبال رنگونی مانچسٹر

برطانیہ کے ولی عہد شہزادہ چارلس نے برطانوی عوام پر زور دیا ہے کہ وہ اسلام سے سبق لیں اور اس کے بعض روحانی عقائد کی قدر کریں جن سے مسلمان ممالک اور مغرب کے درمیان ایک پل کا کام لیا جاسکتا ہے جو عظیم بین الاقوامی رول ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ یہ کام اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک ہم میں اسلام سیکھنے کی آمادگی نہیں ہوگی اور ہم اپنے فطری نظریہ ملیت کو بیدار ذہانت کے ساتھ روحانی کی اہمیت سے متوازن نہیں کریں گے۔ شہزادہ چارلس دنیا میں برطانیہ کے مقام کے عنوان سے ایک کانفرنس سے خطاب کررہے تھے۔ (جنگ لندن ۳۱ر مارچ ۹۵)

برطانوی ولی عہد شہزادہ چارلس دنیا کے اکثر ممالک کا دورہ کرچکے ہیں، اس دورے میں ان ممالک کے مذہبی رہنماؤں سے ملاقات اور ان سے تبادلہ خیالات کا انہیں موقع ملا پھر ان ممالک کے مذہبی عقائد و خیالات اور ان کے مذہبی رسم و رواج کو بھی انھوں نے بڑے قریب سے دیکھا، لیکن موصوف کے فاضلانہ خطاب سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی عقائد اور اس کی روحانی تعلیمات نے موصوف کے دل و دماغ پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے اور موصوف اسلام سے اس قدر متاثر ہوئے ہیں کہ اس کے روحانی عقائد اور اس کی خوبیوں کے علی الاعلان اظہار میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔

شہزادہ چارلس نے اس سے قبل بھی اسلام کے بارے میں اپنے خیالات کا بڑے بلیغ اور اچھے انداز میں اظہار کیا ہے۔ موصوف کی ۲۷ر اکتوبر ۹۳ [کو آکسفورڈ یونیورسٹی میں مطالعہ اسلام کے مرکز کی سرپرستی قبول کرنے کے بعد] کی تقریر اس لحاظ سے بہت

اہم اور تاریخی سمجھی جاتی ہے کہ برطانیہ کی تاریخ میں پہلی بار کسی ولی عہد نے اسلامی عقائد اور اس کے روحانی اقدار کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا اور اسلامی تعلیمات کی پاکیزگی کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔ شہزادہ چارلس کا یہ فاضلانہ خطاب برطانیہ کے انگریزی اخبارا میں بھی شائع ہوا۔ اس کے کچھ اقتباسات آپ بھی ملاحظہ کرلیں۔

شہزادہ چارلس نے کہا کہ قرآن کریم نے خواتین کو جو حقوق تیرہ سو سال قبل دئے تھے مغرب کے لوگ بیسویں صدی کے آغاز میں ان کا تصور تک نہیں کر سکتے تھے انھوں نے کہا کہ برطانوی ابلاغ عامہ نے غلط طور پر یہ تاثر عام کیا ہے کہ اسلامی قوانین بے رحمانہ اور غیر انسانی ہیں، حالانکہ قرآن انسانی مساوات اور رحم کی تعلیم دیتا ہے جو اسلام کے شرعی قوانین کی روح ہے، مغرب کو چاہئے کہ وہ اسلام کے اصل پیغام کو جاننے کی کوشش کرے اور سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے جو کچھ کہا جارہا ہے اس پر کان نہ دھرے شہزادہ چارلس نے یہ باتیں آکسفورڈ سینٹر برائے اسلامک اسٹڈیز میں اسلام اور مغرب کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہیں انھوں نے دین اسلام، دنیائے اسلام اور اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار اور پہلو پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے انسانی تاریخ میں مسلمانوں اور دین اسلام کی سنہری اور گراں قدر خدمات کا ذکر کیا' انھوں نے کہا کہ میرا یہ یقین ہے کہ مغرب اور دنیائے اسلام کے درمیان رابطے کی جتنی ضرورت آج ہے، آج سے قبل کبھی نہ تھی اور ان دونوں کے درمیان غلط فہمیاں ایک خطرناک حد تک پہنچ گئی ہیں انھوں نے کہا کہ نہ صرف عالمی سطح پر بلکہ برطانیہ میں دین اسلام سے عامۃ الناس کی دلچسپی روزافزوں ہے۔ اسلام ہمارے ہر جانب ہے۔ انھوں نے کہا کہ حقیقت تو یہ ہے کہ مغرب نے اسلام کو ہمیشہ ایک مخالف قوت اور ایک ممکن دشمن کی نگاہ سے دیکھا ہے اور مغرب کی اسلام شناسی دنیائے اسلام میں ہونے والے سیاسی ہنگاموں سے متاثر رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ اہم ہے کہ ہم لفظ انتہاپسند کے معنی اور اس کے استعمال کا بھی بغور جائزہ لیں، ہر سچا مسلمان جو مادی زندگی پر روحانی زندگی اور روحانی قوت کا یقین رکھتا ہے اور دنیا میں بڑھتی ہوئی مادیت پرستی سے بیزار ہو کر مذہب کی طرف

راغب ہوجاتا ہے اس پر انتہا پسند کا لیبل لگا دیا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مغرب میں اسلام سے متعلق بے انتہا لاعلمی نہیں پائی جاتی ہے بلکہ دین اسلام اور مسلمانوں کا مغرب اور مغربی تہذیب پر بےکراں احسانات کی جانب سے بھی شدید بے علمی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسلام اور مسلمانوں نے مغرب میں آکر ہمیں سائنس، تاریخ تحقیق، فلسفہ اخوت اور معاشرتی ترقی کے تمام عوامل سے روشناس کردیا۔ درحقیقت اسلام نے ہی مغرب میں علم اور علمی روایات کی آبیاری کی اسپین میں مسلمانوں کا دور بلاشبہ ایک منفرد اور عظیم دور تھا...... الخ۔ [جنگ لندن ۲۸ر اکتوبر ۱۹۹۳ء]

شہزادہ چارلس ملکہ برطانیہ کے بڑے صاحب زادے ہیں ملکہ برطانیہ ایک عیسائی فرقہ CHURCH OF ENGLAND کی سربراہ ہیں اور عیسائیت کی محافظ DEFENDER OF THE FAITH سمجھی جاتی ہیں۔ شہزادہ چارلس کے تخت نشیں ہوتے ہی یہ بھاری بوجھ ان کے سر آنے والا ہے لیکن موصوف اس موقف سے اتفاق نہیں کرتے کہ وہ صرف ایک ہی مذہب کے محافظ ہوں۔ ان کا کہنا ہے کہ برطانیہ میں چونکہ مختلف مذاہب کے پیروکار آباد ہوچکے اور یہاں کے شہری بن چکے۔ اس لیے وہ تمام مذاہب کے محافظ DEFENDER OF THE ALL FAITH بننا پسند کرتے ہیں۔ برطانیہ کے عیسائی رہنماؤں نے شہزادہ کے اس بیان پر گہری تشویش ظاہر کی ہے اور انہیں شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

شہزادہ چارلس کے اسلام کے بارے میں جو بیانات سامنے آرہے ہیں اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام اور اسلامی اقدار کے بارے میں موصوف کی سوچ مغرب کے دوسرے رہنماؤں سے بہت مختلف ہے، مغربی مفکرین اسلام اور عیسائیت کے درمیان ایک ایسی کشمکش پیدا کرنے کی کوشش کررہے ہیں جس سے اسلامی عقائد اور اس کی اخلاقی تعلیمات مغرب کی اداس نسلوں کو کوئی پیغام سکون نہ دے سکیں، اس کے برعکس شہزادہ چارلس کی کوشش ہے کہ اسلامی دنیا اور مغربی دنیا میں مفاہمت کی فضا پیدا ہوجائے اور یہ اس صورت میں ممکن ہے جب مغربی دنیا تعصب و تنگ نظری کے بجائے وسعت قلبی کے ساتھ اسلام سیکھنے پر آمادہ ہوجائے اور پھر وہ دن دور نہیں

جب عیسائی دنیا اپنے مذہب کے تسلسل میں اس کے آخری مظہر کو تسلیم کرلے یہ ان کا اس نازک وقت میں اسلام کی آغوش میں پناہ لینا ہوگا۔ یہ قرآن کی پیش گوئی اور اس کا فیصلہ ہے:

"وان من اهل الكتاب الا ليؤمنن به قبل موته (پ ۶ النساء)

ترجمہ: اور جتنے فرقے ہیں اہل کتاب کے سو (حضرت عیسیٰ) پر یقین لاویں گے اس کی موت سے پہلے۔

ہم شہزادہ چارلس کو ان کے فاضلانہ خطاب اور اسلام کے بارے میں جرأت مندانہ بیان دینے پر خراج تحسین پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ برطانیہ کے غیر مسلم عوام بھی ان کے اس بیان کی روشنی میں اپنے انداز فکر میں تبدیلی اور وسعت قلبی کا مظاہرہ کرے گی۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ آج کئی مسلم حکمراں اسلامی عقائد واحکام کو کھلم کھلا تنقید کا نشانہ بنارہے ہیں اور غیر اسلامی بیان دینا موجودہ دور کی سب سے بڑی ضرورت سمجھتے ہیں اور ایک یہ لوگ ہیں جو اپنے ہی لوگوں کو اسلامی عقائد اور اس کے روحانی اقدار سے سبق حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

کاش کہ موجودہ مسلم حکمراں وقت کی نبض پر ہاتھ رکھیں اور اسلام کے سنہری اصولوں کا دامن تھام کر غیر مسلم پر اسلام کی صداقت وحقانیت ثابت کرکے انھیں اسلام کے قریب آنے کا موقع فراہم کریں۔

یاد رکھئے عزت وشوکت اسلام ہی سے وابستہ ہے نہ کہ غیر اسلامی انداز واطوار اپنانے سے۔ سیدنا حضرت عمر فاروق رضؓ کا یہ ارشاد گرامی ہر وقت سامنے رہنا چاہئے:

"نحن قوم اعزنا الله بالاسلام".

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين۔

مولانا سید ارشد مدنی صاحب

ترتیب: مولانا محمد ارشد رفیق شعبۂ تنظیم دارالعلوم

یا ایھا الناس کلوا مما فی الارض حلالاً طیباً ولا تتبعوا خطوٰت الشیطان، انہ لکم عدو مبین

ترجمہ: اے لوگو جو چیزیں زمین میں موجود ہیں ان میں سے (شرعی) حلال پاک چیزوں کو کھاؤ (برتو) اور شیطان کے قدم بہ قدم مت چلو۔ فی الواقع وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ جل شانہٗ وعم نوالہ نے ارشاد فرمایا کہ لوگو کھاؤ حلال پاک چیزیں جو زمین میں ہیں اللہ تعالیٰ نے جتنی چیزیں پیدا کی ہیں وہ دو نوعیت کی ہیں، یا تو کھائی جانے والی ہیں، یا نہ کھائی جانے والی ہیں۔ جو نہ کھائی جانے والی ہیں وہ بالاتفاق ناجائز ہیں اور جو کھائی جانے والی ہیں ان کی دو نوعیتیں ہیں، یا تو ان کو حلال راستے سے حاصل کیا گیا ہے یا حرام۔ اگر حرام راستے سے حاصل کیا ہے تو ان کا کھانا بھی حرام ہے یعنی حقیقتاً اور حکماً تو حلال تھیں مگر حرمت خارج سے آئی یعنی طریقہ حصول حرام تھا اور جو چیزیں حلال ہیں ان کو بھی اپنی مرضی سے حرام کرنا بھی جائز نہیں۔ ہاں حلال روزی حلال راستے سے کمائی، تب جا کر اس کو حلال اور طیب روزی ملی جو مقصود ہے اس آیت مبارکہ میں۔

نتیجۃً اگر روزی حرام تھی یا حرام راستے سے کمائی گئی تھی اگر اس سے استفادہ کیا اور کھالیا تو جو خون تیار ہوگا وہ بھی حرام ہے اور مستحق جہنم ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "لایدخل الجنۃ جسد غذی بالحرام" حرام مال سے پلا ہوا بدن جنت میں نہیں جائے گا۔ اور اگر روزی حلال تھی اور حلال راستے سے حاصل کی گئی اور حلال طریقہ پر استعمال بھی کی گئی تو جو خون اس سے تیار ہوگا وہ

اللہ جل شانہٗ وعم نوالہٗ کی رضاو خوشنودی کا باعث ہوگا اور مستحق جنت ہوگا۔

اس آیت کریمہ کے نازل ہونے کے بعد حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اے میرے آقا! آپ میرے لیے دعا فرمادیں کہ میں مستجاب الدعوات ہوجاؤں (یعنی ایسا ہوجاؤں کہ میری ہر دعا قبول ہونے لگے) آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے دعا نہیں فرمائی۔ بلکہ اس کے بدلے ایک نسخہ عنایت فرمادیا اور فرمایا کہ "اطب طعامك تكن مستجابًا للدعوات" یعنی اپنی روزی حلال پاک کرلو تو مستجاب الدعوات بن جاؤگے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کیلئے دعا نہ کرنا اور اس کے بدلے ایک نسخہ کیمیا بتادینا ایک خاص مصلحت کی وجہ سے تھا وہ یہ کہ اگر آپ دعا فرمادیتے تو سعدؓ مستجاب الدعوات ہوجاتے جو صرف سعدؓ ہی تک محدود رہتا اور اس نسخۂ کیمیا کے بتادینے سے ہر شخص مستجاب الدعوات بن سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے پیش نظر ہمیشہ پوری امت رہی ہے۔ اسی لیے ہر چیز میں امت کا خیال ملحوظ فرماتے۔

تو معلوم ہوا کہ ہر وہ شخص جو حلال طیب مال کھائے گا، مستجاب الدعوات ہوجائے گا۔ اور جو اس کی رعایت نہیں رکھے گا بلکہ حرام استعمال کرے گا اس کی دعا قبول نہیں ہوگی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دعا کرنے والا دعا کرتا ہے، روتا ہے، گڑگڑاتا ہے مگر پھر بھی اس کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ پھر فرمایا کہ کیسے قبول ہو؟ اس کا کھانا حرام، پینا حرام، لباس حرام، اسی لیے ہر شخص کو حلال روزی کی ہمیشہ تلاش رکھنی چاہیئے۔ اور حلال ہی استعمال کرنی چاہیئے۔

ولا تتبعوا خطوات الشیطان " اور شیطان کے نقش قدم کی اتباع نہ کرو، بیشک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

حصول رزق حرام یا فعل حرام یہ سب شیطان ہی کی اتباع ہے جو باعث ہلاکت ہے، شیطان تو ہر وقت اسی فکر میں لگا رہتا ہے کہ بنی آدم کو کسی نہ کسی راستے سے بہکائے اور واصل جہنم کرے۔ چنانچہ وہ آج بہت حد تک اپنی کوششوں میں کامیاب

بھی نظر آتا ہے اور انسان خصوصاً مسلمان (جس میں ہر وقت خوف خدا ہونا چاہئے) وہ بالکل ہی فکر نہیں کرتا کہ مجھے کس راستے پر چلنا چاہئے۔ قرآن کریم نے تو کھلا ہوا دشمن بتلایا ہے مگر افسوس کہ انسان اس کھلے ہوئے دشمن سے بھی اجتناب نہیں کرتا اور دنیا میں سارے شیطانی وطاغوتی کام کر رہا ہے اور انجام سے بے فکر ہو گیا ہے۔

درحقیقت آج نہیں تو کل میدان محشر میں اس کو پشیمانی اٹھانی پڑے گی، لوگ شیطان کو لعن طعن کریں گے، وہ کہے گا کہ مجھے کیوں لعن طعن کرتے ہو، میں نے کیا بگاڑا ہے۔ ان اللہ وعدکم وعد الحق ووعدتکم فاخلفتکم الخ بے شک اللہ تعالیٰ نے حق وعدہ کیا تھا اس نے اس وعدے کو پورا کر دیا (مؤمنین کو اچھا ٹھکانا دے دیا) اور میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا، اب مجھے کیوں مطعون کرتے ہو بس میری خطا تو صرف اتنی ہے کہ میں نے تم کو غلط راستے پر بلایا تم نے میری آواز پر لبیک کہہ دیا تو اب اپنے آپ کو ملامت کرو مجھے کیوں ملامت کرتے ہو۔ تم نے میری آواز پر کیوں لبیک کہا اور کیوں میرا کہنا مانا، میں نے تو اپنی بات منوانے میں نہ تم پر زبردستی کی نہ ظلم کیا، نہ کوئی تشدد اختیار کیا، بلکہ میں نے تو آواز لگائی تھی، تم نے میرا ساتھ دیا، اب آؤ میرے ساتھ جہنم میں رہو۔ اس وقت انسان پچھتائے گا مگر اس کا پچھتانا نفع نہیں دے گا، دنیا میں دوبارہ واپس آکر نیک اعمال کرنے کی قسم کھائے گا۔ لیکن وہاں تو دنیا میں لوٹنا ہی نہیں ہے بلکہ دنیا کا تو وجود ہی نہیں رہے گا لوٹے گا کہاں؟ پھر بہت نادم ومایوس ہوگا اور عذاب بھگتتا رہ جائے گا۔

اس لیے فرمایا گیا کہ انسان اپنے کھلے دشمن شیطان سے اجتناب کلی رکھے اور ہر وقت اللہ جل شانہ، سے معافی کا خواستگار رہے اور ڈرتا رہے۔ اگر بوجہ بشریت کبھی کوئی شیطانی فریب اس کو آ گھیرے، فوراً خدا کے دربار میں حاضر ہو جائے اور دل سے حقیقی اور سچی توبہ کرے، وہ مالک حقیقی بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا اور معاف کرنے والا ہے۔

حقیقی توبہ کا مطلب یہ ہے کہ دل سے توبہ کرتا ہو، زبانی نہ ہو، دکھاوے

کی نہ ہو، رسمی نہ ہو بلکہ حقیقی توبہ کی تین شرطیں ہیں جب تک تینوں نہ ہوں گی، وہ توبہ نہیں مذاق ہے۔

۱: سب سے پہلے آدمی اس جرم سے نکلے جس میں ملوث ہے۔

۲: اپنے کیے ہوئے جرم پر دل سے نادم و پشیمان ہو۔

۳: آئندہ پھر سے نہ کرنے کا عزم کرے۔

جب صدق دل سے توبہ کرلے گا تو ویسا ہی ہو جائے گا جیسا کہ فرمایا گیا:
التائب من الذنب کمن لا ذنب لہٗ یعنی گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا کہ اس نے گناہ کیا ہی نہیں۔ یعنی بالکل پاک وصاف ہو جاتا ہے۔

دوسری بات فرمائی گئی کہ مومن کی شان یہ ہے کہ جب تک وہ توبہ نہ کرلے اس کو سکون میسر نہ ہو۔ اللہ جل شانہٗ وعم نوالہ کو وہ شخص بہت محبوب ہے جو جرم ہو جانے کے بعد فوراً توبہ کرلے اور خدائے پاک کے سامنے سجدہ ریز ہو جائے اور سب سے زیادہ ناپسند وہ آدمی ہے جو جرم سے نہ تو باز آئے اور نہ توبہ کرے بلکہ یہ تو ایک طرح کی بغاوت ہے اللہ جل شانہٗ کے قانون سے۔ اور ناقابل معافی جرم ہے۔ حالانکہ اللہ تعالےٰ اپنے بندوں پر اس قدر مہربان ہیں کہ اگر بندہ معافی مانگتا ہے تو اللہ تعالےٰ معاف بھی فرما دیتے ہیں اور اس معافی مانگنے کا الگ ثواب بھی عنایت فرما دیتے ہیں۔ نیز فرشتوں کو حکم فرما دیتے ہیں کہ میرے اس بندہ کے گناہ کے آثار ونشان بھی زائل کردو تاکہ کوئی چیز گواہی کی باقی نہ رہے جو ثبوت بن سکے۔ اس کے برخلاف دنیا والوں کا دستور یہ ہے کہ مجرم کو معاف تو کر دیتے ہیں مگر اس کے جرم کو شامل مسل فرما دیتے ہیں اور حکم دے دیتے ہیں کہ اس کا فائل محفوظ کردو۔ تاکہ اگر کبھی آئندہ جرم کرے تو یہ فائل پھر کھولا جائے۔

خدائے پاک کی اس رحمت خاصہ اور مہربانی کے بعد بھی اگر کوئی مسلمان مالک حقیقی کے سامنے سجدہ کرلے اور معافی مانگنے سے کترائے تو یہ اس کی شقاوت ہے جو دنیا میں تو رسوا کرہی دیتی ہے آخرت بھی برباد کردیتی ہے (بقیہ ص۱۱ پر)

ظہور فساد

اسرار عالم

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (الآية)

ترجمہ: خشکی اور تری میں فساد ظاہر ہو گیا لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی سے ....

یہاں غور طلب امر یہ ہے کہ فساد کسے کہتے ہیں، ظہور فساد کیسے ہوتا ہے اور مخلوق کس طرح اس سے دوچار ہوتی ہے۔

بحر و بر میں فساد انسان کی بداعمالیوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ دنیا کی ہر شئے اپنی فطرت کے اعتبار سے اعتدال پر قائم ہے۔ یہ اعتدال اور توازن اللہ کی جانب سے ہے۔ یہی اس کی صلاح ہے۔

امام راغب اصفہانی لفظ ظَهَرَ کا مفہوم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ای کثر و شاع یعنی اضافہ ہوا اور پھیل گیا۔ (مفردات الامام راغب)

لفظ "فساد" کی تشریح کرتے ہوئے امام راغب فرماتے ہیں:

الفساد خروج الشئ عن الاعتدال قليلاً كان الخروج عنه او كثيرا ويضاده الصلاح ويستعمل ذلك فى النفس والبدن والاشياء الخارجة عن الاستقامة۔

یعنی فساد خروج ہے حد اعتدال سے خواہ یہ خروج تھوڑا ہو یا زیادہ۔ اور فساد مخالف ہے اصلاح کا۔ اس کا اطلاق ہر اس بات پر ہوتا ہے جس کا تعلق انسانی جان، بدن اور خارجی اشیاء سے ہے۔

گویا ظہر الفساد سے مراد مخلوق کا فطرت، سنت الٰہی اور حد اعتدال سے انحراف اور باہر نکل جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

الذى خلق فسوىٰ والذى قدر فهدىٰ۔ (الاعلیٰ ۲-۳)

(پروردگار) جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا جس نے تقدیر بنائی۔ پھر راہ دکھائی۔

اس ذیل میں ابو حیان فرماتے ہیں:

ای خلق كل شئ فسواه بحيث لم يات متفاوتا بل متناسبا على احكام واتقان للدلالة على

پروردگار نے تمام چیزوں کو پیدا کیا پھر انہیں درست اور متناسب بنایا کہ اس میں کوئی تفاوت نہ پایا جائے

انه صادر من عالم حکیم -
(البحر المحیط لابی حیان ۸/۴۵۶)

اور کل عالم کو تفاقم کے اعتبار سے تناسب ہو جائے اور وہ اس بات پر دلالت کریں کہ اسے کسی باخبر اور حکمت والی ذات نے بنایا ہے۔

الذی قدر کی تشریح کرتے ہوئے علامہ زمخشری فرماتے ہیں:

قدر لکل حیوان ما یصلحه فهداه الیه وعرفه وجه الانتفاع به -
(الکشاف ۴/۴)

تمام ذی روح کے لیے ایسی تقدیر تجویز فرمائی جو انکے لیے مناسب ہو پھر ان کی طرف انھیں ہدایت دی اور انھیں ان راستوں اور طریقوں سے آگاہ کیا جن کو وہ ان کا استعمال کرسکیں اور فائدہ اٹھا سکیں۔

علامہ آلوسی فرماتے ہیں:

ای قدر لکل مخلوق وحیوان ما یصلحه فهداه الیه وعرفه وجه الانتفاع به
[روح المعانی ۳۰/۱۰۴ وایضاً التسهیل لعلوم التنزیل ۴/۱۹۳]

تمام مخلوق اور ذی روح کے لیے ایسی تقدیر تجویز فرمائی جو ان کے لیے مناسب ہو۔ پھر ان کی طرف انھیں ہدایت دی اور انھیں ان راستوں اور طریقوں سے آگاہ کیا جن سے وہ انکا استعمال کرسکیں اور فائدہ اٹھا سکیں۔

یہ ہدایات متعلق ہیں ان تمام چیزوں سے جن سے اہل دنیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ علامہ زمخشری اس ذیل میں فرماتے ہیں:

وهدایات الله للانسان الیٰ مالا یحد من مصالحه ومالا یحصر من حوائجه فی اغذیته وادویته وفی ابواب دنیاه ودینه
(الکشاف ۴/۴)

اور اللہ کی یہ ہدایات انسان کے لیے مفید چیزوں سے منتفع کرانے والی ہیں (اور ان سے روکنے والی نہیں ہیں) اسی طرح وہ انسان کی غذا علاج اور دنیا اور دین کی جملہ ضرورتوں کی تکمیل کرانے والی ہیں (اور ان پر بے جا پابندی لگانے والی نہیں ہیں)۔

زمین پر فساد کا ظہور مختلف جہتوں اور متعدد راستوں سے ہوتا ہے۔ مثلاً:

الف: فضاء، کرۂ ارض، کرۂ آب، جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان کے فطری توازن میں بگاڑ

(باقی ص۵۶ پر)

سیٹلائٹ کے ذریعہ قادیانیت کی ارتدادی تبلیغ

قادیانی گروہ (اپنے آپ کو احمدی کہلاتا ہے) سیٹلائٹ کے ذریعہ "مسلم ٹیلی ویژن احمدیہ" کے نام سے ٹیلی ویژن پر دنیا بھر میں اسلام کے موضوع پر مختلف زبانوں میں پروگرام نشر کر رہا ہے۔ پروگرام کے آغاز پر خانہ کعبہ اور مسجد حرام کے دو مینارے اور انکے درمیان جھوٹے مدعی نبوت مرزا غلام احمد قادیانی کی تصویر دکھائی جاتی ہے، یوں مسلمانوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ یہ پروگرام ایک صحیح اور خالص اسلامی پروگرام ہے اور یہ کہ قادیانیت دراصل اسلام کا ایک حصہ ہے حالانکہ یہ حقیقت کھل چکی ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا، جسکی بنا پر امت نے مرزا غلام احمد قادیانی اور انکے ماننے والوں کو کافر، مرتد اور زندیق قرار دیا اور آج تک امت قادیانی گروہ کو کافر و مرتد تصور کرتی ہے۔

قادیانی گروہ کا "مسلم ٹیلی ویژن احمدیہ" کے نام پر ٹیلی ویژن پر نشریات کا جاری کرنا مذہب کے نام سب سے بڑا دھوکہ اور فراڈ ہے۔

اس لیے ہم پوری دنیا کے مسلمانوں کو خبردار کرنا چاہتے ہیں کہ قادنیت کے دھوکہ میں نہ آئیں۔

یہاں یہ واضح کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ رابطہ عالم اسلامی نے اپنے ایک اجلاس منعقدہ اپریل ۱۹۷۴ء مکہ مکرمہ اور حکومت پاکستان نے ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا تھا۔

قادیانی مذہب کیا ہے ان کے عقائد و عزائم کیا ہیں اور کس طرح مسلمانوں کو اسلام کے نام پر دھوکہ دیتے ہیں۔ یہ جاننے کے لئے تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند سے شائع شدہ لٹریچر کا مطالعہ کریں اور اس کے دفتر سے رابطہ قائم کریں۔

[از: ادارہ]

بہ حادثۂ وفات حضرت مولانا وحید الزماں صاحب قاسمی کیرانوی رہ
بانی ، النادی الادبی وسابق معاون مہتمم دارالعلوم دیوبند دیوپی)

آج مورخہ ۱۹ ذی قعدہ ۱۴۱۵ھ کو طلبہ دارالعلوم دیوبند کی عربی انجمن النادی الأدبی کی جانب سے ایک تعزیتی جلسہ حضرت مولانا ریاست علی صاحب استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند کی صدارت میں منعقد ہو جس میں حضرات اساتذہ اور النادی الادبی سے وابستہ طلبہ نے شرکت کی۔ جلسہ کا آغاز جناب قاری محمد عدنان سعدی معین التجوید دارالعلوم اورعزیزم قاری محمد عفان سلمہٗ منصور پوری متعلم دارالعلوم کی تلاوت کلام پاک سے ہوا، اس کے بعد حضرۃ الاستاذ حضرت مولانا وحید الزماں صاحب قاسمی کیرانوی سابق معاون مہتمم دارالعلوم دیوبند و بانی النادی الأدبی رحمہم اللہ سے شرف تلمذ رکھنے والے اساتذۂ دارالعلوم میں حضرت صدر جلسہ کے علاوہ حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب، جناب مولانا مجیب اللہ صاحب، جناب مولانا نسیم احمد صاحب بارہ بنکوی، جناب مولانا خورشید انور صاحب، جناب مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری اور شوکت علی قاسمی بستوی نے اپنے خیالات اور احساسات کا اظہار کیا، مقررین حضرات نے حضرۃ المرحوم کے گوناگوں اوصاف وکمالات، خداداد خوبیوں، بے مثال انداز تعلیم وتربیت، جوہر شناسی ومردم گری دارالعلوم اور طلبہ دارالعلوم کے لیے ان کی قربانیوں کو خراج تحسین پیش کیا۔ اوران کی وفات حسرت آیات کو دارالعلوم، عربی زبان وادب، دینی مدارس اور پوری علمی وملی دنیا کے لیے ناقابل تلافی نقصان قرار دیا، اور طلبہ کو ان کے العلم اور جہد مسلسل سے بھرپور قابل رشک زندگی کو مشعل راہ بنانے، ان کی گرانقدر

تصنیفات سے بھرپور استفادہ اور حضرة المرحوم کے لیے زیادہ سے زیادہ ایصال ثواب کرنے کی تاکید کی۔

اخیر میں ایک تجویز تعزیت بھی منظور کی گئی جس میں حضرت کے کارناموں کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ ان کے لیے رفع درجات اور پسماندگان کے صبر جمیل کی دعا کی گئی ہے۔

حضرت صدر محترم کی دعا پر جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

رئیس هیئة الاشراف للنادی الادبی :

محمد عثمان عفی عنہ

تجویز تعزیت النادی الادبی دارالعلوم دیوبند کا یہ اجتماع حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کے سانحۂ وفات پر اپنے گہرے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور بارگاہ خداوندی میں حضرت مرحوم کی مغفرت اور ترقی درجات کے لیے دست بدعا ہے۔

حضرت مولانا رحمہ اللہ ۱۳۸۲ھ میں دارالعلوم دیوبند میں تشریف لائے اور اسی وقت سے دارالعلوم دیوبند کی ہمہ جہت ترقی کے لیے ان کی خدمات کے باب کا آغاز ہوا۔ النادی الادبی دارالعلوم دیوبند بھی حضرت مولانا وحید الزماں صاحبؒ ہی کی یادگار ہے کہ حضرت موصوف نے طلبہ دارالعلوم کے درمیان ذوق عربیت کو عام کرنے، اور طلبۂ دارالعلوم کو عربی زبان میں تقریر و تحریر کی مشق کرانے کے لیے یہ انجمن قائم فرمائی تھی پھر عرصہ دراز تک وہ اس کی تمام سرگرمیوں کی نگرانی فرماتے رہے۔

عربی زبان و ادب کی خدمت اور طلبہ عزیز کی بہتر تعلیم و تربیت سے حضرت مرحوم کو اتنا خصوصی شغف تھا کہ گویا یہی چیز ان کی زندگی کا نصب العین تھی، انھوں نے زندگی بھر ان مقاصد کے لیے بے پناہ محنت کی اور نہایت شاندار خدمات اور گرانقدر کتابیں یادگار چھوڑیں۔

خداوند عالم نے ان کی خدمات کو اتنا قبول عام فرمایا کہ ان کا حلقۂ فیض دارالعلوم

اور طلبۂ دارالعلوم تک محدود نہیں رہا بلکہ کتنے ہی مدارس عربیہ میں النادی الادبی کے انداز پر انجمنیں قائم ہیں اور ہندوستان وپاکستان کے ہر مکتب خیال کے مدارس عربیہ حضرت مولانا کی علمی وادبی خدمات سے استفادہ کر رہے ہیں۔

دعا ہے کہ جس پروردگار نے اس دنیا میں حضرت مولانا کی خدمات کو قبول عام عطا فرمایا وہ آخرت میں ان کے اعمال کو حسن قبول عطا فرمائے، اپنے فضل وکرم سے ان کی مغفرت کرے اور درجات میں ترقی عطا فرمائے۔ جملہ پسماندگان، متعلقین اور تلامذہ کو صبر جمیل کی توفیق ارزانی کرے۔ آمین۔

بقیہ : دنیائے مذاہب میں

ان حضرات کی تالیفات پوری امت کے لیے یکساں اہمیت کی حامل رہی ہیں۔

یہاں ہمارا اصل موضوع حدیث وفقہ کے علمی معرکوں اور اختلافی موضوعات میں اعتدال رواداری اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کے احساس کو اجاگر کرنا ہے، اس لیے ہم یہاں علماء دیوبند کے انہی مشہور اہل قلم کا ذکر کر رہے ہیں جنکی حکیمانہ پالیسی کے تحت آج بھی برصغیر پاک وہند بنگلہ دیش اور برما اور ان کے مضافات میں مسلکی اور فقہی رواداریاں اور بین الاقوامی اتحاد پایا جاتا ہے۔

بقیہ ظہور فساد

پیدا ہوجانے سے۔

(ب) انسانی خلق اور عادات میں غیر فطری تبدیلی ہوجانے یا ان کا غیر فطری استعمال کرنے یا انھیں ضائع کرنے سے۔

(ج) انسانی معاشرے اور معاشرتی آداب واطوار کو ربانی ہدایات سے بے نیاز کرنے یا بالمخالف استوار کرنے سے۔

(د) دنیا میں ربانی ہدایات سے بے نیاز سیاسی، معاشی، معاشرتی، عمرانی اور روحانی نظام برپا کرنے سے۔ وغیرہ۔

دارالعلوم کی نئی جامع مسجد

اللہ تعالیٰ کا بیحد وحساب شکر ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی نئی جامع مسجد پروگرام کے مطابق تعمیری مراحل طے کرتے ہوئے پایۂ تکمیل کے قریب پہنچ رہی ہے اور اب اسکے اندرونی حصوں کو، دیواروں اور فرش کو سنگ مرمر سے مزید پختہ اور مزین کیا جارہا ہے یہ کام چونکہ اہم بھی ہے اور بڑا بھی، اس پر رقم بھی کثیر خرچ ہوگی، محبین ومخلصین کی رائے ہوئی کہ آئے دن رنگ و روغن کرانے کے خرچ سے بچنے کیلیے بہتر یہ ہے کہ ایک ہی مرتبہ اچھی رقم لگادی جائے، اسی احساس کے پیش نظر اتنا بڑا کام سرانجام دینے کا بوجھ اٹھالیا گیا ہے، ہمیں امید ہے کہ تمام حضرات معاونین نے جس طرح پہلے خصوصی تعاون دے کر مسجد کو تکمیل کے قریب پہنچایا ہے، اسی طرح بلکہ مزید سرگرمی کے ساتھ دستِ تعاون بڑھاکر اس مرحلہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ادارہ کی مدد فرمائیں گے۔

یہ مسجد بین الاقوامی اہمیت کی حامل درس گاہ دارالعلوم دیوبند کی جامع مسجد ہے جس میں نہ جانے کس کس دیار کے نیک لوگ آکر نمازیں ادا کریں گے خوش قسمت ہیں مسلمان جن کی کچھ بھی رقم اس مسجد میں لگ جائے، اس لیے اپنی جانب سے اور گھر کے ہر فرد کی جانب سے اس کارخیر میں حصہ لے کر عنداللہ ماجور ہوں اور دوسرے احباب واقرباء کو بھی اس کی ترغیب دیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمیں مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائیں اور دن دونی رات چوگنی ہمہ جہتی ترقیات سے نوازتے ہوئے تمام مصائب و آلام سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

پتہ

ڈراف وچیک کیلیے: "دارالعلوم دیوبند" اکاؤنٹ نمبر ۳۰۰،۶

منی آرڈر کے لیے: حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، اسٹیٹ بینک آف انڈیا دیوبند

پن کوڈ نمبر ۲۴۷۵۵۴

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان
ماہنامہ
دارالعلوم
PH. NO. 22429
COD - 01336
PIN - 247554
جلد نمبر ۸
ماہ صفر ۱۴۱۶ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۹۵ء
شمارہ ۷
سالانہ : 60/-
فی شمارہ : 6/-
نگراں
حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند
مدیر
حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی
استاذ دارالعلوم دیوبند
ترسیل زر کا پتہ
دفتر ماہنامہ دارالعلوم
دیوبند، سہارنپور
یوپی
سالانہ بدل اشتراک
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۴۰۰ روپئے
پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۱۰۰
بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم -/۸۰
ہندوستان سے -/۶۰ "

فہرست مضامین

ختم خریداری کی اطلاع

- یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے
- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چوں کہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہو گیا ہے، اس لیے وی، پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کردیں۔
- ہندوستان وپاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔
- بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس الرحمن سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

وقعت الواقعہ

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

دنیا کی سب سے بڑی دینی تحریک "جماعت تبلیغی" کے سربراہ اور امیر حضرت مولانا انعام الحسن کاندھلوی (حضرت جی) ۱۰ر محرم الحرام ۱۴۱۶ھ مطابق ۱۰ر جون ۱۹۹۵ء کو اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

برصغیر ہی نہیں بلکہ ایشا و یورپ میں دین سے معمولی تعلق رکھنے والا کون مسلمان ہوگا جو "حضرت جی" کے نام نامی اور دعوت و تبلیغ سے متعلق ان کی انتھک جدوجہد اور بے پناہ خدمات سے آشنا نہ ہو؟ حضرت مولانا مرحوم ایک بلند پایہ عالم، محقق استاذ، صاحب نظر محدث، متبع سنّت بزرگ، لاکھوں افراد کے پیرو مرشد اور جماعت تبلیغی کے بانی و معمار حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی دہلوی قدس سرہٗ کے ساختہ و پرداختہ اور معتمد و خلیفہ تھے۔ حضرت مولانا دھلویؒ نے اپنی حیات کے آخری ایام میں اپنے جاری کردہ دعوت و تبلیغ کے تعلق سے جن لوگوں پر اطمینان و اعتماد کا اظہار فرمایا تھا ان میں ایک حضرت مولانا انعام الحسن مرحوم و مغفور بھی تھے اس لیے حضرت مولانا کی وفات تنہا ایک فرد کی وفات نہیں۔ صرف ایک عالم دین کی رحلت کا حادثہ نہیں بلکہ ایک دور کا اختتام، ایک روایت کا خاتمہ اور ایک باب عقیدت و محبت کا انسداد ہے اور بلا تردد کہا جا سکتا ہے:

"کان بنیان قوم تھدما"

ضلع مظفر نگر یوپی کے مشہور مردم خیز اور علمی و ثقافتی قصبہ کاندھلہ میں ۱۸ر جمادی الاولیٰ

۱۳۳۶ھ موافق ۲۰؍ فروری ۱۹۱۸ء چہار شنبہ کو پیدا ہوئے۔ سلسلہ نسب یہ ہے۔
مولانا انعام الحسن، بن مولانا اکرام الحسن، بن مولانا رضی الحسن، بن مولانا حکیم محمد ابراہیم، بن مولانا نور الحسن، بن مولانا ابو الحسن خاتم مثنوی مولانا روم حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلوی رحمہم اللہ علیہم اجمعین۔
صاحب فیض بزرگ "حافظ منگتو" کی خدمت میں قرآن پاک حفظ کیا، اور اپنے نانا مولوی حکیم عبدالحمید بڈولوی سے اردو، فارسی کا درس لیا اور خوش خطی کی مشق کی۔ تقریباً نو سال کے تھے کہ حضرت مولانا محمد الیاس بانی تبلیغی جماعت قدس سرہٗ اپنے ساتھ نظام الدین دہلی لائے اور یہیں رہ کر حضرت مولانا دہلوی اور حضرت مولانا احتشام الحسن سے عربی صرف، نحو، ادب، فقہ وغیرہ کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، پھر آگے کی تعلیم کے لیے ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۴ء میں مظاہر علوم سہارنپور میں داخل ہوئے۔ اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی رح سابق امیر جماعت تبلیغی کی رفاقت میں مظاہر علوم کے اساتذہ مولانا صدیق احمد کشمیریؒ مولانا عبدالشکور رح، مولانا قاری سعید احمد رح صدر مفتی اور مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی سے شرح ملا جامی، کنز الدقائق، اصول الشاشی، میر قطبی، قطبی تصدیقات وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۶ء میں مظاہر علوم ہی میں دورۂ حدیث کی کتابیں صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی، حضرت مولانا عبداللطیف صاحب، حضرت مولانا منظور احمد خاں صاحب اور حضرت مولانا عبدالرحمٰن کامل پوری کی خدمت میں علی الترتیب پڑھیں اور دورہ حدیث کی بقیہ کتابیں یعنی سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، شرح معانی الآثار للطحاوی نظام الدین دہلی میں حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ سے مکمل کیں۔

تعلیم سے فراغت کے بعد جماعت تبلیغی سے وابستہ ہو گئے اور حضرت اقدس مولانا محمد الیاس صاحبؒ دہلوی کے حکم سے دعوت و تبلیغ کے لیے طویل طویل دوروں پر گئے۔ حضرت اقدس دہلوی سے بیعت بھی ہوئے اور مراحل سلوک طے کر کے ۱۳۶۳ھ میں اجازت و خلافت سے مشرف ہوئے۔

امیر جماعت حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی کی وفات ۱۳۸۵ھ/۱۹۶۵ء کے بعد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا قدس سرہٗ نے بحیثیت امیر جماعت مولانا مرحوم کا انتخاب فرمایا، اگرچہ اس انتخاب پر اس وقت بعض حلقوں سے اظہار حیرت کیا گیا لیکن بعد کے حالات و واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ انتخاب نہایت مناسب، موزوں اور درست تھا۔

اس انتخاب کے بعد دعوت وتبلیغ کے اس ہمہ گیر کام کی پوری ذمہ داری مولانا مرحوم کے کاندھوں پر آگئی تھی جسے انہوں نے نہ صرف بحسن وخوبی انجام دیا بلکہ اس کے دائرۂ عمل میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا' ادھر کئی سالوں سے صحت خراب رہی مگر مقصد کی دھن اور کام کی لگن میں صحت کی خرابی سے بے پرواہ ہوکر طویل طویل ملکی وغیر ملکی دورے کرتے رہے اور وعظ وخطابت کا سلسلہ بھی جاری رکھا' اسی مسلسل محنت نے مولانا مرحوم کو اندر سے بالکل نڈھال کر دیا تھا

مولانا مرحوم اسلامی علوم حدیث، فقہ، نحو، لغت وغیرہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ مدرسہ کاشف العلوم نظام الدین میں جب دورہ حدیث کا سلسلہ قائم ہوا تو بخاری شریف کا درس آپ ہی سے متعلق کیا گیا' تقریبًا چالیس سال کی طویل مدت تک درس وتدریس کا سلسلہ جاری رہا اور مروجہ نصاب کی تقریبًا سب ہی کتابیں زیر درس رہیں' آخر میں صحاح ستہ میں سے کوئی ایک کتاب زیر درس رہی مگر قریب کے چند سالوں سے خرابی صحت اور غیر معمولی ضعف کی بنا پر یہ خوش گوار سلسلہ موقوف ہو گیا تھا'

مولانا مرحوم کا آخری تبلیغی سفر ضلع مظفر نگر کے قصبہ کیرانہ کا ہوا' وہاں سے فارغ ہوکر وطن کاندھلہ ایک روز قیام کرکے ۸ محرم کو نظام الدین مرکز واپس ہو گئے۔ یہیں ۱۰ محرم ہفتہ کی رات میں تقریبًا نو بجے دل کا سخت دورہ پڑا' فورًا ہسپتال لے جائے گئے، جہاں ڈاکٹروں بالخصوص امراض القلب کے عالمی شہرت کے معالج ڈاکٹر خلیل اللہ اپنے تمام وسائل کے ساتھ تین گھنٹوں تک کوشش میں لگے رہے مگر وقت موعود آچکا تھا اور دین کا داعی چند گھنٹوں کی علالت کے بعد تقریبًا ڈیڑھ بجے شب میں اپنے ہزاروں متعلقین اور لاکھوں مریدین ومسترشدین کو اللہ کے حوالہ کرکے خود اس کی آغوش رحمت میں پہنچ گیا۔

موت ایک لابدی حقیقت ہے جو بھی دنیا میں آیا ہے لازمی طور پر اس سے دوچار ہوگا۔ کل نفس ذائقۃ الموت لیکن اللہ کی راہ اور عشق الٰہی میں جان دینے والا مرد مومن مرکر بھی مرتا نہیں۔ ؎

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ بعشق   ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

بلاشبہ مولانا مرحوم بھی اسی راہ عشق کے قتیل ہیں جن کا نام وکام انشاء اللہ زندہ وباقی رہیگا۔

دارالعلوم دیوبند میں بذریعہ دفتر جمعیۃ علماء ہند تقریباً ساڑھے پانچ بجے صبح کو حادثۂ فاجعہ کی خبر پہنچی، اس وقت مسجد کے مائک سے اس وحشت اثر خبر کا اعلان ہوا اور دیکھتے دیکھتے دارالعلوم کا چہچہاتا ہوا زعفران زار ماحول غم والم کی فضا میں تبدیل ہو گیا، دارالعلوم سے جنازہ میں شرکت کے لیے حضرت مولانا مرغوب الرحمان صاحب مہتمم، حضرت صدرالمدرسین مولانا نصیر احمد خاں صاحب، ناظم تعلیمات حضرت مولانا قمرالدین صاحب، استاذ حدیث حضرت مولانا سید ارشد مدنی وغیرہم کے علاوہ چار پانچ سو طلبہ مختلف سواریوں سے دہلی کے لیے روانہ ہو گئے اور بقیہ اساتذہ وطلبہ ترقیٔ درجات اور مغفرت کی دعاؤں میں مشغول رہے۔

تقریباً ڈیڑھ بجے ڈاکٹروں نے یہ بتایا کہ اب حضرت جی اس دنیا میں نہیں رہے اور نصف گھنٹہ بھی نہیں گذرا ہوگا کہ اس المناک حادثہ کی خبر پوری دنیا میں پھیل گئی اور کچھ وقفہ کے بعد ہی سے فون اور فیکس اور ملک وبیرون ملک سے جنازہ میں شرکت کے لیے آنے والوں کی اطلاعات آنی شروع ہو گئیں، دن گذار کر ۶ بجے شام کو نماز جنازہ کا اعلان ہوا تھا لیکن صبح ہوتے ہی ہر چہار طرف سے لوگ امنڈ پڑے، ہمایوں مقبرہ کے متصل نرسری پارک کے وسیع میدان میں بعد نماز مغرب جنازہ کی نماز ادا کی گئی، مگر یہ وسیع میدان اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود تنگ پڑ گیا۔ ایک محتاط اندازہ کے مطابق ڈھائی تین لاکھ کا مجمع جنازہ میں شریک رہا۔ ملک کے شہروں کے علاوہ سعودی عرب، قطر، عرب امارات وغیرہ سے بھی متعلقین براہ پرائیویٹ جہازوں کے ذریعہ پہنچ گئے تھے۔

راقم الحروف کے قدیم ونہایت شفیق استاذ حضرت مولانا عبدالقیوم بکھراوی ۱۷ رذوالحجہ ۱۴۱۵ھ مطابق ۱۷ مئی ۱۹۹۵ء چہارشنبہ کو دار فانی سے رحلت کر گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت استاذ محترم ایک علمی ودینی گھرانہ کے چشم وچراغ تھے آپ کے دادا حافظ رمضان صاحب، حضرت سید الطائفہ حاجی امداداللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ کے مجاز بیعت تھے اور والد ماجد حضرت مولانا عبدالرحمٰن دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل اور حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رہ کے اکابر خلفاء میں شمار ہوتے تھے۔

حضرت الاستاذ ۴ محرم ۱۳۲۲ھ کو اپنی نانیہال راجہ پورسکرہ ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم مقامی علماء سے حاصل کی ۱۳۴۱ھ میں کانپور کے مشہور عربی مدرسہ اشرف العلوم میں داخل ہوئے اور یہاں تین چار سال زیر تعلیم رہے ۱۳۴۵ھ میں دارالعلوم دیوبند پہنچے اور مسلسل پانچ سال وہاں رہ کر مروجہ نصاب کی تکمیل کے بعد حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی رح، حضرت مولانا سید اصغر حسین دیوبندیؒ حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی رح، حضرت مولانا رسول خاں ہزارویؒ وغیرہ اساتذہ دارالعلوم سے دورہ حدیث پڑھ کر ۱۳۵۰ھ میں فارغ التحصیل ہوئے، اور ۱۰ محرم ۱۳۵۱ھ میں مدرسہ بیت العلوم سرائے میر میں حضرت شیخ المشائخ مولانا عبدالغنی پھولپوریؒ بانی مدرسہ کی طلب پر استاذ مقرر ہوئے پھر یہ تعلق زندگی کے آخری ایام تک قائم رہا۔

راقم الحروف نے "تذکرہ علماء اعظم گڑھ کی ترتیب کے زمانہ میں حضرت الاستاذ کی خدمت میں ایک خط لکھ کر گذارش کی تھی کہ اپنے والد محترم حضرت مولانا عبدالرحمٰن بکھراوی قدس سرہٗ کے حالات تحریر فرمادیں، چنانچہ حسب درخواست وہ تحریر لکھ دی، اس کے آخر میں لکھتے ہیں:

"جب میں دیوبند سے فارغ ہوکر ۱۳۵۰ھ میں مکان آیا تو آنے کے ساتھ ہی حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری بانی مدرسہ بیت العلوم سرائے میر میں جو میرے والد کے پیربھائی اور حقیقی دوست تھے۔ ۱۰ محرم ۱۳۵۱ھ میں مجھے مدرسہ بیت العلوم میں مدرس رکھ لیا...... اب میری ملازمت کو چھیالیس سال ہورہے ہیں، بزرگوں کی دعا کا اثر ہے کہ حوادث ومصائب کے باوجود اتنے زمانہ تک علوم دینیہ کی خدمت کا موقع ملا، اب میری حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ میری بقیہ زندگی بھی انہیں طلبہ وعلماء وصلحاء کی خدمت میں گذرے اور انھیں سے تجہیز وتکفین کرائے اور حشر اللہ کے مقبول بندوں کے ساتھ ہو، اور ایمان پر خاتمہ ہو۔"

یہ شوال ۱۳۹۵ھ کی تحریر ہے اس حساب سے کل مدت تدریس ۶۵ برس ہوتی ہے۔ ۶۵ سال کا یہ طویل زمانہ صرف ایک مدرسہ میں گذار دیا جس کی مثال اصحاب درس علماء میں کم تر ہی ملے گی، مولانا کو بیت العلوم سے تعلق عشق کی حد تک تھا اس سے دوری اور فرقت کو برداشت نہیں کرپاتے تھے۔

سادگی، تواضع اور خوش خلقی میں سلف صالحین کا نمونہ تھے، پابند اوقات اس درجہ تھے کہ انہیں

(بقیہ صفحہ ۱ پر)

یکم جون ۹۵ء یکم محرم ۱۶ھ کو جامع مسجد مراد آباد میں پڑھا گیا

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد
خاتم الانبیاء والمرسلین وعلیٰ آلہٖ و اصحابہ اجمعین ....

امابعد !

برادران اسلام، بزرگان ملت اور حاضرین کانفرنس ۔ میں آپ کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے اس اہم اجلاس کی صدارت کی عزت بخشی۔ میں اس عزت ورتبہ کو اپنی حیثیت سے کہیں زیادہ سمجھ کر اس کے قبول کرنے سے شاید پس وپیش کرتا لیکن مقصد کی اہمیت اور وقت کی ضرورت نے بلاچوں وچرا تعمیل حکم پر مجھے مجبور کر دیا ۔

حضرات جس داعیۂ عمل اور جذبۂ خیر نے اس گرم موسم میں آپ کو تکلیف سفر پر آمادہ کیا بلاشبہ وہ لائق صد مبارکباد اور قابل ہزار تہنیت ہے ۔ لیکن اسی کے ساتھ ہر ذی شعور، ہوشمند اور دور اندیش یہ بھی مانتا اور باور کرتا ہے کہ ہمارا کام محض کانفرنسوں اور اجتماعات کے انعقاد پر ختم نہیں ہوجاتا بلکہ ؛

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

جس ملی ضرورت اور مذہبی حاجت کے نام پر آپ ہر تکلیف ومشقت سے بے نیاز ہوکر کشاں کشاں یہاں مجتمع ہو گئے ہیں۔ بیکراں خلوص عمل، مسلسل دعوت اور پیہم سعی کے بغیر وہ پایہ تکمیل سے ہم کنار نہیں ہوسکتی ۔ اس لیے آیئے ہم عہد کریں کہ کانفرنس کے

مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے ہم ہر وقت جد و جہد اور ایثار و قربانی کیلئے تیار رہیں گے۔

حالات کا تجزیہ آج ملک جن حالات سے گذر رہا ہے وہ ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ نفرت، تنگ نظری، ظلم و تشدد، اخلاقی گراوٹ، اقتصادی تباہی وغیرہ کی ظلمت خیز گھٹاؤں سے ملک کی فضائیں تیرہ و تاریک ہوگئی ہیں۔ بالخصوص مذہبی تعصب نے موجودہ دور میں انتہائی خطرناک صورت اختیار کرلی ہے جس کی بنا پر مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت اور دینی شناخت و تشخص کانٹے کی طرح کھٹک رہی ہے اور سیاست، صحافت، حکومت وغیرہ ہر طرف سے اسلامی شریعت خصوصاً اسلام کے عائلی احکام و قوانین پر وار پر وار کئے جارہے ہیں۔

ہندوستانی عدلیہ جس نے متعدد موقعوں پر عدل و انصاف کا نام روشن کیا ہے اور غیر معمولی حالات میں نہایت عادلانہ و جرأت مندانہ فیصلے دئے ہیں۔ ادھر چند برسوں سے اس کا طرز عمل بھی اسلامی عائلی قوانین کے بارے میں خاصا پریشان کن اور اضطراب انگیز رہا ہے۔ حالانکہ جمعیۃ علماء ہند ایک بار نہیں بلکہ متعدد مواقع پر ہندوستان کی قومی حکومتوں کو آگاہ کرچکی ہے کہ "تمام ملک کے لیے یکساں سول کوڈ" بنانے کا رجحان یکسر غلط اور جمہوری حقوق اور سیکولرزم کے اصولوں کے منافی ہے۔ مذہبی اور لسانی اقلیتوں کو دستور ہند کی رو سے جو بنیادی حقوق دئے گئے ہیں اور "مسلم پرسنل لاء" کے تحفظ کا جس طرح صراحت کے ساتھ دستور میں ذکر ہے اس کا تقاضا ہے کہ یکساں سول کوڈ کا نعرہ بلند کرکے دستور ہند کی قانونی حیثیت کو مجروح اور سیکولرزم و جمہوریت کی بنیاد کو متزلزل نہ کیا جائے۔

ایک مسلمان کا پختہ عقیدہ ہے کہ اسلام ایک مکمل دین ہے اور اس کے منصوص احکام ناقابل ترمیم ہیں اور مسلم پرسنل لاء بلاشبہ دین اسلام کا جزو لاینفک ہے۔ لہٰذا یکساں سول کوڈ کی باتیں یا مسلم پرسنل میں ترمیم و تنسیخ کی تجویزیں مسلم عقیدے کے لیے ایک چیلنج ہے۔

جمعیۃ علماء ہند کے ان واضح اعلانات کے باوجود درحقیقت ملک میں آباد تمام باشندے

کی ترجمان ہے۔ یکساں سول کوڈ کی ننگی تلوار بدستور مسلمانوں کے سروں پر لٹک رہی ہے اور ملک کے حالات سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ ملک کی عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) نے شاہ بانو کیس کے بعد ابھی حال ہی میں ایک دوسرا اہم اور خطرناک فیصلہ سنایا ہے جس میں عدالت نے حکومت کو یہ ہدایت دی ہے کہ "وہ لاکمیشن کو یہ ذمہ داری دے کہ اقلیتی کمیشن کی مدد اور مشورے سے حالات کا جائزہ لے کر کامن سول کوڈ وضع کرے جو موجودہ وقت میں خواتین سے متعلق انسانی حقوق کے تقاضوں سے ہم آہنگی پیدا کر سکے۔

مذہب و شریعت کے تعلق سے ان نازک تر حالات میں مسلمانانِ ہند کو نہایت بیدار مغزی، ہوش مندی، اور حکمت عملی کا ثبوت دینا اور استقامت و استقلال کے ساتھ چومکھی لڑائی لڑنا ہے۔ اپنے مقصد میں ہم اسی وقت کامیاب و کامراں ہو سکتے ہیں جب کہ وہ سہل انگاری، عیش کوشی اور فرائض و ذمہ داری سے پہلوتہی کی روش کو چھوڑ کر ہر محاذ پر پوری چوکسی کا ثبوت دیں اور اس بات پر ہمیشہ نظر رکھیں کہ حریف ان کی صفوں میں تشتت و انتشار نہ پیدا کر دے۔

ان حالات میں جہاں ہمیں حکومت و سیاست، صحافت اور عدالت کے رجحانات و عوامل پر نظر رکھنی ہوگی اور کامل بصیرت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ وہیں یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ مسلم معاشرہ کو اسلامی خطوط پر استوار کیا جائے اس سلسلے میں درج ذیل امور کا بطور خاص اہتمام کیا جائے اور ایک ایک مسلم بچہ کو ان سے واقف اور ان پر کاربند بنایا جائے۔

۱، توحید، رسالت، آخرت وغیرہ بنیادی عقائد مسلمانوں کے دلوں میں راسخ کیے جائیں، قرآن و سنت کے تعلق سے عام مسلمانوں میں یہ یقین کامل پیدا کیا جائے کہ قرآن مقدس خدا کی آخری کتاب ہے جو ہر قسم کی تحریف و ترمیم سے محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گی۔ یہ کتاب محفوظ ساری دنیا کے لیے ہدایت نامہ ہے۔ ہر وہ عقیدہ و نظریہ اور عمل جو قرآن کے مخالف ہو وہ مردود و نامعتبر ہے۔

۲۔ حدیث نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام قرآن پاک کی تفسیر وتشریح اور اس کے احکام بھی قرآن کی طرح واجب العمل ہیں۔

۳۔ مسلمانوں کو بتایا جائے کہ شریعت پر عمل کرنا عبادت ہے۔ حلال کھانا، حلال روزی کمانا بھی عبادت ہے۔ اسی طرح ہر وہ اچھا کام جو خدا کی رضا کے لیے کیا جائے عبادت ہے لیکن اصطلاحی طور پر عبادت کا لفظ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، تلاوت قرآن پاک اور ذکر واذکار وغیرہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ہر مسلمان کی مذہبی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلامی عبادتوں کا پابند رہے اور دوسرے مسلمانوں کو پابند بنانے کی سعی کرے۔

۴۔ مسلمانوں کو اس بات کا عادی بنایا جائے کہ وہ بالغ لڑکے اور لڑکی کے نکاح میں بلا وجہ شرعی تاخیر نہ کریں۔ کیوں کہ اس اہم فریضہ کی ادائیگی سے غفلت اور سستی معاشرہ کو اخلاقی انارکی طرف لے جاتی ہے۔

۵۔ مسلمانوں کو آمادہ کیا جائے کہ شادی وغیرہ کی تقریبات میں سادگی کے پہلو کو بہر حال ترجیح دیں۔ مسلمانوں کی معاشی واقتصادی بدحالی میں اسراف اور فضول خرچیوں کا نمایاں دخل ہے۔

۶۔ عام مسلمانوں میں یہ یقین پیدا کیا جائے کہ جہیز کا مطالبہ خواہ زبانی ہو یا عرفی، ناجائز ہے۔ اسلامی شریعت میں مطالبۂ جہیز کی قطعاً گنجائش نہیں جس کی پابندی ہر امیر و غریب مسلمان پر لازم ہے۔ خاص طور پر حضرات علماء اور مسلم سماج میں سربرآوردہ لوگوں کو اس رسم بد کے خلاف عملی جد وجہد میں پہل کرنی چاہئے۔

۷۔ مسلمانوں کو بتایا جائے کہ بغیر کسی وجہ شرعی کے طلاق دینا فعل حرام ہے طلاق اسی وقت دینا چاہیے جب ازدواجی زندگی دوبھر ہو جائے اور طلاق نہ دینے کی صورت میں فتنہ کا اندیشہ ہو، پھر انہیں یہ بھی بتا دیا جائے کہ بیک وقت دی گئی تین طلاقیں اگرچہ ازروئے قرآن وحدیث، وفقہ اسلامی تینوں نافذ ہو جاتی ہیں لیکن طلاق کا یہ طریقہ شریعت کی نگاہ میں مذموم اور قابل سرزنش ہے۔ لہٰذا اس سے احتراز کیا جائے۔

۸: اسلامی پردہ کی جانب خواتین اسلام کو خصوصی طور پر متوجہ کیا جائے۔

۹: مسلمانوں کو بتایا جائے کہ وہ اُپسی تعلقات اور لین دین، خرید و فروخت کے جو معاملات شریعت کے دائرے میں رہ کر انجام دیتے ہیں وہ بھی عبادت ہیں اور نماز روزہ وغیرہ عبادتوں کی طرح ان پر بھی ثواب ملتا ہے اور ان کی خلاف ورزی پر گناہ ملتا ہے۔ لہٰذا خلاف شریعت تمام معاملات سے مسلمانوں کو بچنے کی تلقین کی جائے بالخصوص سود اور جوئے کی تمام شکلوں سے پورے طور پر مسلمانوں کو بچانے کی فکر کی جائے۔

۱۰: موجودہ ذرائع ابلاغ عصر حاضر میں جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں وہ صحیح دین سے محروم، اعلیٰ انسانی قدروں سے عاری اور آبرو باختہ ہیں جن کا سارا سرمایہ جھوٹ، فریب، فحاشی اور عریانی ہے وہ ذرائع ابلاغ کے ذریعہ بچوں اور نوجوانوں کو جرائم پیشہ، فحاش اور آوارہ بناتے ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ ان ذرائع کے استعمال سے احتراز کریں۔

۱۱: دینی تعلیم چوں کہ عقائد، تصورات، نظام زندگی اور صالح روایات کی تلقین کا بہترین و موثر ذریعہ ہے اس لیے مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ سو فیصد اپنی اولاد کے لیے دینی تعلیم کا انتظام اور بندوبست کریں اور اسے ہوا، پانی اور غذا سے بھی زیادہ اہمیت دیں۔

۱۲: تہذیب و تمدن اور وضع قطع کی شناخت میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں اس لیے مسلمانوں کو اپنی اسلامی وضع قطع اور تہذیب و تمدن کو کسی حال میں چھوڑنا نہیں چاہیے اور اپنی اخلاقی و دینی قدروں پر مضبوط یقین رکھنا چاہیے۔

اصلاح معاشرہ کا یہ کام اگرچہ نہایت صبر آزما اور مشکل ہے کیوں کہ یہ مسلسل و منظم جدوجہد کو چاہتا ہے لیکن موجودہ نازک حالات و مشکلات کا سب سے کامیاب و پائیدار حل بھی یہی ہے اس لیے اپنی حفاظت و بقاء کے لیے اس مشکل کو انگیز کرنا ناگزیر ہے۔

اصلاح معاشرہ کی منظم و مسلسل کوشش کے ساتھ ملک کے موجودہ خطرناک حالات

میں ایک کام اور بھی انتہائی ضروری ہے اور وہ ہے ملک کے گوشے گوشے میں محکمہ شرعیہ (دارالقضاء) کا قیام۔

محکمۂ شرعیہ یا بالفاظ دیگر (دارالقضاء) ایسا ضروری محکمہ ہے جس کے بغیر مسلمانوں کی سماجی زندگی ایک لفظ بے معنی ہے اور جس سے چشم پوشی سے اسلامی حیات کا تصور ممکن نہیں۔ اسی بناء پر آزادی سے تقریباً اکیس سال قبل ۱۴ر مارچ ۱۹۲۶ء کو جمعیۃ علماء ہند نے مسلمانوں کو ہدایت کی تھی کہ جب تک آئینی طور پر قضاء کا نظام قائم نہیں ہو جاتا ضروری ہے کہ شہروں اور قصبوں کے مسلمان جمع ہو کر جلسۂ عام میں کسی معتمد و متدین عالم کو اپنا قاضی مقرر کرلیں۔ یہ قاضی عام مسلمانوں کی جانب سے شرعی فیصلہ کرنے کا شرعاً مجاز ہوگا۔ لیکن قاضی کے تقرر سے پہلے جمعیۃ علماء سے اس معاملہ میں استصواب کرلیا جائے اور اجازت حاصل کرلی جائے۔

چنانچہ جمعیۃ علماء ہند کی اس رہنمائی اور ہدایت پر ملک کے بہت سے با احساس بہی خواہانِ ملت نے جگہ جگہ جمعیۃ علماء ہند کی ہدایت کی روشنی میں شرعی پنچایت یعنی ایک طرح کا متبادل نظام قضاء جاری بھی کر دیا۔ پھر جمعیۃ علماء کی براہ راست دلچسپی سے ملک کے اکثر اہم مقامات میں یہ نظام برپا ہو گیا۔ اس لیے اب ضرورت محسوس کی گئی کہ اس کے لیے باقاعدہ ضابطۂ عمل مرتب کر کے شائع کر دیا جائے تاکہ کام میں باضابطگی پیدا ہو۔ چنانچہ حضرت مولانا سید محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۹۴۳ء میں اٹھائیس صفحات پر مشتمل ایک کتابچہ بنام "شرعی پنچایت" مرتب فرمایا جس میں شرعی پنچایت (دارالقضاء یا محکمہ شرعیہ) کے اصول و ضوابط شرعی پنچائت کے اختیارات اور فرائض و احکام کی پوری تفصیل بیان فرمادی۔

پھر جب نومبر ۱۹۸۶ء کو بفضلہ تعالےٰ خدام جمعیۃ ملکی سطح پر نظام امارت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور امیر الہند اول محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی رح کے انتخاب امیر کے بعد باقاعدہ ملک کے اکثر صوبوں میں ریاستی امارت قائم ہو گئی تو ضرورت محسوس ہوئی کہ صوبائی امارتوں کے تحت ریاستی اور ضلعی سطح پر محکمہ شرعیہ قائم کیا جائے۔

چنانچہ آج بحمد للہ امارت شرعیہ ہند کے ماتحت ملک میں سینکڑوں سے زائد محاکم شرعیہ معاشرتی و عائلی مسائل و معاملات میں مسلمانوں کی رہنمائی کی خدمت انجام دے رہی ہے لیکن ضرورت یہ ہے کہ محکمۂ شرعیہ یا دارالقضاء کے اس کام کو اور وسعت دی جائے اور ملک کے ہر اہم مقام میں یہ نظام برپا کر دیا جائے۔ اس ضرورت کے تحت صوبہ اتر پردیش کی جمعیۃ نے اس کانفرنس کا اہتمام و انعقاد کیا ہے۔ موجودہ حالات میں اسلام کے عائلی قوانین و احکام کو مخالف دست برد سے محفوظ رکھنے کا یہی سب سے موثر ذریعہ ہے کہ مضبوط شرعی تنظیم اور منضبط نظام قضا پورے ملک میں جاری کیا جائے۔ اس سلسلے میں ابتدائی طور پر حسب ذیل امور کو بطور خاص پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

الف: مسلمان اپنے طور پر طے کرلیں کہ وہ اپنے مقدمات خصوصاً عائلی و خانگی تنازعات کو محکمہ شرعیہ ہی سے طے کرائیں گے اور اس کے فیصلے بخوشی اپنے اوپر نافذ کریں گے اس سلسلہ میں ضروری ہے کہ:

ب: ملک کے ہر خطہ میں دعاۃ اور مبلغین بھیجے جائیں جو مسلمانوں میں یہ احساس زندہ کریں کہ شرعی عدالتوں میں اپنے تنازعات کا فیصلہ کرانا ان کی دینی ذمہ داری ہے۔

ج: پورے ملک میں دعاۃ کے ذریعہ محکمہ شرعیہ (دارالقضاء) کے لیے فضا ہموار ہوجائے اور موقع و محل کے لحاظ سے شرعی محکمے قائم کیے جائیں۔

د: یہ عدالتیں منظم باضابطہ اور احساس ذمہ داری کے ساتھ اپنی خدمت انجام دیں تاکہ لوگ ان پر اعتماد اور بھروسہ کریں۔

قیام انصاف، حقوق کی حفاظت اور شرع اسلامی کی تنفیذ امت مسلمہ کا اہم ترین فریضہ ہے جس پر فقہائے اسلام نے نہایت بسط و شرح کے ساتھ روشنی ڈالی ہے جس کے ضمن میں صراحت کے ساتھ ان مسائل و معاملات کا ذکر کیا ہے جو قضائے قاضی کے محتاج ہیں. پھر یہ معاملات صرف انہیں مسلمانوں کو پیش نہیں آتے جو اسلامی حکومت کے ماتحت ہیں بلکہ ان معاملات سے وہ مسلمان بھی دوچار ہوتے ہیں جو غیر مسلم اقتدار کے تحت زندگی گذار رہے ہیں اس لیے جس طرح اسلامی ملکوں میں رہنے والوں کے لیے قاضی کا تقرر

ضروری ہے اسی طرح غیر مسلم اقتدار کے تحت آباد مسلم معاشرہ کے لیے بھی قاضی شرعی یا اس کے قائم مقام کا انتخاب وتقرر ضروری ہوگا اور عام مسلمانوں کی اسلامی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اپنے مخصوص مسائل کے حل کے لیے انہیں کی طرف رجوع کریں۔ اللہ تعالے عزاسمہٗ کا ارشاد ہے:

"الم تر الی الذین یزعمون انهم اٰمنوا بما انزل الیك وما انزل من قبلك یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا به ویرید الشیطان ان یضلهم ضلالاً بعیدا"۔

ترجمہ: کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ایمان رکھتے ہیں اس کتاب پر جو آپ پر نازل ہوئی اور ان کتابوں پر جو آپ سے پہلے نازل ہوئیں (اس دعویٰ ایمان کے باوجود) چاہتے ہیں کہ اپنا مقدمہ باطل کے پاس لے جائیں، حالانکہ انہیں حکم دیا گیا تھا باطل کے انکار کا اور شیطان چاہتا ہے کہ ان کو بھٹکا کر راستہ سے بہت دور کر دے۔

اس آیت پاک سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ ہر مدعیٔ ایمان اور اسلام کی اتباع کے دم بھرنے والوں کی شرعی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے معاملات فیصل کرانے کے لیے خدائی احکام کی طرف رجوع کریں۔ غیروں کی طرف اپنے مقدمات لے جانا غیر شرعی عمل ہے جو شیطان کے زیر اثر وجود میں آتا ہے۔

یا ایها الذین اٰمنوا اطیعوا الله واطیعوا الرسول واولی الامر منکم الاٰیة۔

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اور اپنے امیر کی اطاعت کرو۔

اس فرمان باری میں تین اطاعتیں لازم ٹھہرائی گئی ہیں۔

(۱) اللہ کی اطاعت (۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت (۳) امیر کی اطاعت

حضرات ائمہ تفسیر نے تصریح کی ہے کہ اولی الامر سے مراد علماء، امراء اور قضاۃ ہیں۔

آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بالذات واجب الاطاعت تو صرف خدائے واحد قدوس ہے اسی لیے اطیعوا اللہ میں اسمائے صفات کے بجائے اسم ذات باری تعالےٰ کا ذکر کیا گیا ہے اور رسول کی اطاعت کے بیان میں اطیعوا محمداً کے بجائے اطیعوا الرسول فرمایا، جس کا مطلب بظاہر یہی ہے کہ رسول اپنی صفت رسالت کی بناء پر واجب الاطاعت ہیں۔ اسی نکتہ کی جانب ذہن کو منتقل کرنے کے لیے دونوں اطاعتوں کو الگ الگ ذکر کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں یعنی اللہ اور رسول اللہ کی اطاعتیں مستقل اور جداجدا حیثیت کی ہیں یعنی اول بالذات واجب الاطاعت ہے اور ثانی بالصفت اور جب تیسری اطاعت کا ذکر کیا تو اطیعوا کے تکرار کے بجائے اولی الامر کی اطاعت کو بذریعہ عطف رسول کی اطاعت کے تابع کر دیا جس کا حاصل یہ ہے کہ اولی الامر مستقلاً واجب الاطاعت نہیں بلکہ رسول کے نائب ہونے کی حیثیت سے مطاع ہیں۔

اس تفصیل سے دو باتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک یہ کہ اولی الامر یعنی علماء امراء اور قاضیوں کے احکام و فرمان کا ماننا اسی وقت ضروری ہوگا جب کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق فیصلہ کریں، دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ چوں کہ علماء امراء اور قاضی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد ان کے نائب ہیں تو اصل کی طرح ان کے احکام کی اطاعت بھی ضروری ہوگی اور چوں کہ دینی معاملات میں مسلمانوں کے اصل مرجع رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں تو اسی طرح ان کے نائب بھی دینی معاملات و مسائل میں مرجع ہوں گے اس لیے مسلمانوں کو اپنے مسائل میں انھیں چھوڑ کر دوسری طرف رجوع کرنا ان کی اسلامی حیثیت کے خلاف ہوگا۔

ایک اور آیت میں فرمایا گیا:

ماکان لمومن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امراً ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم۔

ترجمة: درست نہیں ہے کسی مومن مرد اور مومن عورت کے لیے کہ جب اللہ اور

رسول اللہ (کسی معاملہ میں کوئی) فیصلہ فرمادیں تو اس معاملہ میں ان کا کوئی اختیار رہ جائے۔

مطلب یہ ہے کہ کسی معاملہ میں اللہ اور اس کے رسول کا حکم معلوم ہوجانے کے بعد اس حکم سے انحراف اور روگردانی کرنا کسی مسلمان کے لیے جائز و درست نہیں ہے بلکہ اس کے ایمان واسلام کا تقاضا ہے کہ بے چوں وچرا احکام شریعت کے آگے سر تسلیم خم کردے۔

اسی بات کو درج ذیل آیت میں تاکید و مبالغہ کے ساتھ یوں بیان فرمایا گیا ہے :

فلا وربك لا یؤمنون حتی یحکموك فیما شجر بینهم ثم لا یجدوا فی انفسهم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما الآیة

ترجمہ : قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ مومن نہیں ہوں گے تاوقتیکہ اپنے باہمی تنازعات میں آپ کو حاکم نہ بنائیں پھر (کسی قسم کی) تنگی محسوس نہ کریں آپ کے فیصلے پر اور اسے اچھی طرح سے تسلیم کرلیں۔

غور کیا جائے کہ کس قدر زور اور تاکید کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ دعوائے ایمان کرنے والے اپنے مقدمات فیصل کرنے کے لیے عدالت محمدی میں لے جائیں اور وہاں سے صادر ہونے والے فیصلوں کو پورے انشراح قلب اور دلی بشاشت کے ساتھ بے چوں وچرا تسلیم کرلیں۔ اور اسے اپنے اوپر نافذ و جاری کرلیں۔

گزشتہ آیات سے معلوم ہوچکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد شرعی عدالتیں عدالت محمدیہ کی تائید وقائم مقام ہیں۔

لہٰذا اس آیت کی رو سے مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ محاکم شرعیہ کے قیام وانتظام کا اہتمام کریں اور پھر اپنے مقدمات ان عدالتوں میں فیصلہ کے لیے لے جائیں اور ان سے صادر فیصلوں کے آگے سر تسلیم خم کردیں۔

اس سے متعلق اور بھی بہت سی آیات قرآن میں موجود ہیں جن میں کتاب الٰہی

کے مطابق فیصلہ کا حکم دیا گیا ہے اور جو لوگ قانون شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے انہیں کافر، فاسق اور ظالم بتایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ قانون شریعت کے مطابق فیصلے شرعی عدالتوں میں ہی ہوں گے اور اس وقت جب کہ لوگ اپنے پیش آمدہ معاملات میں ان کی جانب رجوع کریں۔

جس کا مفاد یہی ہے کہ قانون شریعت کے اجراء و نفاذ کے لیے شرعی عدالتیں ہماری آج کی اصطلاح میں "محکمہ شرعیہ" قائم کی جائیں اور عامۃ المسلمین اپنے تنازعات بالخصوص عائلی مقدمات کے فیصلے کے لیے ان سے رجوع کریں اور پھر ان کے فیصلوں کو اپنے اوپر برضا و رغبت نافذ و جاری کریں۔ یہی ہماری اسلامی زندگی کا تقاضا ہے اور اور آج کے اس تعصب پسند ماحول میں اسلامی زندگی اور مذہبی شناخت اور تشخص کی بقاء و حفاظت کا سب سے مؤثر و مفید طریقہ ہے۔

اس سلسلے کی اور بہت سی باتیں کہنے کی تھیں لیکن بتقاضائے وقت و فرصت انہیں گزارشات پر یہ تحریر ختم کی جاتی ہے "یار زندہ صحبت باقی" انشاء اللہ کسی اور موقع پر مزید تفصیلات پیش خدمت کی جائیں گی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام
علیٰ سید المرسلین وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین۔

بقیہ : حرف آغاز

تملت مشکل ہی سے پیش آتا' قرآن کی تلاوت عادت ثانیہ بن چکی تھی چلتے پھرتے' اٹھتے بیٹھتے زبان پر کلام الٰہی کی آیتیں جاری رہتیں' پڑھانے کا انداز ایسا نرالہ تھا کہ اسے پڑھانا نہیں بلکہ اسے گھول کر پلانا کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا' اللہ تعالٰے نے ان کی خواہش پوری فرمادی اور علماء و صلحاء ہی کے ہاتھوں تجہیز و تکفین عمل میں آئی اور انھیں کے کاندھوں پر سوار ہو کر بکمراسے بیت العلوم پہنچے اور اسی کی خاک میں آسودہ خواب ہو گئے۔ ع　عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

اللہ تعالٰے ان کی قبر کو نور سے معمور فرمائے اور ان کی دعا کے مطابق صدیقین، شہداء، صالحین کے ساتھ ان کا حشر فرمائے اور جنت کے درجات عالیہ سے ہم کنار فرمائے۔ (آمین)

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آخری وصیت

ڈاکٹر عبدالمعید کبیری باغ روڈ مئو

بیعت عقبہ اور بدر اور تمام غزوات میں شریک ہوئے ہیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے جب مدینہ تشریف لائے تو پہلے آپ ہی کے مکان میں قیام پذیر ہوئے ہیں ابتداءً نیچے کی منزل میں آپ نے قیام کیا تھا اور ابوایوب رضؓ اوپر رہتے تھے، ایک دن کسی طرح اوپر پانی گر گیا، تو ابوایوب رضؓ نے اپنے اوڑھنے والے کپڑوں میں جذب کیا کہ کہیں نیچے نہ ٹپکے اور آپ کو تکلیف نہ ہو۔ پھر حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضرت اچھا نہیں لگتا کہ ہم اوپر رہیں، آپ اوپر تشریف لے چلیں۔ حضرت راضی ہو گئے اور اپنا سامان اوپر منتقل کرالیا[1]

حضرت معاویہ رضؓ نے قسطنطنیہ فتح کرنے کے لیے جو لشکر روانہ کیا تھا اس میں آپ بھی تھے اس غزوہ میں عبداللہ ابن عباس رضؓ عبداللہ ابن عمر رضؓ اور حضرت حسین رضؓ کے علاوہ بھی صحابہ کرام رضؓ کی ایک جماعت شریک جہاد تھی۔ قسطنطنیہ بیک وقت بازنطینی سلطنت اور عیسائی مذہب دونوں کا اہم ترین مرکز تھا اور اس کی یہی اہمیت تھی جس کی بناء پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اس شہر پر جہاد کرنے والوں کو مغفرت کی بشارت دی تھی۔ بخاری شریف میں روایت ہے :

حضرت انس رضؓ کی خالہ ام حرام بنت ملحان رضی اللہ عنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی رشتہ دار تھیں ایک روز آپؐ ان کے گھر میں دوپہر کے وقت سوئے ہوئے تھے کہ

---

[1] اعیان الحجاج حصہ اوّل ص۵۶۔

اچانک آپؐ مسکراتے ہوئے بیدار ہوئے، حضرت ام حرامؓ نے تبسم کی وجہ پوچھی تو آپؐ نے فرمایا —— ناس من امتی عرضوا علیّ غزاۃ فی سبیل اللّٰہ یرکبون ھذا البحر کالملوک علی الاسرۃ ۔

خواب میں مجھے اپنی امت کے لوگ دکھائے گئے جو جہاد کے لیے سمندر کی موجوں پر اس طرح سفر کریں گے، جیسے تخت پر بادشاہ بیٹھے ہوں۔

ام حرامؓ نے عرض کیا —— یارسول اللّٰہ ادع اللّٰہ ان یجعلنی منھم ۔

یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرمادیجئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ مجھے بھی ان میں شامل فرمالے۔

آپ نے دعا فرمادی اور دوبارہ محو خواب ہوگئے، تھوڑی دیر کے بعد آپؐ پھر مسکراتے ہوئے بیدار ہوئے۔ حضرت ام حرامؓ نے دوبارہ وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ :

اول جیش من امتی یغزون مدینۃ قیصر مغفور لھم [1]

میری امت کا پہلا لشکر جو قیصر (روم) کے شہر (قسطنطنیہ) پر جہاد کرے گا اس کی مغفرت ہوگی۔

پہلا بحری جہاد حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں حضرت معاویہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی سپہ سالاری میں قبرص پر ہوا تھا، اس کے بعد جب حضرت معاویہؓ خلیفہ بنے تو اپنے بیٹے یزید کی قیادت میں قسطنطنیہ پر پہلا حملہ کیا جس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مغفرت کی بشارت دی تھی۔ اس غزوہ میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی شرکت اور یزید کے امیر لشکر ہونے کا تذکرہ صحیح بخاری میں بھی ہے :

قال محمود بن الربیع فحدثتھا قوما فیھم ابوایوب الانصاری صاحب رسول صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی الغزوۃ التی توفی فیھا ویزید بن معاویۃ علیھم بارض الروم [2]

---

[1] بخاری کتاب الجہاد باب فضل من یصرع فی سبیل اللّٰہ وباب ما قال فی قتال الروم ۔

[2] بخاری جلد اول باب صلوٰۃ النفل جماعۃ ۔

راوی محمود کہتے ہیں کہ میں نے یہ حدیث ایک مجمع میں بیان کی جس میں صحابی رسول ابوایوب انصاری رض بھی تھے اور یہ اس مہم اور غزوہ کا ذکر ہے جس میں ابوایوب انصاری رض کی وفات ہوئی اور یزید بن معاویہ رض اس مجمع اور لشکر کے امیر تھے اور سرزمین روم (مدینہ قیصر قسطنطنیہ) پر حملہ کیا جانے والا تھا۔

مشہور عالم ربانی مولانا محمد تقی عثمانی حافظ ابن حجر کی "اصابہ" کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:

"قسطنطنیہ میں جب محاصرہ طویل ہوا تو آپ (حضرت ابوایوب انصاری رض) بیمار ہو گئے یزید آپ کی بیمار پرسی کے لیے حاضر ہوئے اور آپ سے پوچھا کہ کوئی خدمت بتائیے۔ حضرت ابوایوب انصاری رض نے جواب دیا کہ بس میری ایک خواہش ہے اور وہ یہ کہ جب میرا انتقال ہو جائے تو میری لاش کو گھوڑے پر رکھ کر دشمن کی سرزمین میں جتنی دور تک لے جانا ممکن ہو لے جانا اور وہاں لے جا کر دفن کرنا اس کے بعد وفات ہو گئی تو یزید نے آپ کی وصیت پر عمل کیا اور قسطنطنیہ کی دیوار کے قریب آپ کو دفن کیا"۔[1]

حافظ ابن کثیر رح نے اس واقعہ کو ذرا تفصیل سے لکھا ہے وہ تحریر فرماتے ہیں،

"وکان (ابوایوب الانصاریؓ) فی جیش یزید بن معاویہ والیہ اوصیٰ وھو الذی صلی علیہ"[2]

اور ابوایوب انصاری رض یزید بن معاویہ رض کے لشکر میں شامل تھے اسی (یزید) کو انہوں نے وصیت کی اور اسی (یزید) نے ان کے جنازے کی نماز پڑھائی۔ مزید لکھتے ہیں،

وقد قال الامام احمد ان یزید بن معاویۃ کان امیراً علی الجیش الذی غزا فیہ ابوایوب فدخل علیہ عند الموت فقال لہ اذا انامت فاقرؤا علی الناس منی السلام واخبروھم انی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من مات ولایشرک باللہ شیئاً جعلہ

---

[1] جہان دیدہ بحوالہ "الاصابہ" ص ۳۰۸/۱۔ [2] البدایۃ والنہایۃ جلد ۸ ص ۵۹۔

اللہ فی الجنۃ ولینطلقوا فیبعدوا لی فی الارض الروم مااستطاعوا قال احمد فحدث الناس لما مات ابوایوب فاسلم الناس و انطلقوا بجنازتہ" [1]

امام احمد بن حنبل رح نے فرمایا کہ یزید بن معاویہؓ اس فوج کے سردار تھے جس میں شامل ہو کر ابوایوب انصاری رح نے جہاد کیا تھا' ان کے مرنے کے وقت (یزید) ان کے پاس گئے۔ سو انھوں نے ان سے (یزید) سے فرمایا کہ میں جب مرجاؤں تو میرا سلام لوگوں کو پہنچا دینا اور ان کو یہ بتا دینا کہ رسول اللہ کو میں نے یہ فرماتے سنا ہے کہ جو شخص مرجائے اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ جانتا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت نصیب کریں گے اور میرا جنازہ سرزمین روم میں جہاں تک لے جاسکو' لے جاکر دفن کر دینا۔ امام احمدؒ نے کہا کہ جب ابوایوب انصاریؓ کی وفات ہوگئی تو یزید نے لوگوں سے آپ کی وصیت کا ذکر فرمایا۔ لوگوں نے اسے قبول کیا اور ان کے جنازہ کو لے گیے۔

حضرت ابوایوب انصاری رح کی وفات کے بعد جب آپ کو غازیان اسلام قسطنطنیہ کی فصیل کے نیچے دفن کر رہے تھے' اس وقت قیصر نے اس منظر کو دیکھ کر امیر لشکر یزید کے پاس قاصد بھیجا اور حال معلوم کرنا چاہا:

فارسل الیٰ یزید ۔ ۔ ۔ ماھذا الذی اریٰ قال: صاحب نبینا وقد سئلنا ان نقومہ فی بلادك ونحن منفذون وصیتہ او تلحق ارواحنا باللہ۔ [2]

(قیصر روم نے) یزید کے پاس (پیغام) بھیجا کہ یہ کیا کر رہے ہو جو ہم دیکھ رہے ہیں۔ یزید نے جواب دیا' یہ ہمارے نبیؐ کے صحابی کا جنازہ ہے انھوں نے تمہارے ملک میں (جہاد کرنے کی) خواہش کی تھی (وہ وفات پا گئے) اب ہم ان کی وصیت کی تکمیل کر رہے ہیں' اگر تم مانع ہوئے تو ہم ضرور دفن کریں گے' یا اپنی جانوں کو اللہ کے حوالہ کر دیں گے۔

---

[1] البدایۃ والنہایۃ جلد ۸ صفحہ ۵۸ ؛ [2] العقد الفرید جلد ۳ صفحہ ۱۳۳ ۔

اس پر قیصر نے کہا: فاذا ولیت لنخرجناہ الی الکلاب (جب تم یہاں سے لوٹ جاؤ گے تو نعش کو نکال کر ہم کتوں کو دے دیں گے۔ قیصر کے یہ گستاخانہ جملے سن کر امیر لشکر یزید نے رومیوں پر سخت حملہ کیا۔

ابوالفرج اصفہانی تحریر فرماتے ہیں: ثم کیف العسکر وحمل حتی ھزم الروم فاحجرھم فی المدینۃ وضرب باب القسطنطنیہ بعمود حدید فہشمہ حتی انخرق [۱] (پھر یزید فوج کو ادھر پھیر کر (رومیوں پر) حملہ کرنے کو لے گئے یہاں تک کہ رومیوں کو منہدم کر دیا اور شہر کے اندر محصور کر دیا اور قسطنطنیہ کے دروازے پر لوہے کی گرز سے جوان کے ہاتھوں میں تھا ضربیں لگائیں کہ (جگہ جگہ سے) پھٹ گیا)

پھر یزید نے قیصر سے کہا: لئن بلغنی انہ نبش من قبرہ او مثل بہ لاا ترک بارض العرب نصرانیًا الا قتلتہ ولا کنیسۃ الا ھدمتہا (اگر مجھ کو یہ خبر پہنچی کہ ان کی (ابوایوب انصاری رض) کی قبر کو توڑا پھوڑا گیا یا مثلہ کیا گیا تو میں ایک نصرانی کو بھی جو عرب کی سرزمین میں موجود ہوگا زندہ نہ چھوڑوں گا اور نہ کسی گرجا کو بغیر منہدم کیے رہنے دوں گا) [۲]

یزید بن معاویہ رض کے اس دھمکی آمیز کلمات سے قیصر خوف زدہ ہوگیا اور روایت میں ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی قسم کھا کر اس نے یقین دلا دیا کہ قبر کی بے حرمتی نہ کی جائے بلکہ اس کی حفاظت ہوگی۔

فحینئذ حلفوا لھم لدینھم لیکرمن قبرہ ولیحرسنہ مااستطاعوا [۳] (پھر تو اس کی دھمکی کے نتیجہ میں اپنے کے دین کے مطابق حلف لے لیا کہ وہ ان کی قبر کا اکرام اور دیکھ ریکھ کریں گے۔ اس کے بعد قیصر نے ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر پر قبہ بنوا دیا۔

---

[۱] اغانی جلد ۱ ص ۳۳؛ [۲] العقد الفرید جلد ۳ ص ۱۳۳؛
[۳] الروض الانف ص ۲۴۶؛

انہ نبی علیٰ قبرہ قبۃ و یسرج فیہ الی الیوم [۱]

اس نے یعنی قیصر نے ان کی یعنی ابوایوب انصاری رضی کی قبر پر قبہ بنوادیا۔ جہاں آج تک چراغ روشن ہوتا ہے۔

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمان الاعظمی رحہ تحریر فرماتے ہیں:

"عیسائی قحط کے وقت آپ کی مزار کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اس کی برکت سے بارش ہوجاتی تھی، آج بھی آپ کا مزار معروف ہے اور اس سے برکت حاصل کی جاتی ہے" [۲]

یہ مقدس صحابی جنہیں اللہ تعالیٰ نے رحمۃ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم کی میزبانی کا شرف بخشا تھا، اپنے وطن سے ہزاروں میل دور اللہ تعالیٰ کے دین کا پیغام لیے ہوئے اس دیار غربت میں راہی آخرت ہوئے اور زندگی کے آخری لمحوں میں بھی خواہش تھی، تو یہ کہ اس کلمہ کو لئے ہوئے دشمن کی سرزمین میں جتنی دور تک جاسکوں چلا جاؤں

دیکھا جائے تو قسطنطنیہ کے اصل فاتح آپ ہی ہیں، آپ ہی کے ذریعہ اس سرزمین پر پہلی بار اسلام کا کلمہ پہنچا اور آپ ہی کے وسیلے سے اس خاک کو ایک صحابی رسول کا مدفن بننے کی سعادت حاصل ہوئی۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ [۳]

---

[۱] العقد الفرید جلد ۳ ص ۱۲۳، [۲] اعیان الحجاج حصہ اول ص ۵۶۔

[۳] جہاں دیدہ ص ۳۵۶۔
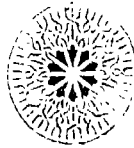
دنیوی زندگی پر اقبالؔ کے قرآنی تصورات

محمد بدیع الزماں - ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، ہارون نگر، فرسٹ سیکٹر، پھلواری شریف پٹنہ ۸۰۱۵۰۵

دنیوی زندگی کا قرآنی تصور اور نقطہ نظر صرف اتنا ہے کہ کارزار حیات میں جو دوڑ دھوپ آدمی کر رہا ہے اس میں آیا وہ دنیوی نتائج پر نگاہ رکھتا ہے یا ان کے اخروی نتائج پر۔ اصل اعتبار دنیوی زندگی کی سعی وجہد کے نتائج کا ہے۔ سورۂ آل عمران ۳ کی آیت ۱۸۵ میں " وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ " کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ آخرت کی حقیقی اور پائیدار زندگی کے مقابلہ میں یہ زندگی ایسی ہے جیسے کوئی شخص کچھ دیر کے لیے کھیل اور تفریح میں دل بہلائے۔ دوسرے یہ کہ حقیقت کے مخفی ہونے کی وجہ سے بے بصیرت اور ظاہر پرست انسانوں کے لیے غلط فہمیوں میں مبتلا ہونے کے اتنے آسان اسباب اس دنیا میں موجود ہیں کہ لوگ حقیقت نفس الامری کے خلاف ایسا طرز عمل اختیار کرتے ہیں جو محض کھیل اور تماشا بن کر رہ جاتا ہے۔ دنیوی زندگی میں اس غلط رویہ اور طرز عمل کو قرآن میں "ضلوا عن سواء السبیل" راہ گم کرنے کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔

جو لوگ خدا کے سامنے اپنے آپ کو ذمہ دار اور جواب دہ نہیں سمجھتے، جو اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں رکھتے کہ انھیں آخرکار خدا کو اپنے پورے کارنامۂ حیات کا حساب دینا ہے وہ بس مفروضے پر کام کرتے ہیں کہ زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے اور اس مادہ پرستانہ تخیلات کی بنا پر ان کی پوری زندگی غلط ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایک موقع پر فرمایا گیا:

> "واقعہ یہ ہے کہ یہ جو کچھ سروسامان بھی زمین پر ہے اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ ان لوگوں کو آزمائیں۔ ان میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے"
>
> (سورۃ الکہف ۱۸۔ آیت ۷)

خدا تعالیٰ نے انسان کو زمین کی خلافت عطا فرمائی اور اس کے لیے زمین و

آسمان کی اشیاء کو مسخر کردیا، اسے زمین پر اختیارات دیئے، اسے عقل وشعور سے نوازا، اللہ کا دین انسان سے یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ وہ اس دنیا کی متاع حیات سے استفادہ نہ کرے۔ اس کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ وہ اس دنیوی زندگی میں اپنے عقل وشعور سے ان واجبات کو پورا کرے جو بحیثیت خلیفۃ الارض اسے سونپے گئے ہیں۔ جیسا سورۃ الانبیاء ۲۱ کی آیت ۱۷ میں فرمایا گیا ہے۔ کائنات کا یہ سارا نظام کوئی کھلنڈرے کا کھیل نہیں جس کا کوئی سنجیدہ مقصد نہ ہو، اور نہ انسان اس دنیا میں یونہی آزاد چھوڑ دیا گیا ہے کہ جو کچھ چاہے کرے اور جس طرح چاہے جئے۔

اسی طرح دنیوی زندگی میں انسان کے سامنے دو نظریہ حیات ہیں۔ ایک یہ کہ اگر وہ دنیوی زندگی کو صرف عیش وعشرت اور دنیا کے مزے لوٹنے تک محدود سمجھتا ہے تو یہ اس کے لیے خسران ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ اگر خود کو خلیفۃ الارض کی حیثیت سے ذمہ دار سمجھتا ہے تو جیسا خدا کا ارشاد ہے کہ قیامت میں یہ دیکھا جائے گا کہ اس نے دنیا میں رہ کر ویسی سعی کی یا نہیں، جیسی کی جانی چاہیئے تھی، اگر اس نے کی تو یہ فلاح کا موجب ہوگی، قرآن میں دنیوی زندگی کے معاملہ میں انہی دونوں نظریات خسران اور فلاح کو بہت سارے مواقع پر مختلف طریقوں سے مثالیں دے دے کر ذہن نشین کرایا گیا ہے۔

جہاں تک دنیوی زندگی پر اقبال کے قرآنی تصورات کا سوال ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ شاعر تھے، نثر نگار نہیں، چند مصرعوں میں بہت سی بات کہہ جانا ہی شاعری ہے اور عظیم شاعر وہ ہے جو چند الفاظ میں وہ سب کچھ کہہ جائے جو کئی مصرعوں کے موضوع ہو سکتے ہیں، اقبال کو زبان وبیان پر قدرت حاصل تھی مگر انہیں کہنا بہت کچھ تھا، قرآن کے ز موضوع کے سمندر کو کوزے میں بند کرنا تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنے پیام وکلام کی پوری عمارت خود اپنی وضع کردہ اصطلاحوں پر کھڑی کی جن کی تعداد پانچ سو سے بھی زائد ہے۔ چنانچہ دنیوی زندگی پر اپنے قرآنی تصورات کے اظہار کے لیے انھوں نے چند ایسی اصطلاحیں وضع کیں۔ جو اس موضوع پر قرآنی آیات کی ہوبہو ترجمان ہوں اور وہ اصطلاحیں ہیں دنیا کے لیے "خاک" زمین ہی کی طرف جھک جانے بلکہ اس سے چمٹ جانے کی بنا پر اپنی خواہشات نفس کے

پیچھے پڑے رہنے کے لیے "جذب خاک" اللہ کی راہ میں نکل کر بلند مرتبہ حاصل کرنے کے لیے "پرواز" اور اپنے نیک مقاصد کے حصول کے جذبے کے لیے "لذت پرواز" اقبال کی یہ چاروں اصطلاحات کا ماخذ قرآن کی درج ذیل آیات ہیں جن سے براہ راست اقبال نے یہ اصطلاحیں وضع کی ہیں۔ فرمایا گیا ہے:

"اور اے نبیؐ، ان کے سامنے اس شخص کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا مگر وہ ان کی پابندی سے نکل بھاگا۔ آخر کار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا یہاں تک کہ وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعہ سے بلندی عطا کرتے مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہش نفس ہی کے پیچھے پڑا رہا۔"

[سورۃ الاعراف ۷، آیات ۱۷۵ اور ۱۷۶]

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمہیں کیا ہو گیا کہ جب تم سے اللہ کی راہ میں نکلنے کو کہا گیا تو تم زمین سے چمٹ کر رہ گئے؟ کیا تم نے آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا؟ ایسا ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ دنیوی زندگی کا یہ سب سروسامان آخرت میں بہت تھوڑا نکلے گا۔"

[سورۃ التوبہ ۹۔ آیت ۳۸]

اب ان آیات کو پیش نظر رکھ کر ان اصطلاحوں سے ترتیب دئے گئے اشعار بہتر طور پر گرفت میں آتے ہیں کیوں کہ اقبال نے انہی دو آیات کو کہیں تمثیلی پیرایہ بیان میں، کہیں مکالمہ کے طور پر اور کہیں غزلوں اور نظموں کے منفرد اشعار میں ذہن نشیں کرایا ہے۔

یہ بات کہ انسان کی بزرگی اس کے مقاصد کی بلندی اور اپنا نظریہ آفاقی رکھنے پر منحصر ہے نہ کہ "خاک نشینی" یعنی دنیا سے چمٹے رہنے میں، اسے اقبال نے "بانگ درا" کی نظم "ایک مکالمہ" میں "مرغ سرا" اور "مرغ ہوا" کے مابین مکالمہ کے طور پر پیش کیا ہے اور یہ نکتہ ذہن نشیں کرایا ہے کہ حالاں کہ "مرغ سرا" یعنی وہ پرندے جو گھروں کے آس پاس یا دیواروں پہ بیٹھے رہتے ہیں جیسے کوّا، اور "مرغ ہوا" جو ہمیشہ فضا میں اڑتے رہتے ہیں جیسے

شاہین، عقاب وغیرہ۔ دونوں ہوا میں اڑنے کے معاملہ میں آزاد ہیں مگر چونکہ "مرغ سرا" یعنی وہ شخص جو دنیا کی طرف جھکا یا اس سے چمٹا ہوا ہو۔ اس کی نظر در و دیوار یا پاس کے درخت تک ہی جاسکتی ہے اس لیے وہ پست ہمت ہے، اس کے برعکس "مرغ ہوا" جس کے انداز آفاقی ہیں وہ اپنا رزق زمین میں تلاش نہیں کرتا بلکہ ستاروں تک پہنچ جاتا ہے، پوری نظم درج ذیل ہے جس میں اقبال نے دونوں کے نظریہ حیات کو حکیمانہ انداز میں پیش کیا ہے ؎

اک مرغ سرا نے یہ کہا مرغ ہوا سے
پردار اگر تو ہے تو کیا میں نہیں پردار؟
گر تو ہے ہوا گیر، تو ہوں میں بھی ہوا گیر
آزاد اگر تو ہے نہیں میں بھی گرفتار
پرواز خصوصیت ہر صاحبِ پر ہے
کیوں رہتے ہیں مرغانِ ہوا مائل پندار
مجروح حمیّت جو ہوئی مرغِ ہوا کی
یوں کہنے لگا سن کے یہ گفتار دل آزار
کچھ شک نہیں پرواز میں آزاد ہے تو بھی
حد ہے تیری پرواز کی لیکن سر دیوار
واقف نہیں تو ہمت مرغانِ ہوا سے
تو خاک نشیمن، انھیں گردوں سے سروکار
تو مرغ سرائی، خورش از خاک بجوئی
ما در صدد دانہ بانجم زدہ منقار

جو سوال متذکرہ نظم میں مرغ سرا نے مرغ ہوا سے کیا تھا کہ "کیوں رہتے ہیں مرغانِ ہوا مائل پندار" وہی سوال "بال جبریل" کی نظم "چیونٹی اور عقاب" میں چیونٹی نے عقاب سے کیا اور اسے عقاب نے وہی جواب دیا جو مرغ ہوا نے مرغ سرا کو دیا تھا، کہ اگر دنیوی زندگی میں مقصدِ حیات کا زاویۂ نگاہ پست ہوگا تو زندگی میں ترقی، عروج یا سربلندی کا رنگ ہرگز پیدا نہیں ہوسکتا۔ یہ نظم جو درج ذیل ہے دو ہی اشعار پر مشتمل ہے ؎

چیونٹی: میں پائمال و خوار و پریشاں و دردمند
تیرا مقام کیوں ہے ستاروں سے بھی بلند؟
عقاب: تو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاک راہ میں
میں نُہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں

اقبال نے دنیوی زندگی پر اپنے قرآنی تصورات کی وضاحت اس طرح کی ہے علائق

دنیوی سے انسان اسی وقت بالکل بیگانہ ہو سکتا ہے جب وہ دولت عشق یعنی عشق رسولؐ سے سرشار ہو، کیوں کہ اسی عشق کی بدولت انسان میں جو جنون کا رنگ پیدا ہوتا ہے اس سے اس کی عقل اور تیز تر ہو جاتی ہے اور اس طرح اس کی نگاہ میں "نشیمن" یعنی علائق دنیوی کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی۔ اسی نکتہ پر "بال جبریل" کی نظم "مسجد قرطبہ" کے پانچویں بند کے درج ذیل اشعار میں اس طرح روشنی ڈالتے ہیں ؎

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اسکے مقاصد جلیل اس کی ادا دل فریب، اس کی نگہ دل نواز

اسی نکتہ پر مزید روشنی اقبال نے "بال جبریل" کی درج ذیل غزل ۴۹ میں اس طرح بھی ڈالی ہے،

فطرت نے نہ بخشا مجھے اندیشۂ چالاک رکھتی ہے مگر طاقت پرواز مری خاک
وہ خاک کہ ہے جس کا جنوں صیقل ادراک وہ خاک کہ جبریل کی ہے جس سے قبا چاک
وہ خاک کہ پروائے نشیمن نہیں رکھتی چنتی نہیں پہنائے چمن سے خس و خاشاک*

اس خاک کو اللہ نے بخشے ہیں وہ آنسو
کرتی ہے چمک جن کی ستاروں کو عرق ناک

اسی مضمون کو اقبال نے اسی مجموعہ کی غزل ۵۱ اور "ضرب کلیم" کی نظم "مومن (دنیا میں)" علی الترتیب اس طرح بھی ذہن نشیں کرایا ہے ؎

خاکی ہے مگر اس کے انداز ہیں افلاکی رومی ہے نہ شامی ہے نہ کاشی نہ سمرقندی
افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن

اقبال نے "بال جبریل" کی نظم "فرشتے آدمؑ کو جنت سے رخصت کرتے ہیں" میں یہ نکتہ ذہن نشین کرایا ہے کہ چونکہ اللہ نے آدم کو اپنا خلیفہ بنایا ہے اور اس شعور، ادراک اور فہم کے ساتھ اس میں ترقی کے لامحدود امکانات پوشیدہ رکھے ہیں، اس لیے دنیوی زندگی میں اس کا کام یہ ہے کہ وہ اس منصب جلیل کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو یا اسے کھیل تماشا سمجھ کر دنیوی لذائذ تک اپنا مقصود حیات محدود کر دے۔

اس نظم میں اقبال نے انسان کے خاکی ہونے کے باوجود اس کا جوہر حیات خاکی

نہیں بلکہ روحانی یا نورانی ہونے کی بات فرشتوں سے آدم کو جنت سے رخصت کئے جانے کے وقت سنائی ہے کہ ؂

سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی

اقبال نے دنیا کی فانی دلچسپیوں' جسے انہوں نے گلشن کے خس وخاشاک سے تعبیر کیا ہے' میں منہمک ہوکر مقصدِ حیات سے غافل ہوجانے کی بات تمثیلی پیرایہ بیان میں "ضربِ کلیم" کی نظم "نسیم وشبنم" میں ذہن نشیں کرائی ہے. شبنم کی زبانی وہ یہ نکتہ ذہن نشیں کراتے ہیں کہ اگر انسان اپنی نظر کو بلند اور مقاصد کو ارفع کرے تو گلشن بھی افلاک کا ہم رتبہ ہے۔ اس میں بھی وہی عظمت پوشیدہ ہے جو سراپردۂ افلاک میں نظر آتی ہے مگر شرط اس نظر کی ہے جو گلشن کی عظمتِ مخفی کو دیکھ سکے ؂

کھینچیں نہ اگر تجھ کو چمن کے خس وخاشاک
گلشن بھی ہے اس سرسراپردۂ افلاک

اقبال کے نزدیک جب تک انسان کا زاویۂ نگاہ آفاقی نہ ہوجائے اس کے دل میں آفاق گیری کا جذبہ پیدا نہیں ہوسکتا اور نہ وہ علائقِ دنیوی سے بے نیاز ہوسکتا ہے "بالِ جبریل" کی غزل ۲۶ میں کہتے ہیں ؂

دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اٹھتے
نگاہوں میں اگر پیدا نہ ہو اندازِ آفاقی

سورۃ الاعراف، کی آیت ۱۷۶ میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ اگر انسان زمین ہی کیطرف جھک کر رہ جاتا تو ہم اسے بلندی عطا کرتے۔ اقبال نے اس بلندی کو "پرواز" سے تعبیر کیا ہے' یعنی دنیوی علائق سے بے نیاز ہوکر بلند مقصد کے حصول کے لیے اپنے زاویۂ نگا کو آفاقی بناڈالنا۔ اس "پرواز" اور "لذت پرواز" پر اقبال کے چند اشعار درج ذیل ہیں' اسی قرآنی آیت کے ترجمان ہیں ؂

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے　　　　تری پرواز لولاکی نہیں ہے

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
ہوتا ہے مگر محنت پرواز سے روشن یہ نکتہ کہ گردوں سے زمین دور نہیں ہے
انکو کیا معلوم اس طائر کے احوال و مقام روح ہے جس کی دم پرواز سرتا پا نظر
درّاج کے پرواز میں ہے شوکت شاہیں حیرت میں ہے صیاد یہ شاہیں ہے کہ درّاج

پہلے دو اشعار "بال جبریل" کے ہیں، اس کے بعد دو "ضرب کلیم" کے اور آخری شعر "ارمغان حجاز" کا ہے۔

اقبال کے نزدیک جس شے کا وجود جذب خاک (یعنی علائق دنیوی سے چمٹے رہنے) سے آزاد نہیں ہوگا وہ "لذت پرواز" (یعنی بلندیٔ مرتبہ کے حوصلے) سے بہرہ اندوز نہیں ہوسکتا۔ اقبال نے "بال جبریل" کی درج ذیل نظم "پرواز" میں "جذب خاک" اور "لذت پرواز" کا موازنہ کیا ہے اور آخر الذکر کی حقیقت اس طرح ذہن نشیں کرائی ہے ؎

کہا درخت نے اک روز مرغ صحرا سے ستم پہ غمکدۂ رنگ وبو کی ہے بنیاد
خدا مجھے بھی اگر بال وپر عطا کرتا شگفتہ اور بھی ہوتا یہ عالم ایجاد
دیا جواب اسے خوب مرغ صحرا نے غضب ہے داد کو سمجھا ہوا ہے تو بیداد
جہاں میں لذت پرواز حق نہیں اس کا
وجود جس کا نہیں جذب خاک سے آزاد

اسی مضمون کو اقبال نے "ضرب کلیم" کی نظم "معراج" میں اس طرح بھی ذہن نشیں کرایا ہے ؎

دے ولولۂ شوق جسے لذت پرواز کرسکتا ہے وہ ذرہ مہ ومہر کو تاراج
مشکل نہیں یاران چمن! معرکۂ باز پرسوز اگر ہو نفس سینۂ درّاج

اور پھر "بال جبریل" کی مثنوی "ساقی نامہ" اصولی طور پر یہ کلیہ ذہن نشیں کراتی ہے ؎

تری آگ اس خاکداں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے، تو جہاں سے نہیں

نقطۂ نظر

عبد الحمید نعمانی، بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی ۲

"ہندوتو" کی جدید اصطلاح جناب ویر ساورکر کی ذہنی پیداوار ہے، لیکن اپنی اصل کے اعتبار سے اس کی تاریخ بہت پیچھے تک جاتی ہے، چاہے وہ ہندو دھرم ہو یا ہندوتو ہو. کسی کی آج تک واضح و متعین تعریف نہیں کی جاسکی ہے، تاہم دوئی پرستی پر مبنی ایک مخصوص قدم ہے، جو دوسرے مذاہب و ادیان اور نظام ہائے حیات کو یا تو اپنے اندر ہضم کرلیتا ہے یا ان کی اصل مخصوص شناخت اور چہرے کو مسخ کر دیتا ہے. اسلام جیسے فطری اصولی دین کی ایک خوبی اصول بندی اور ضابطہ سازی بھی ہے. اس میں ماننے، نہ ماننے، کرنے نہ کرنے کے احکام واضح ہیں. مثلاً عقیدہ ختم نبوت اسلام کا ایک بنیادی عقیدہ ہے جس کا تعلق براہ راست ضروریات دین سے ہے. اقرار و انکار دونوں کا الگ الگ حکم ہے "اقرار" مومن ہونے کے لیے ضروری ہے جب کہ انکار کی صورت میں دیگر اسلامی ارکان کی ادائیگی کے باوجود آدمی دائرہ اسلام سے باہر ہو جاتا ہے. حکم و عقیدے کا یہ تسلسل عہد رسالت سے آج تک بلا انقطاع کے قائم ہے اور پوری امت کا اجماع ہے۔

"لیکن ہندو فکر و تبلیغ کا معاملہ بالکل برعکس ہے. ابہام، بے ضابطگی اور بے اصولاپن، ہندوتو کی سب سے بڑی خوبی ہے. اس سے جہاں دوسروں کو اپنے میں ہضم کرنے کا راستہ ہموار کرتا ہے وہیں خود کو بنائے رکھنے کے ساتھ اپنے مخصوص مفادات کی حفاظت و تحصیل بھی بآسانی ہو جاتی ہے مثال میں گوشت خوری کو پیش کیا جاسکتا ہے۔"

ہندو دھرم کی تمام بنیادی کتابوں میں گوشت خوری (حتیٰ کہ لحم بقر کے کھانے کا) تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ رگ وید اور مجموعۂ احکام منوسمرتی حتیٰ کہ والمیکس رامائن میں مختلف جانوروں کے ساتھ بڑے کا گوشت کھانے کا خاص طور سے ذکر ہے۔ اس کے برعکس جین، بودھ دھرم میں گوشت خوری، جذبۂ ترحم کے منافی ہے۔ بودھ دھرم کا خاصہ یہ ہے کہ جب ہم کسی کو جان دے نہیں سکتے ہیں تو ہمیں کسی کی جان لینے کا بھی حق نہیں ہے۔ یہ نظریہ کس حد تک حقیقت اور معقولیت پر مبنی ہے۔ یہ الگ بات ہے (اس پر فی الحال ہم کچھ کہنا بھی نہیں چاہتے ہیں)، لیکن یہ فلسفہ ہندوستانی سماج میں بڑی تیزی سے مقبول ہوتا چلا گیا اور برہمنی فلسفے پر مبنی، ہندو دھرم کو بری طرح متاثر کیا، قریب تھا کہ ہندوتو کا وجود ختم ہو جائے یا خطرے میں پڑ جائے..... یہ دیکھ کر برہمن وادی نظام کے علم برداروں نے یہ چال چلی کہ ایک طرف بودھوں کے وجود کو طاقت وقوت سے ختم کرنے کی مہم چلائی گئی تو دوسری طرف کچھ چالاک لوگوں نے بودھ نظرے کو شکست دینے کیلئے یہ پرچار کرنا شروع کر دیا کہ خود ہندو دھرم میں بھی گوشت خوری کی صریح ممانعت ہے۔ خاص طور سے گاؤ خوری کی... لہٰذا جذبہ ترحم کے پیش نظر گوشت خوری کی ممانعت پر دھرم دھرم کا امتیاز و کمال نہیں ہے۔ اس پروپیگنڈہ کا اثر یہ ہوا کہ بودھ دھرم کا امتیاز ختم ہو گیا اور آگے چل کر وہ بھی ہندوتہذیب ووجود کا حصہ بن کر رہ گیا۔

"اس تمہیدی گفتگو کا مطلب ہندوتو اور بودھ (جین) دھرم کا موازنہ نہیں ہے بلکہ اس نکتے کی طرف ذہن کو متوجہ کرنا ہے کہ ہندوتو نے کس طرح دیگر عقائد ونظریات رکھنے والی قوموں کو اپنے اندر ہضم کرلیا"۔

میں جب جب ہندوتو یا ہندو سماج کی بات کرتا ہوں تو اس سے مراد برہمنی نظام و سماج ہوتا ہے کیوں برہمنی نظام کا علم بردار طبقہ ہی حقیقت میں ہندو سماج کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ طبقہ بنیادی طور پر تاجرانہ ذہن، بنیادی سوچ اور دوسروں کے تعلق سے حاسد، تنگ نظر اور خود غرض ہوتا ہے اس لیے وہ کسی اور کے قابل شناخت وجود کو برداشت نہیں کرسکتا ہے اس کی سوچ اس گنجے سے مختلف نہیں ہوتی ہے جو دوسروں کے سر پر

بال دیکھ کر تکلیف میں مبتلا ہوجاتا ہے، وہ یہ دعا نہیں کرسکتا کہ مالک میرے سر پر بھی دوسروں کی طرح بال اگا دے بلکہ وہ یہ تمنا کرتا ہے کہ سب میری طرح گنجے ہوجائیں۔ یہ شریف طبقہ جب محکوم اور بے اقتدار ہوتا ہے۔ تو اپنی بزدلانہ نفسیات کے تحت خاموش ہوکر موقع کی تلاش میں رہتا ہے اور جب حاکم اور اقتدار ہوتا ہے تو کمینگی اور کم ظرفی کی ہر حد کو پھلانگ جاتا ہے۔ موجودہ ہندوستان دوسری صورت حال سے دوچار ہے۔ تمام ہندوستانی شہریوں کے لیے یکساں شہری قانون کی توضیع کی مانگ کو اس مذکورہ مخصوص طبقاتی سوچ کے پس منظر میں دیکھنا چاہیئے۔

اس تعلق سے یہ بات بڑی حیرت انگیز اور افسوس ناک ہے کہ ارون شوری رام سروپ جیسے حضرات سپریم کورٹ کے دو نفری بنچ کی ایک درخواست یا زیادہ سے زیادہ ایک ہدایت کو "فیصلہ" کا نام دے کر جہاں ایک طرف سرکار کو "نامرد" نالائق اور غافل قرار دے رہے ہیں، وہیں دوسری طرف یکساں سول کوڈ کے مخالفین کو بنیاد پرست، تاریک خیال ور دقیانوسی جیسے الفاظ سے ملقب ومطعون بھی کررہے ہیں اس سے ہندو سماج کی روایتی تنگ نظری اور حاسدانہ سوچ کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ جس شدت سے مسلم پرسنل لا، کو ختم کرکے پورے ملک کے شہریوں کی یہ یکساں شہری ضابطہ بنانے کی بات کی جارہی ہے۔ اس نے ایک بار پھر ہندو سماج کی مفروضہ کشادہ دلی ... وسیع النظری اور فکری آزادی کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ہندو سماج کو اپنی کمزوریاں خامیاں دور کرنے سے اتنی دلچسپی نہیں ہے جتنی کہ دوسروں کو خوبیوں سے محروم کرنے سے ہے۔ شخصی، انفرادی طور پر کوئی مسئلہ کھڑا ہوتا ہے۔ ہندو سماج میں، اور شعوری، غیر شعوری طور پر جرم میں پورے ملک، سماج کو شریک گردان دیا جاتا ہے۔ ایک ہندو اگر محض شادی کے بعد اسلام قبول کرلیتا ہے تو اس کی دوسری شادی قانونًا قابل تسلیم ہوگی یا نہیں؟ اس سلسلے میں متعدد عدالتی نظریں موجود ہیں کہ دوسری شادی کالعدم سمجھی جائے گی۔ گرچہ اسلامی نقطہ نظر سے غلط اور آئین ہند کی بنیادی دفعہ ۲۵ میں دی گئی آزادی کے منافی ہے، تاہم اگر ایک ہندو کو پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری

شادی سے روکنے کے بعد دوسری شادی کو عدالت کالعدم یا موجب سزا فعل قرار دے دے تو وہ اتنا تشویش ناک نہیں ہے جتنا کہ ایک آدمی کو سزا دینے کے بعد ملک کے تمام شہریوں کی مذہبی آزادی ہی کو سلب کرلینا۔

جناب کلدیپ سنگھ اور آر، ایم سہائے نے علی الترتیب ۲۵ اور ۵ مجموعی طور پر جو کل ۳۰ صفحے کا فیصلہ دیا ہے، اس کی زیریں سطر میں بڑا خطرناک ذہن کارفرما نظر آتا ہے۔ پورے فیصلے کو پڑھنے کے بعد راقم الحروف اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ فیصلے میں ایک مخصوص سیاسی پارٹی اور مخصوص سوچ رکھنے والی تنظیم کی سوچ شامل ہوگئی ہے اور جس انداز میں مسلم دورِ حکومت، تقسیم ملک اور مسلم قانون پر بحث و گفتگو کی گئی ہے۔ اس سے ترشح ہوتا ہے کہ مسلم ملت کی دینی ملی امتیازی شناخت کو ختم کرنے میں قدیم جدید تعلیم یافتہ ہندو ہم خیال ہیں بس فرق یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ مسلم پرسنل لاء کو ختم کرکے پورے ملک کے تمام شہریوں سے یہ یکساں شہری ضابطہ بنانے کی بات کرتا ہے جب کہ قدیم طبقہ کی سوچ رکھنے والی تنظیم (آریہ سماج شدھی کرن، اور آر ایس ایس (جن سنگھ)) ہندو کرن کی بات کرتی ہے۔ بارہا آر ایس ایس، وشوہندو پریشد کے ذمہ دار حضرات مسلمانوں سے اپنے میں واپس لوٹ آنے کی دعوت دے چکے ہیں۔ لیکن اب تک جدید، قدیم تعلیم یافتہ ہندوؤں کو اپنے مقصد میں کوئی خاص کامیابی نہیں مل پائی ہے اب زور زبردستی سے لوگوں کو دھرم کی تبدیلی سے روکنے کا پروگرام بنایا گیا ہے جیسا کہ ابھی پچھلے دنوں ہری دوار میں وشوہندو پریشد کے جنرل سکریٹری اشوک سنگل نے اعلان کیا ہے[۱]

ملک بنیچھی اور روشن خیال دونوں طبقے کی اس گھبراہٹ اور پریشانی کی وجہ کیا ہے؟ ہمارے یہاں اس طرح کے سوال کو بہت ہلکے انداز میں لیا جاتا ہے۔ اس لئے عام طور پر لوگ بات کی اصل حقیقت تک پہنچ پانے میں کامیاب نہیں ہوپاتے ہیں۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ اسلام اور مسلمان، ہندو سماج کے لیے نیا تجربہ ثابت ہوئے ہیں۔ مسلمانوں سے

---

[۱] دیکھئے روزنامہ ہندوستان دہلی بابت ۹ / جون ۱۹۹۵ء۔

قبل جتنی بھی قومیں اور قبیلے کے لوگ ہندوستان آئے، سبھی کو ہندو سماج نے غیر اللہ پرستی اور مخصوص رسم و رواج کے گہرے سمندر میں ڈبو دیا' یعنی اپنے سماج کا حصہ بنالیا. لیکن مسلمانوں کو ہضم کر پانا آج تک ہندوتو کے لیے لوہے کے چنے چبانے سے کم نہیں ثابت ہو رہا ہے. اس لیے بہت سے ہندو واحل علم و دانش مسلم اقلیت اور اس کی ایک مخصوص شناخت کو ملک کے لیے ایک مسئلہ اور اتحاد کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے رہے ہیں.

چنانچہ رام دھاری سنگھ دنکر نے اشارے اشارے میں لکھا ہے:

"قومی اتحاد کا شکریہ ہمارے یہاں یہی ہے۔ اگر ہندو مسلم اتحاد کی تحریک کو لیں تو یہ تحریک مہاتما کبیرداس کے وقت سے چلتی آرہی ہے، مسلمانوں کی آمد سے قبل اس ملک میں ہندو مسلم مسئلہ نہیں تھا لیکن باہر سے آنے والی مختلف جاتیوں اور دھرموں کے جو لوگ اس ملک میں آتے رہے انکی شناخت کا مسئلہ ضرور رہا ہوگا' تاہم یہ مسئلہ بالکل نہیں تھا جو لوگ باہر سے آکر اس ملک کے شہری بن جاتے تھے انھیں ہندو سماج فطری جد وجہد اور عمل سے اپنے اندر ہضم کر لیتا تھا اور بھارتی ایکتا خود بخود بڑھ جاتی تھی" [1]

اس اقتباس سے واضح مطلب یہی ہے کہ مسلمانوں کو ہندو سماج آج تک ہضم نہیں کر پایا ہے۔ اس سے ہندوستان کی ایکتا / اتحاد میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے۔ اس لیے انھیں اپنے اندر ہضم کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنا چاہئے.

اس کی روشنی میں یہ بڑی آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ پورے ملک کے تمام شہریوں کے لیے یکساں شہری ضابطہ بنانے کے مطالبے کے پیچھے کون سی سوچ کارفرما ہے. آریہ سماج، آر، ایس، ایس اور وشو ہندو پریشد اور مسلمانوں کی دینی و ملی اور معاشرتی شناخت کو ختم کر کے جو ایک ضابطہ، ایک تہذیب اور ایک زبان کی بات کرتے ہیں اور پورے ہندستان

---

[1] بھارتی ایکتا ص۱ از: رام دھاری سنگھ دنکر. مطبوعہ نیشنل پبلشنگ ہاؤس دریا گنج دہلی ۱۹۸۹ء.

سماج کو ہندو سماج میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ جناب جسٹس کلدیپ سنگھ نے اپنے فیصلے کی بحث میں جو کچھ کہا ہے وہ اپنی اصل اور غایت کار کے اعتبار سے ہندوکرن اور شدھی کرن سے کوئی زیادہ مختلف نہیں ہے۔ فیصلے کے متعدد مقامات سے یہ واضح تاثر ملتا ہے کہ محترم جسٹس صاحب کسی ہندوستانی اقلیت کی مذہبی ومعاشرتی شناخت وامتیاز اور وجود کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں، مثلاً ایک جگہ کہا گیا ہے کہ :

"ملک کے بٹوارے کے بعد جو لوگ ہندوستان میں رہ گئے تھے وہ بخوبی جانتے تھے کہ ہندوستان کے لیڈر دو قومی نظریہ یا تین قومی نظریہ کے قائل نہیں ہیں اور کوئی فرقہ مذہب کی بنیاد پر اپنا علاحدہ وجود برقرار نہیں رکھ سکتا"[۱]

اس اقتباس سے اس بات کی واضح نشاندہی ہوتی ہے کہ ہمارے محترم جناب کلدیپ سنگھ ملک کی ایک جماعت خاص کے نظریے سے متاثر ہو گئے ہیں، اور انھوں نے ایک قومی نظریے کا جو مفہوم لیا ہے وہ قطعاً قومی رہنماؤں کے ذہن میں نہیں تھا، مذہبی وجود سے انکار کرنا جہاں آئین ہند کی بنیادی دفعات کے خلاف ہے وہیں جدید ہندوستانی تاریخ وتہذیب کے بھی منافی ہے جو قومی رہنما اور قومی نظریے کے شدید ناقد ومخالف تھے۔ اور جو لوگ تقسیم وطن کے بعد ہندوستان میں رہ گئے ہیں، ان کے تو حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں ملتی کہ ایک قومی نظریہ کا مطلب تمام مذہبی اقلیتوں خصوصاً مسلم اقلیت کے مذہب کی بنیاد پر علاحدہ وجود کا خاتمہ ہے۔ اگر یہ بات ہوتی تو دستور میں مذہب کی آزادی اور اس کی دعوت وتبلیغ کا حق وامتیاز نہ دیا جاتا۔ جواہر لال نہرو سے لے کر راجیو گاندھی حتیٰ کہ نرسمہاراؤ تک مذہبی آزادی اور مسلم پرسنل لا میں عدم مداخلت کی یقین دہانی نہ کراتے۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے بھی مذہبی شناخت کے تحفظ وبقا کی یقین دہانی قانون ساز اسمبلی میں کرائی تھی۔ ان تمام باتوں سے یہی تو ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستانی لیڈروں نے ہندوستان کی تمام مذہبی اقلیتوں خصوصاً مسلم اقلیت کی مذہبی شناخت کے تحفظ کو اہمیت دی ہے اور ایک قومی نظریے

---

[۱] دیکھئے فیصلہ کا ص ۲۴۔

کا وہ مفہوم و مطلب ہرگز نہیں ہے جو محترم جج جناب کلدیپ سنگھ زور و زبردستی سے باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں، یہ ان کا اپنا ذاتی خیال ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک تاریخی حقائق اور ہندوستانی رہنماؤں کی بات ہے تو کسی سے بھی محترم جج کے دعوے کی تائید نہیں ہوتی ہے۔

اس کے ساتھ ہم اپنی بات کو مزید صاف کرنے کے لیے ایک اور اہم نکتے کی طرف اشارہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ جسے غیر مسلم حضرات اور جج صاحبان جناب کلدیپ سنگھ اور آر ایم سہائے نے بھی نظر انداز کر دیا ہے۔ چاہے اس کی وجہ کچھ بھی ہو۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ ہندوستان میں ایک قومی نظریہ کے سب سے بڑے حامی و داعی اور دو قومی نظریے کے شدید مخالف سیدنا حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی تھے۔ امام الہند مولانا آزادؒ کا نام بھی اس حوالے سے سرفہرست ہے۔ ان دونوں قومی رہنماؤں نے ایک طرف جہاں محمد علی جناح کے دو قومی نظریے کی شدید مخالفت کے ساتھ ساتھ ایک قومی نظریے کی پرزور حمایت و اشاعت کا فریضہ انجام دیا وہیں دوسری طرف اپنی صدارتی تقریروں، بیانوں اور تحریروں میں مسلم پرسنل لا کی حفاظت اور مذہبی و ملی وجود، اور ثقافت پر زور دیتے ہوئے اپنی اسلامی تہذیب و تمدن اور معاشرت کے کسی ایک جزء کو بھی چھوڑنے سے صاف صاف انکار کر دیا تھا۔ اس دعوے کی دلیل میں حضرت شیخ الاسلام کے رسالہ متحدہ قومیت اور اسلام، جون پور اور بمبئی دعلی الترتیب جون ۱۹۴۰ء اور ۲۶، ۲۷ اپریل ۱۹۴۵ء) اور مولانا آزاد کے رام گڑھ اجلاس کانگریس ۱۹۴۰ء کے خطبہائے صدارت کو پیش کیا جا سکتا ہے ان بزرگوں نے ایک قومی نظریے اور قومیت و وطنیت کو ملکی اقتصادی اور عام قومی معاملات سے جوڑا ہے نہ کہ معاشرت اور سماجی، مذہبی، امور و مسائل سے۔ اور شادی بیاہ، طلاق وراثت وغیرہ کا تعلق مذہب معاشرت اور سماج سے ہے نہ کہ قوم و وطن اور ملکی و اقتصادی امور و سائل سے۔ اصل حقیقت تو یہی ہے لیکن ہندو اہل علم، صحافی اور جج صاحبان جس انداز میں یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی وکالت وحمایت کر رہے ہیں۔

اس کے پیش نظر ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ برہمنی نظام و فلسفے پر جتنی روایتی، تنگ

نظری، حسد اور مذہب ملی تہذیب وتمدن خود نظرے سے وابستگی کا نتیجہ ہے۔

اکثریتی سماج سدا اس خوف میں مبتلا رہتا ہے کہ اگر خود بڑھ کر دیگر اقلیتوں کو اپنے اندر جذب وہضم نہیں کرلیا تو آئندہ اقلیت اکثریت میں بدل جائے گی۔ لہٰذا اقلیت کو اکثریت میں ہضم کرنے کا آسان اور ابتدائی طریقہ یہ ہے کہ اقلیت کی بحیثیت اقلیت کے اصل اور رنگ پہچان کو ختم کردو، اور ساتھ ساتھ یہ سب یک طرفہ طور پر پرچار کرتے رہو کہ اکثریت کی تہذیب وفکر اور رسم ورواج اصل قومی دھارا ہیں جب کہ اقلیتوں خصوصاً مسلم اقلیت کی تہذیب ومعاشرت اور شرعی قوانین، ملکی قومی اتحاد کی راہ میں زبردست رکاوٹ اور علاحدگی پسندانہ سوچ کے حامل ہیں، لہٰذا:

"ملک وقوم کے حق میں یہی بہتر ہوگا کہ ملک کے تمام شہریوں کے لیے لازماً یکساں سول کوڈ بننا چاہیے"۔

یہ بات اگرچہ ملکی قومی اتحاد کے حوالے سے کہی جارہی ہے لیکن ان کہی حقیقت وہی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے کہ ہندوتو کے سوا تمام مذہبی اقلیتوں خصوصاً مسلم اقلیت کی شناخت کو ختم کردیا جائے۔ اس کے بعد تو صرف ہمارا ہی وجود ہوگا اور اس کا شارٹ کٹ راستہ یہی ہے کہ ایک مضبوط وجود، اور امتیازی شناخت رکھنے والی دوسری اکثریت مسلمانوں کو اسّی فی صد اکثریت کا کوڈ ماننے کے لیے مجبور کردیا جائے اور یہ فریضہ یکساں سول کوڈ ہی انجام دے سکتا ہے۔ معاملے کا یہ پہلو انتہائی قابل غور وتوجہ ہے۔

جب بھی مسلم پرسنل لا، کے خاتمہ یا یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی بات سامنے آتی ہے اسے ایک وقتی معاملہ سمجھ کر جدوجہد کی جاتی ہے جب کہ حقیقتاً یکساں شہری قانون کا مطالبہ تہذیب وشناخت خور ہندو فلسفے پر مبنی ہوتا ہے جو ایک تاریخی وروایتی تسلسل پر قائم ہے۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ ملک کی موثر تنظیم جمعیۃ علماء ہند نے اپنے مرادآباد کے اجلاس میں اس اہم نکتے کی طرف توجہ دی ہے اور باقاعدہ ایک تجویز پاس کرکے ارباب حکومت اور ملت اسلامیہ کے لیے غور وفکر کا سامان مہیا کردیا ہے۔

❋

کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دار العلوم دیوبند کے زیر انتظام

۱۱ر جون ۱۹۹۵ء بروز اتوار بمقام امب ضلع اُونا ہماچل پردیش کے بحث مناظرہ میں

علماء اسلام کی سربلندی و سرخروئی

اور

قادیانی دجالوں کی مایوسی و روسیاہی

مرتب: مولانا محمد عثمان صاحب منصور پوری

ہندوستان میں پچھلے چند برسوں سے دوبارہ قادیانی ریشہ دوانیوں کے شروع ہونے کے بعد جب علماء اسلام کی جانب سے جگہ جگہ ان کا تعاقب ہونے لگا تو اس دجالی گروہ نے عام مسلمانوں کو دھوکہ دینے کا پرانا وطیرہ اپنایا ہے کہ علماء اسلام کو حیات و وفات عیسیٰ علیہ السلام جیسے مسائل پر بحث و مناظرہ کا چیلنج دیتا پھرتا ہے۔ جس سے اس کا اصل مقصد اپنی جماعت کی تشہیر کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ پچھلے دنوں ہماچل پردیش کے قصبات و دیہاتوں میں جمیعۃ علماء ہند کے قائم کردہ مکاتب کی نگرانی پر مامور، اس کے قدیم آرگنائزر جناب مولانا ظہیر عالم صاحب بدر قاسمی کو اطلاع ملی کہ قصبہ "امب" میں ایک شخص کے گھر پر "قادیان" کے ذمہ داروں کی آمد و رفت ہے اور علاقہ کے ناخواندہ مسلمانوں کو ڈش انٹینا کے ذریعہ ہر ہفتہ مرزا طاہر کی تقریریں سنانے کا پروگرام رکھا جاتا ہے اور نوجوانوں کو تعلیم کے بہانے قادیان لے جانے کی اسکیم پر عمل شروع ہو گیا ہے (قادیان اس مقام سے ستر، اسی کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے) بہرحال یہ اطلاع ملنے کے بعد جناب مولانا ظہیر عالم صاحب قاسمی ۲۸ر اپریل ۹۵ء امب پہنچے، اور نماز جمعہ سے قبل عام مسلمانوں کو قادیانیت کی حقیقت سمجھائی اور قادیانیوں کی چال بازیوں سے دور رہنے کی تلقین کی۔ نماز کے بعد متصلاً چند قادیانی ذمہ دار مع اپنے میزبان کے مسجد میں آ گئے اور جناب مولانا ظہیر عالم صاحب سے بحث و مناظرہ کا اصرار کرنے لگے۔ موصوف نے ہر ممکن طریقہ سے بحث و مباحثہ سے پہلوتہی

کرنی چاہی، مگر قادیانی گروہ نے بعض مقامی مسلمانوں کے ساتھ مسجد ہی میں میٹنگ کر کے بحث ومباحثہ کی باقاعدہ ایک تحریر مرتب کی اور بحیثیت گواہ کے دوچار اشخاص کے دستخط کرانے کے بعد جناب مولانا ظہیر عالم صاحب سے بھی اس پر دستخط کا مطالبہ کیا۔ موصوف نے حالات کی نزاکت کے پیش نظر اس پر دستخط کر دیئے۔

اس تحریر میں بحث کے عنوانات، حیاتؑ ووفات عیسیٰ علیہ السلام، ختم نبوتؐ اور مرزا غلام احمد قادیانی کا صدق وکذب لکھ کر قید لگائی گئی کہ بحث نمبر وار ہوگی۔ اور ہر فریق اپنے دعوے کے ثبوت میں قرآن وحدیث پیش کرے گا، البتہ اپنے اپنے دعوی کی تصدیق میں ان علماء وکتب کے حوالہ جات پیش کئے جاسکیں گے جن کو فریق مخالف تسلیم کریں گے۔

مولانا موصوف یہ تحریر لے کر دارالعلوم تشریف لائے اور کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت کے ناظم عمومی حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند سے ملاقات کر کے مفصل حالات بتائے اور درخواست کی، مجلس اس سلسلہ میں ہمارا بھرپور تعاون کرے اور ردقادیانیت کے ماہر علماء ومبلغین کو بحث ومناظرہ کی مقررہ تاریخ ۱۱ر جون ۹۵ء پر وہاں بھیجنے کا انتظام کرے۔ باہمی مشورے کے بعد جناب مولانا مفتی محمود حسن صاحب بلند شہری مفتی واستاذ دارالعلوم دیوبند، جناب مولانا محمد یامین صاحب مبلغ دارالعلوم دیوبند کو وہاں کی صورت کا مکمل جائزہ لینے کے لیے ۲۰ مئی کو روانہ کیا گیا۔ ان حضرات نے جناب مولانا ظہیر عالم قاسمی کے ساتھ امب کے مسلمانوں سے ملاقات وگفتگو کی۔ اوران پر واضح کیا کہ شرائط بحث ومناظرہ کی تحریر میں بہت سے نقائص ہیں۔ مقامی باشندوں کی رائے ہوئی کہ مقررہ تاریخ پر علماء اسلام کا تشریف لانا ضروری ہے۔ ورنہ قادیانی گروہ مخالفانہ پروپیگنڈہ کر کے ناواقف مسلمانوں کو اپنے جال میں پھنسا لے گا، اور شرائط بحث ومناظرہ میں جو نقائص ہیں، ان پر اسی وقت بات ہو جائے گی۔

جائزہ رپورٹ موصول ہو جانے کے بعد مرکزی دفتر مجلس تحفظ ختم نبوت نے بحث ومناظرہ کی ضروری تیاری شروع کر دی اور مناظر اسلام حضرت مولانا سید محمد اسماعیل کٹکی نائب صدر کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت ودیگر رفقاء مجلس کو اس پروگرام میں شرکت کے

دعوت نامے ارسال کیے گئے۔ جو رد قادیانیت پر وافر مطالعہ رکھتے ہیں، اور ان میں سے بعض متعدد بار قادیانی پرچارکوں کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کرچکے ہیں۔ چنانچہ مندرجہ ذیل علماء کرام کل ہند مجلس کے زیر انتظام امب تشریف لے گئے۔

۱۔ حضرت مولانا سید محمد اسماعیل صاحب کٹکی مدظلہ العالی۔
۲۔ حضرت مولانا مفتی محمود حسن بلند شہری، مفتی و استاذ دارالعلوم دیوبند۔
۳۔ حضرت مولانا محمد عثمان منصورپوری، استاذ و ناظم کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند
۴۔ جناب مولانا مفتی محمد راشد صاحب، استاذ " "
۵۔ جناب مولانا محمد یامین صاحب، مبلغ " "
۶۔ جناب مولانا محمد راشد صاحب، مبلغ " "
۷۔ جناب مولانا مفتی محمد اسرار صاحب، استاذ مظاہر علوم سہارنپور
۸۔ جناب مولانا ابوبکر شیث صاحب، مبلغ " "
۹۔ جناب مولانا طاہر حسن صاحب ہرسولوی استاذ دارالعلوم حسینیہ تاولی ضلع مظفر نگر
۱۰۔ جناب مولانا محمد عارف صاحب گونڈوی استاذ مدرسہ خادم العلوم باغوں والی "
۱۱۔ جناب مولانا مفتی ریاست علی صاحب رامپوری استاذ و مفتی مدرسہ خادم الاسلام ہاپوڑ، غازی آباد
۱۲۔ جناب مولانا محمد شکیل صاحب غازی آبادی استاذ مدرسہ اعزاز العلوم ویٹ غازی آباد
۱۳۔ جناب مولانا شاہ عالم صاحب گورکھپوری استاذ دارالعلوم الاسلامیہ، بستی
۱۴۔ جناب مولانا مفتی عبدالستار صاحب فرخ آبادی استاذ و مفتی مدرسہ افضل العلوم، آگرہ

ان حضرات کے علاوہ صوبہ ہماچل، پنجاب و ہریانہ کے مندرجہ ذیل ذمہ دار علماء و شخصیات بھی پروگرام کی اہمیت کے پیش نظر امب تشریف لائے تاکہ اپنے علاقائی اثرات کے ذریعہ عوام مسلمانوں کو قادیانی فریب سے بچانے کا فریضہ انجام دیں۔

۱۔ جناب مولانا ظہیر عالم صاحب قاسمی، آرگنائزر جمعیۃ علماء ہند، برائے ہماچل پردیش
۲۔ جناب مولانا محمد اجمل صاحب، امام و خطیب جامع مسجد چندی گڑھ [پنجاب]
۳۔ جناب مولانا شکیل احمد صاحب قاسمی مہتمم مدرسہ ایضاح العلوم منی ماجرا چندی گڑھ ["]

۴: جناب مولانا ممتاز احمد صاحب قاسمی، امام وخطیب مسجد بالوگنج شملہ (ہماچل پردیش)
۵: جناب مولانا محمد الیاس صاحب مہتمم مدرسہ بیت العلوم پپلی مزرعہ (ہریانہ)
۶: جناب مولانا مفتی محمد طیب صاحب قاسمی مہتمم مدرسہ اسلامیہ قصبہ رائے پور گوجران (")
۷: جناب مشتاق احمد صدیقی، صدر جمعیۃ اہل حدیث مالیر کوٹلہ (پنجاب)

اور مرزائیوں کے ہیڈکوارٹر قادیان سے جو لوگ بحث ومناظرہ میں حصہ لینے آئے تھے انھوں نے اپنے نام اس طرح لکھ کر دیئے۔ [۱]

۱: مکرم مولوی عنایت اللہ صاحب، فاضل [۲] (۲) مکرم مولوی ظہیر احمد خادم، فاضل
۳: " " تنویر احمد خادم " (۴) " " سید وسیم احمد تیماپوری "
۵: " " محمد نذیر صاحب مبشر "

بحث کا آغاز

صبح ۹ بجے امب کی مسجد سے متصل خارج مسجد حصہ میں فریقین اور قصبہ امب و قرب وجوار کی بستیوں کے چودھری صاحبان وغیرہ جمع ہو گئے، جانبین کے باہمی تعارف کے بعد حضرت مولانا سید محمد اسماعیل صاحب کٹکی نے وضاحت فرمائی کہ بحث ومناظرہ کا چیلنج قادیانیوں کی طرف سے دیا گیا ہے اور شرائط مباحثہ بھی من مانی طور پر یک طرفہ طے کیے گئے ہیں جیسا کہ جناب مولانا ظہیر عالم صاحب کے بیان سے ثابت ہے۔ قادیانی مناظرین نے دونوں باتوں کا انکار کرنا چاہا مگر مقامی مسلمانوں نے مولانا ظہیر عالم صاحب کے بیان کی تصدیق کی اور علماء اسلام کی طرف سے بھی کہا گیا کہ جیسے آپ لوگ قادیان سے آئے تھے ایسے ہی مولانا ظہیر عالم صاحب کو موقع دیا جاتا کہ دیوبند وسہارنپور وغیرہ سے علماء کو شرائط مناظرہ طے کرنے کے لیے بلا لیتے پھر اس تحریر میں کسی مسلمہ شخصیت کو حکم بھی تجویز نہیں کیا گیا۔ جس کے بغیر بحث ومناظرہ بے نتیجہ رہے گا۔

قادیانیوں نے کہا کہ عوام حَکَم ہیں۔ اس پر علماء اسلام کی طرف سے نقد کیا گیا۔ کہ ناواقف مسلمان علمی مباحث میں کیسے حَکَم بن سکتے ہیں؟ دیر تک اس تمہیدی گفتگو کے بعد

---

[۱] ان میں سے بعض لوگ ۲۸ را پریل کو بھی آئے تھے۔

[۲] نائب ناظر دعوت وتبلیغ قادیان۔

حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب نے فرمایا کہ اگرچہ اصول مناظرہ کے اعتبار سے آپ کی یہ تحریر بالکل ناقص ہے تاہم حیات و وفات عیسیٰ علیہ السلام کے مسئلہ ہی سے ہم بحث کا آغاز کرتے ہیں۔ سنیئے۔

اسلام کا اجماعی عقیدہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اسی جسد عنصری کے ساتھ آسمان پر اللہ تعالیٰ نے زندہ اٹھالیا اور وہ قیامت کے قریب نازل ہوں گے، قرآن کریم کی متعدد آیات اور احادیث نبویہ متواترہ سے ثابت ہے، اگر وقت ملا تو ہم ان کو بالتفصیل پیش کریں گے، مگر اس سے پہلے ہم ثابت کرتے ہیں کہ تمہارے مقتدا مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے مرنے سے آٹھ سال پہلے تک اپنی تصانیف میں بار بار یہی لکھا کہ قرآن شریف و احادیث مبارکہ سے حضرت عیسیٰ ؑ کا زندہ آسمان پر ہونا اور قیامت کے قریب نازل ہونا ثابت ہے۔ چنانچہ مرزا لکھتا ہے کہ:

هُوَ الَّذِی اَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهُ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهِ۔ (الصف)

وہ اللہ ایسا ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کرے۔

یہ آیت صاف بتلاتی ہے کہ اسلام کا غلبہ کاملہ اس وقت ہوگا جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے دوبارہ نازل ہوں گے۔ [براہین احمدیہ]

ازالہ اوہام میں مرزا قادیانی لکھتا ہے:

"مسیح بن مریم کے آنے کی پیش گوئی ایک اول درجہ کی پیش گوئی ہے جس کو سب نے بالاتفاق قبول کرلیا ہے اور جس قدر صحاح میں پیش گوئیاں لکھی گئی ہیں، کوئی پیش گوئی اس کے ہم پہلو اور ہم وزن ثابت نہیں ہوتی، تواتر کا اول درجہ اس کو حاصل ہے"۔ [ازالہ۔ خزائن ص۴۰۰ ج۳] مسیح کے دوبارہ آنے کی احادیث متواتر ہیں۔ [خزائن ص۲۵۲ ج۱۴]

آئینہ کمالات اسلام میں مرزا لکھتا ہے:

ان المسیح ینزل من السماء بجمیع — مسیح علیہ السلام آسمان سے تمام علوم کے ساتھ

علومہ ولا یاخذ شیئاً من الارض　　اتریں گے اور زمین والوں سے کوئی علم
مالھم لا یشعرون ۔　　حاصل نہیں کریں گے ۔ انھیں کیا ہوگیا کہ وہ
(آئینہ کمالات ، خزائن ۱۴۲/۳۲)　　سمجھتے نہیں ۔

بہر حال مرزا غلام احمد قادیانی پچاس ساٹھ سال تک قرآن و حدیث کے حوالوں سے حیات و نزول عیسیٰ ؑ کے عقیدہ کی تشہیر کرتا رہا ۔ پھر جب مسیح موعود بننے کا شوق ہوا تو طرح طرح کے اعلانات شروع کر دیئے ۔ مثلاً کہیں یہ کہا کہ ، میرے اوپر دس برس تک بارش کی طرح مسلسل وحی برستی رہی کہ عیسیٰ ؑ مر گئے اور کئی جگہ بڑی شد و مد سے اس کا اقرار کیا ہے کہ سوائے میرے اللہ تعالیٰ نے کسی پر اس راز کو ظاہر نہیں کیا کہ عیسیٰ ؑ مر گئے ۔ حتیٰ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم پر بھی نہیں کھولا گیا ۔ یہ بھید خاص مجھ پر ظاہر ہوا ۔ کہیں لکھتا ہے کہ جب تک مجھ پر وحی نہیں آئی تھی اس وقت تک میں اپنے سے پہلے نبی محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے عقیدہ پر قائم رہا ۔

کسی جگہ لکھتا ہے کہ یہی سنت الانبیاء ہے کہ جب تک کسی خاص بات میں اس نبی پر وحی نہیں آتی ہے وہ اپنے پہلے نبی کے طریقہ پر قائم رہتا ہے جیسا کہ تحویل قبلہ میں ہوا ۔

مرزا کے ان تمام بیانات سے واضح ہوا کہ قرآن و حدیث سے تو حیات و نزول عیسیٰ ہی کا قطعی عقیدہ ثابت ہوتا رہا ہے پھر ان کی وفات کا راز مرزا کی مزعومہ وحی کے ذریعہ صرف اس پر کھلا ۔ اس سے پتہ چلا کہ حضرت عیسیٰ ؑ کو مردہ قرار دینے والی چیز مرزا کی وحی ہے نہ کہ قرآن و حدیث ۔ لہٰذا مرزا اور اس کے پیروکاروں کی طرف سے وفات عیسیٰ ؑ پر قرآنی دلائل پیش کیا جانا خود مرزا کے کذاب ہونے کا اعلان کرنا ہے کیونکہ بقول تمہارے جب یہ بات قرآن میں آچکی تھی تو مرزا کا یہ کہنا کہ یہ بھید خاص مجھ پر ظاہر ہوا ۔ سراسر جھوٹ ہے یا نہیں ؟ اس لئے میں قادیانیوں سے مطالبہ کرتا ہوں کہ میرے اس سوال کا جواب دو ٹوک الفاظ میں دیں ۔

حضرت عیسیٰ ؑ کو قرآن و حدیث نے مردہ قرار دیا یا مرزا کی مزعومہ وحی نے ؟ اگر تم کہتے ہو کہ قرآن کی تیس آیات سے ان کی وفات ثابت ہے تو میرے اس سوال کا جواب دو کہ مرزا

نے جو اپنی وحی کے حوالہ سے حضرت عیسیٰ ؑ کی وفات کا اعلان کیا ہے اس میں وہ کاذب ہے یا نہیں ؟ آپ جتنی آیات وفات عیسیٰ پر پیش کریں گے اتنی ہی مرتبہ مرزا قادیانی کا کذاب و دجال ہونا ثابت ہوتا چلا جائے گا۔

حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ ہم لوگ کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے جمع ہوئے ہیں، حیات و وفات عیسیٰ کا مسئلہ خود مرزا قادیانی کے لکھنے کے مطابق ایمانیات کا جزء نہیں ہے (آئینہ کمالات اسلام ص۲۱) ہماری یہ غرض ہرگز نہیں کہ مسیح علیہ السلام کی وفات و حیات پر جھگڑے اور مباحثے کرتے پھرو (ملفوظات احمدیہ ص ۲) لہٰذا میرا تیسرا سوال قادیانیوں سے یہ ہے کہ مرزا قادیانی کے منع کرنے کے باوجود تم حیات و وفات عیسیٰ کے مسئلہ پر بحث و مباحثے و جھگڑے کیوں کرتے پھرتے ہو ؟ تمہیں تو سب سے پہلے بحث اس پر کرنی چاہیئے کہ مرزا قادیانی جھوٹا تھا یا سچا ! کیوں کہ تمہاری ساری محنت کا حاصل یہی ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد مرزا کو نبی وغیرہ منوانا چاہتے ہو تو پہلے یہ ثابت کرو کہ کم از کم ایک سچا انسان تھا یہی بحث مفید اور نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔

حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کٹکی مدظلہ العالی کی جانب سے اٹھائے گئے کسی سوال کا بھی جواب دے کر قادیانی مناظر ظہیر خادم نے مرزا کے صدق و کذب سے بحث کا رخ موڑنے کے لیے کہنا شروع کیا کہ کوئی قرآنی آیت پیش کی جائے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جسد عنصری کے ساتھ آسمان پر جانا اور وہاں پر زندہ ہونا مذکور ہو۔ اس مرحلہ پر مرزا صاحب کا تذکرہ بالکل نہ کیا جائے۔ اور جب آپ ان کو جھوٹا سمجھتے ہیں تو ان کی کتابوں وغیرہ کا حوالہ کیوں دیتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب نے برجستہ جواب دیا کہ ہم جھوٹوں کے لیے ان کے جھوٹے پیشوا کا حوالہ دے رہے ہیں۔ تاکہ ان پر اس کا کذاب و دجال ہونا واضح ہو جائے۔

بہرحال مرزائی مناظر نے اپنے عقیدہ وفات عیسیٰ ؑ کے ثبوت میں قرآن کریم کی یہ آیت پیش کی :

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (آل عمران) — اور محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) ایک رسول ہے۔ اس سے پہلے سب رسول فوت ہو چکے ہیں۔

اور شہور سطحی انداز میں کہا کہ عقلاً بھی ضروری ہے کہ ہم حضرت عیسیٰ ؑ کو آسمان پر زندہ نہ مانیں ورنہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی فضیلت حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر لازم آجائے گی جو زیر زمین مدفون ہیں اور اس سے عیسائیوں کے خیال کی تائید ہو جائے گی۔ جو ہرگز مناسب نہیں۔

قادیانی پورا زور اس پر لگا رہے تھے کہ حیات ووفات عیسیٰ ؑ کی بحث میں الجھا کر وقت گذاری کی جائے تاکہ مرزا کے صدق وکذب کی بحث نہ آسکے اور عوام مسلمان کسی فیصلہ کن نتیجہ پر پہنچ کر ہمارے بارے میں بدگمان نہ ہوں، مگر حضرت مولانا سید محمد اسماعیل صاحب بار بار اپنے سوالات دہراتے تھے تاکہ مرزا کے صدق وکذب کی بحث چھڑے اور قادیانی دجل وتلبیس سے عام مسلمان محفوظ رہیں جو بحث ومناظرہ سے علماء اسلام کا اصل مقصد ہوتا ہے، اس لیے حضرت موصوف اب تک حیات عیسیٰ ؑ کی مثبت آیات پیش نہیں فرمارہے تھے۔ جب موصوف نے محسوس فرمالیا کہ قادیانی گروہ کی جانب سے موصوف کے سوالات کا جواب نہ دیے جانے کی وجہ سے ان کی چالاکی عام مسلمان سمجھ رہے ہیں، تو اب موصوف نے مناسب سمجھا کہ حیات عیسیٰ ؑ کی مثبت آیت بھی پیش کر دی جائے تاکہ قادیانیوں سے بار بار ایسی آیت کا مطالبہ کرنے اور علماء اسلام کی طرف سے فوراً آیت پیش نہ کیے جانے کی بنا پر عوام کسی مغالطہ میں نہ پڑجائیں۔ چنانچہ مولانا نے یہ آیت پیش فرمائی۔

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ۔ (نساء ۱۵۹) — اور کوئی شخص اہل کتاب میں سے نہ رہے گا مگر وہ عیسیٰ علیہ السلام کی ان کے مرنے سے پہلے ضرور تصدیق کرے گا۔

(حضرت تھانوی رح)

موصوف نے فرمایا کہ قَبْلَ مَوْتِهٖ کا صاف مطلب یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ ؑ ابھی حیات ہیں۔

قادیانی مناظر ظہیر احمد خادم نے عوام کو مخاطب کرکے کہا کہ اس آیت میں کہاں آیا ہے کہ حضرت عیسیٰ ؑ کو زندہ جسد عنصری کے ساتھ آسمان پر اٹھایا گیا ہے؟ اسکے بعد مولانا محمد عثمان نے

عوام کو قادیانیوں کے اس مغالطہ سے بچانے کے لیے مسئلہ کی تنقیح کی کہ کسی چیز کے قرآن سے ثابت ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ بات صاف صاف انہی الفاظ میں مذکور ہو جیسے نماز، روزہ، حج وغیرہ فرائض اسلامیہ اصولی طور پر قرآن سے ثابت ہیں اور ان کا انکار کفر ہے۔ حالانکہ نمازوں کے اوقات ورکعات کی تعیین، ایسے ہی حج وغیرہ کے احکام کی تفصیلات قرآن میں مذکور نہیں ہیں جب کہ ان کا ماننا بھی ضروری ہے کیوں کہ یہ تمام چیزیں قرآن کی تشریح "احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام" سے ثابت ہیں۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ جسد عنصری کے ساتھ آسمان پر اٹھایا جانا انہی الفاظ کے ساتھ مذکور نہ ہونے سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ قرآن سے ثابت نہیں کیونکہ احادیث میں اس کی وضاحت موجود ہے۔

عوام اس تنقیح سے بہت مطمئن ہوئے اور انھوں نے قادیانی مطالبہ کو بے معنی قرار دیا۔ مگر قادیانی مناظر نے آیت کا مطالبہ ترک کر کے حدیث کا مطالبہ شروع کر دیا تاکہ یہ بحث طول پکڑے۔

قبل اس کے علماء اسلام کی طرف سے قادیانیوں کے جواب میں کچھ گفتگو کی جاتی صوبہ ہماچل پردیش کی ذمہ دار شخصیت، سیاسی و سماجی کارکن، پنجاب وقف بورڈ کے ممبر جناب مولانا ممتاز احمد قاسمی نے عوام کے نمائندہ کی حیثیت سے مداخلت کر کے بحث کا رخ پھر مرزا قادیانی کے صدق وکذب کی طرف پھیرنے کی کوشش فرمائی اور اپنی تقریر میں فرمایا کہ ہماچل پردیش کے مسلمان سیدھے سادے مسلمان ہیں، حیات وممات عیسیٰ کی علمی بحثیں ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں، یہ بحثیں آپ لوگ قادیان میں بیٹھ کر کرو یا دیوبند جا کر۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں ہم انہی کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ اے قادیانیو! تم یہ کہتے ہو کہ ہمارا کلمہ بھی یہی ہے تو پھر تم ہمیں کون سی نئی بات بتانے آئے ہو؟ اگر کوئی نئی بات ہے تو وہ یہی ہے کہ تم یہ پرچار کرتے ہو کہ مرزا قادیانی کو نبی، مسیح موعود، مہدی معہود مانو۔ تب جا کر حقیقی اسلام آئے گا۔ جب یہ بات ہے تو سیدھے سیدھے پہلے مرزا قادیانی کا

سچا ہونا ثابت کرو۔ جب کہ علماء اسلام کہتے ہیں کہ وہ دجال وکذاب تھا۔

مولانا موصوف کی تقریر سن کر قادیانی گروہ نے پھر شرائط مناظرہ کی دہائی دینی چاہی مگر موصوف کے سادہ لب ولہجہ سے عوام کا وہ موڈ پختہ ہوگیا۔ جو حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب شروع ہی سے بناتے جارہے تھے کہ سب سے پہلے مرزا کے صدق وکذب کی بحث ہونی چاہیے۔

قادیانی گروہ کسی قیمت پر اس موضوع پر گفتگو کو تیار نہیں ہوا' اور اس نے مجمع میں شور مچاکر افراتفری کا ماحول پیدا کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اسی دوران انہی میں سے ایک شخص دوڑ کر تھانہ گیا اور پولیس پارٹی کو بلالایا۔ علماء اسلام وعوام نے پولیس کو معاملہ کی نوعیت سمجھائی۔ پروگرام چلتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ پارٹی واپس چلی گئی' آخر کار عوام کی اس بیداری کو دیکھ کر قادیانی گروہ سخت مایوس ہوا' اور میدان مناظرہ سے راہ فرار اختیار کرکے کچھ دیر اپنی کار کے پاس کھڑا رہا۔ اس کے بعد وہاں سے بھی چلا گیا والحمدللہ رب العالمین۔ ۱۱½ بجے دوپہر کے قریب بحث ومناظرہ کی مجلس، جلسہ کی شکل میں تبدیل ہوگئی' اب اور قرب وجوار کی بستیوں سے آئے ہوئے تمام چودھری صاحبان و دیگر مسلمانوں کے سامنے علماء اسلام نے تقریباً ڈیڑھ بجے تک مرزا غلام احمد قادیانی کے دعاوی وعقائد کفریہ خود اس کی کتابوں میں کھول کھول کر پڑھ کر سنائے اور ثابت کیا کہ دنیا کے جو مسلمان مرزا کو نہیں مانتے' اس کے ہاتھ پر یا اس کے خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرتے' مرزا قادیانی اور اس کا گروہ ان کو پکا کافر اور دائرہ اسلام سے خارج مانتا ہے حالانکہ خود یہ کافروں ومرتدوں کا گروہ ہے

ان بیانات سے عوام نے مرزا قادیانی کے دجل وتلبیس کو اچھی طرح سمجھ لیا اور اخیر میں چودھری صاحبان وغیرہ نے بحث ومناظرہ کے نتیجہ کا اعلان تحریری شکل میں مرتب کراکے اس پر دستخط کئے' انگوٹھے لگائے۔ جس کا متن حسب ذیل ہے۔ اصل تحریر کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت کے دفتر میں محفوظ ہے۔

عوام کا فیصلہ

آج مورخہ ۱۱؍جون ۱۹۹۵ء بروز اتوار امب ضلع اونا (ہماچل پردیش میں) علما اسلام اور قادیانیوں کے درمیان مباحثہ ہوا۔ ہم نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ مرزا غلام احمد قادیانی بالکل جھوٹا و دجّال تھا اور قادیانی مبلغین ہمیں راہ اسلام سے ہٹانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

جب ہمارے نمائندہ نے مطالبہ کیا کہ مرزا غلام احمد قادیانی جھوٹا تھا یا سچا؟ اس پر بحث ہونی چاہیے تو قادیانیوں نے انکار کر دیا بالآخر مجلس سے اٹھ کر چلے گئے حالانکہ ہم عام مسلمان بھی بار بار مطالبہ کرتے رہے کہ اسی چیز کو تبلاؤ کہ مرزا جھوٹا تھا یا سچا؟

علاوہ ازیں علاقہ کی مسلم گوجر برادری نے اپنے ایک فرد "الف دین" سے کہہ دیا ہے کہ اگر تیرے یہاں قادیانی گروہ کی آمد و رفت رہے گی تو ہم تیرا بائکاٹ کریں گے، اس کے باپ اور چچا نے حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب و دیگر حضرات سے بڑی لجاجت کے ساتھ کہا کہ ہمارے لڑکے الف دین نے گفتگو کے دوران جو سخت کلامی کی ہے ہم اس کی معافی چاہتے ہیں۔

بفضلہ تعالےٰ امب کے اس کامیاب پروگرام کے بعد امید ہے کہ دور دور تک کے مسلمان قادیانی مکر و فریب سے محفوظ رہیں گے۔ انشاء اللہ تعالےٰ۔

واللہ ولی التوفیق

حافظ محمد اقبال رنگونی مانچسٹر

روزنامہ جنگ لندن ۸ر جنوری ۹۵ء کی رپورٹ کے مطابق چیچنیا کے دارالحکومت گروزنی روسی حملوں سے لرزاٹھا ہے شہر میں ہر منٹ میں تقریباً ۱۵ گولے گر رہے ہیں. صدارتی محل پر بھی زبردست بمباری ہوئی اور ہر طرف آگ کے شعلے اٹھے ہوئے ہیں اطلاعات کے مطابق اب روس نے کیمیائی جنگ کا آغاز کردیا ہے اور پانی کے ذخائر میں زہر ملادیا ہے۔

سوویت کی شکست وریخت کے بعد جس طرح مختلف ریاستوں کو آزادی کا سورج دیکھنا نصیب ہوا، چیچنیا کی اسلامی حکومت نے بھی آزادی کی خواہش کی اور کہا کہ وہ ایک اسلامی مملکت ہے اور آئندہ کے لیے روسی فیڈریشن کا حصہ بننے کے لیے تیار نہیں بلکہ وہ اپنی اس چھوٹی سی مملکت کو روسی سیاست سے آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ روسی رہنماؤں نے نہ صرف یہ کہ اس ننھی منی اسلامی ریاست کے قیام کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا بلکہ دھمکی دی گئی کہ اگر چیچنیا کے مسلم رہنماؤں نے اپنا مطالبہ برقرار رکھا تو ان کے خلاف سخت کارروائی بھی ہوسکتی ہے۔ دوسال تک روسی رہنماؤں نے چیچن رہنماؤں کو قابو میں لانے کے لیے مختلف حربے استعمال کیے تاہم چیچن رہنما جنرل ڈڈائیف نے اپنا اور اپنے عوام کا مطالبہ برقرار رکھا۔ نئی حکومت نے ملک کو اسلامی جمہوری خطوط پر استوار کرنے کے لیے قرآن پر بھی حلف لیا۔

(ہفت روزہ وطن ۲۲ر دسمبر ۹۴ء) روسی حکومت نے ۱۱ر دسمبر کو چالیس ہزار فوجیوں جدید ترین ہتھیاروں، ٹینکوں، بکتربند گاڑیوں اور بہت سے لڑاکا تیاروں پر مشتمل ایک لشکر اسلامی ریاست کو کچلنے کے لیے بھیج دیا۔ مغربی اخبارات کے نمائندوں نے جب

جنرل ڈڈایف سے پوچھا کہ آپ اتنی بڑی قوت سے مقابلہ کیسے کریں گے ؟ جواباً انھوں نے کہا ہم صرف ایک ذات سے ڈرتے ہیں اور وہ اللہ ہے اس کے علاوہ ہمیں کسی اور سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ گروزنی کی سڑکوں اور اس ریاست کے دوسرے علاقوں میں اللہ اکبر، اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوتی رہیں، ہر شخص اللہ رب العزت کی کبریائی کا نعرہ لگا رہا، چیچنیا کے مسلمان بیک زبان یہ کہہ رہے تھے کہ یہ اسلامی مملکت ہے، یہاں نہ روس کی سیاست چل سکتی ہے نہ کسی اور کی۔ ہم اس مملکت کو اسلامی اصولوں کے مطابق چلانے کے خواہش مند ہیں اور اس کا پختہ ارادہ کر چکے ہیں۔ روسی رہنماؤں (اور بباطن تمام اعدائے اسلام قوتوں) نے اس اسلامی ریاست کو سزا دینے کا فیصلہ کر لیا، روسی فوج پوری تیاری کے ساتھ آگے بڑھنے لگی، راستے میں جن علاقوں نے اس کی مزاحمت کی انہیں بھی تہس نہس کر دیا گیا، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ روس دنیا کی سب سے بڑی قوت سے ٹکرانے چلا ہے اور ایک عظیم قوت سے مقابلہ کرنے کے لیے میدان جنگ میں اترا ہے۔ چیچنیا کے مسلمان نہتے تھے نہ ان کے پاس اعلیٰ درجے کے ہتھیار تھے نہ لڑاکا جہاز، مادی وسائل کے اعتبار سے ہر چیز کا فقدان تھا لیکن روحانی قوت اور ایمانی استقامت کی فراوانی تھی اور اسلامی مملکت کی حفاظت کی خاطر جان کی بازی لگا دینے والے بچے جوان اور بوڑھے سب ایک صف میں شانہ بشانہ کھڑے تھے۔

ادھر اسلام دشمنوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر آج اس چھوٹی سی اسلامی مملکت کو سزا نہ دی گئی تو آئندہ سنٹرل ایشیا کی سیاست میں ایک ایسی کھلبلی مچ جائے گی جس سے خود ماسکو بھی نہ بچ سکے گا، اس فیصلے کی روشنی میں روسی فوج نے چیچنیا کے مختلف علاقوں بالخصوص گروزنی پر زمینی اور فضائی حملہ کر دیا صدارتی محل روسی توپوں اور طیاروں کی زد میں آگیا بجلی اور پانی کی لائنیں منقطع کر دی گئیں۔ سرکاری وغیر سرکاری عمارتوں پر شدید بمباری کی گئی۔ چیچنیا کے مسلمانوں نے روسی فوج کا مقابلہ کیا۔ روسی وزیر دفاع بار بار کہہ رہے تھے کہ گروزنی چند گھنٹوں کے اندر ہمارے قبضے میں ہوگا لیکن ان کے لیے یہ ایک ایک گھنٹہ ہزار دنوں سے کم نہ تھا، کئی روسی فوجی گرفتار ہوئے، کئی گروزنی کی سڑکوں پر پڑے سڑتے رہے۔ روسی فوجیوں کی لاشوں نے پورے ماسکو میں ہلچل مچا دی۔ روسی سربراہ یالسن اور دوسرے

فوجی رہنما اس صورت حال سے تنگ آگئے اور آگ وخون کی ہولی کھیلنے کی کھلی اجازت دے دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گروزنی کے مسلمانوں کو چاروں طرف سے چن چن کر ہلاک کر دیا۔ مغربی اور امریکی ذرائع ابلاغ روزانہ چیچنیا کے مسلمانوں پر ہونے والے اس بدترین ظلم وستم کی تصاویر دکھاتے رہے روسی فوج کی مسلسل بمباری، آگ کے شعلے، اور خون میں لت پت پڑی مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کی لاشیں امریکی اور مغربی ٹیلیویژن کی شہ سرخیوں میں دکھائی گئیں لیکن کسی امریکی اور مغربی حکمراں کو یہ کہنے کی توفیق نہ مل سکی کہ روسی رہنما اور اس کی فوج یہ ظالمانہ اور وحشیانہ کھیل فوراً ختم کر دے۔

کون نہیں جانتا کہ بالٹک کی تینوں ریاستوں نے جب آزادی کا اعلان کیا تو دنیا کے بیشتر ممالک نے اسے فوراً تسلیم کر لیا اور جب روس نے اس کے خلاف کارروائی کا عندیہ دیا تو امریکہ اور مغرب سب سے پہلے روس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور اسے اپنے ارادے سے باز رہنے کی دھمکی دے دی تھی۔ لیکن چیچنیا کے اعلان آزادی اور اس پر مسلسل گولہ باری کے خلاف یہ قومیں کیوں خاموش رہیں؟ آخر اسی زبان میں بات کرنے میں انہیں کیا تکلیف تھی جس زبان میں بالٹک کی ریاستوں کے مسئلہ پر بات کر چکے تھے۔ حالانکہ روسی صدر کی اس وحشیانہ کارروائی کے خلاف خود ماسکو کی سڑکوں پر مظاہرے ہوئے روسی پارلیمنٹ کے کئی ممبروں نے اس ظالمانہ اقدام کی مخالفت کی، فوج کے کئی جنرل اس حملہ کو حماقت قرار دیتے ہوئے استعفیٰ دیتے پائے گئے ان سب کے باوجود روسی صدر اس ظالمانہ اقدام سے ایک قدم پیچھے نہ ہٹے اور نہ ہی امریکہ اور مغرب روس کے خلاف میدان عمل میں اترے۔ مغربی حکمراں صرف بیان بازی پر اکتفا کرتے رہے۔ امریکی صدر کلنٹن بہت دیر کے بعد بولے کہ ہماری خواہش ہے کہ اس تنازعہ میں کم سے کم خون بہے اور یہ مسئلہ جلد حل ہو جائے۔ مغربی حکمرانوں نے کہا کہ یہ روس کا داخلی معاملہ ہے اور ہم بہت قریب سے اس کا جائزہ لے رہے ہیں۔ یورپی یونین کے صدر نے یورپی یونین کے چند ارکان سے صرف اتنا مطالبہ کیا کہ وہ روسی صدر سے اتنا پوچھیں کہ آخر ایک قفقازی جمہوریہ کے خلاف طاقت کے ایسے بے معنی استعمال کا مطلب کیا ہے؟ ان ارکان نے روسی صدر سے اتنی بات بھی پوچھی یا نہیں، اس کی کوئی رپورٹ

نہیں ملتی۔ امریکی صدر کلنٹن کی خواہش تھی کہ خون ضرور بہے۔ مسلمانوں کو سبق ضرور ملے، اور مغربی حکمراں یہ دیکھ رہے تھے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اقوام متحدہ جسے اس بات کی بڑی فکر رہتی ہے کہ اسلامی ممالک میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی تو نہیں ہورہی ہے وہ چیچنیا کے مسلمانوں پر ہونے والے ظلم وستم پر خاموش تھا، وہ بھی اسے روس کا داخلی معاملہ قرار دے رہا تھا۔

ان سب پر مستزاد یہ کہ اسلامی ممالک کے حکمراں کھلی آنکھوں ایک ننھی سی اسلامی ریاست کی تباہی اور بربادی کا نقشہ دیکھتے رہے۔ مرنے والوں کی تعداد گناتے رہے اور مذمتی قرارداد پاس کرتے رہے لیکن مجال ہے کہ وہ بھی روس کے خلاف کوئی عملی اقدام اٹھانے پر آمادہ ہوئے ہوں حتیٰ کہ انہیں اس بات کی توفیق بھی نہ مل سکی کہ وہ کھل کر چیچنیا کے مسلمانوں کی حمایت میں کوئی بیان دے سکیں۔

اس وقت چیچنیا کے رہنما جنرل ڈڈایف گروزنی چھوڑ کر کہیں روپوش ہو چکے ہیں چیچنیا کی مساجد اور ان کے گھر کھنڈرات میں تبدیل کر دیئے گئے ہیں جو مرد عورت گروزنی منہ چھوڑ سکے ان کی جانیں ابھی محفوظ نہیں، وہ کھانے اور ادویات کے محتاج ہیں، امدادی قافلوں کو گروزنی اور دوسرے شہروں کے باہر ہی لوٹ لیا جاتا ہے۔ گذشتہ دنوں اسلامک ریلیف کے ایک ذمہ دار شخص نے راقم الحروف کو بتلایا کہ امدادی قافلوں کے پانچ ٹرک گروزنی بھیجے جائیں تو ان میں سے صرف ایک ہی پہنچ پاتا ہے باقی سب لوٹ لیا جاتا ہے۔

جہاں تک روس کی پالیسی کا تعلق ہے وہ یہ کہ اب چیچنیا کے مسلمانوں کو اس قدر نہتا اور بے بس کر دیا جائے کہ آئندہ وہ کسی طور پر سر نہ اٹھا سکیں۔ گروزنی کے بعد آرگوان وہ شہر ہے جہاں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد پناہ گزیں ہے اور کسی وقت بھی ماسکو حکومت کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔ چنانچہ روسی حکمراں اب آرگوان پر حملہ کرنے کے منصوبے بنا چکے ہیں۔ روزنامہ نوائے وقت کی ایک خبر کے مطابق چیچنیا کے دوسرے بڑے شہر آرگوان پر زبردست حملہ کرنے کے لیے روس کے وزیر دفاع پاؤل گریچیف وزیر داخلہ وکٹر یارین نائب وزیر اعظم اولیگ اور ملک کے انٹیلی جنس کے سربراہ روس کے

فوجی اڈے مزدوک اور گروزنی میں صلاح ومشورے کر رہے ہیں۔ علاوہ ازیں چیچنیا کے مجاہدین کے درمیان تفرقہ پھیلانے اور انھیں آپس میں لڑانے کے منصوبے بھی بنائے جا رہے ہیں۔ [۱۹؍ مارچ ۱۹۹۵ء]

یہ خبر اس بات کی نشاندہی کر رہی ہے کہ روس چیچنیا کے مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے پر تول رہا ہے۔ مغربی حکمراں اس سے بے خبر نہیں اور اسلامی حکمرانوں کے بارے میں بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اس منصوبے سے بے خبر ہوں گے۔

اب اگر مسلمان حکمرانوں نے چیچنیا کے مسلمانوں کی جان ومال کی حفاظت کے سلسلے میں کوئی عملی قدم نہ اٹھایا اور کھل کر روسی جارحیت کے خلاف اتحاد کا مظاہرہ نہ کیا تو پھر روس اپنے ناپاک عزائم میں بہت آگے بڑھتا چلا جائے گا اور اس کا نشانہ صرف اسلامی ریاستیں ہوں گی، اس طرح یہ آزاد ہونے والی اسلامی ریاستیں پھر سے اس کے زیر تسلط آجائیں گی۔

ہم اسلامی ممالک کے رہنماؤں سے پرزور درخواست کرتے ہیں کہ وہ سابق سوویت یونین سے آزاد ہونے والی اسلامی ریاستوں کو مزید تباہی سے بچانے کے لیے کوئی تو عملی تدبیر کریں اور اگر مسلمانوں کے نصیب میں امریکہ کو خوش کرنے کے سوا اور کوئی سیاسی کام نہیں تو کم ازکم امت مسلمہ پر اتنا رحم کریں کہ اسے اللہ عزوجل کے سپرد کرکے خود اپنے چند روزہ اقتدار سے جیتے جی دستبردار ہوجائیں، اور اگر آپ رحمۃ للعٰلمین خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم کی امت کے لیے اتنی قربانی بھی نہیں دے سکتے تو پھر دوسرے مسلم حکمرانوں کو ایک جگہ جمع کرکے سب مسلمانوں کو ایک جھنڈے تلے لے آئیں۔ کیوں کہ جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے اور اللہ کا ہاتھ ہمارے دنیوی اسباب کا محتاج نہیں جب وہ کسی کام کا فیصلہ کرلے تو پھر اس کے ہاتھ کو کوئی روک نہیں سکتا۔ [۲۱؍ مارچ ۱۹۹۵ء]

وما علینا الا البلاغ المبین

دارالعلوم دیوبند میں ایصال ثواب اور تعطیل

۱۰ جون۔ آج حضرت مولانا انعام الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سانحۂ وفات کی اطلاع ملتے ہی دارالعلوم دیوبند میں غم واندوہ کی فضا چھا گئی، اور فوراً ہی ایصالِ ثواب کا انتظام کیا گیا، جس میں تمام طلبہ، اساتذہ اور کارکنان نے شرکت کی، اور دعا کی گئی۔

ایصال ثواب کے بعد حضرت مولانا مرغوب الرحمان صاحب مہتمم، حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب، صدر المدرسین۔ حضرت مولانا قمر الدین صاحب ناظم تعلیمات حضرت مولانا عبد الحق صاحب، حضرت مولانا ارشد صاحب اور دیگر اساتذہ کرام نماز جنازہ میں شرکت اور تعزیت کے لیے دہلی پہنچے، اور دارالعلوم میں ایک یوم کی تعطیل کرکے طلبہ، اساتذہ اور کارکنان کو ایصال ثواب کے تسلسل کو باقی رکھنے کی ہدایت کر دی گئی۔

خدا مرحوم کی مغفرت فرمائے اور ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے غیب سے اس کی تلافی کا انتظام فرمائے۔ آمین۔

مرغوب الرحمن
مہتمم دارالعلوم دیوبند

دار العلوم دیوبند کا ترجمان
ماہنامہ
دار العلوم
PH. NO. 22429
COD " 01336
PIN - 247554
جلد ۸
ماہ ربیع الاول ۱۴۱۶ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۹۵ء
شمارہ ۸
نگراں
حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب
مہتمم دار العلوم دیوبند
مدیر
حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی
استاذ دار العلوم دیوبند
سالانہ ——— ‎60/-
فی شمارہ ——— ‎6/-
ترسیل زر کا پتہ
دفتر ماہنامہ دار العلوم دیوبند
سہارنپور
یوپی
سالانہ بدل اشتراک
سعودی عرب افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ... روپئے
پاکستان سے ہندوستانی روپئے ‎100/-
بنگلہ دیش سے ہندوستانی روپئے ‎80/-
ہندوستان سے ‎60/- روپئے

فہرست مضامین

ختم خریداری کی اطلاع

○ یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔

● ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں

● چوں کہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے اس لیے دی، پی میں صرفہ زائد ہوگا۔

● پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کردیں۔

● ہندوستان اور پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

● بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس الرحمن سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

عدل و انصاف کا حصول، جان و مال کا تحفظ، دین و مذہب کی آزادی، اور حق شہریت میں مساوات، یہ وہ بنیادی انسانی حقوق ہیں جو انسان کے فطری شرف کا خاصہ ہیں جنھیں تاریخ کے ہر دور میں تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ "بھارت میں انگریزی راج" کے مصنف پنڈت سندر لال الٰہ آبادی سلطنت مغلیہ میں مذہبی آزادی پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور ان کے بعد اورنگ زیب کے تمام جانشینوں کے زمانہ میں ہندو مسلم یکساں رہتے تھے، دونوں مذاہب کی یکساں توقیر کی جاتی تھی اور مذہب کے لیے کسی کے ساتھ کسی قسم کی جانب داری نہ کی جاتی تھی، ہر بادشاہ کی طرف سے بے شمار مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دی گئی تھیں، آج تک ہند میں متعدد ہندو مندروں کے پجاریوں کے پاس اورنگ زیب کے دستخطی فرمان موجود ہیں جن میں خیرات اور جاگیروں کے عطا کیے جانے کا تذکرہ ہے۔" (روشن مستقبل ص ۲۴)

تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان مذکورہ حقوق بالخصوص آزادیٔ مذہب پر جب بھی کسی حکومت کی جانب سے قدغن لگائی گئی ہے، عوام نے اسے برداشت نہیں کیا ہے، اور اکثر حالات میں حکومت کا یہی رویہ انقلاب کا پیش خیمہ بن گیا ہے خود ہندوستان میں برطانوی حکومت کے خلاف ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ایک اہم محرک ہندوؤں اور مسلمانوں کا یہ اندیشہ تھا کہ اُن کے مذہب میں رخنہ اندازی کی جارہی ہے اور اسے خراب کرنے کی کوشش ہورہی ہے۔ جنگ آزادی کے مشہور مجاہد اور .... حکومت ہند کے سابق وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے حکومت برطانیہ کو مخاطب کرتے ہوئے ایک موقع پر فرمایا تھا:

"اسلام کے احکام کوئی راز نہیں جن تک گورنمنٹ کی رسائی نہ ہو وہ چھپی ہوئی کتابوں میں مرتب ہیں، اور مدرسوں کے اندر شب و روز لوگ ان کا درس دیتے ہیں پس گورنمنٹ کو چاہئے کہ صرف اس بات کی جانچ کرے کہ واقعی اسلام کے شرعی احکام ایسے ہیں یا نہیں؟ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ایسا ہی ہے تو پھر صرف دو ہی راہیں گورنمنٹ کے سامنے ہونی چاہئیں، یا مسلمانوں کے لیے ان کے مذہب کو چھوڑ دے، اور کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے ان کے مذہب میں مداخلت ہو یا پھر اعلان کر دے کہ حکومت کو مسلمانوں کے مذہبی احکام کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ نہ اس پالیسی پر قائم ہے کہ ان کے مذہب میں مداخلت نہ ہوگی، اس کے بعد مسلمانوں کے لیے بھی نہایت آسانی ہو جائے گی، کہ اپنا وقت بے سود شور و فغاں میں ضائع نہ کریں اور برٹش گورنمنٹ اور اسلام ان دونوں میں سے کوئی ایک بات اپنے لیے پسند کریں۔" (مسئلہ خلافت و جزیرۂ عرب ص۲۰۴)

آزادئ مذہب کا مسئلہ اتنا حساس ہے کہ کوئی قوم بھی ایک لمحہ کے لیے اس میں مداخلت برداشت نہیں کرتی۔ بالخصوص مسلمانوں کا احساس تو اس مسئلہ میں انتہائی نازک ہے، اس لیے کہ مسلمانوں کا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ اس کے مذہبی احکام (جن میں مسلم پرسنل لا بھی داخل ہے) خدا کے بنائے قوانین ہیں جن میں کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ ممکن نہیں ہے اور ایسی ہر کوشش اسلامی نقطۂ نگاہ سے غیر مقبول اور مردود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے آزاد ہونے کے بعد جب اس کا نیا دستور مرتب کیا گیا تو اس میں مذہب کی کھلی ضمانت دی گئی کیوں کہ اس ضمانت کے بغیر ملک کا سیاسی اتحاد برقرار نہیں رہ سکتا تھا، ملاحظہ کیجئے دستور ہند کا باب سوم جس کا عنوان ہے "بنیادی حقوق" جس میں ہندوستان میں رہنے والے تمام باشندوں کے لیے چند حقوق کو بنیادی حقوق کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے، اور ان کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے۔ چنانچہ اس باب کی (دفعہ ۲۵) اور (دفعہ ۲۹) میں کھلے لفظوں یہاں کے شہریوں کے ہر طبقہ کو اپنی مخصوص تہذیب و کلچر کو برقرار رکھنے اور اپنے لیے کسی مذہب کو اختیار کرنے، اس پر عمل کرنے، اور اس کی تبلیغ و اشاعت کا پورا پورا حق دیا گیا ہے۔

پھران بنیادی حقوق کی بالادستی کو قائم رکھنے کے لیے دستور کی (دفعہ ۳۲) میں یہ صراحت کی گئی ہے۔ ہر بنیادی حق کو سپریم کورٹ کے ذریعہ نافذ کرایا جاسکے گا۔ اسی کے ساتھ بنیادی حقوق کو مزید مستحکم بنانے کے لیے دفعہ ۱۳ ضمن ۲ کے ذریعہ ریاست کے اختیاراتِ قانون سازی کو محدود کر دیا گیا ہے کہ ریاست کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکتی، جس سے باب سوم میں مندرجہ بنیادی حقوق میں سے کسی حق پر کوئی ضرب پڑے۔

دستور ہند کا چوتھا باب "ریاست کی پالیسی کے رہنما اصول" کے عنوان سے ہے جو متعدد دفعات پر مشتمل ہے۔ ان دفعات میں سے دفعہ ۴۴ میں کہا گیا ہے کہ ریاست ہندوستان کے پورے علاقے کے شہریوں کے لیے یکساں سول کوڈ بنانے کی کوشش کرے گی۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ رہنما اصولوں اور بنیادی حقوق کے ابواب میں سے کون سا مقدم ہے، ماہرین قانون اس مسئلے میں مختلف الرائے ہیں لیکن عدلیہ کے اب تک کے فیصلوں کے پیش نظر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا رجحان بنیادی حقوق کو اہم تر قرار دینے کا ہے لیکن بعض سیاسی پارٹیوں کے بیانات اور ان سے متاثر بعض عدالتی فیصلوں میں یکساں سول کوڈ کے نافذ کرنے کی حکومت سے سفارش کی گئی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت کی جانب سے مسلسل یقین دہانیوں اور دستور ہند کی ان مستحکم ضمانتوں کی موجودگی میں ہندوستان کی عدالت عالیہ کا یہ فیصلہ اور حکومت سے اس کی مذکورہ سفارش ایک عظیم خطرہ کا سگنل ہے۔ لیکن حکومت کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس خطرہ کے شکار تنہا مسلمان ہی نہیں ہوں گے بلکہ پورا ملک ہوگا، اور اس کی تمام تر ذمہ داری حکومت پر عائد ہوگی۔

اس لیے اس وقت کے آنے سے پہلے پہلے حکومت کو اس مسئلہ میں دوٹوک فیصلہ کرکے ملک کو انتشار و اضطراب سے بچانے کی فکر کرنی چاہئے۔

آج مسلمان جس صورت حال سے دوچار ہیں ماضی میں یہ صورت نہ تھی، آج مسلمان ہر لحاظ سے پسماندہ ہیں، علم وفن، صنعت وحرفت، تہذیب وتمدن، سیاست وحکومت کسی بھی شعبہ میں یہ اقوام عالم کے دوش بدوش نہیں ہیں۔ جب کہ ہمارا ماضی ہمارے تصور سے زیادہ حسین اور عصر حاضر کی رنگا رنگیوں سے بڑھ کر تابناک تھا، لیکن آج ہمارے پاس سوائے یادِ ماضی کے اور کیا رہ گیا ہے؟ آج ہم اسی کو بہت سمجھتے ہیں کہ اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں کو یاد کرلیں اور تھوڑی دیر اپنے دل کو طفلانہ تسلیوں سے بہلالیں، یادوں کے چراغ جلانا اور تصورات کے دیپ روشن کرنا ہمارا بہترین مشغلہ بن گیا ہے ؎

اولٰئک اٰبائی فجئنی بمثلھم
اذا جمعتنا یا جریر المجامع

یہ ہمارے اسلاف ہیں! اے جریر! اپنی پوری جماعت سے ایک مثال پیش کردو۔

بالیقین ہمارا ماضی اس لائق ہے کہ اس پر فخر کیا جائے، ہمارا عہد گذشتہ جتنا حسین ہے اتنا کسی قوم کا نہیں، تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ جس وقت آج کا ترقی یافتہ یورپ اندھیروں میں بھٹک رہا تھا، اس وقت بھی ہمارے علم وفن کا چراغ روشن تھا جب اس کے پاس لباس کا کوئی تصور بھی نہ تھا اس وقت دارالخلافت بغداد میں ململ ومخمل اور نفیس کپڑوں کی فیکٹریاں قائم تھیں جس دور میں مغرب فن تعمیر کے تخیل سے بھی نابلد

تھا اور کھلے آسمان کے سائے میں وہ زندگی کے تاریک دن کاٹ رہا تھا اسی دور میں مسلمان فن تعمیر میں کمال حاصل کرچکے تھے اور بغداد، قرطبہ اور غرناطہ میں دنیا کی حسین ترین عمارتیں وجود میں آچکی تھیں۔ تاریخ کے جس موڑ پر یورپ ہر طرح کے تمدن سے محروم، اور ایجاد و اختراع کے ہر احساس سے خالی تھا اس وقت بھی اسلامی شہروں کا تمدن نقطۂ عروج پر تھا اور اندلس کے ایجادات اور انکشافات دنیا کی خاموش فضا میں ہلچل پیدا کر رہے تھے۔ یہ سب کچھ بلکہ اس سے بھی بہت بڑھ کر درست اور تاریخی حقیقت ہے جس کا کوئی انکار نہیں کرسکتا لیکن ان سب کے باوجود اقبال کی زبان میں۔ ع

تھے وہ آبا، ہی تمہارے مگر تم کیا ہو ؟

اور ایک عربی شاعر کے الفاظ میں ؎

ان الفتی من یقول ھا انا ذا

لیس الفتی من یقول کان ابی

جوان مرد وہ ہے جو اپنے ذاتی کمالات کا دنیا سے اعتراف کرالے یہ جواں مرد ہی نہیں کہ اپنے باپ دادا کے کمالات کے راگ الاپتا رہے اور خود کسی قسم کا کمال نہ رکھتا ہو۔

اصل کام یہ ہے کہ ان زینوں کو دریافت کیا جائے جن پر چڑھ کر ماضی کے مسلمان علم و فن اور عظمت و شوکت کے بام عروج پہ پہنچ گئے تھے، اور اس روح کو تلاش کیا جائے جس کی طاقت سے انہوں نے اقوام عالم کو مسخر کیا تھا۔ جب ہم اس نقطۂ نگاہ سے ماضی و حال کا جائزہ لیتے ہیں تو بنیادی طور پر تین قابل توجہ گوشے نظر آتے ہیں جن پر سوچنے والوں کو سوچنا چاہیئے اور لکھنے والوں کو لکھنا چاہیئے۔

۱، ماضی کے مسلمانوں کے عروج کے اسباب کیا تھے۔ ؟

۲، موجودہ زوال کے اسباب وعوامل کیا ہیں ؟

۳، عصر حاضر میں مسلمانوں کی ترقی کے امکانات کیا ہیں ؟

ماضی میں مسلمانوں کے عروج کے اسباب

ماضی میں مسلمان عروج وارتقاء کے جن آسمانوں پر پہنچے ان کا بنیادی سبب قرآن اور اسلامی تعلیمات سے بے پناہ لگاؤ تھا' قرآن نے مسلمانوں کو جو تعلیمات دی تھیں مسلمان ان پر عمل پیرا تھے جن راہوں کی طرف رہنمائی کی تھی ان پر چلنے کے لیے وہ بے چین رہتے تھے اور جن اشارات کی جانب اس نے توجہ مبذول کرائی تھی وہ ان کی تمام تر توجہات کا مرکز بنے ہوئے تھے۔

۱: **ذہن سازی** قرآن نے حد سے زیادہ گری ہوئی قوم کو ترقی کی شاہراہ پر لگانے کے لیے سب سے پہلے ذہن بنانے کی کوشش کی کہ علم و جہل، نور وظلمت اور تمدن ووحشت میں کافی فرق ہے۔ یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں، کوئی شخص بہتر انسان اسی وقت نہیں بن سکتا ہے جب کہ وہ ان دونوں کے باہمی فرق کو محسوس کرے اور ایسا راستہ اختیار کرے جو ان میں اچھی منزل تک پہنچانے والا ہو' ایک ترقی پسند انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ جہالت وظلمت اور وحشت وپستی کے راستے کو چھوڑ کر علم وفن اور تہذیب وتمدن کا راستہ اختیار کرے اس کے بغیر نہ کوئی قوم بڑھی ہے اور نہ بڑھ سکتی ہے۔

"قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لایعلمون انما یتذکر اولوالالباب" (الزمر - ۹)

"اے نبیؐ! آپ کہہ دیجئے کہ کیا وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ جو نہیں رکھتے، برابر ہو جائیں گے۔ عبرت تو صرف عقل والے ہی حاصل کرتے ہیں"۔

قرآن نے اس قوم کی ترقی کی ضمانت دی جو علم ومعرفت کے راستے گامزن ہو:

"یرفع اللہ الذین اٰمنوا منکم والذین اوتوالعلم درجات" (مجادلہ ۱۱)

اللہ اہل ایمان اور اہل علم کے درجات بلند کرتا ہے۔

قرآن نے عقل وفکر سے جاہلانہ جمود ختم کرنے کے لیے آفاق وانفس میں غور کرنے کی دعوت دی۔

"ان فی خلق السمٰوات والارض واختلاف الیل والنہار لآیات لاولی الالباب ۝ الذین یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبہم ویتفکرون فی خلق السمٰوات والارض ربنا ما خلقت ھذا باطلاً سبحانک فقنا عذاب النار" (آل عمران ۱۹۰-۱۹۱)

ترجمہ: بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور شب وروز کی گردش میں نشانیاں ہیں عقل والوں کے لیے جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور کروٹ پر لیٹے ہوئے اور غور کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی خلقت میں (پھر بول اٹھتے ہیں) اے ہمارے رب تو نے یہ سب بے مقصد پیدا نہیں کیا تو تمام عیوب سے پاک ہے پس ہم کو آگ کے عذاب سے بچالے"۔

پیغمبر اسلام محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی موقعہ بموقعہ علم ومعرفت کا وعظ فرمایا اور مسلمانوں کو اس کی جانب متوجہ کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ آپ نے فرمایا:

"طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم"۔ (مشکوٰۃ ۳۴)

علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

علم کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں لگائی کہ اتنی عمر تک علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد نہیں، بلکہ آپ نے آغاز عمر سے دم واپسیں تک کے ہر لمحہ میں تحصیل علم کی تاکید فرمائی۔

"اطلبوا العلم من المہد الی اللحد۔ (الحدیث)

علم آغوش مادر سے قبر میں جانے تک حاصل کرو۔

علم وفن کے راستے میں جدوجہد کی ضرورت پیش آتی ہے جس کے لیے حضورؐ نے قوت وحوصلہ کو جوہری عنصر قرار دیا۔ فرمایا:

"المؤمن القوی خیر واحب الی اللہ من المؤمن الضعیف" (الحدیث)

طاقتور مومن اللہ کے نزدیک کمزور مومن کے مقابلے میں بہتر اور پسندیدہ ہے۔

ان روایات میں سے بعض میں لفظی طور پر کلام ہے مگر معنی کے اعتبار سے وہ صحیح ہیں۔
اس طرح کی اور بھی متعدد روایات ہیں جن میں حضورؐ نے اس فکر و خیال کو راسخ کرنے کی کامیاب کوشش فرمائی کہ دنیا میں کسی قوم کو زندگی علم کی بدولت ملتی ہے، جو قوم علم و ہنر سے مالا مال ہوتی ہے وہ زندہ رہتی ہے اور کوئی اس کی زندگی چھین نہیں سکتا۔ لیکن جو قوم جہالت و وحشت کا راستہ پکڑ لیتی ہے۔ اس کو مٹ جانے سے کوئی چیز بچا نہیں سکتی۔

قرآن اور پیغمبر اسلام کی مسلسل کوششوں کے نتیجے میں ایک وحشی قوم، اچانک بیدار ہو گئی اور وہ علم و ہدایت کا نور لیے تاریک دنیا کی طرف جانے کے لیے آمادہ ہو گئی۔

۱۲ دعوت انقلاب

جب قرآن نے محسوس کیا کہ اب اس قوم کی حسیت جاگ اٹھی ہے اور اس کی قوت فکریہ اپنی پرواز کے لیے کسی وسیع خلاء کو ڈھونڈ رہی ہے تو فوراً اس نے انقلاب اور حرکت و عمل کی دعوت دی اور قوت فکریہ کے ساتھ ساتھ قوت عملیہ کو بھی جھنجوڑا، اس کو سمجھایا گیا کہ دنیا میں انقلابات عدم کے پیٹ سے خود بخود وجود میں نہیں آ جاتے بلکہ اس کے لیے زبردست محنت کرنی پڑتی ہے۔ زندہ قوم اپنی فتمندیوں کے فیصلے اپنے عزم کے ہاتھوں لکھتی ہے وہ امکانات اور وسائل تک کے انتظار میں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھنا گوارہ نہیں کرتی بلکہ ناممکنات سے اور مشکلات سے آسانیوں کو فراہم کرنے کی کوشش کرتی ہے وہ حالت کے بدلنے کا انتظار نہیں کرتی، بلکہ دستِ ہمت سے حالات کا رخ خود پلٹ دیتی ہے اور اندھیروں سے ڈر کر وہ اپنا سفر موقوف نہیں کرتی بلکہ احکام الٰہی کے چراغ اندھیرے راستوں پر جلاتی ہوئی چلی جاتی ہے ؎

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

قرآن نے نہایت بروقت اپنی صدائے لاہوتی بلند کی جس کی گونج نے نیم خواب و نیم بیدار قوم کو اچانک انقلاب کے لیے آمادہ کر دیا۔

" ان اللّٰہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم ، واذا اراد اللّٰہ بقوم سوءً فلا مرد لہ وما لھم من دونہ من وال "

(رعد ۱۱)

بے شک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے آپ کو نہ بدل ڈالے' اور جب اللہ کسی قوم کو برے دن دکھانے کا ارادہ کرتا ہے تو پھر اسے کوئی ٹال نہیں سکتا' اور اللہ کے سوا ایسوں کا کوئی بھی مددگار نہیں ہوسکتا۔"

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

قرآن نے قوموں کے خیر و شر کا مدار خود اس کے اپنے اعمال پر رکھ دیا ہے جو قوم یہ کہتی ہو کہ کیا کریں' حالات اور قسمت نے ہمیں پیچھے کر دیا وہ درحقیقت اپنی بزدلانہ کم ظرفی کا اظہار کرتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جو قوم جیسا عمل کرتی ہے اس کے ساتھ قدرت کا فیصلہ اسی طرح ہوتا ہے ،

" فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہ "۔ زلزال ، ۷-۸)

پھر جو ذرہ برابر بھی نیک عمل کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا اور جو ذرہ برابر برا عمل کرے گا وہ (بھی) اس کو دیکھ لے گا۔"

قرآنی مطالعہ سے تو یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ زمین پر فساد کی آگ جو بھڑکتی ہے اور شیطنت کا ننگا ناچ جو دیکھنے میں آتا ہے اس میں بھی انسانی کرتوت کا دخل ہوتا ہے ،

" ظھر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس (الایۃ)

(روم ۴۱)

" فساد خشکی و تری میں لوگوں کے کرتوت کی بناء پر ظاہر ہوگیا"۔

قرآن نے صاف طور پر اس قوم کو خسارہ کا سودا کرنے والی اور ناکام قرار دیا ہے جس میں نور باطنی کے ساتھ ساتھ اخلاق و عمل کی اسپرٹ موجود نہ ہو۔ اور قرآن اس کے لیے

تاریخ عالم اور حوادث روزگار کو بطور شہادت کے پیش کرتا ہے کہ اگر اس نظریہ پر عین الیقین حاصل کرنے کے آرزومند ہو، تو انسانیت کی تاریخ الٹ کر پڑھ لو، تم کو ہر قوم کے عروج وزوال کی داستان میں یہی بنیادی عنصر ملے گا۔ قرآن نے اس لمبی اور تلخ تاریخ کو اپنے مختصر اور جامع پیرایہ بیان میں جس طرح سمیٹ لیا ہے وہ اس کا اعجاز ہے :

" والعصر ان الانسان لفی خسر الا الذین آمنوا وعملوا الصٰلحٰت وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر " (العصر)

ترجمہ : زمانے کی قسم بے شک انسان گھاٹے میں ہے مگر جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے اور حق پر قائم رہنے کی اور صبر کرنے کی آپس میں وصیت کرتے رہے (وہ نقصان سے بچ گئے)۔

انقلابی ہدایات

یہ کسی قوم کو تدریجی انقلاب کی طرف لانے کے لیے قرآن کے طرز تعلیم کا دوسرا مرحلہ تھا، فکر وعمل کی پیہم تاکیدات کے بعد جب یہ قوم کسی عمل کے لائق ہوگئی اور علم وفن تہذیب وتمدن اور تجارت وسیاست کے میدان میں اترنے کے قابل ہوگئی تو اس کو اشارات دیئے گئے، ہدایات واحکام سے نوازا گیا اسرار عالم کی جھلکیاں دکھائی گئیں۔ عقل وخرد اور فکر وفن کے وہ راز بتائے گئے جو آج تک کسی مصلح قوم نے اپنی قوم کو نہ بتائے تھے، اور خود خالق کائنات نے اپنی دنیا کے بعض حقائق وعلل کی نشان دہی کردی جس کی روشنی میں چل کر آج دنیا فلسفۂ جدید اور سائنٹفک دور تک پہنچی ہے۔

سب سے پہلے جس مذہب نے فکر وفلسفہ کی بنیاد ڈالی اور لوگوں کو آسمان وزمین اور مخلوقات عالم میں غور کرنے کی دعوت دی وہ اسلام تھا۔ اسلام سے قبل کسی بڑے سے بڑے آشنا راز نے بھی ان حقائق کا پردہ چاک نہ کیا۔ جو خدا کے خزانۂ غیب میں مستور تھے اس لحاظ سے یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ فلسفہ اور سائنس کا اصل موجد وبانی اسلام اور پیغمبر اسلام ہیں اور فکر وفن کی سب سے پہلی کتاب قرآن پاک ہے .... مگر افسوس کہ خود ہم نے اس کی طرف توجہ نہ کی اور غیروں کے کاسہ گیر بن کر رہ گئے ؎

دیکھ آ کے کوچۂ چاک گریباں میں کبھی
قیس تو، لیلا بھی تو، صحرا بھی تو، محمل بھی تو
وائے نادانی کہ تو محتاج ساقی ہو گیا
مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو

زبان و قلم کی ضرورت قرآن نے عہد جدید کی تخلیق کے لیے زبان و قلم پر زور دیا اس لیے عالم الغیب والشہادہ خوب جانتا تھا کہ اب تک کا دور جس طرح گذرنا تھا گذر گیا لیکن آج کے بعد کا جو دور آنے والا ہے وہ علم و فن، عقل و فلسفہ اور سائنٹفک ایجادات کا دور ہوگا۔ اس کے لیے خود قرآن میں اس نئے دور کی بنیاد رکھ رہا تھا، اور علم و فن اور فلسفہ و سائنس کے لیے بنیادی طور پر زبان و قلم کی ضرورت پڑے گی۔ چنانچہ قرآن نے دونوں کی اہمیت اجاگر کی۔ .... سب سے پہلی وحی جو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، اس کے الفاظ یہ تھے :

"اقرأ باسم ربك الذی خلق خلق الانسان من علق، اقرأ وربك الاکرم ہ الذی علم بالقلم (علق)

ترجمہ : پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ پیدا کیا انسان کو بستہ خون سے پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے علم سکھایا قلم سے۔

پہلے ہی دن حضور کے ذہن میں لکھنے اور پڑھنے کی اہمیت بٹھا دی گئی ...... قلم کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ قرآن میں ایک پوری سورت کا نام بھی سورۂ قلم ہے اس سورت کی ابتدا ہی میں اللہ نے قلم اور لکھنے کی قسم کھائی ہے جو قرآنی اسلوب میں کسی شئے کے لیے بہت بڑا اعزاز ہے :

"نٓ والقلم وما یسطرون"۔
قلم کی قسم اور اس کی جو لوگ لکھتے ہیں۔

ایک طرف قرآن نے مسلمانوں کو زبان و قلم کی جانب متوجہ کر کے ان کو ذریعہ ابلاغ و ترسیل سے نوازا، تو دوسری جانب کائنات کے بعض ایسے اسرار کی جانب اشارے

کیے جن سے سائنس کو وجود ملتا ہے، قرآن کے آفاق وانفس میں غور کرنے کی تلقین کی۔
قرآن کا اگر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو اس میں بہت سی آیات علم وعمل کے داعی اور سائنسی
اشارات کی رہنما مل جائیں گی اور بقول ایک مسلم سائنسداں کے کہ قرآن کا ایک ربع فکر وفلسفہ
سے بھرا ہوا ہے۔ میں مثال کے طور پر چند آیات کا تذکرہ کرتا ہوں:

ظواہر طبعی قرآن نے بعض آیات میں ان اسباب طبعی کی کرشمہ سازیوں کا ذکر کیا ہے جو اکثر لوگوں کی نگاہوں کے سامنے رہتے ہیں مگر قوت فکریہ کی کمی کی بناء پر وہ ان پر غور نہیں کرتے اور نہ ان سے کوئی سبق حاصل کرنا چاہتے ہیں:

"انزل من السماء ماءً فسالت اودیة بقدرها فاحتمل
السیل زبدًا رابیا ومما یوقدون علیه فی النار ابتغاء حلیة
او متاع زبد مثله ط کذلک یضرب اللہ الحق والباطل فاما
الزبد فیذهب جفاءً واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض
کذلک یضرب اللہ الامثال۔ (رعد: ۱۷)

ترجمہ: آسمان سے پانی اس نے برسایا اور ہر ندی نالے اپنی اپنی گنجائش کے
مطابق بہہ نکلے اور پانی کے ریلے نے ابھرے ہوئے جھاگ کو اوپر اٹھالیا
اور آگ میں تپا کر زیور بناتے وقت یا کام کی دوسری کوئی دھات کو بھٹی میں
پگھلایا جاتا ہے۔ اس میں ایسا ہی جھاگ اٹھ کر اوپر آجاتا ہے۔ اسی طرح
اللہ مثال بیان فرماتا ہے۔ حق وباطل کی تو جو کوڑا کرکٹ ہوتا ہے وہ سوکھ کر
ضائع ہوجاتا ہے اور لوگوں کے نفع کی چیز زمین میں رہ جاتی ہے۔ اسی طرح
اللہ تعالے سبھی مثالیں بیان کرتا ہے۔

"اولم یر الذین کفروا ان السموات والارض کانتا رتقا
ففتقنا هما وجعلنا من الماء کل شئ حی افلا یومنون"

(انبیاء: ۳۰)

کیا انکار کرنے والوں نے نہیں دیکھا کہ آسمان وزمین دونوں بند تھے ہم نے

نے ان کو کھول دیا اور ہم نے پانی سے ہر جاندار چیز کو بنایا کیا پھر بھی وہ ایمان نہیں لاتے۔

اس آیت میں زمین و آسمان کی ابتدائی حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے جس کو موجودہ زمانے میں بگ بینگ نظریہ کہا جاتا ہے۔ جدید سائنسی تحقیقات کے مطابق زمین و آسمان کا تمام مادہ شروع میں ایک بہت بڑے گولے (سپر ایٹم) کی شکل میں تھا۔ معلوم طبیعاتی قوانین کے تحت اس وقت اس کے تمام اجزاء اپنے اندرونی مرکز کی طرف کھینچ رہے تھے، اور انتہائی شدت کے ساتھ باہم جڑے ہوئے تھے پھر نامعلوم اسباب کی بنا پر اس گولے کے اندر ایک دھماکہ ہوا اور اس کے تمام اجزاء بیرونی سمتوں میں پھیلنے لگے۔ اس طرح بالآخر وسیع کائنات وجود میں آئی جو آج ہمارے سامنے ہے۔

ہمارے سامنے یہ کائنات بنی بنائی صورت میں پھیلی ہوئی ہے مگر ہم غور نہیں کرتے کہ ابتدائی پوزیشن اس کی کیا تھی اور کن اسباب کے تحت یہ موجودہ شکل میں تبدیل ہو گئی۔

" وجعلنا فی الارض رواسی ان تمید بھم وجعلنا فیھا فجاجا سبلا لعلھم یھتدون ۔ وجعلنا السماء سقفا محفوظا وھم عن آیٰتھا معرضون؛ [انبیاء : ۳۱-۳۲]

اور ہم نے زمین میں پہاڑ بنائے کہ وہ ان کو لے کر جھک نہ جائے اور اس میں ہم نے کشادہ راستے بنائے تاکہ لوگ راہ پائیں اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنایا اور وہ اس کی نشانیوں سے اعراض کیے ہوئے ہیں۔

اس آیت میں زمین کی چند نشانیوں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں ایک پہاڑوں کے سلسلے میں جو سمندروں کے نیچے سے کثیف مادہ کو متوازن رکھنے کے لئے سطح زمین پر ابھر آئے ہیں، اس سے مراد غالباً وہی چیز ہے جس کو سائنس جدید میں ارضی توازن (ISOSTASY) کہا گیا ہے۔ اسی طرح زمین یا اس قابل ہونا بھی ایک بڑی نشانی ہے کہ اس پر انسان اپنے لیے راستے بنا سکتا ہے، کہیں ہموار زمین کی شکل میں تو کہیں

پہاڑی، دروں اور کہیں دریائی شگاف کی صورت میں۔
اسی طرح آسمان کا محفوظ چھت ہونا بھی بہت بڑی نشانی ہے کہ آسمان اور اس کے ساتھ پھیلی ہوئی پوری فضاء کی ترکیب اس طور پر ہے کہ وہ ہم کو سورج کی نقصان دہ شعاعوں سے بچاتی ہے اور شہاب ثاقب کی یورشوں سے محفوظ رکھتی ہے۔

"وسخر لکم الفلک لتجری فی البحر بامره وسخر لکم الانهار وسخر لکم الشمس والقمر دائبین وسخر لکم اللیل و النهار وآتٰکم من کل ما سألتموه وان تعدوا نعمة الله لا تحصوها ان الانسان لظلوم کفار۔ (ابراهیم ۳۲ - ۳۴)

اور سمندر میں کشتیاں تمہارے تابع کردیں جو اس کے حکم سے چلتی ہیں اور بہتی ہوئی ندیاں اور نہروں کو تمہارے لیے کام میں لگا دیا اور سورج اور چاند کو تمہاری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے لگا دیا جو ایک دستور پر مسلسل چلتے رہتے ہیں اور رات اور دن کو بھی تمہارے کام میں لگا دیا اور تمہاری ضرورتوں کے ہر ہر سوال کو اس نے پورا کر دیا اور اللہ کی نعمتوں کو اگر گننا چاہو تو گنتی کا شمار پورا نہ کرسکو گے، بے شک انسان بڑا بے انصاف اور ناشکرا ہے۔

اس آیت میں قرآن نے تسخیر کائنات کے انواع ومقاصد پر روشنی ڈالی ہے، او انسان کو خدا کے ان بے شمار احسانات میں غور وفکر کرنے کی دعوت دی ہے۔ مگ انسان اپنی طبعی جہالت اور ظلمت کی بناء پر عموماً اس جانب توجہ نہیں کرتا۔
سب سے پہلے یہ راز قرآن ہی نے واضح کیا کہ پوری کائنات انسان کے لیے دراصل خادم کی حیثیت رکھتی ہے ان کو ان کی ضرورت بالیقین پڑتی ہے مگر ایک فقیر اور بھکاری کی پوزیشن میں نہیں بلکہ اس بادشاہ کی طرح جس کو اعیان و وزراء اور افواج وخدام ضرورت ہو .... ورنہ قرآن سے پہلے انسان اتنے پست ترین احساس میں مبتلا تھا کہ کائنات کی ہر طاقتور اور باکمال چیز کی پرستش کرنے کو تیار رہتا

سورج کے جلال کو دیکھا تو اس کے آگے سجدہ میں جھک گیا۔ چاند کا جلوۂ جمال دیکھا تو اس کے قدموں پر گر گیا۔ آگ کی شعلہ فشانیاں دیکھیں تو اس کی پوجا کرنے بیٹھ گیا، شیاطین کی طاقت و قوت کے افسانے سنے تو غائبانہ طور پر ان کا بندہ و غلام بن گیا۔ کسی بڑے درخت کے پتوں کے ٹکراؤ نے اس کو خوف زدہ کیا تو اسی کو معبود بنالیا۔ اس طرح نہ معلوم کتنی چیزیں تھیں جن کی پرستش توہماتی کمال کی بنا پر شروع کر دی گئی۔۔۔۔۔۔ مگر قرآن نے آکر انسانیت کو واضح انداز میں یہ تخیل دیا کہ تم کسی کے خادم اور غلام نہیں بلکہ کائنات تمہاری غلام ہے، تم اپنے مقام کو پہچانو، تم تو وہ ہو جس کو فرشتوں نے سجدہ کیا، پھر کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ فرشتوں کا مسجود دنیا کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے سامنے سجدہ ریز ہو؟ تم صرف ایک اللہ کے سجدہ کے لیے پیدا کیے گئے ہو، تمہارا مرتبہ اس سے کہیں بلند ہے کہ تم غیر اللہ کی پرستش کرو، کائنات تمہارے لیے مسخر کر دی گئی ہے، اس تسخیر کو تم اور بھی مضبوط کرو۔ ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

وارسلنا الریاح لواقح فانزلنا من السماء ماءً فاسقینٰکموہ وما انتم لہ بخازنین (حجر، ۲۲)

بوجھل اور اس بھری ہوا کے جھونکے بھیج کر ہم نے آسمان سے پانی برسایا پھر تم کو خوب سیراب کیا (اور تمہاری پیاس بجھانے کا پورا انتظام کر دیا) جب کہ تم اپنی ضرورت کے مطابق پانی کا خزانہ جمع نہ رکھ سکتے تھے۔

اس آیت کی کسی دقیق علمی تفسیر سے گریز کرتے ہوئے اگر ظاہری معنی کے لحاظ ہی سے دیکھا جائے تو ظواہر طبعی کے چند مبہمات پر روشنی پڑتی ہے۔ آیت میں تو بظاہر ہوا کا فائدہ بیان کیا گیا ہے کہ ہواؤں کے چلنے سے ابر باراں کا نزول ہوتا ہے مگر قدرتی طور پر یہاں ہوا اور ابر باراں کے تعلق پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ ہوا چلنے سے بادلوں کا سفر شروع ہوتا ہے، اس سفر کے دوران بادلوں کے درمیان تصادم۔ (بقیہ ص ۲۲ پر)

آقائے نامدار، سرورِ کائنات احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کس جاہلی ماحول میں ہوئی، انسانیت کس پستی اور تنزلی کے غار میں گری ہوئی تھی، مذہبی بیزاری اور ناخدا شناسی کس حد کو پہنچ چکی تھی، پورا انسانی گلہ کس طرح صراطِ مستقیم سے بھٹکا ہوا، اور اوہام وخرافات، ظلمت وضلالت اور کفر وجہالت نیز شرک ولادینیت کی دل دل میں پھنسا ہوا تھا یہودیت ونصرانیت اور دوسرے مذاہب دنیوی اپنی اصلی صورت وسیر مسخ کر چکے تھے ...... قیمتی زندگی کا ہر شعبہ مثلاً ایمان ویقین، عدل گستری وخود اعتمادی، صداقت وروحانیت معیشت ومعاشرت، تعلق ومحبت، حکومت وقیادت غرض ہر صفت بے جان وبے روح تھی، پھر اسلام نے اس انسانیت کی دوبارہ تعمیر کی اور اس انسانی روح کو مرض وفساد، ناپاکی اور گندگی اور تباہ کر دینے والے تہذیب وتمدن سے نکالا، اور انسانی معاشرہ کو یقین ومعرفت، وثوق واعتماد، طہارت ونظافت جیسی بلند قدریں بخشیں، اور زندگی کے ہر دور کی صحیح نشوونمائی کی۔ اور لادینیت سے نکال کر مذہبیت وخداشناسی پیدا کی کس طرح؟ آئندہ سطور میں اسی سوال کا جواب اور اسی اجمال کی کچھ تفصیل ہے

مذہب بیزاری اور لادینیت

اس وقت کے تمام مذاہب سماوی اندر سے کھوکھلے ہو چکے تھے۔ دینی غفلت خدا فراموشی اور بے راہ روی اپنی حد کو پہنچ چکی تھی، دوسرے مذاہب وادیان بھی خرافات

سے پُر تھے اور اپنی اصلی صورت وحقیقت مسخ کر چکے تھے۔ مسیحیت یونانی خرافات، رومی بت پرستی، مصری افلاطونیت اور رہبانیت نیز تحریفات وتاویلات کا ایک معجون مرکب تھی حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمات کا عنصر سمندر میں قطرہ کی طرح گم ہوگیا تھا اور نصرانیت چند بے جان وبے روح مراسم کا نام رہ گیا تھا، اور ایک عرصہ کے بعد بت پرستی کے سانچہ میں ڈھل گئی تھی۔

بزبان انگریزی مترجم قرآن کریم سیل چھٹی صدی عیسوی کے عیسائیوں کے بارے میں لکھتا ہے:

"مسیحیوں نے بزرگوں اور حضرت مسیحؑ کے مجسموں کی پرستش میں اس درجہ غلو کیا کہ اس زمانہ کے رومن کیتھولک بھی اس حد تک نہیں پہنچے"۔

(سیلس ٹرانسلیشن ص۶۲ بحوالہ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر ص۳۵)

رومی سلطنت کے اندر مسیحی مذہب کے بارے میں آپسی اختلافات کی سخت شورش برپا ہوگئی تھی، روم وشام کے عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کی فطرت ایک الٰہی اور ایک بشری جزو سے مرکب ہے جب کہ مصری عیسائیوں کا اس پر اصرار تھا کہ آپ کی فطرت الٰہی ہے اور بشریت سمندر میں سرکہ کے قطرہ کے مانند فنا ہوگئی ہے......... پہلے مذہب نے سرکاری حیثیت اختیار کرلی تھی اور وہ اپنے مخالفین کو دل دہلا دینے والی سزا دیتے تھے، تاریخ ان پر ڈھائے جانے والے لرزہ خیز مظالم اور وحشیانہ سزاؤں کی داستان سے لبریز ہے۔

یہودیت اور یہودیت میں اگرچہ کچھ معمولی جان تھی اور ان میں دینی تعبیرات سمجھنے کی کچھ استعداد تھی۔ مگر تقدیر ازلی میں ان کے لیے مصائب وحوادث ظلم واستبداد، سزا وجلاوطنی کا ہدف بنا رہنا لکھا جا چکا تھا۔ ـــــــ غرور وتکبر، مال ودولت اور زندگی کی حد سے بڑھی ہوئی حرص وطمع، مسلسل سودی کاروبار، مغلوبیت کی حالت میں ذلت وخوشامد، غلبہ کی حالت میں بے انتہا، بے رحمی وسنگ دلی اور عام احوال میں دغابازی وخودغرضی، نفاق وبدمعاملگی اور مفت وحرام خوری اور راہ حق سے لوگوں کو روکنا وغیرہ

برائیاں انکا کردار اور طبیعت ثانیہ بن چکی تھیں ۔ قرآن کریم نے مختلف آیات میں ان کی اس انسانی پستی اور اخلاقی تنزلی کو بہت وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے ۔ ارشاد باری ہے :

۱ ۔ وجاعل الذین اتبعوک فوق الذین کفروا یوم القیٰمۃ (آل عمران آیت ۵۵)

اور جو لوگ تمہارا کہنا ماننے والے ہیں ان کو غالب رکھنے والا ہوں، ان لوگوں پر جو کہ (تمہارے) منکر ہیں قیامت تک (گو اس وقت یہ منکرین غلبہ اور قدرت رکھتے ہیں)

(بیان القرآن)

یہاں اتباع سے مراد خاص اتباع ہے یعنی اعتقاد نبوت . سو اس میں نصاریٰ اور اہل اسلام دونوں داخل ہیں اور منکرین سے مراد یہود ہیں جو منکر نبوت عیسویہ تھے حاصل یہ ہوا کہ امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور نصاریٰ ہمیشہ یہود پر حاکم وغالب رہیں گے ۔ چنانچہ یہ وعدہ جلدی پورا ہوا، یہود ذلیل وخوار ہوئے، ان کی حکومت وسلطنت تباہ وبرباد ہوئی ۔ پھر آج تک ہر جگہ وہ لوگ یا تو اہل اسلام کی رعایا ہیں، یا نصاریٰ کی، اور قرب قیامت تک ایسا ہی رہے گا ۔ صرف چالیس دن کے لیے دجّال کا ایک گونہ شر وفساد پھیلے گا، لیکن اول تو وہ فوراً مٹ جائے گا ۔ دوسرے وہ کوئی باضابطہ امن وامان سے حکومت نہ ہوگی بلکہ ایک عارضی شورش ہوگی جس کو سلطنت نہیں کہہ سکتے ۔ (بیان القرآن، سورہ آل عمران، مختصراً)

دوسری جگہ ارشاد ہے :

۲ ۔ وضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ وباء و بغضب من اللہ ذلک بانھم کانوا یکفرون بایات اللہ ویقتلون النبیین بغیر الحق ذلک بما عصوا وکانوا

اور جم گئی ان پر ذلت (کہ دوسروں کی نگاہ میں قدر نہ رہی) اور پستی (کہ خود ان کی طبیعتوں میں اولوالعزمی نہ رہی) اور مستحق ہوگئے غضب الٰہی کے (اور) یہ (ذلت وغضب) اس وجہ سے (ہوا) کہ وہ لوگ منکر ہو جاتے تھے احکام الٰہیہ کے، اور

یعتدون ۔ قتل کردیا کرتے تھے پیغمبروں کو (کہ وہ خود
(البقرہ ۲۱) ان کے نزدیک بھی) ناحق (ہوتا تھا) اور
(نیز) یہ (ذلت وغضب) اس وجہ سے (ہوا) کہ ان لوگوں نے اطاعت نہ کی
اور دائرہ (اطاعت سے نکل نکل جاتے تھے ۔ (تفسیر بیان القرآن)

ان آیات میں دور تک قرآن کریم نے ان کی بدعنوانیاں ذکر کی ہیں ۔ مثلاً بدعہدی یوم ہفتہ کے متعلق، تجاوز عن الحد، پتھر سے بھی زیادہ سنگ دلی و قساوت قلبی، عقل اور علم رکھنے کے باوجود جان بوجھ کر تحریف کلام اللہ اور پھیر پھار ۔ صرف اس غرض کے لیے تاکہ دو چار پیسے ہاتھ آجائیں، باہم خونریزی کرنا اور کسی کو آزار و تکلیف پہونچا کر ترک وطن پر مجبور کرنا، غرور و تکبر، زندگی پر تمام لوگوں سے یہاں تک کہ مشرکین سے بھی زیادہ حریص اتباع سحر و جادو، ضد و حسد، مسجدوں سے روکنا اور ویرانی و بربادی میں سعی و کوشش کرنا، یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ پر اتخاذ ولد کا زبردست بہتان و افتراء وغیرہ وغیرہ۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے :

۳ فبظلم من الذین ھادوا حرمنا علیھم طیبات احلت لھم وبصدھم عن سبیل اللہ کثیرا واخذھم الربوا وقد نھوا عنہ واکلھم اموال الناس بالباطل ۔ الآیۃ۔ (النساء، آیت ۱۶۰ - ۱۶۱)

سو یہود کے ان ہی بڑے بڑے جرائم کے سبب (جن میں سے بہت سے امور سورۂ بقرہ میں مذکور ہو چکے) ہم نے بہت سی پاکیزہ (یعنی حلال و نافع و لذیذ) چیزیں جو (پہلے سے) ان کے لیے بھی حلال تھیں ۔ ان پر (شریعت موسویہ میں) حرام کردیں ۔ اور بسبب اس کے کہ (وہ آئندہ بھی ایسی حرکتوں سے باز نہ آئے مثلاً یہی کہ) وہ (احکام میں تحریف و کتمان کرکے) بہت آدمیوں کو اللہ تعالےٰ کی راہ (یعنی دین حق کے قبول کرنے) سے مانع بن جاتے تھے اور بسبب اس کے کہ وہ سود لیا کرتے تھے حالانکہ ان کو (توریت

ہیں) اس سے ممانعت کی گئی تھی اور بہ سبب اس کے کہ وہ لوگوں کے مال ناحق
طریقہ (یعنی غیر مشروع ذریعہ) سے کھاتے تھے۔ الخ (بیان القرآن)
اسی مضمون کی ایک آیت سورۂ توبہ آیت ۳۴ بھی ہے۔۔۔ غرض یہ نمونہ کے طور پر
چند آیتیں ہیں۔ قرآن کریم نے ان کے اخلاقی انحطاط کا تفصیلی نقشہ کھینچا ہے، احادیث میں
بھی بہ کثرت ان کی شناعتیں اور بدکرداریاں وارد ہوئی ہیں۔ مثلاً ان کا توریت میں نازل شدہ
حکم رجم کو چھپانا (بخاری شریف ص ۶۵۴ ج ۲) وغیرہ وغیرہ۔

غرض کہ یہ دونوں مذاہب (یہودیت ونصرانیت) تو بالکل بے روح مراسم کا نام تھا۔

آتش پرستی

اہل ایران آگ کی پوجا و پرستش اور اس کو عظمت و تقدس کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مجوسیوں کا یہ مذہب بھی (آتش پرستی) چند
چند من گھڑت مراسم وروایات کا نام تھا، جن کو وہ اوقات مخصوصہ اور مقامات خاصہ میں ادا
کرلیا کرتے تھے، معرفت و حقیقت اور دین وعبادت سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا
ظاہر ہے کہ آگ اپنے عابدوں اور پجاریوں کو نہ ہدایت دے سکتی ہے اور نہ ان کے
مسائل زندگی کو حل کر سکتی ہے، نیز نہ مجرموں کے جرم میں، نہ گنہگاروں کے گناہ میں اور
نہ مفسدوں کے فساد میں دخل دے سکتی ہے۔ اس کی کوئی روح اور طاقت نہیں تھی جس
کا لازمی نتیجہ تھا، کہ وہ اپنی عبادت گاہوں کے باہر گھروں اور بازاروں، نیز سیاسی واجتماعی
امور اور اخلاقی معاشی مسائل میں بالکل آزاد منش تھے، ان کا من، خیالات، مصلحت
اور وقت کا تقاضا جس طرح چاہتا ان کو موڑ دیتا۔ جیسا کہ عام طور پر مشرکوں کا یہی حال
ہوتا ہے۔

بودھ مت

ایسے ہی بودھ مت زمانہ دراز سے اپنی حقیقت و صورت کھو چکا تھا گوتم کی سادہ اور اخلاقی تعلیم نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ مریضانہ
تخیلات اور مکائد و تخلیقات نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ اس مذہب نے برہمنیت
کو اپنے میں ضم کرکے اور اس کے اوتاروں اور دیوتاؤں کو اختیار کرکے اپنی ہستی
کو گم کر دیا تھا۔ اور عرصہ سے یہ دونوں مذاہب حریف و متحارب چلے آتے ہوئے اب باہم

شیر وشکر کی طرح گھل مل گئے تھے۔ جس کے نتیجہ میں بودھ مت بت پرستی کا ایک مذہب بن گیا تھا، بلکہ فی الواقع بت پرست اور کثیر الآلہہ مذاہب کا سرتاج بن گیا تھا، جن ممالک میں پہنچتے بت ان کے ساتھ رہتے، اور گوتم کے مجسمے اور شبیہیں نصب کرتے اور فخر کے ساتھ پوجا پاٹ کرتے۔ بہرحال ہندوستان میں ایک ہزار سال تک باقاعدہ رائج رہنے کے بعد بودھ مت پر تنزلی آگئی ــــــــ پنڈت جواہر لال نہرو نے بدھ مت کی تنزلی اور تدریجی زوال کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے۔ وہاں دیکھ لی جائے۔

(تلاش ہند ص۲۰۱ بحوالہ "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر ص۴۲")

ایسے ہی چھٹی صدی عیسوی میں بت پرستی اپنے زوال پر تھی۔ دیوتاؤں کی تعداد کی ہندوستان بھر میں کوئی حد نہ تھی۔ زندگی کی کوئی بھی ضرورت پوری کرنے والی چیز دیوتا تھی، اس طرح بتوں، مجسموں اور دیوی، دیوتاؤں کا کوئی شمار نہ تھا، اور ان قابل پرستش اشیاء میں دنیا کی ہر چیز تھی۔ حتیٰ کہ آلات تناسل بھی شامل تھے۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دنیا کی اقوام میں ہندو قوم کے لیے عبادت اور پرستش میں ظاہر صورت کا ہونا ضروری ہے۔ اسی وجہ سے بعض مصلحین کی ہندو مذہب میں توحید کے اثبات کی کوشش بے فائدہ اور رائیگاں گئی ــــــــ سب سے بڑے دیوتا شیو کے عضو تناسل کی پوجا اور پرستش اور اس کے ساتھ اہل ہند کے شغف کو ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر گستاولی بان لکھتا ہے :

"ہندوں کو مورتوں اور ظاہری علامات سے بے انتہا انس ہے، ان کا کوئی مذہب کیوں نہ ہو اس کے اعمال کو یہ نہایت اہتمام سے بجالاتے ہیں، ان کے مندر پرستش کی چیزوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ جن میں سب سے مقدم لنگم اور یونی ہیں۔ جن سے مراد مادۂ خلقت کے دونوں جزو ہیں۔ اشوک کے ستونوں کو بھی عام ہندو لنگم خیال کرتے ہیں، اور اسطوانہ اور مخروطی شکلیں ان کے نزدیک واجب التعظیم ہیں"۔

(تمدن ہند ص۴۴۱ بحوالہ "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر ص۵۱")

یہاں تک کہ ایک فرقہ تو مرد برہنہ عورتوں کی اور عورتیں برہنہ مردوں کی پرستش اور پوجا پاٹ کرتے تھے۔

(ستیارتھ پرکاش" (دیانند سرسوتی) ص۳۴۳ بحوالہ بالا ص۵)

اس کے متوازی چند اقل قلیل افراد نفس کشی اور ریاضت ومجاہدہ میں مصروف تھے مگر اول تو معدودے چند افراد تھے۔ دوسرے حد درجہ غلو اور انتہا پسندی سے کام لیا جاتا تھا۔ اور ملک کو اعتدال وتوازن اور میانہ روی سے محرومی تھی۔

بت پرستی

رہے اہل عرب تو وہ بھی دینی اخلاقی تنزلی وانحطاط کے بالکل آخری نقطہ پر تھے، انبیاء اور ان کی تعلیمات سے یکسر بُعد تھا، محاسن سے محروم اور بدترین معائب میں مبتلا تھے اور بت پرستی میں تو وہ دنیا کے امام تھے۔ خدا تعالیٰ اور اس کی وحدانیت وربوبیت سے بے تعلقی اور صریح شرک کا دور دورہ تھا۔ ہر قبیلہ، ہر شہر اور ہر علاقہ بلکہ ہر گھر کا ایک جدا بت تھا۔۔۔۔۔۔۔۔سفر پر روانگی کے وقت سب سے آخری فعل اور سفر سے واپسی پر سب سے پہلا کام تبرکاً اور حصول برکت کے لیے بت کو ہاتھ لگانا ہوتا تھا۔ (سیرابن ہشام مترجم اردو ص۱۱۳ ج اول)

خانہ کعبہ کہ جس کو صرف اللہ کی عبادت کے لیے بنایا گیا تھا اس کے اندر اور اردگرد تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

(بخاری شریف ص۶۱۴ ج۲)

اور صرف یہی نہیں بلکہ پتھر کی قسم کی جو چیز بھی ملتی اسی کی پوجا پاٹ کرنے لگتے تھے حضرت عمران بن ملمان ابورجاء العطاردی رحمۃ اللہ علیہ (مخضرمین میں سے ہیں) سے روایت ہے کہ:

"ہم لوگ پتھر کو پوجتے تھے اور اگر کوئی اس سے اچھا اور بہتر پتھر ملتا تو اس کو پھینک کر اس نئے پتھر کو اٹھا لیتے تھے اور اگر پتھر نہ پاتے تھے تو مٹی کا ایک ڈھیر بنا کر اس پر بکری کو لاکر دوہتے پھر اسی کا طواف کرتے تھے۔"

(بخاری شریف، کتاب المغازی ص۶۲۸ ج۲)

غرض مشرکین عرب کا حال بھی ہر زمانہ اور ہر ملک کے مشرکین کے حال سے کچھ مختلف

نہ تھا اور ان کے معبود صرف پتھر ہی نہیں بلکہ فرشتے، جن اور ستارے بھی ان کے معبود تھے فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں اور جنوں کو اس کا شریک کار تصور کرکے ان سے وسیلہ پکڑتے اور شفاعت کے طالب ہوتے اور ان کی پرستش کرتے

علامہ صاعد اندلسی کا بیان ہے کہ قبیلہ حمیر، آفتاب کی پرستش کرتا تھا اور قبیلہ کنانہ چاند کی۔ اور بنو تمیم دبران کی۔ لخم و جذام، مشتری کی۔ قبیلہ طے سہیل کی، بنو قیس شعریٰ کی، اور بنو اسد عطارد کی، پوجا و پرستش کرتا تھا۔

(طبقات الامم ص۴۳ بحوالہ "مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" ص۵)

غرض کہ پوری دنیا ایسے مکمل اور جامع دین سے یکسر محروم تھی، جو ان کے باطن کی اصلاح اور اخلاق کو سنوارتا۔ تنزلی و پستی اور انحطاط کے ذلت آمیز غار سے نکال کر ان کو رفعت و بلندی عطا کرتا۔ اور ان کو نفسانی اور شہوانی جذبات و خواہشات کو دبانے کی صلاحیتیں اور نیک خواہشات کو ابھارنے کی قابلیتیں بخشتا۔ اور مجرموں و ظالموں کا ہاتھ پکڑ سکتا، مفسدوں کے فساد اور فتنہ پردازوں کے فتنہ کو روکتا۔ ان کے معاشی، معاشرتی سماجی اور نظام زندگی کے مسائل حل کرتا۔ ان کو حقارت و ذلت سے نکال کر فضیلت و برتری عنایت کرتا، اور ان کو ہادی و مہدی کی خاص صفتیں عطا کرتا۔

قرآن کریم نے اس تاریکی و فساد اور دنیا بھر میں گھٹا ٹوپ اندھیری کا بہت جامع اور عمدہ نقشہ کھینچا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

ظهر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس لیذیقهم بعض الذی عملوا لعلهم یرجعون۔

(الروم آیت ۴۱)

لوگوں کے اعمال (مثلاً بت پرستی، مشرکیہ افعال و اعمال وغیرہ) کے سبب بلائیں پھیل رہی ہیں (مثلاً قحط، وبا، اور جہاز و کشتیوں کے ڈوبنے کا وبال وغیرہ) تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے بعض اعمال کا مزہ ان کو چکھا دے تاکہ وہ باز آجائیں۔

(قرآن مترجم اردو ترجمہ)

(جاری)

مولانا اعجاز صاحب

نقد بر حقیقتِ رجم

کسی جگہ ایک لطیفہ پڑھا تھا۔ ایک عورت کو نمائش کا بڑا شوق تھا، اس نے عمدہ قسم کی چوڑیاں پہنیں، اور پھر ہاتھ مٹکا مٹکا کر اپنی سہیلیوں اور ہمجولیوں کو ان کی طرف متوجہ کرتی تھی۔ کہ شاید کسی سے داد ملے، مگر کسی نے توجہ نہ دی، اس عورت کو بہت طیش آیا، غصہ میں اس نے اپنے ہی مکان میں آگ لگا لی، لوگ دوڑے، کسی طرح آگ بجھائی گئی، گھر کا کافی نقصان ہوا، اب پاس پڑوس کی عورتیں تعزیت میں آنے لگیں، اور عادت کے مطابق آپس میں باتیں کرنے لگیں، گفتگو کے دوران کسی نے کہا کہ بہن جی! آپ کے ہاتھوں میں چوڑیاں بڑی خوبصورت ہیں، کہاں سے آپ نے لی ہیں، وہ سنتے ہی جھلا گئی، اور بولی اگر یہی بات پہلے تم نے کہہ دی ہوتی تو میرے گھر میں آگ کیوں لگتی؟

یہ قصہ ہمیں اس وقت یاد آیا جب ایک کتاب "حقیقت رجم" نامی پڑھنے کا موقع ملا بیچارہ مصنف چاہتا ہے کہ اس کی شہرت ہو اور نہیں ہوئی، تو اس نے اپنے گھر کے ایک اجماعی مسئلے میں آگ لگانے کی ٹھان لی، شاید اسی بہانے شہرت ہو۔ بہت مشہور مسئلہ ہے کہ زمانہ رسالت سے عہد حاضر تک اس میں کوئی قابل ذکر اختلاف نہیں ہوا ہے کہ زانی محصن" یعنی چند خاص شرائط کے ساتھ شادی شدہ زانی خواہ مرد ہو یا عورت، اس کی سزا شریعت میں "رجم" ہے یعنی پتھروں سے مار کر اس کو ہلاک کر دینا ہے۔ اس مسئلہ میں ابتدائی دور میں خوارج نے اختلاف کیا تھا، اور کچھ معتزلہ نے، مگر امت نے اس اختلاف کو رد کر دیا تھا، تفصیلات کے لیے المغنی لابن قدامہ حنبلی ص۔۔۔ کا مطالعہ کیجئے۔ ہم کو اس مسئلہ کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ یہ مسئلہ قطعاً اجماعی ہے۔ ہم صرف مصنف کتاب کی

علمی دیانت اور ان کی عقل و ذہانت اور ان کے معروضی مطالعہ کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ یہ کتاب اہلِ علم حضرات کے لیے ایک تماشا گاہ عبرت ہے کہ کوئی شخص جب دین کے کسی اجماعی مسئلے سے انحراف کرتا ہے تو کیسی کیسی ہمالیائی غلطیوں میں مبتلا ہو کر بھی مگن رہتا ہے کہ میں نے تحقیق و تدقیق کی وادی سر کر لی ہے۔ مصنف نے اس سلسلے میں اپنا نظریہ اجمالاً بالکل ابتداء میں عربی زبان میں دو صفحات میں تحریر کیا ہے۔ ہم اپنی گفتگو کا آغاز وہیں سے کرتے ہیں۔ ساری کتاب ہی علمی و عقلی اعجوبہ کاریوں کی جلوہ گاہ ہے، سب سے تعرض کرنا تو مشکل ہے۔ بس خاص خاص جلوہ گاہوں کی ہم سیر ناظرین کو کرائیں گے، اسی سے اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارا مصنف کن کن ابوالعجبیوں کا مرقع ہے۔ سب سے پہلی عبارت .... جو فہرست سے بھی پہلے ہے، پیش لفظ سے بھی پہلے ہے......... مصنف نے یہ لکھی ہے اور اسے نمایاں اور جلی قلم سے رقم کیا ہے:

"الرجم حقيقة ظاهرة ثابتة، حقيقة جاء بها الكتاب وجاءت بها السنة واجمعت عليها الامة"

"رجم ایک کھلی ہوئی اور ثابت شدہ حقیقت ہے، ایسی حقیقت جو کتاب اللہ سے بھی ثابت ہے، سنت رسول سے بھی ثابت ہے اور امت کا اس پر اجماع ہے"

اس عبارت کے پڑھنے کے بعد جب ہم نے کتاب کا مطالعہ کیا تو ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی، کیوں کہ مصنف نے از ابتداء تا انتہا اس پر آخری حد تک زور لگایا ہے کہ رجم کا ثبوت کتاب اللہ سے نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے ایک جگہ بڑی صراحت سے لکھا ہے کہ،

"اس سے صاف ظاہر ہے کہ رجم کا حکم قرآن پاک میں موجود نہیں ہے وہ سر تا سر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ماخوذ ہے" ص ۱۴۸۔

ایک طرف تو یہ صراحت ہے، اور دوسری طرف یہ دعوی ہے کہ رجم ایک حقیقت ظاہرہ ثابتہ ہے جو کتاب اللہ سے ثابت ہے۔ (جناب شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی)۔

بہرکیف مصنف نے رجم نے شریعت میں ہونے سے صاف انکار نہیں کیا ہے تاہم ان کا

نظریہ اجماع امت کے قطعاً خلاف ہے، انہیں کے الفاظ میں ان کا نظریہ ملاحظہ ہو :

"الا ان الذی یجب ان ندرکہ .... وھو الذی یستفاد من الکتاب والسنۃ .... ان الرجم لا ینفذ علیٰ کل متزوج اذا تورط فی الزنا المجرد انہ تورط فی الزنا وھو صاحب زوج وانما ینفذ علیٰ من تعودہ وتربی علیہ واستسری فیہ ھذا الداء وتفاقم بحیث لا یجدی معہ علاج ولا یرجی لہ شفاء فھذا الذی یحکم علیہ بالرجم سواء کان بکرا او ثیبا، متزوجا او غیر متزوج فان آخر الدواء الکی وآخر الحیل السیف" ص۳ ۔

یعنی رجم کی سزا محض زنا میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے شادی شدہ شخص پر نافذ نہیں ہوتی، اس کا نفاذ صرف اس شخص پر ہے جو زنا کا عادی مجرم ہو، اور یہ مرض اس میں اس درجہ جڑ پکڑ چکا ہو کہ اس کے لیے کوئی علاج کارگر نہ باقی رہا ہو اور اس کے شفایاب ہونے کی توقع ہو، پس صرف اسی شخص پر رجم لاگو ہوگا۔ خواہ وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ کنواری ہو یا ثیبہ !

پھر مصنف نے اس کی مثال میں حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کو پیش کیا ہے کہ وہ زنا کے عادی مجرم تھے، (نعوذ باللہ) اور ان میں یہ بیماری اس طرح سرایت کر چکی تھی کہ اب امید شفا باقی نہ رہی تھی، اس لیے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے انھیں رجم کرا دیا تھا۔

پھر لکھتے ہیں کہ جو شخص فی نفسہٖ صالح ہو، اور اتفاق سے زنا کے گناہ میں مبتلا ہو گیا پھر وہ امام و حاکم کی گرفت میں آنے سے پہلے، اور قانون جنایت کے اس پر نافذ ہونے سے پہلے توبہ کر لیتا ہے تو ایسے شخص پر نہ رجم کی سزا لاحق ہوگی اور نہ سو کوڑوں کی، خواہ وہ شادی شدہ ہو، یا غیر شادی شدہ۔ فرماتے ہیں کہ یہ مسئلہ حق تعالےٰ کے اس ارشاد سے مستفاد ہوتا ہے :

"الا الذین تابوا من قبل ان تقدروا علیھم فاعلموا ان اللہ غفور رحیم" (المائدہ ۳۴)

"مگر وہ لوگ جنھوں نے توبہ کرلی، قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ، تو سمجھ لو کہ اللہ تعالےٰ مغفرت کرنے والے رحم کرنے والے ہیں"۔

پھر فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہی عمل بہت سے ایسے لوگوں کے ساتھ رہا ہے جو زنا میں مبتلا ہوئے، پھر انہوں نے توبہ کرلی، ہاں جس شخص کا یہ گناہ مشہور ہوگیا ہو، اور توبہ کرنے سے پہلے قاضی تک اس کا مقدمہ پہنچ گیا ہو، اس پر البتہ کوڑوں کی سزا نافذ ہوگی۔ (یہ ان کے اجمالی نظریہ کی تلخیص ہے)۔

اس نظریہ پر چند مواخذات ہیں۔

۱۔ آپ نے فرمایا کہ رجم کی سزا محض زنا کی وجہ سے نہیں نافذ ہوتی، اس پر گذارش ہے کہ اس حکم میں رجم کی تخصیص کیوں فرمائی، آپ نے تو کوڑوں کی سزا کو بھی محض زنا پر موقوف نہیں رکھا بلکہ اس کے مشہور ہونے اور توبہ کرنے سے پہلے قاضی تک مقدمہ پہنچنے کی قید لگائی ہے، گویا مطلق نہ یہ ہے، نہ وہ۔ پھر ایک کی تخصیص کی وجہ کیا ہے؟

۲۔ آپ فرماتے ہیں کہ زنا کے عادی مجرم کو کسی طرح اس کے چھوڑنے پر آمادہ نہ ہو، رجم کی سزا دی جائے گی۔ یہ بات خود آپ کے نظریہ کے خلاف ہے کیوں کہ آپ نے آگے چل کر الزانیۃ والزانی کو عام قرار دیا ہے اور یہ عام لفظ عادی اور غیر عادی دونوں کو شامل ہے، اس لیے خواہ زانی عادی ہو یا غیر عادی، آپ کے قول کے مطابق اسے کوڑوں ہی کی سزا ملنی چاہئے۔ جیسے کہ آپ نے شادی شدہ اور غیر شادی شدہ دونوں کے لیے یہ حکم عام رکھا ہے۔ پھر اس میں سے عادی زانی کی تخصیص کی وجہ کیا ہے؟ آخر قرآن میں عادی مجرم کا کوئی اشارہ تو نہیں ملتا اور نہ اس پر رجم کا کوئی اشارہ ملتا، پھر آپ پر بھی وہی الزام آئے پ نے فقہاء پر رکھا ہے کہ "قرآن کے حکم کو غیر محصن کے ساتھ خاص کردینا قرآن کے خلاف ہوگا" ٹھیک اسی طرح ہم بھی گذارش کریں گے کہ قرآن کے حکم کو غیر عادی کے ساتھ خاص کرنا یقیناً قرآن کے خلاف ہوگا۔

۳: حضرت ماعزؓ کے متعلق یہ الزام لگانا کہ وہ زنا کے عادی مجرم تھے اور اس سے کسی طرح باز نہیں آتے تھے۔ اب اس مرض سے ان کے صحت یاب ہونے کی کوئی امید نہ تھی، ایک ایمان سوز اور نفاق افروز تہمت ہے، اس کے خلاف صحیح احادیث اور عقل سلیم اور سب سے بڑھ کر قرآن کی آیات گواہ ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جس ارشاد سے اس تہمت پر استدلال کیا گیا ہے، وہ توجیہ القول بما لا یرضیٰ بہ القائل کی قبیل سے ہے اس پر مکمل بحث آئندہ آرہی ہے

۴: مصنف کا کہنا ہے کہ جو شخص فی نفسہ صالح ہو اور اتفاق سے زنا کے گناہ میں مبتلا ہوگیا ہو، پھر قبل اس کے کہ امام کی گرفت میں آئے اور قبل اس کے کہ اس پر قانون نافذ ہو، وہ توبہ کرلیتا ہے، ایسے شخص پر نہ رجم عائد ہوگا نہ جلد! یہ بات بے دلیل بلکہ خلاف دلیل ہے۔ قرآن وحدیث میں کہیں اس کا ذکر نہیں ملتا۔

۵: اور اس کے لیے جس آیت کا حوالہ دیا ہے وہ اللہ اور رسول کے ساتھ محاربہ اور ملک میں فساد برپا کرنے کے باب میں وارد ہے، اس کے علاوہ دوسرے حدود سے اس کا تعلق نہیں ہے۔

۶: مصنف کا یہ ارشاد کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہی عمل بہت سے ایسے لوگوں کے ساتھ رہا ہے جو زنا میں مبتلا ہوئے اور پھر اس سے توبہ کرلی، قطعاً بے دلیل ہے اور آگے چل کر دلیل کے نام پر جو کچھ پیش کیا ہے وہ ان کی علمی وعقلی افلاس کی دلیل ہے۔

۷: مصنف کا تاثر یہ ہے کہ حضرات صحابہ کثرت سے زنا میں مبتلا ہوئے لیکن انھوں نے توبہ کرلی، اس لیے سزا سے بچ گئے، صرف دو تین صحابہ نے توبہ نہیں کی اس لیے مبتلائے سزا ہوئے۔ صحابہ جیسی مقدس جماعت کے بارے میں یہ کس قدر گھناؤنا تصور ہے۔ دشمنان صحابہ "شیعہ" شاید اس تصور سے اجتناب کریں۔

۸: آگے ان کا ارشاد ہے کہ ہاں جس شخص کا گناہ مشہور ہوگیا ہو اور توبہ کرنے سے پہلے قاضی تک اس کا مقدمہ پہنچ گیا ہو، اس پر البتہ کوڑوں کی سزا نافذ ہوگی، یہ بات

بھی بالکل غلط اور بے دلیل ہے بلکہ خلاف دلیل ہے، گناہ کی شہرت کا کیا مطلب ہے ؛ اور اس پر شریعت نے حدود کی بنیاد کب رکھی ہے ؛ ذرا اس کو قرآن سے یا صحیح حدیث سے ثابت کریں۔

۹ : اس طرح کے جرائم میں شہرت افواہی حکایات سے ہوتی ہے، شریعت نے تو اسے بجائے خود جرم قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے : ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشۃ فی الذین اٰمنوا لھم عذاب الیم فی الدنیا والاٰخرۃ واللّٰہ یعلم وانتم لاتعلمون ۔

یا مصنف کی مراد شہرت سے کچھ اور ہے اس کی وضاحت فرمائیں، ورنہ شہرت تو حضرت ماعز رضؓ کے جرم کی بھی نہیں ہوئی تھی، انھوں نے جب خود آکر اقرار کیا یا یہ کہ انھوں نے اپنے گناہ کے احساس سے مغلوب ہوکر اپنے سرپرست حضرت ہزال سے بطور مشورہ کے اس کا تذکرہ کردیا تھا۔ تب لوگوں نے جانا۔

۱۰ : مصنف کو خبر ہی نہیں کہ حد زنا، خواہ رجم ہو یا جلد، اس کا مدار شہرت اور عدم توبہ پر نہیں ہے، اس کی بنیاد چار عینی گواہوں کی شہادت پر ہے یا یہ کہ مجرم خود چار مرتبہ قاضی کے پاس اقرار جرم کرے۔ اس کے ساتھ مزید کچھ اور بھی شرطیں ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، اسے قانونی احکام میں شہرت وغیرہ کا نام لینا، پتہ دیتا ہے کہ مصنف کو اسلامی احکام کے علم سے قطعاً مناسبت نہیں ہے، قرآن سے تو کیا مناسبت ہوگی۔

دو صفحہ کی مختصر سی عبارت میں مصنف کی گردن پر گیارہ مواخذات ہیں (دس یہ اور ایک ...ن سے پہلے گذرا) اسی سے باقی کتاب کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، تاہم کچھ اور نمونے ان کی عقل و ذہانت کے پیش کرنے مناسب ہیں۔

مصنف ایک جگہ لکھتے ہیں :

"یہ ممکن نہیں کہ قرآن ایک مسئلہ کو ایک بار نہیں کئی بار چھیڑے اور نہایت شد و مد کے ساتھ چھیڑے، لیکن اس کے باوجود اس کے سلسلہ میں اس کی

ہدایات نامکمل ہوں، اس کی کوئی نظیر ہمیں قرآن میں نہیں ملتی" ص۱۲۔

مصنف نے یہ بات بڑے جذباتی انداز میں لکھی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کا علم سے کوئی لگاؤ نہیں ہے، ہدایات کے مکمل ہونے سے مصنف نے کیا مراد لیا ہے اس کو اگر وہ واضح کر دیتے تو گفتگو میں آسانی ہوتی۔ اگر اس کا منشا یہ ہے کہ قرآن نے جن احکام کو شدومد کے ساتھ بیان کیا ہے ان کی تمام تفصیلات کو ذکر کیا ہے، تو یہ بات بالکل غلط ہے، قرآن میں احکام کا بیان نامکمل نہیں، البتہ اجمالی ہے، احکام کی تفصیلات قرآن میں بہت کم بیان ہوئی ہیں قرآن کریم میں نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، ربوا، خمر، قصاص، دیت وغیرہ کے مسائل کس شدومد کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، لیکن ان کی تمام تفصیلات جن کی روشنی میں ان احکام کے مطابق عمل ہو سکے، ان کا بیان قرآن میں کہاں ہوا ہے؟ کتنے وقت کی نماز فرض ہے؟ نماز کے ارکان کیا کیا ہیں، ان میں ترتیب کیا ہوگی، اس کے شرائط صحت کیا کیا ہیں؟ کن چیزوں سے نماز باطل ہو جاتی ہے، ان کی تفصیل قرآن میں تلاش کر کے ذرا یہ صاحب بتلا تو دیں۔

اور اگر ہدایات کے مکمل ہونے کا کوئی اور مطلب ہو تو اسے واضح کریں۔ مبہم اور غیر واضح بات ایسے اصولی مسائل میں لکھنی عقل کی نارسائی کی دلیل ہے۔

جو صاحب یہ گفتگو کر رہے ہیں، ان کی عقل ونظر کو ایک بار دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، فقہ اسلامی اکیڈمی کا پہلا سیمینار ہو رہا تھا، اس میں اعضاء کی پیوندکاری کا مسئلہ زیر بحث تھا اور اصولی طور پر یہ گفتگو ہو رہی تھی، کہ انسان اپنے اعضاء کا مالک ہے یا نہیں؟ سیمینار کے تمام شرکاء متفق تھے کہ انسان اپنے اعضاء کا مالک نہیں ہے، یہ جسم اور یہ جان اس کے پاس بطور امانت ہیں، یہ بات پورے اتفاق کے ساتھ لکھی جانے والی تھی کہ اچانک پیچھے سے ایک آواز آئی کہ انسان اپنے اعضاء کا مالک ہے، یہ بات قرآن سے ثابت ہے، حاضرین کو سخت حیرت ہوئی، لوگوں نے گردنیں گھما گھما کر دیکھنا شروع کیا، تو ہمارے یہ مصنف ہی ارشاد فرما رہے تھے، پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کا قول قرآن پاک میں نقل کیا ہے، "رب انی لا املک الا نفسی" اے میرے رب میں صرف اپنے نفس کا مالک ہوں اس سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے جسم و اعضاء کے مالک تھے، پس ہر آدمی اپنے جسم اور اعضاء کا مالک

ہوا، موصوف کی اس جرأت ونظر پر سخت تعجب ہوا۔ مجمع سے آواز آئی کہ پوری آیت پڑھئے، اس میں آگے ایک لفظ اور ہے لا املك الا نفسی واخی توکیا انسان اپنے اعضاء کے ساتھ ساتھ اپنے بھائی کے اعضاء کا بھی مالک ہوگا۔ اس پر یہ دیدہ ور مصنف خاموش ہوگیا۔ اگر اسی نظر سے انھوں نے قرآن کو پڑھا ہے تو سچ یہ ہے کہ انھیں قرآن میں کچھ نظر نہیں آیا ہے۔

اسی نظر کی بنیاد پر آپ لکھتے ہیں:

"حدیث وقرآن تمام اہل ایمان کی مشترکہ میراث ہے، لہٰذا جذباتیت سے بلند ہوکر ہر صاحب نظر کو اس کا حق دینا چاہئے کہ وہ ان پر غور کرے، اور دیانت داری کیساتھ جس نتیجے تک پہنچے اس کا اظہار کرے۔" ص۲۱

اس سے مراد اگر انھیں جیسے صاحب نظر ہیں، تو انھیں بالکل اجازت نہیں دی جاسکتی کیوں کہ انھیں تو سامنے کا لفظ نظر نہیں آتا، تو معلوم نہیں کہاں کس کھائی میں کس کو گرادیں گے۔

اس طرح کے "صاحب نظر" افراد جب یہ لکھتے ہیں:

"حدیث قرآن کی شرح ہے، لیکن قرآن بھی حدیث کی صحت کے لیے ایک زبردست کسوٹی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تکثر لکم الاحادیث بعدی فما روی لکم عنی حدیث فاعرضوہ علی کتاب اللہ فما وافق فاقبلوہ وما خالف فردوہ، میرے بعد تمہارے سامنے بہت سی احادیث آئیں گی، توجب میرے حوالہ سے تم سے کوئی حدیث بیان کی جائے تو اسے کتاب الٰہی پر پیش کرو، جو اس کے مطابق ہو، اسے قبول کرلو، اور جو اس کے مخالف ہو، اسے رد کردو۔" ص۱۴

تو ان سے پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ کتاب اللہ کی موافقت ومخالفت کا فیصلہ کون کرے گا، اگر آپ ہی اس کے فیصل ہیں، تب تو دین وایمان کی خیر نہیں، کیوں کہ آپ کی نظر کا تجربہ یہ ہوچکا ہے، ایک تجربہ اور ہم بتاتے ہیں، آپ نے حقیقت رجم میں لکھا ہے اور پوری کتاب اسی پر مبنی ہے کہ زانی محصن کے رجم والی احادیث اپنے ظاہر کے اعتبار سے کتاب اللہ کی آیت الزانیۃ والزانی الخ کے خلاف ہیں، اس لیے وہ قبول نہیں بلکہ صرف

زنا کی وجہ سے کسی کو رجم کرنا درست نہیں ہے پھر آپ نے اس حدیث کا صحیح محل تجویز کیا کہ،

"ان لوگوں کو رجم اس وجہ سے کیا گیا کہ یہ سارے لوگ اس معاشرے میں رہنے کے قابل نہ تھے، یہ لوگ شرم و حیاء سے بہت دور جنسی بے راہ روی کے شکار تھے، یہ لوگ اسلامی اقدار سے یکسر عاری اور نفسانیت سے پوری طرح مغلوب تھے، اور یہ لوگ اپنی عادتوں کی اصلاح کرنے اور اپنی حرکتوں سے باز آنے کے لیے کسی طرح تیار نہ تھے۔" ص ۱۹۳

اول تو حضرت ماعزؓ اور غامدیہؓ وغیرہ کے بارے میں ایسی گھناؤنی تصویر واقعہ کے بالکل خلاف ہے۔ ایک شخص جو گناہ ہوجانے کے بعد اتنا متاثر ہے کہ وہ یہ جانتے ہوئے کہ زنا کی سزا خود رجم ہو یا کوڑا، بہت سخت سزا ہے، اپنے آپ کو خوف خدا کی وجہ سے سزا کے لیے پیش کر دیتا ہے اس کی یہ تصویر بنانا کہ وہ انتہائی بدقماش قسم کا انسان تھا کس قدر مبنی بر غلاظت انداز فکر ہے تاہم اگر تھوڑی دیر کے لیے ان صاحب نظر کی یہ بات مان لی جائے اور یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت ماعزؓ نے جو چار مرتبہ اقرار زنا کیا تھا، یہ چار الگ الگ واقعات کا اقرار ہے اور اسی سے ان کا عادی مجرم ہونا ثابت ہوتا ہے[1] تو سوال یہ ہے کہ کیا اس بات کو قرآن پر نہیں پیش کیا جائے گا، قرآن میں الزانیۃ والزانی مطلق فرمایا گیا ہے، اس میں چار چھ مرتبہ کی کوئی قید نہیں ہے، تو بس ہر ایک کے لیے سو کوڑے کافی ہیں۔ یہ رجم کی بات کہاں سے آگئی، مگر ایک مرتبہ زنا کرنے سے رجم کرنا قرآن کے خلاف ہے، تو چار، چھ، دس مرتبہ، بلکہ اس سے بھی زیادہ مرتبہ زنا کرنے سے رجم کرنا یقیناً قرآن کے خلاف ہے، ان صاحب نظر نے دونوں کے درمیان فرق کی کوئی وجہ نہیں بتائی۔

---

[1] حالانکہ جب تک کوئی شخص ہوش و حواس کی تمہیلات سے بھی خالی نہ ہو، یہ تصور نہیں کرسکتا کہ کوئی عادی مجرم چار مرتبہ زنا کرکے ہر مرتبہ امام و قاضی کے دربار میں آکر الگ الگ اقرار جرم کرے گا اور یہ بات تو اس سے بھی بعید ہے کہ امام وقت پہلی ہی مرتبہ سزا دینے کے بجائے اسے عادی مجرم بننے کا موقع فراہم کرے گا۔

ناظرین دیکھ لیں کہ انھوں نے ایک ہی حدیث کے دو مصداق کے لیے الگ الگ پیمانہ بنا رکھا ہے، ایک مصداق کو قرآن پر پیش کر کے اسے خلاف قرار دے کر رد کرتے ہیں اور دوسرے مصداق کو سرے سے پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرتے، شاید اس لیے کہ وہ خود ان کی تجویز ہے، اب غور کیجئے، ان کے فیصلے پر کیسے اعتماد ہو؟

اس گفتگو کی روشنی میں انھیں صاحب نظر کا ایک تحریر کردہ اصول اور پڑھئے لکھتے ہیں:

"حدیث صحیح اور قرآن میں اختلاف ممکن نہیں اور اگر اختلاف پایا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس روایت کی مزید تحقیق کی ضرورت ہے"۔ ص۱۵

حدیث صحیح اور قرآن میں اختلاف ممکن نہیں ہے، یہ اصول بالکل درست ہے مگر اختلاف کی صورت میں اس کا جو حل تجویز کیا ہے وہ علی الاطلاق صحیح نہیں ہے، بلکہ حدیث کی تحقیق کے ساتھ اس بات کی بھی تحقیق ضروری ہے کہ صاحب نظر قسم کے لوگ قرآنی آیت کا جو مفہوم سمجھ رہے ہیں وہ صحیح بھی ہے یا نہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کی غلط فہمی یا غلط بینی کی وجہ سے صحیح حدیث اور قرآن میں اختلاف نظر آ رہا ہو۔ پھر یہیں سے ان کے ایک اور اصول کی غلطی واضح ہو جاتی ہے۔ جس میں وہ لکھتے ہیں کہ:

"جب قرآن و حدیث میں اختلاف ہو (تو) تطبیق نہ ہوسکنے کی صورت میں قرآن کو لیا جائے گا، اور حدیث چھوڑ دی جائے گی، اس لیے کہ قرآن قطعی ہے اور حدیث ظنی ہے اور قطعی پر ظنی کو ترجیح دینا زیادتی ہے"۔ ص۱۵

قرآن کا ثبوت قطعی ہے، یہ تو بالکل درست ہے، اور حدیث ظنی ہے، یہ دعویٰ اپنے عموم کے ساتھ قطعی باطل ہے، احادیث کا ایک بڑا ذخیرہ تعامل اور تواتر کی راہ سے آیا ہے وہ بالکل قطعی ہے، مثلاً نماز کے پانچ اوقات، نمازوں کی رکعات، موزوں پر مسح وغیرہ کی احادیث، اسی طرح قطعیت کی حامل ہیں، جیسے قرآنی احکام!

یہ تو ثبوت کی بات ہے لیکن ایک چیز اور ہے جس کی شاید مصنف کو خبر نہیں یا خبر ہے تو بالقصد مغالطہ دیتے ہیں وہ ہے قرآن و حدیث کے الفاظ کی کسی حکم پر دلالت، مطلب یہ ہے کہ قرآن کی آیات اپنے ثبوت کے لحاظ سے تو یقیناً قطعی ہیں، یعنی یہ کہ قرآن کا ہر ہر لفظ

اللہ کی طرف سے ہے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے۔ اور آج جو آیات و کلمات قرآن کے ہم پڑھتے ہیں، بعینہ یہی آیات وکلمات نازل ہوئے ہیں، اس میں یقیناً قطعیت ہے، لیکن ہر آیت اور ہر کلمہ کا مفہوم جو اس سے سمجھنے والے نے سمجھا ہے وہ بھی قطعی ہو، ایسا بالکل نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو قرآنی آیات کے مفہوم و مستدل میں کبھی اختلاف نہ ہوتا جیسا کہ اس کے کلمات وحروف میں اختلاف نہیں ہے۔ اگر آیات قرآنی کی تمام دلالتیں قطعی ہوتیں توان میں اختلاف کرنے سے ادنیٰ کفر میں جا پڑتا۔ کیا ایسا کہنے کی کوئی جرأت کرسکتا ہے آخر خود ان صاحب نظر مصنف نے الزانیۃ والزانی کے مفہوم میں تمام علماء و فقہاء سے اختلاف کیا ہے کہ اس کو عام قرار دے کر محصن اور غیر محصن سب کو اس میں داخل کردیا ہے جب کہ امت کا اجماع ہے کہ غیر محصن اس سے خارج ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر قرآن اپنے لفظ اور دلالت دونوں اعتبار سے قطعی ہے تو جو لوگ صاحب نظر مصنف کی بتائی ہوئی دلالت کو نہیں قبول کرتے، انھیں یہ کیا کہیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کو مطلقاً قطعی کہنا گو کہ بظاہر خوبصورت بات ہے، مگر اس میں التباس ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ پورا قرآن ثبوت کے اعتبار سے قطعی ہے۔ لیکن دلالت کے اعتبار سے اس کے بہت سے احکام ظنی ہیں، اور ظنی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سمجھنے والوں نے اس سے جو کچھ سمجھا ہے، وہ سب قطعی نہیں ہے، اسی کو اصول فقہ کی اصطلاح میں ظنی الدلالت کہتے ہیں، ظنی ہونے کا تعلق اللہ تعالےٰ کے کلام سے براہ راست نہیں ہے بلکہ استدلال کرنے والوں کے استدلال و فہم سے ہے، لیکن ہمارے صاحب نظر قسم کے لوگ جو اپنے مزعومات کو ثابت کرنے کے لیے قرآن کے قطعی ہونے کی دہائی دیتے ہیں، اس دہائی کا تعلق قرآن کی دلالتوں ہی سے ہوتا ہے اس کے ثبوت سے نہیں ہوتا اور یہیں سے وہ سادہ لوح عوام اور علماء کو دھوکہ دیتے ہیں۔۔۔ یعنی وہ اپنے مزعومہ نظریہ کے لیے قرآن کی آیت پیش کرکے اس کی قطعیت کا حوالہ دے دیتے ہیں، حالانکہ جس مطلب کے لیے وہ حوالہ دیتے ہیں، بسا اوقات وہ بالکل غلط اور خود ساختہ ہوتا ہے اس میں التباس بہت ہو رہا ہے، اس لیے اس کی قدرے تفصیل کردی گئی۔

صاحبِ نظر مصنف لکھتے ہیں کہ :

"سورۂ نور کے بعد اگر آپ نے کسی کو رجم کرایا ہے تو حد زنا کے طور پر نہیں بلکہ کسی اور سنگین تر جرم کی سزا میں" ص۳

خالص تہمت ہے، تمام روایتیں بتاتی ہیں کہ آپ نے بطور حد زنا کے رجم کرایا ہے ہاں بعض روایات میں ایک شخص کو بطور قصاص کے بھی رجم کرانا ثابت ہے، اس کے علاوہ ذرا مصنف اپنے عقلی و قیاسی نکتوں کو چھوڑ کر تاریخ و روایت کا کوئی ٹھوس اور صریح ثبوت پیش کریں، کہ آپؐ نے بجز حد زنا کے اور بجز ایک بار قصاص کے کسی اور سنگین تر جرم میں کسی کو رجم کرایا ہو۔

صحیح مسلم کے حوالہ سے ایک روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے واسطے سے مصنف نے نقل کی ہے، انھوں نے فرمایا کہ :

"رجم النبی صلی اللہ علیہ وسلم رجلاً من اسلم ورجلا من الیھود وامرأتہ"۔

(اس کا ترجمہ لکھتے ہیں کہ) نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے بس قبیلہ اسلم کے ایک شخص کو اور یہود کے ایک مرد اور ایک عورت کو رجم کرایا" ص۳۱۔

پھر لکھتے ہیں کہ :

"اس روایت میں حضرت جابرؓ بن عبد اللہ صرف تین واقعاتِ رجم کا ذکر فرماتے ہیں، جب کہ عہد رسالت میں ان تین کے علاوہ بھی رجم کے واقعات ہوئے ہیں، جیسے ماعزؓ کا واقعہ، غامدیہ کا واقعہ، یا عسیف والا واقعہ"۔

اتنی سی عبارت میں صاحب نظر مصنف سے دو فاش غلطیاں ہوئی ہیں، ایک غلطی تو جہل کی بنا پر ہے، اور دوسری دیدہ و دانستہ خیانت ہے۔ جہل کی غلطی یہ ہے کہ حضرت جابرؓ نے قبیلہ اسلم کے جس شخص کا تذکرہ کیا ہے، وہ حضرت ماعزؓ ہی ہیں، دوسرا کوئی نہیں ہے۔

اور خیانت یہ ہے کہ حدیث کے الفاظ میں صرف تین آدمیوں کے رجم کرنے کا کوئی ذکر نہیں صرف اتنا ہے کہ حضرت جابرؓ نے تین آدمیوں کے رجم کا تذکرہ کیا ہے، لیکن اس سے کسی اور

کی نفی نہیں ہوتی، مگر دیدہ ور مصنف نے ترجمہ میں خیانت کی اور ترجمہ کیا "بس قبیلہ اسلم کے ایک شخص" گویا کسی اور کا رجم نہیں ہوا، اور پھر اسی ترجمہ کی خیانت پر مفروضات کی عمارت کھڑی کر دی ہے جو صرف ان کے ذہن کی پیداوار ہے، روایات میں اس کا کوئی اشارہ تک نہیں ملتا پھر نہایت شدومد کے ساتھ یہ بات لکھتے ہوئے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ جیسے صحابی جو مدینہ کے رہنے والے تھے اور حضورؐ سے ان کے قریبی تعلقات تھے، بھلا رجم کے باقی واقعات سے بے خبر ہوں گے، ایسا ممکن نہیں ہے۔ آگے لکھتے ہیں کہ :

> "اس پس منظر میں ان کے اس بیان کو دیکھا جائے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بس قبیلۂ اسلم کے ایک شخص کو اور ایک یہودیہ کو رجم کرایا تھا تو ان کا یہی منشاء سامنے آئے گا کہ رجم کے یہ تینوں واقعات اپنی نوعیت کے لحاظ سے بقیہ واقعات رجم سے مختلف تھے" صا۳۱ ۔

بناء الفاسد علی الفاسد کی واضح مثال : جس چیز کا حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں وہم تک نہیں، اسے یہ شخص زبردستی اس میں داخل کر رہا ہے اور مزید طرہ اس پر یہ کہ یہ شخص لکھتا ہے :

> "اور یہ فرق واختلاف اسی پہلو سے تھا کہ یہ تینوں رجم سزائے زنا کے طور پر ہوئے تھے، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور بعد میں رجم کے جو واقعات ہوئے وہ اس نوعیت کے نہ تھے، ان کا تعلق سزائے زنا یا حد زنا سے نہیں تھا، بلکہ کچھ دوسرے ہی اسباب تھے، جو ان کے پیچھے کام کر رہے تھے"۔

اپنے اوہام وخیالات کو نص قطعی کے ہم رتبہ سمجھنے کی اس سے بدتر مثال اور کیا ہوگی، واقعی نظر ہو تو ایسی ہو کہ جس چیز کا حضرت جابرؓ کی روایت تو کیا، کسی روایت میں نام و نشان تک نہیں، اس کو دریافت کر لیتی ہے بلکہ بس اسی کو دیکھتی ہے اور سزائے زنا جس کا صراحۃً ہر روایت میں ذکر ہے وہ اسے دکھائی ہی نہیں دیتی۔ ایسی ہی نظر پر حق مانگا جاتا ہے کہ ہم بھی قرآن وسنت میں اجتہاد کریں گے۔

ترجمہ غلط کیا مصنف نے قرآن کی ایک آیت کا ایسا شاندار ترجمہ کیا ہے جس سے ان کی دیدہ وری کا پورا جلوہ سامنے آجاتا ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے

"الزانی لاینکح الا زانیۃ اومشرکۃ والزانیۃ لاینکحھا الا زان اومشرک وحرم ذلک علی المومنین" (سورۂ نور)

اس کا ترجمہ ہم "تدبر قرآن" مصنفہ مولانا امین احسن اصلاحی سے نقل کرتے ہیں جو ترجمہ کے مسئلہ میں مصنف کے پیش رو ہیں، انھوں نے اس کا ترجمہ کیا ہے:

"زانی نہ نکاح کرنے پائے مگر کسی زانیہ یا مشرکہ سے، اور کسی زانیہ سے نہ نکاح کرے مگر کوئی زانی یا مشرک، اور اہل ایمان پر یہ چیز حرام ٹھہرائی گئی" ص ۳۶۵

اب اس کے بعد ہمارے صاحب نظر مصنف کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

"کوئی زناکار کسی زانیہ یا کسی مشرکہ سے ہی زنا کرسکتا ہے، اور کسی زانیہ سے کوئی زناکار یا کوئی مشرکہ ہی زنا کرسکتا ہے، اور مومنین کے لیے یہ چیز مطلقاً حرام ہے" ص ۳۳۔

کیا کوئی صاحب بقید ہوش و خرد اس مضمون کو قرآن کا مضمون بتا سکتے ہیں یہ مصنف کی وہ معراج ہے، جہاں تک شاید ہی کوئی بڑے سے بڑا امر ف قرآن پہنچ سکے، اس ترجمہ کی روشنی میں اگر انھیں جیسا کوئی صاحب نظر ان سے یہ کہے کہ جناب اس سے معلوم ہوا کہ غیر زانیہ سے، غیر زناکار اور غیر مشرک زنا کرسکتا ہے، کیوں کہ اس کی حرمت کا ذکر اس آیت میں نہیں ہے تو آپ کیا جواب دیں گے؟ اگر آپ کہیں کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ ولاتقربوا الزنا فرمایا ہے، تو وہ پھر آپ ہی کی زبان میں الٹ کر سوال کرے گا کہ القرآن یفسر بعضہ بعضاً، لہٰذا دونوں آیتوں میں اگر یوں تطبیق دی جائے کہ ولاتقربوا الزنا اجمال ہے، اور سورۂ نور کی مذکورہ بالا آیت اس کی تفصیل ہے، اور آپ نے جو مفہوم بتایا ہے اس کی روشنی میں زنا کا خاص یہی طریقہ جو آپ کے ترجمہ سے واضح ہے، حرام ہے، باقی اور طریقوں کی حرمت نہیں ہے۔ ذرا اپنے ترجمہ اور اپنی قرآن فہمی کے اصول پر اس سوال کا جواب تحریر فرمادیں۔ نعوذ باللہ من ھذا الھذیان۔

اگر کوئی صاحب کہیں کہ یہ کتابت کی غلطی ہو سکتی ہے، تو یہ صحیح نہیں ہے، کیوں کہ مصنف نے یہ ترجمہ کتاب میں دو جگہ کیا ہے، یہاں جو الفاظ ہم نے نقل کیے ہیں وہ ص۳۳ پر ہیں، اور دوسری جگہ ص۱۹۱ پر ان الفاظ میں ترجمہ کیا ہے۔ اسے بھی ملاحظہ فرمائیے۔ دونوں کا مفہوم بالکل ایک ہے معلوم ہوا 'دیدہ ور مصنف اس آیت کا یہی مطلب سمجھتا ہے:

"کوئی زانی زنا نہیں کرے گا مگر کسی زانیہ یا کسی مشرکہ ہی سے، اور کسی زانیہ سے زنا نہیں کرے گا مگر کوئی زانی یا مشرک ہی" ص۱۹۱۔

ناظرین اب خود بتائیں کہ ایسے شخص کو قرآن و حدیث میں رائے زنی کا حق دیا جا سکتا ہے اور کیا یہ کتابت کی غلطی ہو سکتی ہے۔

طمانچہ بر رخسارِ خود

ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

"چنانچہ ان کا (باندیوں کا) نکاح ہو جانے کی صورت میں ان پر نصف حد رکھی، اور نکاح نہ ہونے کی صورت میں کوئی حد نہیں رکھی" ص۱۶۔

چلئے، باندیوں کو نکاح سے قبل حدِ زنا سے رخصت مل گئی، صاحب نظر مصنف کا یہ فتویٰ ہے، اسی صاحب نظر مصنف کا جس نے فقہاء کو جب دیکھا کہ ایک سنت متواترہ کی بنا پر وہ الزانیة والزانی کو زانی غیر محصن کے ساتھ خاص کرتے ہیں تو وہ چیخ پڑا کہ یہ یقیناً قرآن کے خلاف ہوگا، لیکن اب وہ خود باندی غیر منکوحہ کو اس کے عموم سے خارج کر رہا ہے اور وہ بھی بے دلیل۔ تو کچھ مضائقہ نہیں!

سنت سے بے نیازی

ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ:

"اگر کسی مسئلے میں قرآن پاک کی واضح تعلیمات موجود ہیں تو پھر ہمیں کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں، حتیٰ کہ اس جستجو کی بھی ضرورت نہیں کہ اس سلسلے میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت کیا ہے، یا اس باب میں آپ کی ہدایات کیا ہیں؟" ص۶۷۔

سنت اور حدیث سے یہ شانِ بے نیازی قابل دید ہے، پھر آپ کے نزدیک حدِ زنا کے سلسلے میں واضح تعلیمات جب موجود ہیں تو آپ کو کتب حدیث کی ورق گردانی کی ضرورت کیوں پیش

آئی۔ آپ صرف یہ اعلان کر دیتے، وہ کافی ہوتا کہ حدِ زنا کے سلسلے میں رجم کا کوئی واقعہ پیش ہی نہیں آیا، اور جو کچھ روایات میں نظر آئے، چونکہ وہ قرآن کی واضح تعلیمات کے خلاف ہے اس لیے قابلِ رد ہے، مائش مصنف کو واضح تعلیمات کے مفہوم کا پتہ ہی نہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ سنت سے بے نیازی کسی حکم کی عملی تشکیل کے سلسلہ میں ہو ہی نہیں سکتی۔

فقہاء پر نوازش پھر اسی بنیاد پر لکھتے ہیں:

"ہمارے فقہائے عظام کی ایک بڑی تعداد ہے، جو اس اصول کی رعایت نہیں کر سکی، جس کی وجہ سے خود اس مسئلے میں بڑی الجھنیں پیدا ہو گئی ہیں" ص۲۷۔

مصنف نے بڑی رعایت کی ہے ورنہ ان کے حساب سے تو یہ فردِ جرم تمام فقہاء پر عائد ہوتی ہے، صحابہ کرام پر عائد ہوتی ہے، تابعین پر عائد ہوتی ہے، کیوں کہ رجم کے مسئلے میں کبھی کوئی اختلاف نہیں رہا ہے، صرف خوارج اور بعض معتزلہ کا اختلاف ہے جن کے ہم نوا یہاں بظاہر مصنف ہیں، لیکن ان کی نظر معلوم ہو چکی ہے۔

لغت میں قیاس فرماتے ہیں کہ:

"رجلٌ اور امرأۃٌ کا جو واضح اور متبادر مفہوم ہے وہ پختہ سن مرد، اور پختہ سن عورت ہے جس میں شادی شدہ ہونے کا پہلو غالب ہوتا ہے"

علمائے لغت کا کہنا ہے کہ لغت میں قیاس کا دخل نہیں ہوتا، لیکن مصنف بہادر ہے اس حصار کو توڑ کر اپنا قیاس اس میں ٹھونس رہا ہے، ابھی جگہ بنا رہا ہے، ابھی قیاس کو قطعیت کا درجہ نہیں دیا ہے۔ آگے ملاحظہ ہو:

"یہ دونوں الفاظ اپنی اصل اور حقیقت کے لحاظ سے یہی مفہوم رکھتے ہیں، اور عام طور سے اسی مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں"

مطلب یہ ہے کہ شادی شدہ مرد و عورت کے لیے رجل اور امراۃ کا لفظ حقیقت ہے اور غیر شادی شدہ کے لیے مجاز۔ اور معلوم ہے کہ مجاز کے لیے قرینہ کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

"لہٰذا غیر شادی شدہ مرد یا عورت کے مفہوم میں وہ اسی صورت میں لیے جا سکتے ہیں جب کوئی واضح قرینہ اس دوسرے مفہوم کے لیے موجود ہو" ص۳۰۲

یہ بالکل نئی تحقیق ہے، جس سے نہ اہل لغت واقف ہیں، اور نہ ارباب بلاغت! واقعی ع

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

اور آپ جانتے ہیں کہ رجل اور امرأۃ میں اتنی دور کی کوڑی لانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ بات یہ ہے کہ دیدہ ور مصنف نے امام ابو یوسف کی کتاب الخراج سے چار واقعات نقل کیے ہیں، ان چاروں میں کوڑا لگانے کا تذکرہ ہے۔ اب مصنف چاہتے ہیں کہ یہ سزا شادی شدہ کے لیے ثابت ہو جائے تاکہ شادی شدہ کے لیے زنا کی سزائے رجم کے خلاف دلیل بن جائے، ان میں سے تین روایات میں اتی برجل کا لفظ ہے اور چوتھی روایت میں علی امرأۃ کا لفظ ہے، اور اس کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ وہ مرد یا وہ عورت شادی شدہ تھی، مگر مصنف نے اس میں محض اپنی رائے سے شادی شدہ ہونے کو نص قطعی بنا دیا ہے، اسی کا نام معروضی مطالعہ ہے جس کا دعویٰ مصنف نے ابتداء کتاب میں کیا ہے ص۱۲۔

(جاری)

بقیہ: .... ایک انقلابی قوم ....

ہوتا ہے جس کے نتیجے میں کڑک اور اس کے ساتھ ہی بجلی پیدا ہوتی ہے اور پھر اس کے بعد بارش کی فیاضی شروع ہوتی ہے۔ اس طرح صرف اس ایک آیت سے کڑک، بجلی کی چمک اور بارش کے نزول کے بارے میں کتنے سائنسی نقطے معلوم ہو جاتے ہیں بلکہ یہیں سے ایک اور بھی سائنسی انکشاف ہوتا ہے کہ بجلی کی تخلیق مثبت اور منفی اثرات کے تصادم سے ہوتی ہے۔ اس انکشاف سے انسانی عقل اس حقیقت تک پہنچی جو آج ہمارے پاس الیکٹرک نظام کی شکل میں موجود ہے۔

☆☆☆

حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب درخواستی رح

حافظ بشیر حسین ایم اے (اردو، اسلامیات) شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج شیروان (ایبٹ آباد)

بقیۃ السلف، حجۃ الخلف، عالم بے بدل، ولی کامل، حافظ حدیث والقرآن حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب درخواستی رح عالم باقی کی طرف رحلت پذیر ہو گئے۔ آپ کی ذات بابرکات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ بقول ؎

زمدح ناتمام ما جمال شیخ مستغنی است
بہ آب ورنگ وخال وخط چہ حاجت روئے زیبا را

جامعیت اگر یوں کہا جائے کہ اللہ رب العزت نے آپ کی شخصیت میں ایک عالم جمع کر دیا تھا تو یہ مبالغہ نہیں ہوگا ؎

لَیْسَ عَلَی اللّٰہِ بِمُسْتَنْکَرٍ اَنْ یَّجْمَعَ الْعَالَمَ فِیْ وَاحِدٍ

آپ اسلاف کے تمام الوان کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھے، آپ کا طریق تفسیر حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح کی یاد دلاتا تھا۔ آپ کا فہم قرآنی اور ربط قرآنی میں ملکہ حضرت مولانا حسین علی صاحب (واں بھچراں) کی یاد دلاتا تھا، آپ کا تبحر فی الحدیث حافظ ابن حجر عسقلانی رح کی یاد دلاتا تھا، آپ کی آواز کی غناہٹ اور بے مثال حافظہ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رح کی یاد دلاتا تھا، آپ کا سلوک وتصوف میں انہماک حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رح کی یاد دلاتا تھا، آپ کی مجاہدانہ زندگی شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رح کی یاد دلاتی تھی آپ کا جمال اپنے مرشد حضرت خلیفہ غلام محمد دینپوری رح کی یاد دلاتا تھا، اور آپ کا جلال مولانا تاج محمد امروٹی کی یاد دلاتا تھا۔ بلاشبہ جامعیت میں آپ کی شخصیت اسلاف کی یادگار تھی۔ ع

اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

تعلیم و تربیت

آپ کی ولادت محرم ۱۳۲۴ھ[1] بروز جمعۃ المبارک اپنے آبائی گاؤں "درخواست" تحصیل خان پور" ضلع رحیم یار خان" میں ہوئی، آپ کے والد ماجد حافظ محمود الدین صاحب حضرت دینپوری رہ کے خاص متعلقین میں سے تھے اور حضرت ہی کے قائم کردہ مدرسہ صدیقیہ راشدیہ میں تعلیم دیتے تھے۔ نو برس[2] کی عمر میں آپ نے اپنے والد ماجد رہ سے قرآن مجید حفظ کر لیا تھا' فارسی کی تعلیم اور خوش نویسی کی مشق مولانا احمد بخش رہ کے یہاں فرمائی۔ عربی کی تعلیم مولانا قادر بخش ملک پوری اور مولانا عبدالغفور صاحب حاجی پوری رہ کے یہاں فرمائی۔ قرآن مجید کی تفسیر مولانا حسین علی صاحب[3] (واں بچراں) سے پڑھی۔ فقہ کی تعلیم مولانا عبدالرزاق گھوٹوی رہ[4] سے حاصل کی۔ دورہ حدیث کی تکمیل ۱۸ برس کی عمر میں شیخ الحدیث حضرت مولانا غلام صدیق صاحب[5] حاجی پوری رہ کے یہاں فرمائی۔ آپ کی دستار بندی آپ کے شیخ حضرت دینپوری رہ نے خود فرمائی، اور اپنے دستار مبارک آپ کے سر پر رکھ کر تعلیم و تدریس کا حکم فرمایا۔ آپ کے حافظہ میں اللہ تعالیٰ نے ہزاروں احادیث محفوظ کر رکھی تھیں، بعض علماء کے بقول آپ کو دس ہزار احادیث یاد تھیں' اور بعض اس سے بھی زیادہ تبلاتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس صدی میں "حافظ الحدیث" ہونے کا اعزاز صرف آپ ہی کو حاصل تھا۔

درس و تدریس

آپ نے فراغت کے بعد حضرت دینپوری رہ کے حکم کی تکمیل میں ۱۳۵۴ھ میں "مخزن العلوم" کے نام پر اپنے گاؤں "درخواست"

ل اکثر کتب میں مہینہ ہی مذکور ہے تاریخ مذکور نہیں۔ نیز بعض اخبارات ورسائل میں جو سنین آئیں ہیں وہ محل نظر ہیں ۔ ۲ بعض جگہ گیارہ سال بھی آیا ہے (مقدمۃ القرآن)

۳ یہ مولانا ثناء اللہ کے شاگرد تھے اور مولانا ثناء اللہ مولوی الٰہی بخش کے (جو فاضل دیوبند تھے)۔ (ہمارے مشائخ) ۔ ۴ مولانا حسین علی رہ کے واسطہ آپ کا سلسلہ حضرت گنگوہیؒ سے جا ملتا ہے۔

۵ انہوں نے ترمذی کے چند اسباق حضرت شیخ الہندؒ سے۔ بخاری شریف حضرت مدنی رہ سے اور سند تکمیل مولانا سید انور شاہ صاحبؒ سے حاصل کی۔ نیز آپ حکیم الامت حضرت تھانوی رہ کے خلفاء میں سے تھے۔

یں مدرسہ کی بنیاد رکھی اور بارہ سال تک اسی مدرسہ میں لوجہ اللہ تعلیم و تدریس میں مشغول رہے یہاں درس نظامی تک کتابیں پڑھائی جاتی تھیں مگر جگہ تنگ پڑجانے کی وجہ سے آپ نے ۱۳۶۶ھ میں حضرت دینپوری رح ہی کے حکم سے شاہی مسجد عیدگاہ خان پور شہر میں مدرسہ کو منتقل کردیا[1] جہاں ۵۰ سال سے یہ مدرسہ بے لوث دینی خدمات سرانجام دے رہا ہے اور پاکستان کے صف اول کے مدارس میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

آپ نے تقریباً ایک سال احمد پور شرقیہ والی مسجد میں بھی تدریس کا کام کیا جہاں بعض لوگوں کی درخواست پر آپ کو حضرت دینپوری رح نے بھیجا تھا۔ مگر حضرت دینپوری رح کے وصال کے بعد آپ واپس آگئے۔ پھر کچھ عرصہ مدرسہ شمس العلوم بستی مولویاں اور بستی مومن (مڈالیاس) میں پڑھانا بھی ثابت ہے۔

آپ کے مدرسہ کی دینی خدمات کا احاطہ مشکل ہے۔ نصف صدی کے عرصہ میں ۱۵ ہزار طلبہ کے قریب دورۂ تفسیر کی سند حاصل کی ، ۵ ہزار علماء کرام دورۂ حدیث کی سند حاصل کرچکے ہیں ، ۱۰ ہزار طلبۂ کرام قرآن کریم حفظ مکمل کرچکے ہیں ۱۸ ہزار طلبہ نے ناظرہ قرآن کریم مکمل کیا ہے، تقریباً ساڑھے تین ہزار طالبات ناظرہ قرآن کریم کی سند حاصل کرچکی ہیں اس کے علاوہ جامعہ کی مختلف چھوٹی بڑی شاخوں سے تقریباً ۱۲ ہزار طلبہ و طالبات ناظرہ قرآن کریم مکمل کرکے فارغ ہوچکے ہیں[2]

آپ کے مدرسہ میں ہر سال دورۂ تفسیر کا اہتمام کیا جاتا ہے جس میں ہزاروں تشنگانِ علم دور دراز سے سفر کرکے شعبان و رمضان میں یہاں قیام فرماتے ہیں، جن کا طعام و قیام مدرسہ کے ذمہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ سے امید ہے کہ یہ سلسلہ آپ کے بعد بھی قائم رہے گا۔

یہاں میں حضرت کے دورۂ تفسیر کی خصوصیات کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں تاکہ یہ اندازہ

---

[1] خان پور شہر میں منتقل ہونے سے قبل یہ مدرسہ پانچ برس تک چولستان میں بھی رہا۔

[2] تعارف جامعہ مخزن العلوم خانپور (شعبہ نشر و اشاعت جامعہ مخزن العلوم عیدگاہ خانپور)

لگے کہ آپ کس قدر تحقیق و تدقیق سے تفسیر کے لوازمات کو پورا کرتے تھے ۔
۰ آسان اور سلیس لفظی ترجمہ کے ساتھ ساتھ مختصر مطلب اور خلاصہ کا بھی اہتمام کیا جاتا تھا ۔

ب ۰ متعدد طرق پر ربط کو خاص طور پر واضح کیا جاتا تھا، مثلاً ربط بین السور، ربط بین الجمل و ربط الکلمات وغیرہ ۔

ج ۰ آیات کے مضامین کی وضاحت اور مطالب کے تعین کے لیے قرآن مجید اور حدیث رسول صلے اللہ علیہ وسلم، اقوال صحابہ کرام رضہ، اقوال تابعین و تبع تابعین، ائمہ مجتہدین اور سلف صالحین کے اقوال کی طرف اشارہ فرمایا کرتے تھے ۔

د ۰ قرآن مجید سے مذہب حق کے دلائل اور فرقہ باطلہ کی تردید کا مختصر اور جامع انداز میں خاص طور پر التزام فرماتے تھے ۔

و ۰ علماء کے ذوق میں اضافہ کے لیے تفسیری نکات اور اسرار و معارف کو بھی ساتھ ساتھ کھولتے جاتے تھے ۔

ھ ۰ اصلاح نفس اور جذبۂ جہاد کی روح پھونکنا تو گویا آپ کے مقاصد اولیں میں سے تھا ۔

سلوک و تصوف آپ کی تربیت بچپن ہی سے حضرت دینپوری رح کی نگرانی میں ہوئی، پھر بیعت بھی حضرت رح ہی کے دست مبارک پر فرمائی اور اجازت و خلافت حضرت دینپوری رح کے فرزند ارجمند و خلیفہ مجاز حضرت مولانا عبدالہادی دینپوری رح کی طرف سے عطا کی گئی

آپ کے شاگردوں کی طرح آپ کے مریدین بھی ہزاروں کی تعداد میں ملک اور بیرون ملک، دنیا کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں ۔

آپ کا مزاج خانقاہی نہیں تھا اس لیے آپ کے یہاں وہ نظام موجود نہ تھا، جو خانقاہوں میں ہوتا ہے، آپ اپنے متعلقین کو ذکر و اذکار تو بتلاتے تھے ہی، مگر آپ کا اصل منشاء اور چاہت یہ تھی، کہ قرآن و حدیث کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو، اس کو آپ جہاد اعظم فرماتے تھے اور اس مقصد کی خاطر زیادہ سے زیادہ مدارس اور مراکز

کھولے جائیں، علماء کرام ان کی سرپرستی فرمائیں، اور عوام ان سے تعاون فرمائیں، آپ کے نزدیک امت کے زوال کا سب سے اہم سبب قرآن و حدیث سے بے اعتنائی اور غفلت تھی، اسی لیے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "آج نہ مجھے قرآن کا شیدائی ملتا ہے نہ حدیث مصطفیٰ کا۔ پہلے حال والے تھے وہ چلے گئے، اب قال والے رہ گئے، پھر قال والے بھی چلے گئے تو اب نقال رہ گئے۔

آپ کی بیعت انفرادی بھی ہوتی تھی، اجتماعی بھی، بیعت کے الفاظ مختلف موقعوں پر مختلف سنے گئے، مگر بنیادی چیزیں ایک ہی ہوتی تھیں۔ عمومی طور پر بیعت ان الفاظ میں لیتے تھے۔

سب کہو۔ یا اللہ تو ایک ہے، تیرا کوئی شریک نہیں۔ یا اللہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تیرے سچے رسول اور پیغمبر ہیں۔ یا اللہ قرآن تیری سچی کتاب ہے۔ یا اللہ قیامت برحق ہے، سب نماز کی پابندی کرو، عشاء کے بعد ایک تسبیح لا الٰہ الا اللہ ایک تسبیح الا اللہ، ایک تسبیح اللہ اور ایک تسبیح ھُو کی۔

بعض مریدین کو ایک تسبیح لا الٰہ الا اللہ کی شام کو اور ساتھ ایک تسبیح استغفار کی، اور فجر کے بعد ایک تسبیح درود شریف کی اور ساتھ ایک تسبیح استغفار کی بھی تلقین فرماتے تھے۔

اس کے علاوہ بھی اپنے متعلقین کو خصوصاً اور عام مجمع کو عموماً مختلف موقعوں پر مختلف اوراد و وظائف تلقین فرمایا کرتے تھے، جو فیضان رحمت میں جمع کر دیئے گئے۔

ساری زندگی درس و تدریس اور زبانی وعظ و ارشاد ہی کو اپنا معمول بنائے رکھا ملک کے اطراف و اکناف میں جا جا کر قال اللہ و قال الرسول کے ذریعہ تذکیر و تبلیغ آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیث یار کہ تکرار می کنیم

تصنیف و تالیف

تصنیف و تالیف کی طرف آپ کا بالکل رجحان نہیں تھا۔ اگر آپ چاہتے تو کتب حدیث کی ضخیم شرحیں املا کروا سکتے تھے، اور

معارف وحکم پرمشتمل قرآن مجید کی عجیب وغریب تفسیر ہمارے سامنے ہوتی، مگر خدا کی شان کہ نہ تو خود آپ نے قلم اٹھایا' اور نہ کسی کو حکم فرمایا' البتہ آپ کے بعض مریدین ومعتقدین نے آپ کے مواعظ وملفوظات کو کتابی شکل میں لانے کی کوشش کی ہے جو حسب ذیل ہے :

۱: مُقَدِّمَۃُ القُرآن : آپ کے صاحب زادہ مولانا فداء الرحمان صاحب نے مرتب فرمایا ہے، اسے قرآنی علوم ومعارف کا خلاصہ سمجھنا چاہئے. قرآن فہمی کے لیے بہت ہی مفید ہے. مکتبہ مدینہ مخزن العلوم خان پور سے چھپا ہے .

۲: فَیضَانِ رَحمَت [۱] : آپ کے مختلف موقعوں پر تبلائے گئے اذکار وادعیہ کا مجموعہ ہے. جناب محمد منظور الوحیدی صاحب نے اسے مرتب کیا ہے' مکتبۃ الیوم ۱۹- مین بازار مزنگ لاہور سے چھپا ہے .

۳: شفاء المریض : جس کے مرتب مولانا محمد امان اللہ صاحب ہیں. سرورق پر لکھا ہے "افادات حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب درخواستی" مگر کتاب کے اندر مرتب کے اپنے شیخ مولانا سید زوار حسین شاہ صاحب کے افادات بھی شامل کردیئے گئے جس سے سارا مسئلہ خلط ملط ہوگیا ہے. اگر مرتب ساتھ ساتھ حوالہ دیتے جاتے کہ یہ دعا یا ذکر کس نے تلقین فرمایا ہے تو زیادہ مفید ہوتا. بہر حال اس کتابچہ کو کلیۃً حضرت درخواستی رح کے ساتھ منسوب کرنا صحیح نہیں. ادارہ کریمیہ تعلیم القرآن شیرانوالہ گیٹ لاہور سے چھپی ہے .

۴: فَیضَانِ رَحمَت : یہ حضرت درخواستی رح کی ایک تقریر ہے جو آپنے مسجد نبوی م

---

[۱] فیضان رحمت کے دو مزید نسخے میرے پاس موجود ہیں. ایک نسخہ پر "مرتبہ مولانا حاجی مطیع الرحمن درخواستی" لکھا ہوا ہے جامعہ مخزن العلوم خانپور سے چھپا ہے. دوسرے نسخہ پر مرتب کا نام مولانا فداء الرحمن درخواستی" درج ہے. جامعہ انوار القرآن کراچی کا طبع کیا ہوا ہے جس کے مرتب محمد منظور الوحیدی صاحب ہیں.

میں علماء و دینی طلبہ کے سامنے فرمائی تھی ۔حضرت مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی صاحب دامت برکاتہم نے اسے براہ راست لکھا اور دارالارشاد اٹک سے چھپوایا' دوسرا ایڈیشن ۱۴۰۳ھ میں نکل چکا ہے ۔

۵ ؛ فضائلِ ذِکر ؛ حضرت کے افادات کو آپ کے نواسے مولانا شفیق الرحمان درخواستی صاحب نے مرتب فرمایا ۔ انجمن خدام النبی والصحابہ خان پور نے اس کو طبع کروایا ہے ۔

۶ ؛ تقویٰ . باطنی کمال کا معیار ؛ حضرتؒ کے افادات آپ کے صاحب زادہ مولانا فضل الرحمان درخواستی صاحب نے مرتب فرمائے ہیں ۔ جامعہ مخزن العلوم عید گاہ خان پور سے یہ کتابچہ طبع ہوا'

۷ ؛ اُسوۂ حَسَنَہ ؛ یہ حضرت لاہوری رح اور حضرت درخواستی رح کی تقاریر کا مجموعہ ہے .مولانا عبدالرحمان صاحب نوشہروی نے مرتب فرما کر طبع کرایا

۸ ؛ اُصُولِ زِندَگی ؛ حضرت کے ملفوظات کا مجموعہ جناب عبدالکریم آف میلسی نے مرتب فرمایا ہے ۔ ادارہ کریمیہ شیرانوالہ گیٹ لاہور سے چھپا ہے ۔

۹ ؛ تفسیر سورۃ فَاتِحَہ ؛ احقر نے آپ کے تین دروس کو جو آپ نے ۷۶ء میں شہزادہ مسجد ایبٹ آباد میں دیئے تھے مرتب کیا' پہلی مرتبہ ۷۷ء میں دوسری مرتبہ ۸۳ء میں اور اب تیسری مرتبہ" معارف سورہ فاتحہ" کے نام سے ۹۳ء میں چھپ چکی ہے ۔

۱۰ ؛ تفسیر القرآن المجید ؛ آپ کے بڑے صاحب زادے مولانا فداء الرحمان (مہتمم جامعہ انوار القرآن نارتھ ناظم آباد کراچی) آپ کے دورۂ تفسیر کی ریکارڈ شدہ کیسٹوں سے قرآن مجید کی تفسیر مرتب فرما رہے ہیں ۔ اللہ کرے جلد یہ تفسیر منظر عام پر آکر تشنگان علوم قرآنی کی پیاس بجھا سکے ۔

اس کے علاوہ آپ کی مختلف تقاریر اور دروس قرآن و حدیث مختلف رسائل و جرائد میں چھپتے رہے ہیں جن کو اکٹھا کرنا ایک مستقل کام ہے ۔

سیاسی وابستگی آپ اپنے مرشد خلیفہ غلام محمد دینپوری رہ کے زمانہ ہی سے سیاست کے ساتھ وابستہ ہو چکے تھے، اور ان کی سرپرستی میں انگریز کے خلاف چلنے والی تحریک میں برابر حصہ لیا، حضرت دینپوری رہ کی وفات کے بعد جمعیۃ علماء ہند سے وابستہ ہو گئے۔ اور وہاں کام کرتے رہے۔ حضرت مدنی رہ سے آپ کا خصوصی تعلق تھا اور حضرت مدنی رہ بھی آپ پر خصوصی توجہ رکھتے تھے۔ جس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ حضرت مدنی رہ نے اپنے آخری دورۂ سندھ وملتان میں آپ کو اپنے ہمراہ رکھا۔

تقسیم کے بعد جب مولانا شبیر احمد عثمانی رہ کی سرپرستی میں جمعیۃ علماء اسلام کی بنیاد رکھی تو آپ جمعیۃ کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ ۱۹۵۶ء میں شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری کو جمعیۃ کی ذمہ داری سونپی گئی، تو آپ نے ان سے مل کر کام کیا۔ پھر ۱۹۶۲ء میں جب حضرت لاہوری کا انتقال ہوا تو متفقہ طور پر آپ کو جمعیۃ کا امیر منتخب کیا گیا۔ آپ کی امارت میں جمعیۃ نے نہ صرف ملک میں اسلامی نظام کے لیے خوب دوڑ دھوپ کی بلکہ ملک میں چلنے والی تمام اسلامی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، خصوصاً تحریک ختم نبوت ﷺ اور تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ، میں جمعیۃ ملکی سطح پر پیش پیش رہی، ملک کے بڑے بڑے علماء کرام نے آپ کی امارت میں کام کیا خصوصاً مولانا مفتی محمود صاحب رہ نے ۲۲ سال آپ کے ساتھ مل کر کام کیا۔

اہل وعیال آپ نے دو شادیاں کیں۔ پہلی اہلیہ محترمہ سے دو صاحبزادے مولانا فداء الرحمان درخواستی اور مولانا مطیع الرحمان درخواستی، اور تین صاحب زادیاں ہوئیں۔

پہلی اہلیہ محترمہ کے انتقال کے بعد مولانا عبدالشکور دینپوری کی ہمشیرہ سے نکاح ہوا۔ ان سے چھ صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں ہوئیں

صاحبزادے، عبدالرحمٰن درخواستی، مولانا عطاء الرحمان درخواستی، مولانا حافظ فضل الرحمٰن درخواستی، جمیل الرحمان درخواستی، عزیز الرحمان درخواستی، خلیل الرحمان درخواستی۔

بڑی صاحب زادی مولانا عبدالرؤف صاحب کے نکاح میں تھیں، آپ کے چار بیٹے

مفتی حبیب الرحمان درخواستی، مولانا سیف الرحمان درخواستی، مولانا انیس الرحمان درخواستی ہوئے۔

آپ کی تمام صاحبزادیاں بھی علم دین سے پوری واقفیت رکھنے والی تھیں۔

آپ کے خاندان میں دینی علوم کا اس قدر ذوق وشوق اور اس قدر اہمیت ہے کہ عصری علوم کی تحصیل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سب آپ کی تربیت کا فیضان ہے۔

خلافت آپ نے صرف دو صاحب زادوں کو خلافت عطا فرمائی۔

(۱) مولانا فداء الرحمان صاحب درخواستی (مہتمم جامعہ انوار القرآن کراچی)

(۲) مولانا حافظ فضل الرحمان صاحب درخواستی۔ (استاذ جامعہ مخزن العلوم خانپور)

حوالہ کے لیے دیکھئے رسالہ "تقویٰ" باطنی کمال کا معیار" کے سرورق کے اندرونی صفحہ، مرتبہ مولانا فضل الرحمان صاحب درخواستی۔ مطبوعہ جامعہ مخزن العلوم خان پور)

وفات طویل علالت کے بعد حضرت درخواستی رح ۶/ربیع الاول ۱۴۱۵ھ /۲۸/اگست ۱۹۹۴ء صبح ۱۰ بجے ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ واکرم نزلہ ووسع مدخلہ واغسلہ بالماء والثلج والبرد ونقہ من الخطایا کما ینقی الثوب الابیض من الدنس وابدلہ دارا خیرا من دارہ واھلا خیرا من اھلہ وزوجا خیرا من زوجہ وادخلہ الجنۃ واعذہ من عذاب القبر وعذاب النار۔

مآخذ

(۱) ید بیضا، حامی جیدی۔ خانقاہ عالیہ قادریہ راشدیہ دینپور شریف خانپور (۲) مقدمۃ القرآن، مولانا فداء الرحمن درخواستی، مکتبہ مدینہ مخزن العلوم خانپور (۳) ماہنامہ الرشید ساہیوال (دارالعلوم دیوبند) مکتبہ رشیدیہ ساہیوال۔

(۴) مشاہیر علماء دیوبند، حافظ قاری ڈاکٹر فیوض الرحمن صاحب، مکتبہ عزیزیہ ۱۳۔ اردو بازار لاہور۔

(۵) اکابر علماء دیوبند، حافظ اکبر شاہ بخاری، ادارہ اسلامیات ۱۹۰، انارکلی لاہور۔ (۶) ہمارے مشائخ (دستور العمل کے آئینے میں)، حکیم محمد حبیب اللہ الاقیمر احمد علوی، زہرالحسنی خانپور جنوبی (غازی خان)

(۷) تعارف جامعہ مخزن العلوم، شعبہ نشر واشاعت جامعہ مخزن العلوم عیدگاہ خانپور۔

مکرمی و محترمی ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ -

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس منعقدہ ۱۸ رجون ۱۹۹۵ء میں ائمہ مساجد کے محکمۂ اوقاف گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے تقرر اور مشاہرہ ملنے کی جو تجویز بحث وفکر کے لیے شرکائے مجلس کے سامنے آئی ہے اس پر ناچیز راقم السطور نے جو اظہار خیال کیا اس کا خلاصہ ارسال خدمت ہے امید ہے کہ شائع فرماکر ایک اہم دینی خدمت انجام دیں گے ۔

ابوالحسن علی ندوی
صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ و ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۸ رجون ۱۹۹۵ء کو دہلی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا جو جلسہ یونیفارم سول کوڈ نفاذ کے مسئلہ پر (جس کی طرف سپریم کورٹ نے حکومت کو توجہ دلائی) غور کرنے کے لئے منعقد ہوا اور جس میں نہ صرف پرسنل لا بورڈ کے اہم ارکان اور ذمہ داروں کا بلکہ ملک کے ممتاز علماء، قانون دانوں اور دانشوروں کا بھی ایک اچھا اجتماع تھا ایک اور مسئلہ سامنے آیا اور وہ ائمہ مساجد کے گورنمنٹ آف انڈیا کے وقف بورڈ سے مشاہرہ (تنخواہ) دینے کا مسئلہ جس کی بعض ائمہ مساجد اور اس تحریک کے خاص داعی اور ذمہ دار مولوی جمیل الیاسی صاحب کی طرف سے پُرزور تحریک چل رہی ہے ۔

راقم السطور اپنے وسیع تاریخی مطالعہ، امت اسلامیہ کے امتحانات اور آزمائشوں کی منزلوں اور دین کے مسخ و تحریف کے خطرات اور امت میں غلط رجحانات خاص طور پر حکومت واقتدار پرستی کے جذبہ کے حامل ہونے کے امکانات و مظاہر کی تاریخ سے بہ صرف مطلع ہونے بلکہ اس موضوع پر خصوصی طور پر تحقیق و تصنیف کے مرحلہ سے گذرنے کی بنا پر (جس کا ایک نمونہ اس کی کتاب تاریخ دعوت و عزیمت ۱، ۲، ۳، ۴، ۵ ہے) اس مطالبہ و تحریک کا نہ صرف مخالف بلکہ اس سے سخت خائف تھا' اس کے مطالعہ کا ماحصل اور نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں جو واحد دین 'مسخ و تحریف اقتدار وقت کا آلۂ کار بننے اور "زمانہ با تو نسازد تو بازمانہ بساز" کے اصول پر عمل کرنے سے

محفوظ رہا، اس کی ایک بڑی وجہ مساجد اور مدارس کی آزادی، حکومتوں سے بے نیازی اور خو کفالتی، اور ان کا مسلمانوں کے جذبۂ ایثار و اعانت اور ائمہ مساجد اور ذمہ داران و اساتذہ مدارس کا ایثار و قربانی و زہد و استغناء ہے جس کا ثبوت ہر دور میں ملتا رہا اور اس کی ایسی تابناک مثالیں ہیں جن کی نظیر دوسری ملتوں اور مذاہب میں تقریبًا ناپید ہیں۔ اب اگر مساجد و مدارس کی یہ آزادی خود کفالتی اور ائمہ و علماء کے ایثار و استغناء کا سدباب کر دیا گیا اور وہ حکومت کے حاشیہ بردار اور اس کے براہ راست یا اس کے صیغہ و شعبہ کے نمک خوار بن گئے تو پھر اس حق گوئی، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، رد منکرات و بدعات اور جہر و اعلان بالحق کا سلسلہ مسدود ہو جائے گا، اور ان مساجد و مدارس سے الکشنوں میں بھی کام لیا جائے گا، اور حکومت کی تائید و حمایت کا بھی۔

اس سلسلہ میں راقم السطور نے ہندوستان کے چند نامی گرامی مدارس عربیہ دینیہ کے کردار و ایثار اور استغناء و قربانی کے واقعات بیان کئے جن کی وجہ سے ابھی تک دین کی کوئی تحریف واقع نہیں ہونے پائی، اور اعلان حق اور انکار منکر کرنے والے ابھی تک موجود ہیں۔

اس سلسلہ میں مولوی محمد رابع ندوی مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے بڑے کام کی بات کہی، کہ ایک متعدد اسلامی ملک میں کچھ عرصہ سے یہ معمول ہو گیا ہے کہ خطبۂ جمعہ حکومت کی طرف سے لکھ کر دیا جاتا ہے اور وہی مرکزی مساجد میں پڑھا جاتا ہے، اس پر راقم نے یہ اضافہ کیا کہ ابھی بلاد عربیہ کے ایک سفر میں معلوم ہوا کہ ایک قابل اعزاز و احترام ملک میں یہ ہدایت جاری کی گئی ہے کہ سورۂ فاتحہ کی اخیر آیت "غیر المغضوب علیہم" کی تفسیر میں "مغضوب علیہم" کا مصداق بتاتے ہوئے یہود کی تصریح نہ کی جائے، جب ان بعض عرب اسلامی ملکوں میں خطبات جمعہ اور وعظ و بیان میں یہ مداخلت و پابندیاں شروع ہو گئیں ہیں تو پھر ہندوستان جیسے غیر مسلم اکثریت کے ملک اور "ہندو احیائیت" کے دور میں کیا اطمینان کیا جا سکتا ہے۔

الحمد للہ اس تقریر و مخالفت کے بعد (جس میں تقریبًا تمام حاضرین کی ترجمانی تھی) اس کے خلاف تجویز پاس کر لی گئی، اور اس سے مجلس کے اختلاف کا اعلان کر دیا گیا۔

*

شیخ الہند اکیڈمی کی اہم علمی مطبوعات

۱: **ادلۂ کاملہ** تالیف: حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ، جسے تسہیل وتشریح کے بعد نہایت دل کش انداز میں شائع کیا گیا ہے ——— ہدیہ -/۳۵

۲: **ایضاح الادلہ** تالیف: حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ، تحقیق وتحشیہ حضرت مولانا مفتی محمد سعید صاحب پالن پوری، نہایت اعلیٰ کتابت وطباعت -/۵۵

۳: **شوریٰ کی شرعی حیثیت** تالیف: حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری استاذِ حدیث دارالعلوم دیوبند، اس کتاب میں شوریٰ کی شرعی حیثیت کے علاوہ مدارس عربیہ کے شورائی نظام کار، ان کے دستوراساسی، رجسٹریشن اور وقف کے موضوعات پر مدلل ومحققانہ بحث کی گئی ہے۔ ——— ہدیہ -/۵۵

۴: **اجودھیا کے اسلامی آثار** تالیف: حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی استاذ وایڈیٹر رسالہ "دارالعلوم" دیوبند۔ اس کتاب میں شہر اجودھیا کے قدیم اسلامی آثار اور ان کی تاریخی حیثیت پر تحقیقی بحث کی گئی ہے۔ اپنے موضوع پر ایک مکمل ومستند کتاب ——— ہدیہ -/۳۵

۵: **ائمہ اربعہ** تالیف: حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری، اس کتاب میں محترم قاضی اطہر صاحب نے ائمہ اربعہ کے مکمل حالات زندگی اور ان کی دینی وعلمی گراں قدر خدمات کی تفصیلات کو مؤثر انداز میں تحریر کیا ہے ——— ہدیہ -/۴۰

۶: **تدوین سیر ومغازی** تالیف: قاضی صاحب موصوف۔ اردو لٹریچر میں ایک وقیع اضافہ، مواد معلومات میں مستند ترین اسلامی تاریخ سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے ایک بیش بہا علمی ذخیرہ ——— ہدیہ -/۵۵

۷: **ردشیعیت قرآن وسنت کی روشنی میں** تالیف: حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب قاسمی شیعیت کی تردید میں نہایت جامع کتاب جس میں خالص علمی وتحقیقی انداز میں قرآن وسنت کی میزان عدل

سے شیعیت کی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے ——— ہدیہ ۱۲/-

تفہیم القرآن کا تنقیدی جائزہ از: مولانا جمیل الرحمن صاحب پرتاپ گڈھی، اس میں مودودی صاحب کی تفسیر "تفہیم القرآن" کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے ——— ہدیہ ۱۹/-

شیخ الہند اکیڈمی کی دینی علمی پیش کش

خیر القرون کی درس گاہیں اور ان کا نظام تعلیم و تربیت از حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری

کتاب کا موضوع نام سے ظاہر ہے، اور اس کے علمی و تاریخی معیار کی بلندی کے لیے بحیثیت مؤلف قاضی صاحب کا نام نامی کافی ہے، مولانا مناظر احسن گیلانی کی تالیف نظام تعلیم و تربیت کے بعد اردو زبان میں اس موضوع پر یہ ایک جامع ترین اور محققانہ کتاب ہے، مدارس کے علماء و طلباء کے لیے جس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے، علاوہ ازیں اسلامیات کے موضوع پر مطالعہ کرنے والوں کے لیے یہ ایک اہم ترین تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب، ٹائیٹل دل کش، صفحات چار سو ——— ہدیہ صرف ۷۰/-

بحوث فی الدعوۃ والفکر الاسلامی معراج جسمانی، تعدد ازواج، دعوت دین سے متعلق مسلمانوں کی ذمہ داریاں، داڑھی کی شرعی حیثیت وغیرہ اہم دینی و علمی موضوعات پر حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمہ کے بلند پایہ مقالات و مضامین کا سلیس عربی ترجمہ بقلم حضرت مولانا نور عالم صاحب خلیل الامینی استاذ ادب عربی و ایڈیٹر "الداعی" دارالعلوم دیوبند مع تحقیق و تعلیق، کمپیوٹر کمپوزنگ، جاذب نظر طباعت کے ساتھ پہلی بار منظر عام پر آیا ہے ——— ہدیہ صرف ۳۰/-

---

PHONE: 2429
CODE: 01336
دار العلوم دیوبند کا ترجمان
PIN
247554
ماہنامہ
دار العلوم
جلد نمبر
شمارہ ۹
ماہ ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۹۵ء
فی شمارہ ۶/-
سالانہ ۶۰/-
نگراں
حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب
مہتمم دار العلوم دیوبند
مدیر
حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی
استاذ دار العلوم دیوبند
سالانہ بدل اشتراک
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ۳۰۰/- روپے
پاکستان سے ہندوستانی رقم ۱۰۰/-
بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ۸۰/-
ہندوستان سے ۶۰/-
دفتر ماہنامہ دار العلوم دیوبند سہارنپور
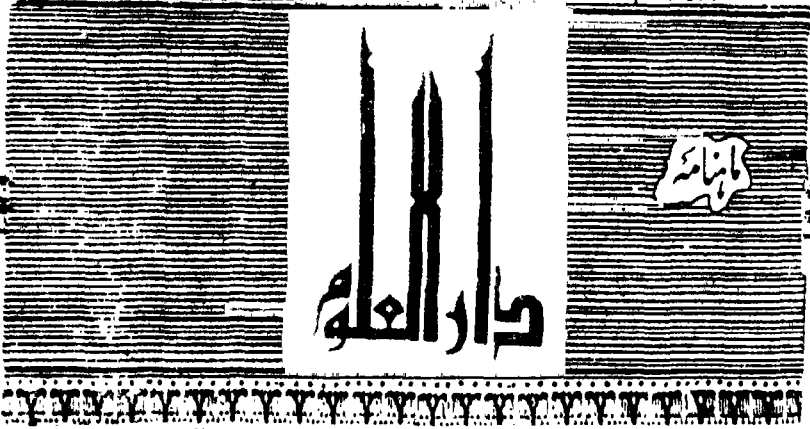
فہرست مضامین

ختم خریداری کی اطلاع

- ○ یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔
- ● ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں
- ● چوں کہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہو گیا ہے اس لیے وی، پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- ● پاکستانی حضرات مولانا عبد الستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کر دیں۔
- ● ہندوستان اور پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔
- ● بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس الرحمن سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی حسب ذیل بیان کئے ہیں (۱) تلاوت آیات (۲) تعلیم کتاب (قرآن) وحکمت (سنت) (۳) تزکیہ قلوب، جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے۔

لقد من اللّٰہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولاً منھم یتلوا علیھم آیاتہ و یزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ۔ (الآیۃ)

اللہ تعالیٰ نے مومنین پر احسان فرمایا کہ ان میں بھیجا ایک رسول انہی میں سے پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

خود اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے مقصد بعثت کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے "بُعثت معلماً" اور بعثت لاتمم مکارم الاخلاق" یعنی میں اس لیے بھیجا گیا ہوں تاکہ اللہ کے بندوں کو اللہ تعالیٰ کے احکام و فرمان سے باخبر کردوں اور انسانوں کو تمام مراتب شرک ومعصیت اور نفسانی آلائشوں سے پاک وصاف کر کے انہیں اخلاق وکردار کے اعلیٰ مقام پر پہنچا دوں۔

قرآن وحدیث کی ان تشریحات سے پتہ چلتا ہے کہ "اسلام" اور تعلیم وتزکیہ کی تاریخ ساتھ ساتھ چلتی ہے، اسلام کا آغاز ہی تعلیم وتزکیہ کی ابتداء ہے اور ان میں باہم چولی دامن کا ساتھ ہے، اس لیے اسلام بغیر علم وتزکیہ کے ایک جسد بے روح ہے اور تزکیہ وتعلیم کا تصور بغیر اسلام کے ایک فریب محض ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی تبلیغ ودعوت کے ساتھ تعلیم وتزکیہ کا بھی پورا پورا اہتمام فرماتے تھے، مکہ کی زندگی جہاں مالک حقیقی کا نام لینا ہی سب سے بڑا گناہ اور فکرو رائے کی آزادی سنگین جرم تھا، شرک وکفر اور ظلم وجبر کی اس گھٹی ہوئی فضا میں آپ جہاں ایک طرف چل پھر کر اسلام کی دعوت کا فریضہ انجام دیتے تھے وہیں دوسری طرف دار ارقم میں بیٹھ کر مسلمانوں کو کتاب وسنت کی تعلیم اور تزکیۂ اخلاق کا کام بھی انجام دیتے تھے۔

ہجرت مدینہ کے بعد جب ایک گونہ اطمینان نصیب ہوا، اور آزادی کا ماحول میسر آیا تو مسجد نبوی کی تعمیر کے ساتھ مسجد سے متصل جانب شمال الگ سے ایک مدرسہ اور تربیت گاہ بھی تعمیر کرائی جو اسلامی تاریخ میں "صفة المسجد" اور مختصر لفظوں میں "صفہ" کے نام سے معروف ومشہور ہے، یہ اسلام کی اولیں اقامتی درس گاہ تھی، جہاں طالبانِ علوم وتزکیہ کا ہمہ وقت قیام رہتا تھا، اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وتربیت سے مستفیض ہوتے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرات خلفاء نے اس سلسلے کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اس کو مزید آگے بڑھایا، بالخصوص خلیفۂ ثانی حضرت فاروق اعظم نے اسے مستقل نظام بنا دیا۔ حکومتی سطح پر اس کوشش کے ساتھ ساتھ حضرات صحابہ بطور خود بھی اپنی اپنی جگہوں پر تعلیم تربیت اور تزکیۂ اخلاق کی خدمات انجام دیتے تھے، گویا جو صحابی جہاں پہنچ جاتا تھا وہیں ایک مدرسہ اور خانقاہ قائم ہوجاتی تھی، چنانچہ ان حضرات کے تلامذہ یعنی تابعین حدیث، تفسیر، فقہ اور مغازی وسیر کے امام ہونے کے ساتھ زہد وتقویٰ اور مکارم اخلاق کے بھی پیکر ہوتے تھے، امام حسن بصری رح، امام محمد بن سیرین، سعید بن مسیب، امام زہری رح، امام اوزاعی، امام نخعی وغیرہ حضرات تابعین کے تذکرے پڑھ کر دیکھ لیجئے ان کا ہر ہر فرد علمی عبقریت کے ساتھ اعمال واخلاق کا مجسمہ ملے گا۔

پھر یہ زریں سلسلہ حضرات تابعین ہی پر ختم نہیں ہوگیا بلکہ تراجم اور تذکروں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری تک علماء میں بالعموم یہی جامعیت موجود رہی کہ وہ بیک وقت محدث، مفسر، متکلم، ادیب اور مورخ ہونے کے ساتھ اعلےٰ درجے کے متقی پارسا اور اور اصطلاحی الفاظ میں صوفی وشیخ ہوتے تھے، چوتھی صدی کے بعد اس جامعیت میں اضمحلال

آنا شروع ہوگیا جو دھیرے دھیرے اس حد تک پہنچ گیا کہ علما مختلف طبقات میں تقسیم ہو گئے، اور ہر طبقہ کسی ایک فن کے ساتھ مخصوص ہوگیا، لیکن علم وعمل میں توافق اور یکسانیت پہلے کی طرح قائم رہی اگر کہیں اس میں تضاد یا کمی نظر آتی ہے تو وہ بالعموم انفرادی اور شخصی حد تک ہے، جسے معاشرۂ علماء نے برداشت نہیں کیا اور ایسے شخص کو وہ اپنی جماعت میں شمار نہیں کرتے تھے۔

علم وعمل یا تعلیم وتزکیہ کا یہ باہمی ارتباط اسلامی ہند کے آخری عہد تک قائم رہا چنانچہ مسند ہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح کا خانوادہ جو اسی آخری دور کی یادگار ہے اس کا ایک ایک فرد علوم وفنون اور سلوک وتصوف کا جامع تھا بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ اس گنج گرانمایہ اور متاع گم گشتہ کو اگلی نسلوں تک پہنچانے میں اس خاندان نے تاریخی کردار ادا کیا ہے۔

۱۸۵۷ء (۱۲۷۴ھ) کے سیاسی انقلاب نے مسلمانوں کی قوت وشوکت کے مناروں کے ساتھ ان کے تعلیمی وتربیتی مراکز کو بھی تہ وبالا کر دیا، اس اتھل پتھل کے وقت اسی خانوادۂ ولی اللہی کے چند حاشیہ نشینوں اور فیض یافتوں نے اسلام اور اس کی روایات کی حفاظت کے لیے نہایت خاموشی کے ساتھ "دیوبند" جیسے کوردہ اور گم نام مقام میں ایک ایسے مدرسہ کی بنیاد رکھ دی جو بیک وقت مدرسہ اور خانقاہ دونوں کی ضرورت پوری کرے اور اسلام کے ایسے مبلغ وسپاہی تیار کرے جو فی اللیل رہبان وفی النہار فرسان کے نمونے ہوں۔ اور حضرات بانیین کے اخلاص نیت کی برکت سے تھوڑی ہی مدت میں یہ قصباتی مدرسہ اسلامیہ ایک عظیم بین الاقوامی دار العلوم بن گیا، اور اس کے علماء وفضلاء کو ایسی مقبولیت ومرجعیت حاصل ہوئی کہ ان کے سامنے کسی کا چراغ روشن نہ رہ سکا۔ حالانکہ علماء دیوبند کے علاوہ دیگر علمی حلقوں میں ایسے علماء وفضلاء کی خاصی تعداد اس وقت موجود تھی، جو تبحر علمی میں علماء دیوبند سے کسی طرح فروتر نہیں تھے لیکن علم وعمل یا عالمیت ومشیخت کی وہ جامعیت جو علماء دیوبند کی خصوصیت تھی، ان میں یہ حضرات ہمارے علماء کا مقابلہ نہ کر سکے، اس لیے پیچھے رہ گئے۔

علم وعمل کی جامعیت ہی "دارالعلوم دیوبند" کی وہ خصوصیت ہے جس نے اسے ماضی میں چہار دانگ عالم میں شہرت ومقبولیت سے ہم کنار کیا اور آج بھی اس کی نیک نامی اسی جامعیت پر موقوف ہے، دارالعلوم کا یہ وہ منہاج اور نصب العین ہے جو اسے دیگر علمی اداروں سے ممتاز بناتا ہے۔ مقام شکر ہے کہ دارالعلوم کی موجودہ انتظامیہ اس بات کو پورے طور پر محسوس کرتی ہے اور اس جامعیت کو برقرار رکھنے کی جدوجہد میں پوری طرح سے کوشاں ہے۔

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ مغربیت کے عروج اور مادیت کے فروغ سے پہلی جیسی کامیابی حاصل نہیں ہورہی ہے لیکن بندہ کا کام تو سعی وکوشش ہے اثرات ونتائج تو قادر مطلق کے قبضۂ قدرت میں ہیں، انشاء اللہ یہ جدوجہد رائگاں نہیں جائے گی اس لیے عیب چینوں اور خوردہ گیروں کی باتوں سے نہ بددل ہونے کی ضرورت ہے اور نہ ہی ان کے جواب کی فکر کی۔ بس اخلاص اور دل سوزی کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہنا چاہیے۔

امام شافعیؒ کے ملفوظات

فرماتے تھے "علماء کا جمال شرافتِ نفس ہے اور علم کی زینت ورع اور پرہیزگاری ہے۔
آپ کا ارشاد ہے" جو شخص آخرت کا طالب ہے اس کو علم میں اخلاص لازم ہے۔
ایک مرتبہ فرمایا" عالم کے لیے ضروری ہے کہ اس کا کوئی ورد اور وظیفہ ہو جو اس کے اور اللہ کے درمیان ہو۔
فرماتے تھے" اگر تم پوری کوشش کرو کہ سب لوگ تم سے راضی ہوجائیں تو اس کی کوئی صورت نہیں ہے، پس چاہیے کہ بندہ اپنے اور اللہ تعالے کے درمیان عمل کو خالص کرے۔

از: اقوال سلف

مولانا عبدالعلیم اعظمی، جامعہ مظہرالعلوم بنارس

طبقۂ نسواں پر رحمۃ للعالمین

کے ناقابل فراموش احسانات

مقالہ کا عنوان " طبقۂ نسواں پر رحمۃ للعالمین کے ناقابل فراموش احسانات" ہے، مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ احسانات کے ذکر سے پہلے عورتوں کی وہ حالت ذکر کردی جائے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تھی، اس لیے کہ اشیاء کی مکمل معرفت اضداد سے ہوا کرتی ہے۔ اس طرح عورت کے بارے میں دو دور فرض کیے جاسکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اور آپ کے بعد۔

عورت کی حیثیت یونان قدیم میں

یونان میں عورت کو شیطان کی بیٹی، اور نجاست کا مجسمہ سمجھا جاتا تھا، وہ غلاموں کی طرح بازاروں میں بیچی جاتی تھی، میراث میں اس کا کوئی حق نہ تھا۔ نکاح وطلاق کا پورا معاملہ مردوں کے ہاتھ میں رہتا تھا، اسی طرح شوہر کے مال میں اس کو تصرف کا کوئی حق نہ تھا۔

عورت یہودی مذہب میں

یہودیوں کے وہاں بیٹیوں کا درجہ بیٹوں سے کمتر بلکہ نوکر چاکر سے بھی بدتر تھا، بھائیوں کی موجودگی میں اسے میراث کا حق نہ تھا، حتی کہ باپ اسے فروخت بھی کرسکتا تھا۔

عورت ہندو معاشرہ میں

عورتوں کی ہندو معاشرہ میں کیا حیثیت تھی، اس کے متعلق پروفیسر، ان، سی، مہتا لکھتے ہیں:

"معاشرتی نظام میں ہندو عورت کی جداگانہ حیثیت تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے خصوصاً اس حالت میں جب کہ وہ کسی کی بیٹی یا کسی کی بہو یا بیوی ہو، اس کو مرد کی محبت آمیز نگرانی کے بجائے وراثت کے جداگانہ حقوق دے دینا گویا دیوی

کو اسکے تخت اعلیٰ سے آتار دینا تھا، اسی طرح شوہر کی چتا پر زندہ جل کر مرنا، ایک ہندو بیوہ کے لیے کار عظیم سمجھا جاتا تھا۔"

عورت عرب جاہلیت میں

لڑکیاں زندہ دفن کی جاتی تھیں اور ان کی کفالت کو ایک بوجھ سمجھا جاتا تھا، وہ بطور وراثت بھی دی جاتی تھیں، خریدی اور بیچی جاسکتی تھیں، دامادی کے عیب سے بچنے کے لیے ان کا نہ ہونا ہی اچھا سمجھا جاتا تھا قرآن نے اس معاشرہ کی اس طرح تصویر کھینچی ہے، جب بیٹی کی پیدائش کی خبر کسی کو دی جاتی ہے تو مارے غم کے اس کا چہرہ سیاہ پڑجاتا ہے اور دل میں گھٹنے اور الجھنے لگتا ہے۔ اس منحوس خبر سے لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا ہے، (اور اسکی سمجھ میں نہیں آتا کہ) یہ ذلت کا بوجھ اٹھائے پھرے یا مٹی میں گاڑ دے، کتنا برا اور غلط ان کا فیصلہ ہے لڑکیوں کو زندہ دفنانے کا عام رواج تھا، جس کے خلاف قرآن نے پُرزور آواز اٹھائی، اور مظلوموں کی وکالت کی، (واذا الموٴدة سئلت ۔ بأی ذنب قتلت ۔ (التکویر ۸-۹) جس دن دفنائی ہوئی بے گناہ بچی سے پوچھا جائے گا کہ کس جرم میں قتل ہوئی۔

پوری دنیا میں عورت ظلم وستم کا تختۂ مشق بنی ہوئی تھی، اور کہیں بھی اس کے زخموں کا درماں نہیں تھا۔ اگر اس کے ساتھ احسان کیا تو رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ اس کو زندہ درگور ہونے سے بچایا، اس کو وراثت کا وارث بنایا۔ گھر کے اندر اسکی حاکمیت کو تسلیم کرایا۔ اس کی پیدائش کو باعث برکت بتایا۔ اس کے پیروں کے نیچے جنت کو رکھا، اور اس کا عملی نمونہ بھی پوری امت کے سامنے پیش کیا جیساکہ آنے والی حدیثوں سے اس کی مکمل وضاحت ہورہی ہے، آپ نے اپنے عنفوان شباب میں جو جوانی کے جذبات اور ولولوں کی ہوتی ہے۔ ایک سن رسیدہ بیوہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا جو عمر میں آپ سے پندرہ سال بڑی تھیں، اور ان کے ساتھ اس لطف ومحبت کی زندگی بسر کی، جب تک وہ زندہ رہیں، دوسری شادی نہیں کی

ایک حدیث میں بطور تمثیل آپ نے اس طرح ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن میں سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھولونگا تو دیکھونگا، کہ ایک عورت مجھ سے پہلے اندر جانا چاہتی ہے۔

میں پوچھوں گا، تو کون ہے ؟ وہ کہے گی میں ایک بیوہ ہوں جس کے چند یتیم بچے تھے۔
لڑکیوں کی پیدائش منحوس سمجھی جاتی تھی، مگر آپ نے ان کی پیدائش کو خیر و برکت بتلایا۔ ارشاد ہوا، جس نے دو یا تین بچیوں یا دو یا تین بہنوں کی ان کی شادی تک پرورش کی یا انہیں چھوڑ کر مرا، تو میں اور وہ جنت میں انگلیوں کی طرح ساتھ ہوں گے، اور یہ کہتے ہوئے آپ نے دو انگلیوں کو ملا کر اشارہ کیا۔

دوسری حدیث میں فرمایا گیا، جس پر ان بچیوں کی ذمہ داری آئی اور ان سے عہدہ برآ ہوا تو اس پر دوزخ حرام ہے۔

ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا، جس کی تین بیٹیاں یا دو بہنیں یا دو دو ہوں اور وہ ان سے اچھا معاملہ کرتا ہے یعنی انہیں علم و ہنر سکھا کر شادی کر دیتا ہے تو اس کے لیے جنت ہے۔

ایک حدیث میں تو بالکل صاف کہہ دیا گیا ہے، کہ جس کے کوئی بیٹی ہو اور اسے وہ دفن نہ کرے، نہ اس کی توہین کرے اور نہ بیٹے کو اس پر ترجیح دے تو اللہ اسے جنت میں داخل کرے گا۔

مسلم شریف کی روایت ہے کہ جو شخص لڑکیوں کی پیدائش میں مبتلا کیا گیا اور اس نے ان کی پوری پرورش کی تو وہ لڑکیاں اس کے لیے دوزخ سے آڑ بن جائیں گی۔

ایک صحابی سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول سے عرض کیا کہ ہماری بیویوں کا ہم پر کیا حق ہے، تو آپ نے فرمایا کہ جب تم کھاؤ تو انہیں بھی کھلاؤ، اور تم پہنو تو انہیں بھی پہناؤ، اور چہرے پر مت مارو، اگر اس سے علیحدگی اختیار کرنا چاہو، تو صرف یہ کرو کہ بستر الگ کر دو، مکان الگ نہ کرو۔

ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جو عورت اپنے شوہر کی تابعدار اور مطیع ہو، اس کے لیے پرندے ہوا میں استغفار کرتے ہیں۔ اور مچھلیاں دریا میں اور فرشتے آسمانوں میں، اور درندے جنگلوں میں۔

صحیح بخاری میں خادمہ کے بارے میں فرمایا گیا۔ "ان تین آدمیوں میں جن کو دوہرا اجر

ملے گا، وہ بھی ہے جس کی کوئی نوکرانی یا باندی ہو اور وہ اسے علم وادب اور سلیقہ سکھائے دوسری روایت میں ہے پھر نکاح کرے۔

رحمۃ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم نے جس طرح ازواج مطہرات کے ساتھ خود کریمانہ وشریفانہ برتاؤ کیا، اپنی امت کے مردوں سے بھی مطالبہ کیا کہ وہ اپنی اپنی بیویوں کے ساتھ بہتر سے بہتر برتاؤ کریں۔ اتنا ہی نہیں کیا بلکہ خوش اخلاقی کو ایمان کی علامت قرار دیا، حدیث شریف میں ہے کہ کامل ایمان والا شخص وہ ہے جو اپنی بیویوں کے لیے اچھا ہے۔

مذکورہ احادیث اور ان کی تصریحات سے واضح ہو گیا کہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو ماں، بہن، بیٹی اور بیوی ہونے کی ہر حیثیت اور ہر حالت میں اس کا جائز حق دلایا اور ہر طرح اس کی قدر ومنزلت میں اضافہ کیا۔ حسن معاشرہ کے باب میں فقہ اور حدیث کی ہر کتاب میں عورتوں کے ساتھ کس طرح زندگی بسر کی جائے اس کا باب موجود ہے، طوالت کے خوف سے انھیں چند سطور پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مراجع

۱: معارف القرآن — از: مولانا مفتی محمد شفیع صاحب

۲: مسلم پرسنل لا اور اسلام کا عائلی نظام — ” مولانا شمس تبریز خاں ”

۳: دین رحمت — ” مولانا معین احمد ندوی ”

۴: تعمیر حیات و دیگر پرچہ جات۔

مولانا اعجاز احمد اعظمی

نقد بر حقیقتِ رجم

قسط ۲

مصنف کی زبردستی

صاحب نظر مصنف نے زانی محصن سے رجم کی نفی کے سلسلے میں ایک روایت نقل کر کے اس سے استدلال کیا ہے، حالانکہ ان کے بقول قرآن کی واضح تعلیمات کے بعد اس کی قطعاً ضرورت نہ تھی بلکہ سرے سے کتاب ہی لکھنے کی قطعاً ضرورت نہ تھی، مگر جب بیکار ہی کی ٹھن چکی تھی، اور سہی۔ فرماتے ہیں کہ :

"حضرت عبداللہ بن عباس کے واسطے سے عہد رسالت کا اسی طرح کا ایک اور واقعہ بھی آتا ہے جس میں آپ نے مزنم خاتون کو رجم نہیں کرایا، باوجودیکہ وہ شادی شدہ تھی .... اس واقعہ کی تفصیل یوں ہے۔

ان رجلا جاء الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال ان امرأتی لاترد ید لامس قال غربها قال اخاف ان تتبعها نفسی قال فاستمتع بها۔

ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا کہ میری بیوی کسی بھی لامس کے ہاتھ کو نہیں لوٹاتی، آپ نے فرمایا، اسے وطن سے کہیں دور بھیج دو، اس نے عرض کیا مجھے ڈر ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ میری جان نکل جائے گی۔ آپ نے فرمایا اگر ایسا ہے تو اس سے فائدہ اٹھاؤ۔

اس حدیث کے ترجمہ میں صاحب نظر مصنف سے دو ایسی فاش غلطیاں ہوئی ہیں جس کی توقع کسی ایسے شخص سے نہیں ہو سکتی جس کو اسلامی فقہ سے ذرا بھی مناسبت ہوگی پہلی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے غربها کا ترجمہ "وطن سے کہیں دور بھیج دو" لغت کے اعتبار سے

یہ ترجمہ درست ہے، لیکن جس کو بھی ذرا عقل ہو گی، یہاں غربہا کا یہ ترجمہ ہرگز نہیں کرے گا ظاہر ہے کہ بیوی زانیہ ہو، تو اس کے وطن سے دور بھیجنے کا عقلاً اور شرعاً کوئی معنی ہی نہیں مصنف غریب کو معلوم ہی نہیں کہ لفظ غرب طلاق سے کنایہ ہے۔ صاحب سبل السلام علامہ امیر صنعانی لکھتے ہیں کہ قال فی النہایۃ ای البعدھا یرید الطلاق ص۱۹۴ ج۳ مطلب یہ ہے کہ اسے دور کر دو، یعنی طلاق دے دو۔

دوسری غلطی اخاف ان تتبعہا نفسی کے ترجمہ میں کی ہے اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ طلاق دینے کے بعد مجھے اندیشہ ہے کہ میری طبیعت اسی کے پیچھے لگی رہے گی جس کی وجہ سے میرے برائی میں پڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ تب آپ نے فرمایا کہ ایسا ہے تو پھر اسی کو رکھو۔ اس کا ترجمہ جان نکلنے سے کرنا قطعاً غلط ہے۔

پھر مصنف نے زبردستی کا زور اس پر لگایا ہے کہ لا ترد ید لامس کا معنی قطعی طور پر زنا کا ہے پس ثابت ہوا کہ باوجود زانیہ محصنہ ہونے کے آپ نے اسے رجم نہیں کرایا۔ اگر مصنف کی یہ بات مان لی جائے، تو ان سے چند سوالات ہیں۔

۱۔ یہ لفظ کھلی بات ہے کہ زنا کے معنی میں صریح نہیں ہے، کنایہ ہے اور کیا آپ ثابت کر سکتے ہیں کہ کنایہ سے حد زنا یا حد قذف یا کسی بھی حد کا ثبوت ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کی نظر میں اس کا کوئی ثبوت ہو تو ہم بھی مشتاق ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ الفاظ کنائی سے حدود کا ثبوت قطعاً نہیں ہوتا۔ اس لیے نہ یہاں زنا کا ثبوت ہے نہ قذف کا، پس نہ رجم کا حکم ہو گا، اور نہ لعان کا۔ مگر مصنف نے قلم پکڑنا سیکھ لیا تو سمجھ گیا کہ احکام میں بھی قلم چلا سکتا ہے۔

۲۔ اگر مصنف کے بقول زنا کا ثبوت اس لفظ سے ہو بھی جائے تب بھی محض اتنی سی بات سے کسی حد کا تصور مصنف کی عالی دماغی کا کرشمہ ہے کیوں کہ ایک طالب علم بھی جانتا ہے کہ صرف شوہر کے الزام سے کوئی حد نافذ نہیں ہوتی جب تک کہ چار گواہ نہ ہوں، اور گواہوں کی شرط قرآن کریم کی نص قطعی سے ثابت ہے یا جب تک عورت کے دعوی برأت کے بعد شوہر کی طرف سے چار قسمیں اور عورت

کی طرف سے قسم کھانے سے انکار نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ شوہر جب بیوی پر زنا کا الزام لگاتا ہے اور عورت قاضی کے یہاں برأت کا دعوی کرتی ہے تو قاضی دونوں سے چار چار قسمیں لیتا اور پانچویں مرتبہ میں جھوٹے ہونے کی صورت میں دونوں کے اوپر اللہ کی لعنت اور غضب کی بد دعا انہیں سے کرواتا ہے، اسی کو لعان کہتے ہیں۔ اگر دونوں ایسا کر لیتے ہیں تو عورت پر سے زنا کی تہمت اور حد ختم ہو جاتی ہے اور اگر دونوں میں سے کوئی قسم سے انکار کر دیتا ہے تو چند شرطوں کے ساتھ یا تو مرد پر حد قذف یا عورت پر حد زنا لگتی ہے اس کے بغیر عورت پر حد زنا کا تصور، اور پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اس کو ٹال دینا، اس کا خیال تک مصنف کے علاوہ کوئی لا نہیں کر سکتا۔

۲، اور اگر مصنف کو اصرار ہو کہ صرف شوہر کے کہہ دینے سے ہی زنا کا ثبوت ہو جاتا ہے تو اولاً تو یہ قرآن کے خلاف ہے اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے ولم یکن لھم شھداء الا انفسھم تاہم اگر تھوڑی دیر کے لیے مصنف کا نظریہ مان بھی لیا جائے تو مصنف سے سوال ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو کم از کم سو کوڑے تو لگوانے چاہئیں تھے، آخر قرآن کے قطعی حکم کو آپ نے کیوں کر معاف کر دیا۔

بحمد للہ مصنف کو بھی یہاں کھٹک پیدا ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ہوش درست تھے، مگر پھر فوراً ہی اس ہوش کو رخصت کر دیا۔ جو جواب حضرت نے دیا ہے وہ بغیر بے ہوشی یا جنون کے دیا ہی نہیں جا سکتا۔ جواب میں ایک وہم وگمان پیش کیا ہے اور اس طرح پیش کیا ہے، جیسے وہ کوئی تاریخی واقعہ ہو۔ فرماتے ہیں:

> "رہا سو کوڑے لگانے کا مسئلہ تو یہاں اس کا احتمال ہے کہ اس عورت کو اس سے پہلے اس جرم میں سو کوڑے لگوائے جا چکے ہوں، اس کے باوجود اس نے اپنی روش کی اصلاح نہ کی ہو، اس پر اس کے شوہر نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دوبارہ یہ مسئلہ رکھا ہو تو آپ نے وہ مشورہ دیا ہو جس کا ذکر روایت میں موجود ہے۔"

سبحان اللہ! محض احتمال سے سو کوڑے لگائے جانے کا ثبوت علم تاریخ کا بالکل نیا

استدلال ہے۔ جو ہمارے صاحب نظر مصنف کی ایجاد ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کسی زانیہ کو جرم زنا کی سزا میں سو کوڑے لگائے جا چکے، اور وہ پھر اسی گناہ کی مرتکب ہوتی ہے، تو اسے معاف کردیا جائے گا، اور اس پر حد نہیں لگے گی، ؟ مصنف جواب دیں

۴۔ اچھا چلئے یہ بھی مان لیا کہ اس عورت پر پہلے سو کوڑے لگائے جا چکے مگر پھر بھی اس نے اپنی روش کی اصلاح نہ کی تو آپ کا کیا خیال ہے ؟ کیا وہ عورت اسلامی معاشرہ میں رہنے کے قابل ہے وہ کس لامس کے ہاتھ کو نہیں لوٹاتی تو کیا اس کے اصلاح حال کی امید ہے اور کیا جنسی بے راہ روی اس کے رگ وریشے میں سرایت نہیں کرگئی ہے ؟ اس کا جواب آپ نفی میں نہیں دے سکتے۔ پس آپ کے اصول کے مطابق تو یہ عورت مستحق رجم تھی، نہ کہ قابل درگذر! کبھی کبھی اپنے فرمودات پر غور کرلیا کیجئے۔

۵۔ پھر ایک پیچیدہ سوال یہ ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی بیوی کے زنا جیسے سنگین جرم کا معاملہ پیش کرتا ہے تو وہاں آپ کو مشورہ دینا چاہئے یا بحیثیت امام وحاکم اس کا فیصلہ کرنا چاہئے خواہ کوڑا ہو یا رجم۔ کیا یہ بھی کوئی قانون ہے کہ ایک شخص پر زنا کی حد کے طور پر مثلاً کوڑا لگایا جا چکا ہے اور پھر دوبارہ وہ زنا کا مرتکب ہوتا ہے تو اس پر دوبارہ حد جاری کرنے کے بجائے گھر والوں کو مشورہ دیا جائے گا کہ اسے وطن سے دور بھیج دو، اور اگر وہ کہیں کہ اس کے جانے سے ہماری جان نکل جانے کا اندیشہ ہے تو انھیں رخصت دے دی جائے کہ اچھا ایسا ہے تو پھر اسے رہنے دو، کیا حد کا ثبوت ہونے کے بعد امام کو اس کے معاف کرنے کا اختیار ہے۔

۶۔ پھر ایک اور اہم سوال یہ ہے کہ کیا زنا کی عادی عورت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی مومن کے نکاح میں رہنے دینے کو گوارہ فرمائیں گے؟ کیا یہ والزانیۃ لاینکحہا الا زان او مشرک وحرم ذلک علی المؤمنین کے خلاف نہیں ہے ؟ اور کیا آپ کسی شخص کو دیوث بننے کا مشورہ دیں گے ؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاحب نظر مصنف کی صرف نظر ہی نہیں دل و دماغ بلکہ ذوق و احساس تک مردہ اور بے جان ہیں جو ان سے اس قسم کی باتیں سرزد ہوئی ہیں۔

یہ ساری مصیبت اس لیے آئی کہ انھوں نے لاترد ید لامس سے مراد فعل زنا لے لیا مگر یہ کھلی ہوئی غلطی ہے، اس کا مطلب یہاں زنا ہرگز نہیں ہے بلکہ وہ ہے جو علامہ امیر صنعانی نے سبل السلام میں لکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں فالا قرب المراد انها سهلة الاخلاق ليس فيها نفور و وحشة عن الاجانب لا انها تاتي الفاحشة وكثير من النساء والرجال بهذه المثابة مع البعد من الفاحشة ص۱۹۵ ج۳۔

مطلب یہ ہے کہ لاترد ید لامس کا قریب تر مطلب یہ ہے کہ اس کے اخلاق میں لچک ہے اس میں اجنبیوں سے وحشت و نفور نہیں ہے، نہ یہ کہ وہ زنا کا ارتکاب کرتی ہے اور بہت سے مرد و عورت باوجود زنا سے دور ہونے کے اس صفت کے ہوتے ہیں یعنی ان میں نرمی اور لچک پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ غیروں سے بہت جلد بے تکلف ہو جاتے ہیں، اور انھیں حجاب نہیں ہوتا، کسی غیرت مند شخص کے لیے ایسی عورت سوہان روح بن جاتی ہے، شکایت کرنے والے صاحب غیرت مند بھی ہیں، اور محبت کے ہاتھوں مجبور بھی ہیں۔ غیرت کے باعث انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ لیا، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے غیرت کے ہی تقاضے کے مطابق جواب دیا، کہ اسے چھوڑ دو، مگر وہ محبت کے ہاتھوں بے بس ہو گئے، ان کی جب یہ کیفیت حضورؐ نے دیکھی تو مجبوراً اسی کو رکھنے کی اجازت دے دی۔ اس مطلب کی صورت میں مذکورہ بالا اعتراضات سے نجات ہو جاتی ہے۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی شان میں ہرزہ سرائیاں:

اس بحث کے بعد صاحب نظر مصنف نے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ پر تہمت زنا کے قصہ کو چھیڑا ہے اور اس کو اتنے شرح و بسط کے ساتھ تمام جزئیات سمیت بیان کیا ہے جیسے یہ ان کا محبوب موضوع ہو، تہمت کا یہ واقعہ بصرہ میں پیش آیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں یہ مقدمہ پیش ہوا، آپ نے معاملہ کی تحقیق کی، گواہیاں لیں تین گواہوں نے زنا کی گواہی دی، اور ایک گواہ نے زنا کی گواہی سے انکار کیا، اس پر حضرت عمر

رضی اللہ عنہ نے حضرت مغیرہ رضؓ کو اس تہمت سے بری قرار دیا، اور تینوں گواہوں پر حد قذف لگوائی۔ اس صورت واقعہ کو تفصیل سے مصنف نے ذکر کیا ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صاحب نظر مصنف کو حضرات صحابہؓ سے کچھ عداوت ہے محض اپنے وہم وخیال کی بنیاد پر یہ دعوی کر دیا ہے کہ راویوں سے صورت واقعہ کے بیان کرنے میں غلطی ہو گئی ہے، انھوں نے کہا کہ واقعہ دراصل یہ ہو گا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک زنا ثابت ہو گیا ہو گا کیونکہ چار گواہیاں مکمل تھیں، پھر انہوں نے ـــــ مصنف کے زعم کے مطابق زنا کی سزا مطلقاً سو کوڑے ہیں ـــــ سو کوڑے بطور حد زنا حضرت مغیرہ کو لگوائے ہوں گے لیکن راویوں نے اپنے اس گمان باطل اور شہرہ عام کی وجہ سے کہ زانی محصن کی سزا رجم ہے اور یہاں رجم کا نفاذ ہوا نہیں اس لیے راویوں پر بات الٹ گئی، اور بجائے حضرت مغیرہ رضؓ کے گواہوں پر حد لگانے کی بات کہہ ڈالی۔ استغفر اللہ، اور پھر اپنے اس وہم باطل کو موکد کرنے کے لیے بالکل بے موقع اور قطعاً غلط طور پر حضرت عائشہ رضؓ کے واقعۂ افک کو لے بیٹھے اور وہ گل کھلائے کہ شاید معتزلہ وخوارج کو بھی نہ سوجھے ہوں گے، اس سلسلے میں انھوں نے بالکل بے معنی نو صفحے سیاہ کیے ہیں، اس کی ایک ایک سطر بتاتی ہے کہ مصنف کو روایت ودرایت، اصول وقواعد اور ہوش وعقل کسی چیز سے مس نہیں ہے۔ اس بحث کی تردید کرنا محض وقت کی تضییع ہے لیکن جی چاہتا ہے کہ چند ایک باتیں ذکر کر دی جائیں بطور لطیفہ کے مصنف کی ایک ذرا طویل عبارت ملاحظہ ہو:

> "معاملے کے تمام پہلو پر غور کرنے سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان گواہوں پر حد قذف نہیں جاری کی گئی، بلکہ خود حضرت مغیرہ رضؓ پر حد زنا جاری کی گئی اس لیے کہ چاروں گواہ ثقہ تھے اور گواہی اتنی واضح اور دو ٹوک تھی کہ وہ کسی صورت سے رد نہیں کی جا سکتی تھی، فطری طور پر یہاں سوال پیدا ہو گا کہ پھر معاملے کی صحیح صورت ہمارے سامنے کیوں نہیں آئی، اور حد زنا کے بجائے حد قذف کی بات کہاں سے چل پڑی۔؟

جواب بالکل واضح ہے، رجم محصن کی حکایت ـــــ باوجودیکہ اس کی کوئی

اساس نہ تھی، ـــــــ چھیڑنے والوں نے کچھ اتنے زور و شور سے چھیڑی کہ وہ عام ذہنوں میں اچھی طرح رچ بس گئی، اور اچھے اچھوں کے ذہن و دماغ میں یہ بات جاگزیں ہوگئی کہ شادی شدہ زانی کی سزا رجم ہی ہے تو جب انھوں نے یہ سنا کہ حضرت مغیرہ کو رجم نہیں کیا گیا، باوجودیکہ وہ شادی شدہ تھے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس موقع پر کوڑے بھی برسائے گئے تو اس سے انھیں یہ گمان ہوا کہ اس موقع پر کوڑوں کی بارش ہونے اور حضرت مغیرہ کے رجم نہ کیے جانے کا صاف مطلب یہ ہے کہ جرم ثابت نہیں ہوسکا اور پھر جن لوگوں نے اس واقعہ کی گواہی دی، ان پر حد قذف کے کوڑے برسائے گئے۔ حالانکہ صورت حال اس سے مختلف تھی یعنی وہ کوڑے حد قذف کے نہیں، حد زنا کے تھے اس لیے کہ قذف کا معاملہ یہاں تھا ہی نہیں یہاں تو معاملہ بس زنا کا تھا، جس کی سزا اسلام میں بس سو کوڑے ہے، قطع نظر اس کے کہ وہ ملزم شادی شدہ ہے یا غیر شادی شدہ" ص ۹۰

شاباش، آفریں، اب نہ کسی روایت کی ضرورت ہے نہ کسی حکایت کی۔ بس صاحبِ نظر مصنف غور و فکر کر کے کسی بھی واقعہ کی صورت حال متعین کر دیں، وہی نص قطعی ہے، تمام راوی متفق ہیں کہ تین گواہیاں زنا پر آئیں، چوتھے نے زنا کی گواہی نہیں دی۔

سب راوی کہتے ہیں کہ تین گواہوں کو کوڑے لگائے گئے۔ روایت میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ان گواہوں سے توبہ کا مطالبہ کیا گیا، دو گواہوں نے توبہ کر لی، تیسرے نے نہیں کی۔ نصب الرایہ صفحہ ۳۲۵ ج ۲ اتنی تفصیل کے بعد بھی جب مصنف غور و فکر کرتا ہے تو صورتِ حال بالکل برعکس اسے نظر آتی ہے، اس نظر کا کمال ہے کہ چودہ صدیوں کے حجاب کو بغیر کسی اوزار و اسباب کے چیر کر صحیح صورت حال کو دیکھ لیتی ہے اور جو لوگ وہاں موجود تھے انھیں نظر نہ آسکی۔

البتہ ایک بات مصنف کے اقرار سے ثابت ہوگئی کہ زانی محصن کے رجم کا مسئلہ بعد کی پیداوار نہیں ہے بالکل قرون اولی میں ہی اس زور و شور سے اس کی حکایت چھڑی

تھی کہ کسی کو اس کے خلاف کا وہم وگمان بھی نہ ہوا، کیوں کہ اس روایت کے آخری راوی شیخ عبدالرزاق الصنعانی سنہ ۲۱۱ھ میں وفات پاتے ہیں، ان سے لے کر دور صحابہ تک راویوں کی کڑی سے کڑی ملی ہوئی ہے، سب کے ذہنوں پر ایک ہی بات کا چھایا ہوا ہونا قطعی دلیل اس بات کی ہے کہ یقینی اور بنیادی بات وہی ہے اور مصنف کا جو کچھ ارشاد ہے اس کی قیمت خواب میں بڑا تے ہوئے آدمی سے زیادہ نہیں ہے۔

عقل کی خوبی اس واقعہ میں چار گواہ تھے، تین گواہوں نے حضرت مغیرہ پر صریح زنا کی شہادت دی اور ایک گواہ نے زنا کی گواہی نہیں دی، چوتھے گواہ کے بیان سے زنا کا ثبوت نہیں ہوتا، چونکہ چار گواہی نہ تھی، اس لیے اللہ تعالٰے کے قانون ثم لم یاتوا باربعۃ شہداء فاجلدوھم ثمانین جلدۃ۔ (چار گواہ نہ لا سکیں تو انھیں اسّی کوڑے مارو) کے مطابق اب مسئلہ شہادت زنا کا نہیں رہا، تہمت زنا کا ہو گیا، اور اس کی سزا اسی کوڑے ہیں، اس لیے ان گواہوں پر اسّی اسّی کوڑے کی حد قذف نافذ کی گئی اور چوتھا گواہ بچ گیا۔ اس پر صاحبِ نظر مصنف کا تبصرہ ملاحظہ ہو:

> "اگر حضرت ابوبکرہ اور ان کے دونوں ساتھیوں پر حد قذف جاری ہوئی، تو وہ حد قذف زیاد پر بدرجہ اولیٰ جاری ہوئی ہوگی۔ کیونکہ گواہی دینے میں تو وہ بھی شریک تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ان تینوں بزرگوں کی گواہی مکمل سمجھی گئی، اور زیاد کی گواہی ناقص یا نامکمل قرار دی گئی تو کیا گواہی کا ناقص ہونا بھی کوئی خوبی ہے، اور اس کی وجہ سے اس گواہ کے ساتھ رعایت کی جائے گی، اور کیا گواہی کا مکمل ہونا کوئی عیب ہے اور اس کی وجہ سے گواہ کی زدوکوب کی جائے۔" ص۹۲

بے دانشی کا طغیان اسی کو کہتے ہیں، گواہی کے مکمل یا نامکمل ہونے کی بنیاد پر حدِ قذف کون لگاتا ہے۔ حد قذف تو تہمت زنا کی بنیاد پر لگتی ہے اور اس صورت میں لگتی ہے جب قاضی کے دربار میں چار گواہ تہمت زنا کے نہ پیش ہو سکیں بلکہ اس سے کم ہوں

خواہ ایک یا دو یا تین۔ ان پر حد قذف جاری کرنا قرآن کا حکم ہے' اللہ تعالیٰ کے قانون میں چار گواہ سے کم زنا کے باب میں جھوٹے ہیں چنانچہ ارشاد ہے لولا جاؤا علیہ باربعۃ شہداء فاذ لم یاتوا بالشہداء فاولئک عند اللہ ھم الکاذبون (سورہ نور) یہ لوگ اس پر چار گواہ کیوں نہیں لائے، پس جب اتنے گواہ نہ لاسکیں تو یہی لوگ اللہ کے نزدیک جھوٹے ہیں۔

مذکورہ بالا واقعہ میں چار آدمی زنا کی گواہی کے لیے چلے' تین شخصوں نے تو زنا کا صریح الزام عائد کیا' اور چوتھے شخص نے اس سے گریز کیا' گویا تین شخصوں نے زنا کی تہمت لگائی اور ایک اس سے ہٹ گیا، نصاب شہادت مکمل نہ تھا' لہٰذا تین گواہ جھوٹے قرار پائے اور چوتھا اس سے خارج ہوگیا' اب کوئی عقل و ہوش رکھنے والا بتائے کہ حد قذف کس پہ لگے گی ؟ ان پر جو اللہ کے قانون میں جھوٹے ثابت ہوئے یا اس پر جس کے جھوٹے ہونے کا کوئی ثبوت موجود نہیں ؟ یہاں گواہوں کے بیان کے مکمل یا نامکمل ہونے کی بحث سے کیا غرض ہے ؟ بس یہ ہے ان صاحب کی عقل کا حال' جو سارے فقہاء کو غلط فہمی کا شکار بتاتے ہیں اور پھر اپنی اسی ناتمام عقل کی ترنگ میں لکھتے ہیں کہ :

> "عقل تو کہتی ہے کہ ناقص گواہی ایک جرم ہے جس کی دہری سزا اس گواہ کو ملنی چاہیئے' کیوں کہ جب اس کی معلومات ناقص تھیں، تو گواہی کے لیے وہ آگے بڑھا کیوں ؟" ص ۸۳

واقعی اگر عقل یہی کہتی ہے تو نہ جانے بے عقلی کیا کہے گی' محترم ! یہ عقل نہیں کہتی بے عقلی کہتی ہے' کیوں کہ جھوٹی گواہی کو تو جرم پڑھا اور جانا گیا ہے لیکن ناقص بیان بھی جرم ہے۔ یہ بات بالکل پہلی دفعہ کان میں پڑی ہے یعنی گواہ جتنا جانتا ہے' بیان کرتا ہے لیکن اس کے بیان اور گواہی کی بنیاد پر مدعا علیہ پر مطلوبہ فرد جرم عائد نہیں ہوتی، ایسی گواہی کو عدالت فرد جرم عائد کرنے کے لیے گواہی تسلیم نہیں کرتی' یہ تو ہر شخص جانتا ہے۔ لیکن ایسی گواہی کوئی جرم ہے جس کی دہری سزا ملنی چاہیئے۔ یہ بات آج صاحب نظر مصنف نے واضح کی' عدالتوں کو چاہیئے کہ اپنے مجموعہ قوانین میں اس کا اضافہ کرلیں کہ اگر کسی گواہ

کی گواہی سے مدعا علیہ پر فردِ جرم نہ عائد ہوسکتی، تو وہ دُہری سزا کا مستحق ہوگا۔
اگر ان حضرت کے ہاتھ میں قانون سازی کا کوئی مرحلہ آگیا تو نہ جانے کتنے ناکردہ گناہ بڑی بڑی سزاؤں میں از روئے قانون ماخوذ ہوجائیں گے۔

کہاں وہ شوراشوری اور کہاں یہ بے نمکی

حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ والی بحث میں ایک جگہ مصنف نے لکھا ہے:

"اس سلسلے میں امام ابن تیمیہ کا موقف بہت صحیح اور متوازن ہے، وہ فرماتے ہیں جب کوئی گواہی دینے والا یہ گواہی دے کہ اس نے کسی مرد اور عورت کو ایک ہی لحاف میں، یا کسی ایک ہی حمام میں دیکھا ہے یا ان دونوں کو برہنہ دیکھا ہے، یا ان دونوں کا تہبند یا پاجامہ کھلا ہوا دیکھا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ کوئی قرینہ بھی پایا جاتا ہو جو اس بات کی تائید کر رہا ہو، مثلاً یہ کہ لحاف اپنی اصل جگہ سے ہٹ کر ان دونوں کی جگہ پر ہو، یا ان میں سے کسی کے پاس یا دونوں کے پاس کوئی روشنی ہو، جس کو جلتے ہوئے اس نے دیکھا ہو، پھر اسے انھوں نے بجھا دیا ہو، تو اس روشنی کو بجھا دینا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس کام کو چھپانا چاہتے ہیں جس کو وہ کر رہے ہیں، تو اگر وہاں چھپانے کی کوئی بات نہ ہو سوائے اس بات کے جس کی اس گواہ نے گواہی دی، تو یہ نہایت زبردست ثبوت ہوگا، اس بات کے حق میں جس کی اس نے گواہی دی۔" ص ۸۶۔

اس عبارت پر ناظرین غور کریں کیا یہ صراحتًہ زنا کی گواہی کا تذکرہ ہے؟ اور کیا اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی گواہی دینے والا اسی طور پر جس کو علامہ ابن تیمیہ رح نے تحریر فرمایا ہے، گواہی دے۔ تو اس سے حدِ زنا کا ثبوت ہوجائے گا۔؟ اور کیا علامہ موصوف کا مقصد یہ ہے کہ زنا کے لیے ایک گواہ ہو تو وہ بھی کافی ہے؟ ان سوالات پر غور کریں اور صاحبِ نظر مصنف کے آب زر سے لکھنے کے لائق استنباط کو ملاحظہ فرمائیں۔ لکھتے ہیں کہ:

"معلوم ہوا کہ ثبوت زنا کے لیے ہمیشہ چار گواہوں کی گواہی شرط نہیں ہوا

کرتی، بلکہ قرائن کی موجودگی میں ایک گواہ کی گواہی بھی کافی ہو سکتی ہے بشرطیکہ وہ گواہ مشتبہ اور ناقابل اعتبار نہ ہو" ص۸۶

لیجئے، قرآن نے چار گواہوں کی گواہی کو حد زنا کے لیے جو شرط قرار دیا تھا، اس سے چھٹی مل گئی۔ علامہ ابن تیمیہؒ کی ایک مبہم عبارت سے مصنف نے جو کچھ سمجھا ہے، اس نے قرآن کے نص قطعی کو منسوخ کر دیا، چنانچہ فرما دیا کہ ثبوت زنا کے لیے ہمیشہ چار گواہوں کی گواہی شرط نہیں ہوا کرتی۔ بلکہ قرائن کی موجودگی میں ایک گواہ کی گواہی بھی کافی ہو سکتی، اور یہ کون کہہ رہا ہے، وہ کہہ رہا ہے جس نے شروع کتاب میں دعویٰ کیا تھا کہ :

"اگر کسی مسئلے میں قرآن پاک کی واضح تعلیمات موجود ہیں تو پھر ہمیں کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں، حتیٰ کہ اس جستجو کی بھی ضرورت نہیں کہ اس سلسلے میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت کیا ہے، اس باب میں آپ کی ہدایات کیا ہیں" ص۶۷

کہاں تو وہ شوراشوری تھی کہ حدیث رسولؐ کی طرف بھی دیکھنے کی ضرورت نہیں اور کہاں یہ بے نمکی کہ قرآن کے نص قطعی کے مقابلے میں علامہ ابن تیمیہؒ کی عبارت سے استدلالات کرنے لگے۔ ؎

بریں عقل و دانش بباید گریست
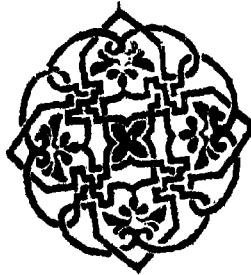
علمی حقائق

قرآن میں جہاں ظاہر بینوں اور معمولی عقل والوں کی ہدایت وروشنی کے لیے ظواہر طبعی سے استدلال کیا جاتا ہے وہیں اہل نظر اور ارباب علم وعقل کے لیے دقیق علمی وتکوینی حقائق سے بھی بحث کی گئی ہے۔ صحیح ہے کہ قرآن کوئی فلسفہ و سائنس اور فنون لطیفہ کی کتاب نہیں بلکہ یہ اصل میں کتاب ہدایت ہے جس کا مقصد ساری انسانیت کو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر جمع کرنا ہے مگر چونکہ یہ ایک کامل ومکمل کتاب ہے اور ہر دور کے لیے یہ کافی رہنمائی کی صلاحیت رکھتی ہے اس بناء پر اس میں عام عقلی وبدیہی استدلالات سے لے کر دقیق سائنسی حقائق سے بھی تعرض کیا گیا ہے تاکہ ہر قسم کا مذاق رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب بہتر غذا مہیا کر سکے ——— ہمارے محققین نے اس موضوع پر بہت کام کیا ہے اور قرآن وسائنس کے درمیان رشتے کو کامیاب طور پر واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے تفصیل کے لیے تو انہی کتابوں کی طرف رجوع کرنا مناسب ہوگا، میرا مقصد کرگسوں میں پلے ہوئے شکست خوردہ شاہینوں کو یہ بتانا ہے کہ جس علم وفن کی تلاش اور جس آب حیات کی جستجو میں تم مغرب کے بیاباتوں کی خاک چھان رہے ہو وہ خود تمہارے گھر میں موجود ہے۔ مغرب تمہیں علم وفن کی چند جزئیات سے آگاہ کر سکتا ہے اور آب حیات کے چند قطرات فراہم کر سکتا ہے مگر ڈھونڈنا ہو تو ڈھونڈو، خود تمہارے گھر میں علم وفن کی کلیات پر مشتمل کتاب (قرآن) موجود ہے تم ایک قطرۂ آب کے لیے پریشان ہو، حالانکہ خود تمہارے مذہب کی سبیل سے چشمۂ حیات بہہ رہا ہے۔ تم یورپ کے آشیانوں میں شاہبازی کے آداب سیکھنے جارہے ہو جب کہ

قرآن تم کو اس سے بدرجہا بہتر طور سے سکھانے کو تیار ہے بشرطیکہ تم اس کی طرف دھیان دو، اور اپنے مقام و مرتبہ کو پہچانو ؂

وہ شکست خوردہ شاہین جو پیدا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

اس مقصد کے لیے چند نمونے پیش کر دینا میں کافی سمجھتا ہوں۔ مثلاً:

سورج کے بارے میں قرآن کا نظریہ

سورج کے بارے میں قرآن کا شروع سے یہ نظریہ ہے کہ سورج اپنے مدار میں گردش کر رہا ہے:

" والشمس تجری لمستقرلها ذالك تقدير العزيز العليم
والقمر قدرناه منازل حتی عاد کالعرجون القديم. لا الشمس
ينبغي لها ان تدرك القمر ولا الليل سابق النهار وكل فی فلك
يسبحون" (یٰس ۳۸-۴۰)

اور سورج وہ اپنی ٹھہری ہوئی راہ پر چلتا رہتا ہے یہ عزیز و علیم کا باندھا ہوا اندازہ ہے، اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کر دیں یہاں تک کہ وہ ایسا رہ جاتا ہے جیسے کھجور کی پرانی شاخ۔ نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو پکڑ لے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے، اور سب ایک ایک دائرہ میں تیر رہے ہیں۔

یہاں پر تجری لمستقر کے معنی یہ نہیں ہے کہ سورج اپنے ایک خاص مستقر کی طرف سفر کر رہا ہے بلکہ لام، فی کے معنی میں ہے۔ قرآن میں لام کو فی کے معنی میں متعدد مقامات پر استعمال کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک آیت کا ٹکڑا ہے:

" ونضع الموازين القسط ليوم القيامة" (انبیاء ۴۷)

اور ہم قیامت کے دن انصاف کی میزان قائم کریں گے۔

یہاں لیوم القیامہ یقیناً فی یوم القیامہ کے معنی میں ہے، اسی طرح

تجری لمستقر میں بھی لام فی کے معنی میں ہے ———— اس لحاظ سے اس کا معنی یہ ہے کہ سورج اپنے مستقر اور مدار میں گھوم رہا ہے۔

اس آیت میں قرآن نے سورج کی حرکت کے بارے میں کتنا دوٹوک نظریہ دیا ہے مگر سائنس کی حیرانی و پریشانی دیکھئے۔ ایک زمانہ میں سائنس نے یہ نظریہ قائم کیا تھا کہ سورج اپنی جگہ ٹھہرا ہوا ہے اور زمین اپنے محور پر گردش کررہی ہے اور اس سے لیل ونہار وجود میں آرہے ہیں۔ مگر کچھ ہی دنوں کے بعد حقائق نے یہ ثابت کردیا کہ یہ نظریہ غلط تھا، اور صحیح نظریہ یہ ہے کہ سورج بھی اپنے مدار میں حرکت کررہا ہے ———— ———— اور یہ انکشاف مسلمانوں نے نہیں کیا کہ ان پر مذہبی جانب داری کا الزام عائد کیا جائے، بلکہ بے مذہب اہل مغرب کے ذریعے یہ راز کھلا جس سے قرآن کے نظریے کی صداقت کھل کر سامنے آگئی ———— مغربی سائنس دانوں نے اس انکشاف کو جو اہمیت دی، اس کا اندازہ ایک مشہور ماہر فلکیات محقق "وسیون" کی کتاب کے اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے بڑے اعتماد کے ساتھ لکھا ہے کہ:

"اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ ان حقائق میں سب سے اہم ترین حقیقت کیا ہے، جس کا انکشاف انسانی عقل نے کیا ہے؟ تو میں اس کے جواب میں سورج، چاند اور کواکب کا نام لوں گا جن کے بارے میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ یہ سب بسیط فضا میں گول گنبد کی طرح نہایت تیزی کے ساتھ گردش کررہے ہیں جو ہمارے احساس سے بالاتر ہے۔"

(مضمون جریان الشمس، عبدالرحمان فرنسا س مجلہ العلم والایمان ۱۹۷۶ء)

کواکب کے بارے میں قرآنی نظریہ

کواکب وسیارات کے بارے میں قرآن کا نظریہ یہ ہے کہ وہ آسمان کی نچلی سطح کو خوبصورت بھی بناتے ہیں اور مضر اثرات اور طاغوتی یورشوں سے حفاظت کا کام بھی کرتے ہیں،

"انا زینّا السماء الدنیا بزینة الکواکب وحفظا من کل شیطان مارد ؁ لایسمعون الی الملأ الاعلیٰ ویقذفون

من كل جانب دحورا ولهم عذاب واصب الا من خطف الخطفة فاتبعه شهاب ثاقب" (الصفت ۶-۱۰)

ہم نے آسمانِ دنیا کو ستاروں کی زینت سے سجایا اور ہر شیطان سرکش سے اس کو محفوظ کیا ہے وہ ملاءِ اعلیٰ کی طرف کان نہیں لگا سکتے اور ہر طرف سے مارے جاتے ہیں، بھگانے کے لیے اور ان کے لیے ایک دائمی عذاب ہے مگر جو شیطان کوئی بات اچک لے تو ایک دہکتا ہوا شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے۔

زمین کے متعلق قرآنی تصور

قرآن نے آج سے چودہ سو سال پیشتر ہی قرآن کی خلقت اس کی تشکیل اور اس کی حرکت کے متعلق مباحث دنیا کے سامنے رکھ دیئے تھے، جس پر سائنس جدید ایک حرف کا بھی اضافہ نہیں کر سکی ہے۔

۱: زمین کی خلقت کے متعلق قرآن کا نظریہ یہ ہے کہ زمین انسانی آبادی کے قابل چھ مرحلوں کے بعد ہو سکی۔

" هو الذى خلق السموات والارض فى ستة ايام ثم استوى على العرش" (الحدید: ۳)

وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا چھ دنوں میں پھر وہ عرش پر متمکن ہوا۔

" قل أئنكم لتكفرون بالذى خلق الارض فى يومين و تجعلون له اندادا ذلك رب العلمين وجعل فيها رواسى من فوقها وبارك فيها وقدر فيها اقواتها فى اربعة ايام سواء للسائلين . (حم سجدہ، ۹-۱۰)

کہو کیا تم لوگ اس ہستی کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں بنایا اور تم اس کے ہمسر ٹھہراتے ہو، وہ رب ہے تمام جہان والوں کا اور اس نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور اس میں فائدے کی چیزیں رکھ دیں

اور اس میں اس کی غذائیں ٹھہرادیں، یہ چار دن میں پورا ہوا، پوچھنے والوں کے لیے۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین و آسمان اور کائنات کو اللہ نے چھ یوم کے بعد پیدا کیا اور اس کے بعد ہی زمین انسانی آبادی کی متحمل ہو سکی، مگر یوم سے مراد یہاں لیل ونہار کے دورمراد نہیں ہیں جو سورج کی چوبیس گھنٹے کی گردش سے مکمل ہوتے ہیں، اور نہ قطب ارضی مراد ہے جو عموماً چھ ماہ کی گردش کے بعد دن یارات کی صورت میں پورا ہوتا ہے، بلکہ یوم سے مراد وہ قرآنی مدت ہے جس کو قرآن کی دوسری آیات میں بیان کیا گیا ہے:

ان یوما عند ربك كالف سنة مما تعدون ۔ (حج، ۴۷)

"بے شک ایک دن تیرے رب کے نزدیک تمہارے شمار کے ہزار سال کے برابر ہے۔"

تعرج الملئكة والروح اليه فی یوم کان مقداره خمسين الف سنة ۔ (المعارج، ۴)

"فرشتے اور روح الامین وہاں تک ایک دن میں چڑھ کر پہنچتے ہیں جس کی مقدار ۵۰ ہزار سال ہے۔"

اس طرح ان آیات سے وضاحت کے ساتھ یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ زمین انسانوں کے رہنے کے قابل اصطلاحی طور پر چھ یوم یا چھ مرحلوں کے بعد ہوئی۔ یہ ایک طویل ترین مدت ہے، آغاز کے وقت سے تکمیل تک کے درمیان مراحل کیا تھے، ان کے بارے میں قرآن نے جس قدر بیان کیا ہے، سائنس اس سے زیادہ کے بارے میں عاجز اور خاموش ہے .... اور جس قدر سائنس بیان کررہی ہے وہ قرآن بھی بیان کررہا ہے۔

زمین کا ابتدائی مادہ | قرآن زمین کے ابتدائی مادے کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ پہلے پانی میں پوشیدہ تھا اور پانی ہی اس کی

اصل حلقہ ہے اور زمین اس کے اندر سے نمودار ہوئی ہے۔ قرآن کی یہ آیت پڑھئے اور پھر زمین کے آغاز پر غور کیجئے:

وهو الذی خلق السموات والارض فی ستة ایام وکان عرشه علی الماء لیبلوکم ایکم احسن عملا۔ (هود: ۷)

"اور وہی ذات ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا جب کہ اس کا عرش پانی پر تھا تاکہ تم کو آزمائے کہ تم میں کون بہتر عمل کرتا ہے۔"

تورات میں بھی یہ نظریہ موجود ہے:

"اور زمین ویران اور سنسان تھی اور چہرہ چاند پر تاریکی کا حجاب تھا اور روح خداوندی سطح آب پر تیر رہی تھی۔" (توراۃ، سفر تکوین)

یہ خدائی انکشاف جو قرآن و تورات کے ذریعہ کیا گیا تھا آخر کے ادوار میں علم زولوجی بھی یہیں تک پہنچ سکا، زولوجی کے مطابق زمین کے آغاز کی صورت حال یہ تھی۔

"زمین کو اس کی ابتدائی حالت میں بخارات نے ڈھانپ رکھا تھا جو بعد میں پانی سے تبدیل ہو گئے، پھر وہ پانی نشیب میں اترنے لگا، اور اس سے نہریں اور سمندر بہتے چلے گئے۔"

(احمد محمود سلیمان مضمون القرآن والعلم مجلہ العلم شمارہ ۱۷، نومبر ۱۹۸۱ء)

درمیانی مراحل

عمل تخلیق کے آغاز کے بعد زمین جن مختلف مراحل سے گذری، قرآن ان کو اشاراتی طور پر زمانی ترتیب کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

والارض بعد ذلك دحها ٥ اخرج منها ماءها ومرعها ٥ والجبال ارسها۔ (النازعات)

"زمین کو اس کے بعد پھیلایا اس سے اس کا پانی اور چارہ نکالا، اور پہاڑوں کو قائم کر دیا۔"

اس آیت سے زمین کو عمل تخلیق کے درمیانی مراحل پر روشنی پڑتی ہے کہ زمین کا

مادہ جو عالم آب میں مستور تھا ظاہر ہونے کے بعد پھیلنا شروع ہوا، اور پھر سطح ارض کے نشیبی حصوں میں پانی اترنے لگا جس سے نہریں اور سمندر بنتے چلے گئے اس کے بعد اس کے اندر سے پہاڑی چٹانیں برآمد ہوئیں، جو بتدریج اونچے پہاڑوں کی شکل میں تبدیل ہوگئیں، اور سائنس کی تحقیق بھی اس سے زائد نہیں ہے۔

زمین کا قالب قرآن نے زمین کے اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا کہ زمین کی شکل و صورت کیسی ہے، آج کے جدید سائنسی دور میں یہ مشہور سی بات ہے کہ زمین کرۂ (گیند) کی طرح گول ہے یعنی خط استوا سے دیکھا جائے تو وسیع ترین نظر آتی ہے۔ اور اس کے قطب سے دیکھا جائے تو وہ چھوٹی اور معمولی نظر آتی ہے، مگر سائنس کا بیان قرآن کے بیان پر اضافہ نہیں ہے۔ قرآن نے بھی زمین کے قالب کا یہی نقشہ اپنے الفاظ میں کھینچا ہے ؛

اولم یروا انا نأتی الارض ننقصها من اطرافها واللہ یحکم لامعقب لحکمه وهو سریع الحساب۔ (رعد : ۴۱)

"کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ زمین کو ان پر ہم اس کے کناروں سے کم کرتے ہیں، حکم صرف اللہ کا رہے گا، کوئی اس کے حکم کو ٹال نہیں سکتا، اور حساب لینے میں اسے کچھ بھی دیر نہیں لگے گی"

بل متعنا هولاء واٰباءهم حتی طال علیهم العمر افلا یرون انا نأتی الارض ننقصها من اطرافها افهم الغالبون۔

(انبیاء : ۴۴)

"بلکہ ہم نے ان کو اور ان کے باپ داداؤں کو ایک مدت تک برتنے کو سامان زندگی دیا اور طویل عمر گذارنے پر بھی حق بات ان کی سمجھ میں نہ آسکی کیا وہ نہیں دیکھتے کہ زمین کو ہم چاروں طرف سے ان پر کم کرتے ہیں تو کیا اب بھی کوئی امکان رہ گیا ہے کہ یہ غالب آجائیں گے"

ننقص من اطرافها کا مطلب اگر یہ لیا جائے کہ زمین اپنے کناروں سے چھوٹی

معلوم ہوتی ہے تو زمین کا کروی قالب ہونا صاف ثابت ہو جاتا ہے اس لیے کہ ہر گول جسم خط استواء میں وسیع اور طرفین میں چھوٹا معلوم پڑتا ہے۔

خلقت انسانی کے بارے میں قرآنی نظریہ

اسی طرح قرآن نے انسانی تخلیق اور اس کے درمیانی مراحل پر بھی بھرپور روشنی ڈالی ہے، قرآن کے بیان کے مطابق جب مرد کا نطفہ عورت کے رحم میں جاتا ہے تو کچھ مدت کے بعد وہ بستہ خون بن جاتا ہے، اس کے بعد یہ خون بستہ گوشت کے لوتھڑے میں تبدیل ہو جاتا ہے، اس کے بعد اس میں ہڈیاں پیدا ہوتی ہیں اور پھر اس پر گوشت کی موٹی تہیں جم جاتی ہے اور کچھ دنوں رحم مادر میں ترتیب و نشو نما پاکر ایک نئی صورت میں دنیا کی کھلی فضا کے اندر وہ آجاتا ہے جس کو ہم ولادت کہتے ہیں:

ثم جعلناه نطفة فی قرار مکین —— ثم خلقنا النطفة علقة فخلقنا العلقة مضغة فخلقنا المضغة عظاما فکسونا العظام لحمًا ثم انشأناه خلقًا آخر فتبارك الله احسن الخالقین۔ (مومنون : ۱۱)

"پھر ہم نے پانی کی ایک بوند کی شکل میں اس کو ایک محفوظ ٹھکانے میں رکھا پھر ہم نے پانی کی بوند کو بستہ خون کی شکل دی، پھر بستہ خون کو گوشت کا ایک لوتھڑا بنایا، پھر لوتھڑے کے اندر ہڈیاں پیدا کیں، پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا، پھر ہم نے اس کو ایک نئی صورت میں بنا کھڑا کیا پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ بہترین پیدا کرنے والا"

یہ چند نمونے ہیں جو قرآن سے پیش کیے گئے ہیں ورنہ قرآن کے اس طرح کے حقائق کا احاطہ کیا جائے تو ضخیم کتاب بن جائے گی۔ مقصد یہ ہے کہ قرآن نے اپنی تعلیمات کے ذریعہ انسانیت سے یہ اعتراف کرالیا کہ وہ ہر لحاظ سے کامل و مکمل کتاب ہے اس میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں ہے۔

وہ ہر دور کے لیے یکساں معیار ہدایت ہے اور ہر دور کے تقاضوں کی رعایت اس میں ملحوظ ہے، قرآن کی اسی جامعیت اور کاملیت کا اثر تھا کہ اس کی تاثیر انسانوں سے گذر کر جناتوں تک پہنچی، قرآن کی آواز نے ان کو بھی رقص بسمل کر دیا اور وہ بول پڑے:

انا سمعنا قرآنا عجبا ٥ یھدی الی الرشد فآمنا به، ولن نشرك بربنا احداً۔ (جن ۱-۲)

"ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے جو ہدایت کی راہ بتاتا ہے تو ہم اس پر ایمان لائے۔ اور اب ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک ہرگز نہیں بنائیں گے۔"

قرآن میں جب خدا کی قدرت وکبریائی کی نشانیاں سنیں اور اس کی کائنات کے اسرار ورموز سے وہ آگاہ ہوئے تو ان پر خدا کا خوف اور تصور کتنا غالب ہوا، وہ ان کے اس بیان سے سمجھ میں آتا ہے جو انھوں نے اپنی قوم کے سامنے دیا تھا۔

وانا ظننا ان لن نعجز اللّٰه فی الارض ولن نعجزه هربا۔

(جن: ۱۲)

"اور ہم نے یہ سمجھ لیا کہ ہم زمین میں اللہ کو نہیں ہرا سکتے اور نہ بھاگ کر اس کو عاجز کر سکتے ہیں۔"

قرآن نے حقائق ومعارف کا خزانہ بکھیرنے کے بعد پوری دنیا کے انس وجن کو چیلنج کیا ہے کہ پوری کائنات خدا کے قبضے میں ہے۔ تم خدا کی گرفت سے بھاگ کر جانا بھی چاہو تو نہیں جا سکتے۔

یا معشر الجن والانس ان استطعتم ان تنفذوا من اقطار السمٰوات والارض فانفذوا لا تنفذون الا بسلطان۔

(الرحمٰن، ۳۳)

"اے جنوں اور انسانوں کے گروہ! اگر تم سے ہو سکے کہ تم آسمانوں

اور زمین کی حدود سے نکل جاؤ تو نکل جاؤ، تم نہیں نکل سکتے بغیر سند کے۔"

۴: علم کی طلب قرآن کریم کی ان تعلیمات نے مسلمانوں میں حصول علم کی اسپرٹ پیدا کی اور وہ اس راہ میں بڑھتے چلے گئے، ان کے جذبہ صادق پر حضورؐ کے الفاظ نے مہمیز کا کام کیا۔ حضورؐ نے علماء کو انبیاء کا وارث قرار دیا:

ان العلماء ورثة الانبياء وان الانبياء لم يورثوا دينارًا ولا درهمًا وانما ورثوا العلم فمن اخذه اخذ بحظ وافر۔

(مشکوۃ، ص ۳۴)

" بے شک علماء انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء کی وراثت درہم و دینار نہیں ہے بلکہ ان کی وراثت علم ہے پس جس نے علم حاصل کیا اس نے بڑا وافر حصہ پایا۔"

حضورؐ نے علم کو عبادت سے افضل قرار دیا:

فضل العالم على العابد كفضل القمر ليلة البدر على سائر الكواكب۔ (مشکوۃ ص ۳۴)

"عالم کی فضیلت عابد کے مقابلے میں اسی طرح ہے جس طرح چودھویں رات میں چاند کی فضیلت تمام ستاروں پر۔"

پھر اس علم و فضل کو حضورؐ نے کسی ایک باب کے ساتھ خاص نہ رکھا بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں صالح معلومات حاصل کرنے کو علم قرار دیا ہے، ایک کسان کو اپنے کھیت کی، ایک تاجر کو اپنی تجارت کی، ایک کاریگر کو اپنے کام کی اور ایک مزدور کو اپنے معاملے کی معلومات حاصل کرنے کی تاکید فرمائی تاکہ خدائی احکام کی روشنی میں مومن کا کیا ہوا کوئی بھی عمل عبادت بن جائے ——— اس طرح حضورؐ نے اپنے صحابہؓ اور مسلمانوں کو علم کا شائق و رسیا بنا دیا، اور خود صحابہؓ نے بھی اس باب میں جس دلچسپی کا مظاہرہ کیا اس کا اعتراف اغیار کو بھی کرنا پڑا۔

ماضی کے کارناموں کی ایک جھلک

ہم اگر اپنے ماضی کا جائزہ لیں تو ہم کو نظر آئے گا کہ مسلمان نے علوم فنون کے میدان کے کیسے شہسوار تھے اور اس کے لیے انہوں نے کیسی کیسی مشقتیں برداشت کی تھیں، جن کی بدولت ان کو علوم و فنون میں سیادت و مرکزیت کا باعث رشک مقام حاصل ہوا، تجدید علوم کا منصب مسلمانوں کو ملا، اور صدیوں تک ان کے پاس رہا، اور پوری دنیا نے ان کے تجدیدی کارناموں کو سراہا اور قبول کیا ——— یہ تاریخ کی ایسی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک انگریز مؤرخ "جارج سارٹن" نے اپنی ایک کتاب "مقدمہ فی تاریخ العلم" میں جو پانچ ضخیم جلدوں میں ہے اس میں اس نے علوم و فنون، ان سے متعلق تجدیدی کارناموں، اور تجدیدی کام کرنے والی اقوام اور شخصیتوں کا جائزہ لیا ہے پھر اس نے تاریخی حوالوں کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر نصف صدی کے بعد حالات اور تقاضے بدل گئے اس لیے ان حالات کے مطابق علوم و فنون کی تجدید و اصلاح کا کام کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی مرکزی شخصیت ضرور پیدا ہوئی، اس طرح جب اس نے نگاہ ڈالی، تو اس کو ہر نصف صدی پر کوئی نہ کوئی مجدد مل گیا

وہ سنہ ۴۵۰ قبل مسیح سے لے کر سنہ ۳۵۰ قبل مسیح تک کے وقفے کو عہد افلاطون (ولادت ۴۲۷، وفات ۳۴۷ قبل مسیح) کہتا ہے اس کے بعد کی صدیوں میں یکے بعد دیگرے ارسطو (ولادت ۳۸۴ - وفات ۳۲۲ قبل مسیح) پھر اقلیدس (۳۰۰ قبل مسیح)، اور پھر ارشمیدس (ولادت ۲۸۷ - وفات ۲۱۲ قبل مسیح) نے علوم کی تجدید و اصلاح کا کام کیا ——— اس کے بعد چھٹی صدی عیسوی کے آغاز سے ساتویں صدی کے آغاز تک کا زمانہ اس کے نزدیک چین کے علمی ارتقاء و تجدید کا زمانہ ہے پھر اس کے بعد سنہ ۷۵۰ عیسوی سے لے کر سنہ ۱۱۰۰ء تک کا ساڑھے تین سو سالہ طویل عہد خالص مسلمانوں کا عہد ہے، اس پوری مدت میں علوم و فنون کی تمام تر خدمات مسلمانوں نے انجام دیں یکے بعد دیگرے ان میں مجددین علوم آتے رہے اور علوم کی خدمات انجام دیتے رہے۔ جابر ابن حیان

(۸۵۰ء) سے لے کر خوارزمی (۸۴۹ء) رازی (۸۶۴-۹۳۲ء) تاریخ داں سیاح مسعودی (۹۵۹ء) البیرونی (۹۷۳-۱۰۴۸ء) اور عمر خیام (۱۱۳۲) تک مجددین و خدام علوم کی فہرست ہے جنھوں نے علم کیمیا، الجبراء، طب، جغرافیہ، ریاضات، الفزیا اور فلکیات کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دیں جن میں کوئی عربی ہے تو کوئی ایرانی، کوئی ترکی ہے تو کوئی افغانی، علاقہ نسل سے گذر کر محض اسلامیت نے ان سب کو خدمت و تجدید علوم پر مجتمع کر رکھا تھا، (جارج سارٹن کی نگاہ میں، اتنے طویل عرصے تک یورپ میں کوئی بھی آدمی نظر نہیں آتا جو علوم و فنون کی خدمت کے لیے اٹھا ہو۔

گیارھویں صدی کے بعد ہی جراڈ کرمونی اور روجر بیکن جیسے یورپی مفکرین پیدا ہوئے، اور علم و فضل میں مقام حاصل کیا، درمیان کی صدیاں بھی ہمارے اسلامی مفکرین سے خالی نہ رہیں بلکہ علامہ ابن رشد (۱۱۲۶-۱۱۹۸ء) نصیر الدین محمد طوسی (۱۲۰۰-۱۲۷۴ء) ابن النفیس مصری (۱۲۸۸ء) اور ابن خلدون (۱۳۳۲-۱۴۰۶ء) جیسے علماء نے علم و فن کی وہ خدمات انجام دی ہیں جن کے سامنے یورپی علماء کے کارنامے پھیکے نظر آتے ہیں۔

(مضمون امة العلم من اجل نهضة علمية فى العالم الاسلامى الاستاذ عبدالسلام رسالہ الیونسکو۔ آب ــ ایلول ۱۹۸۱ء ص۵)

واضح رہے کہ یہ اعترافات کسی مسلمان مورخ کے قلم سے نہیں۔ بلکہ ایک انگریز مورخ کے قلم سے نکل رہے ہیں جس سے کم از کم ان لوگوں کو یقین آجانا چاہئے جو ہر بات کی صداقت کے لیے انگریز علماء کی سند کے طلب گار رہتے ہیں۔

اس کے بالمقابل اسلام ہے

غرض ایسے وقت میں کہ انسانیت سسک رہی تھی، ہلاکت اس کے سروں پر منڈلا رہی تھی، طوق وسلاسل اس کی گردن میں پڑے ہوئے تھے کہ ؎

ہوئے پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیلؑ اور نویدِ مسیحا (حالی)

چالیس سال کی عمر شریف ہوئی تو نبوت سے اور رسالت سے سرفراز کیے گئے، اور غار حرا میں یہ عظیم خلعت آپ کو عطا کیا گیا۔ اس آفتاب نبوت ورسالت کے طلوع ہوتے ہی جو قلب کے بصیر اور بینا تھے، (مثلاً یار غار ورفیق حضرت ابوبکر صدیق رضؓ) وہ سامنے آئے اور آفتاب رسالت کے انوار وتجلیات سے خوب مستفید ہوئے، اور جو کور باطن اور خفاش دل تھے، (جیسے ابوجہل لعنہ اللہ) اس آفتاب کے طلوع ہوتے ہی خفاش کی طرح اُن کی آنکھیں چندھیا گئیں اور نبوت ورسالت کے آفتاب عالم تاب کی تمازت کی تاب نہ لا سکے۔

ے رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ الآیۃ (البقرہ آیت ۱۲۹) — اے رب ہمارے اور بھیج بیچ ان کے پیغمبر ان ہی میں سے۔ (شاہ رفیع الدین رح)

ے وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِن بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ۔ (الصف آیت ۶) — اور میرے بعد جو ایک رسول آنے والے ہیں جن کا نام (مبارک) احمد ہوگا، میں ان کی بشارت دینے والا ہوں۔ (حضرت تھانوی رح)

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ
راست خواہی ہزار چشم چناں (سعدیؒ)
کور بہتر کہ آفتاب سیاہ

چنانچہ آپ نے خدا تعالےٰ کے راہ راست سے بھٹکے ہوئے بندوں کو جو ہزاروں اور لاکھوں معبودوں کے سامنے سر نیاز خم کرتے تھے، ایک خدائے وحدہ لاشریک لہٗ کی بندگی اور اطاعت اور اسی ایک کے سامنے پیشانی رکھنے اور سر جھکانے کا حکم فرمایا اور دنیا کی ساری بندگیوں اور اطاعتوں سے نجات دی، صحیح راہ دکھلائی۔

اور اس جاں بلب انسانیت کو نئی زندگی بخشی، اس سسکتی دنیا کے منہ میں پانی ڈالا، اور گمراہ لوگوں کو صحیح راستہ، صحیح یقین و ایمان، دین و دنیا کی صحیح رہنمائی، خداشناسی اور خدا ترسی، نیز خدا پرستی و خود اعتمادی عطا کی، اللہ تعالےٰ کی ہدایات و تعلیمات سے روشناس کرایا۔ نیا تمدن اور نیا معاشرہ عطا کیا۔ اور لوگوں کو محاسن و کمالات، محامد و پاکیزہ صفات، اخلاق و شمائل، معانی و فضائل کا مخزن و معدن بنا دیا۔ اور جاہلیت و اسلام کے درمیان بعید فاصلہ اور مسافت مدید کو دیکھتے ہی دیکھتے جس سرعت کے ساتھ قطع کرایا اس کی نظیر نہیں ملتی ——— اگر آپؐ چاہتے تو بڑے سردار اور حاکم، نیز دولت مند بن سکتے تھے، جیسا کہ اہل مکہ (زادھا اللہ شرفاً وعظمۃً) نے اس کی پیش کش بھی کی تھی۔ مگر آپؐ کو اس کے لیے مبعوث نہیں فرمایا گیا تھا، بلکہ آپ کی بعثت تو اس لیے ہوئی تھی تاکہ محرف و باطل مذاہب و ادیان کے طور و طریق، ناانصافیوں اور زیادتیوں سے نجات دلا کر عظیم دین و مذہب یعنی اسلام سے متمتع کرائیں۔ نیکی اور بھلائی کی ترغیب دیں، برائی سے منع فرمائیں، پاک و عمدہ چیزوں کو حلال اور گندی و ناپاک اشیاء کو حرام قرار دیں اور ان بندشوں اور بیڑیوں کو توڑ ڈالیں جن میں انسانوں نے اپنی نادانی اور کم فہمی سے یا مذاہب و حکومتوں کی زبردستی کی وجہ سے اپنے پاؤں جکڑ لیے تھے ——— ارشاد ربانی ہے :

يامرهم بالمعروف وينهٰهم عن المنكر ويحل لهم الطيبات ويحرم عليهم الخبائث ويضع عنهم إصرهم والاغلال التي كانت عليهم ط
(الاعراف ۱۵۷)

وہ ان کو نیک باتوں کا حکم فرماتے تھے اور بری باتوں سے منع کرتے تھے اور پاکیزہ چیزوں کو ان کے لیے حلال بتاتے ہیں، اور گندی چیزوں کو ان پر حرام فرماتے ہیں اور ان لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے ان کو دور کرتے ہیں۔ (حضرت تھانوی رح)

نیز آپ کو تو اس لیے بھیجا گیا تھا کہ آپ ان لوگوں کو جو پہلے شرک و جاہلیت کے میل کچیل میں ملوث تھے اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھ پڑھ کر سنائیں، ان کو اس میل و کچیل، عقائد باطلہ اور اخلاق ذمیمہ سے پاک و صاف کریں اور ان کو علم و دانشمندی سے روشناس کرائیں۔ ارشاد ہے:

لقد من الله على المومنين اذ بعث فيهم رسولاً من انفسهم يتلوا عليهم آيته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة وان كانوا من قبل لفي ضلال مبين۔
(آل عمران ۱۶۴)

اللہ تعالیٰ نے احسان کیا ایمان والوں پر جو بھیجا ان میں رسول ان ہی میں کا پڑھتا ان پر آیتیں اس کی اور پاک کرتا ہے ان کو یعنی شرک وغیرہ سے اور سکھلاتا ہے ان کو کتاب اور کام کی بات اور وہ تو پہلے سے صریح گمراہی میں تھے
(حضرت شیخ الہند رح)

خلاصہ یہ کہ اس آیت میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی چار شانیں بیان کی گئی ہیں۔

۱۔ کتاب اللہ کی آیات پڑھ کر سنانا۔

۲۔ تزکیۂ نفوس، یعنی نفسانی آلائشوں اور تمام مراتب شرک و معصیت سے ان کو پاک کرنا اور دلوں کو مانجھ کر صیقل بنانا

۳۔ تعلیم کتاب، یعنی کتاب اللہ کی مراد بتلانا۔

۴۔ تعلیم حکمت (حکمت کی گہری باتیں سکھلانا) یعنی قرآن کریم کے غامض اسرار و

لطائف اور شریعت کی دقیق وعمیق علل پر مطلع کرنا، خواہ تصریحاً ہو یا اشارةً۔ آپؐ نے خدا کی توفیق واعانت سے علم وعمل کے ان اعلیٰ مراتب پر اُس درماندہ قوم کو فائز کیا جو صدیوں سے انتہائی جہل وحیرت اور صریح گمراہی میں غرق تھی۔ آپؐ کی چند روزہ تعلیم وتربیت سے وہ ساری دنیا کے لیے ہادی ومعلم بن گئے (فوائدِ عثمانی۔ مختصراً)

غرضیکہ آپ چوں کہ داعی الی اللہ اور سراج منیر تھے، اس لیے آپؐ نے لوگوں کو سب سے پہلے خدائے ذوالجلال پر ایمان لانے کی دعوت دی، اور معبودانِ باطلہ کے انکار، نیز طاغوت کی نافرمانی کی تلقین وہدایت فرمائی، اور ان کے مابین زور سے اور علی الاعلان آپؐ نے فرمایا: یاایھاالناس قولوا لا الٰہ الا اللّٰہ تفلحوا۔" اے لوگو کہو کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی چیز لائق پرستش نہیں، کامیاب ہو جاؤ گے۔

(البدایہ والنہایہ ص۴۱ ج۳ بیروت)

آپؐ کی اس دعوت اور درد بھرے اعلان سے جاہلیت تلملا اٹھی، اس پر لرزہ طاری ہوگیا، اس کے کڑھاؤ میں اُبال پیدا ہوا۔ اور جاہلیت کے سورما معرکہ کے لیے کیل، کانٹوں سے لیس ہو کر میدان میں اتر آئے ———— ارشادِ ربانی ہے:

وعجبوا ان جاءھم منذر منھم وقال الکافرون ھذا سٰحرٌ کذّاب اجعل الآلھة الٰھا واحدا ان ھذا لشئٌ عجاب۔ وانطلق الملأ منھم ان امشوا واصبروا علیٰ اٰلھتکم ان ھذا لشئٌ یراد۔ ماسمعنا بھذا فی الملة الآخرة ان ھذا الا اختلاق اءنزل علیہ الذکر من بیننا ط

(سورۂ ص ۴ تا ۸)

اور تعجب کرنے لگے اس بات پر کہ آیا ان کے پاس ایک ڈر سنانے والا انہی میں سے اور کہنے لگے منکر، یہ جادوگر ہے جھوٹا، کیا اس نے کر دی اتنوں کی بندگی کے بدلے ایک ہی کی بندگی۔ یہ بھی ہے بڑے تعجب کی بات، اور چل کھڑے ہوئے کئی پنچ ان میں سے کہ چلو اور قائم رہو اپنے معبودوں پر بے شک اس بات میں کوئی غرض ہے، یہ نہیں سنا ہم نے اس پچھلے دین میں اور کچھ نہیں یہ بنائی ہوئی بات ہے۔ کیا اسی پر اُتری

نصیحت ہم سب میں سے۔ (حضرت شیخ الہند رح)

یعنی آسمان سے ایک فرشتہ آتا تو خیر ایک بات تھی، ہم ہی میں سے ایک آدمی کھڑا ہو کر ہم کو ڈرانے دھمکانے لگے اور کہے کہ میں آسمان والے خدا کی طرف سے مرسل ہوں، یہ عجیب بات ہے اب بجز اس کے کیا کہا جائے کہ ایک جادوگر نے جھوٹا ڈھونگ بنا کر کھڑا کر دیا ہے ——— اور مزید براں یہ کہ اتنے بے شمار دیوتاؤں کا دربار ختم کر کے صرف ایک خدا رہنے دیا اس سے بڑھ کر تعجب کی بات کیا ہوگی کہ مختلف شعبوں اور محکموں کے جن خداؤں کی بندگی قرنوں اور صدیوں سے چلی آتی تھی وہ سب یک قلم موقوف کر دی جائے۔ روایات میں ہے کہ ایک مرتبہ سرداران قریش نے خواجہ ابوطالب سے آن کر حضرت م کی شکایت کی کہ یہ ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتے ہیں، آپ ان کو سمجھائیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے چچا جان! میں صرف ان سے ایک کلمہ چاہتا ہوں جس کے بعد تمام عرب ان کا مطیع ہو جائے اور عجم ان کو جزیہ دینے لگے، انہوں نے خوش ہو کر کہا کہ ایک نہیں بلکہ دس کلمے ماننے کے لیے تیار ہیں۔ آپ نے فرمایا "لا الٰہ الا اللہ" یہ سنتے ہی وہ طیش میں بھر گئے اور کہنے لگے، اتنے خداؤں کو ہٹا کر اکیلا ایک خدا، چلو جی! یہ اپنے منصوبہ سے کبھی باز نہ آئیں گے یہ تو ہمارے معبودوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہیں، ان کی انتھک کوششوں کے مقابلہ میں ہم کو بہت زیادہ صبر و استقلال کے ساتھ اپنے آبائی اور قدیم دین کی حفاظت کی ضرورت ہے۔ نیز کیا غضب ہے کہ سارے ملک میں ایک یہی اس منصب کے لیے رہ گئے تھے؟ اور کوئی بڑا رئیس اور مالدار نہ ملتا تھا جس پر اپنا کلام نازل کرتا۔

(فوائد عثمانی رح ملخصاً)

چند شیر دل اور بھی مخالفتوں کے سیلاب آئے مگر بہہ گئے، آندھیاں آئیں اور نکل گئیں مگر آپ نے اپنی جگہ سے ذرا جنبش نہ کی، اس بارہ میں آپ کو ادنیٰ تذبذب بھی نہیں ہوا، بلکہ مسلسل توحید و رسالت، آخرت پر یقین کی دعوت بغیر لوچ و لچک اور بلا کم و کاست پورے شرح صدر کے ساتھ دیتے رہے، مصلحت اور مخالفتوں کی ادنیٰ رعایت بھی نہیں کی ——— کہ قریش کے چند شیر دل جوان مرد بغیر کسی دنیاوی ترغیب اور لالچ

کے آگے بڑھے اور انھوں نے رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم تک پہنچنے، اسلام لانے اور اسی ایک بارگاہِ ایزدی کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے، نیز اپنے بتوں کو چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا جب کہ اس وقت ایمان لانا اسی مردِ جواں کا کام تھا جو موت سے خائف نہ ہوں، اپنے اس عقیدہ اور یقین کے لیے سخت سے سخت تکالیف و مصائب برداشت کرنے اور انگاروں پر لوٹنے کے لیے آمادہ ہو، کفار و مشرکین کی ایذارسانی اور ان کی مارپیٹ سہنے کے لیے تیار ہو، اور دنیا و مافیہا سے رشتہ و تعلق منقطع کرچکا ہو۔

حضرت ابوبکر صدیق رضہ کے اسلام لانے کے بعد ان کو مکہ میں ایک روز دشمنوں نے خصوصًا بدبخت عتبہ بن ربیعہ نے اس قدر مارا کہ چہرہ پر اتنا ورم آگیا کہ شناخت مشکل ہوگئی بنوتیم ان کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر لے گئے یہاں تک کہ آپ کی موت میں ذرا شک نہ تھا، بے ہوش تھے مگر ہوش آنے پر سب سے پہلے یہ بولے کہ "ما فعل رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم"؟ (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟)، لوگوں کو غصہ آیا کہ ایسی حالت میں بھی ان کو یاد کرتے ہیں، حالانکہ ان ہی کی وجہ سے یہ حال ہوا، مگر آپ برابر اصرار کرتے رہے چنانچہ ام جمیل بنت خطاب نے بتایا کہ بخیر و عافیت ہیں اور دارارقم رضہ میں ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ بخدا میں اس وقت تک کوئی چیز چکھ نہیں سکتا جب تک کہ آپؐ تک نہ پہنچ جاؤں، چنانچہ جب آمد و رفت موقوف ہوئی تو آپ رضہ تشریف لائے اور حضورؐ کو دیکھ کر جان میں جان آئی۔ آپؐ کا دل بھی حضرت ابوبکر صدیق رضہ کی صورت دیکھ کر بہت زیادہ بھر آیا۔

(حیاۃ الصحابہ ص۴۱۲ تا ۴۱۳ ج ۱۔ ملخصًا والبدایۃ والنہایۃ ص۳۰ ج ۳ ملخصًا)

حضرت عثمان بن عفان رضہ نے جب ایک خدائے وحدہ لاشریک کی بندگی اختیار کرلی تو ان کو ان کے چچا حکم بن ابی العاص نے ایک مضبوط رسی سے باندھ دیا اور کہا کہ بخدا میں تجھ کو اس وقت تک نہیں چھوڑ سکتا جب تک تو اس نئے دین سے نہیں پھرے گا۔ مگر آپ نے بھی سختی سے کہا کہ بخدا میں اس دین کو کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ (حیاۃ الصحابہ ص ۴۲۲/۱)

حضرت بلال حبشی رضہ کو اسلام لانے کی وجہ سے لوہے کی زرہیں پہنا کر مکہ کی پتھریلی زمین میں، سخت دھوپ میں لٹا کر ایک بہت بڑا پتھر آپ کے سینے پر رکھ دیا جاتا، اور کبھی

لڑکوں کے سپرد کر دیئے جاتے جو مکہ کی گلیوں میں آپ کو کھینچتے تھے مگر آپؓ کی مبارک زبان پر "اَحَدٌ اَحَدٌ" کی رٹ ہوتی تھی۔ (حیاۃ الصحابہ ص۲۲۶ وص۲۲۵/۱)

ام عمار حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو تو اسی ایمان واسلام کی وجہ سے شقی ازلی بدبخت ابوجہل نے شرمگاہ میں نیزہ مار کر شہید ہی کر دیا تھا۔ اور آپؓ اسلام کی سب سے پہلی شہید ہیں۔

(البدایۃ والنہایۃ ص۵۹/۳، حیاۃ الصحابۃ ص۲۳۰/۱)

حضرت خباب بن الارت رضؓ کو آگ پر لٹا دیا جاتا تھا اور وہ آگ آپؓ کی چربی سے پگھل پگھل کر بجھتی تھی۔ (حیاۃ الصحابہ ص۲۳۲/۱)

ان تمام دل دہلانے والی تکالیف کے باوجود ان کے پیروں میں جنبش نہیں آئی، اس لیے کہ وہ اپنے برے اخلاق، بری معاشرت، غلیظ مذہب اور مسخ شدہ زندگی سے تنگ آکر اس عظیم وعزیز مذہب میں داخل ہوئے تھے، اور انھوں نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد مبارک سنا تھا کہ:

ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یاتیکم مثل الذین خلوا من قبلکم مستھم الباساء والضراء وزلزلوا حتی یقول الرسول والذین آمنوا معہ متی نصر اللہ، الا ان نصر اللہ قریب۔ (البقرہ ص۲۱۴)	کیا تم کو یہ خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ تم پر نہیں گذرے حالات ان لوگوں جیسے جو ہو چکے تم سے پہلے کہ پہنچی ان کو سختی اور تکلیف اور جھڑ جھڑائے گئے یہاں تک کہ کہنے لگا رسول اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے، کب آوے گی اللہ کی مدد۔ سن رکھو، اللہ کی مدد قریب ہے۔ (حضرت شیخ الہندؒ)

یعنی بحالت اضطرار بمقتضائے بشریت اس کی نوبت آئی کہ پریشانی کی حالت میں مایوسانہ کلمات سرزد ہونے لگے، یہ کہنا کوئی شک کی وجہ سے نہیں تھا —— اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوئی، کہ اے مسلمانوں تکالیف دنیوی اور دشمنوں کے غلبہ سے گھبراؤ نہیں، تحمل کرو اور ثابت قدم رہو، بس اللہ تعالیٰ کی مدد آگئی۔

(مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ)

اس لیے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ان کی پختگی اور یقین بڑھتا ہی گیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے ہم سے اسی کا تو وعدہ کیا تھا.......... ارشاد باری ہے :

ولما رأى المومنون الاحزاب قالوا هذا ما وعدنا الله ورسوله وصدق الله ورسوله وما زادهم الا ايمانا وتسليما ؛ (الاحزاب ۲۲)

اور جب دیکھیں مسلمانوں نے فوجیں، بولے یہ وہی ہے جو وعدہ دیا تھا ہم کو اللہ نے اور اس کے رسول نے، اور سچ کہا اللہ نے اور اس کے رسول نے، اور ان کو اور بڑھ گیا یقین اور اطاعت کرنا۔ (حضرت شیخ الہندؒ)

حاصل کلام یہ ہے آقائے نامدار تاجدار مدینہ محمد عربی صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کے اندر سے سطحی و اتھلی مذہبیت دور کر کے ان کے دل و دماغ کو رب العالمین کے یقین و معرفت کے فیضان سے معمور کیا۔ اور ایمان کی بے روح رسمیں و بے جان تقلیں نکال کر اس خدائے قدوس کی وحدانیت کا اقرار دل میں جاگزین کیا جو سب سے اونچی شان والا ہے، بڑا مہربان اور بے انتہا رحم کرنے والا ہے۔ قیامت کے دن کا تنہا مالک و مختار ہے، شہنشاہوں کا شہنشاہ ہے، کارخانہ عالم کا خالق اور صانع ہے۔ جنت اس کی نعمت و انعام اور جہنم اس کی سزا ہے، آنکھوں کی چوریوں، دلوں کے اسرار اور آسمان و زمین کی تمام پوشیدہ اشیاء سے واقف ہے جو سراپا جمال، سراپا جلال اور سراپا کمال ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے کمال میں ایمانی حرارت، یقین و معرفت اور خلوص و للہیت کی صحیح روح پھونک دے اور پختگی و اسلام کو ہمارے سینوں میں پیوست فرمائے۔

(آمین اللّٰھم آمین)

(جاری)

مولانا [illegible] (لندن)

آہ! مفتی اعظم پاکستان

حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب ٹونکی رح

۴ر رمضان المبارک ۱۴۱۵ھ مطابق ۳ر فروری ۱۹۹۵ء شب جمعہ بوقت سحر میرے استاذ محترم حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حادثہ وفات نے خصوصًا پاکستان اور عمومًا پورے عالم اسلام کے تمام دینی اور علمی حلقوں کے اہل قلوب کو متاثر کر کے رکھ دیا "انا للہ وانا الیہ راجعون"۔

راقم الحروف ۱۹۸۶ء میں جب برطانیہ آیا' ابھی چند مہینے گذرے تھے کہ یہ فرحت بخش اطلاع ملی کہ آج شام بعد عصر حضرت مفتی ولی حسن صاحب تشریف لارہے ہیں۔ حضرت کا کچھ غائبانہ تعارف تو پہلے سے تھا مگر شوق زیارت نے عصر کا انتظار ایسا مشکل بنادیا کہ "الانتظار اشد من الموت" کی مثل کا عملی تجربہ ہوگیا' یہ حضرت کی پہلی زیارت و ملاقات تھی۔ پھر تو حق تعالے نے ۱۴۰۸ھ میں حضرت سے شرف تلمذ کا موقع عنایت فرمایا۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

ولادت

حضرت رح کی ولادت ۱۹۲۴ء میں ہوئی' مفتی صاحب مرحوم کے والد ماجد مولانا مفتی انوار الحسن خاں صاحب جید عالم و مفتی تھے' غالبًا عدالت شرعیہ ٹونک میں عہدہ افتاء پر بھی فائز تھے' آپ کے جد امجد حضرت مولانا مفتی محمود صاحب ٹونکی رح ریاست ٹونک کے مایۂ ناز علماء میں سے تھے' انہوں نے تن تنہا "معجم المؤلفین" کے نام سے عربی مصنفین کی ایک وسیع انسائیکلو پیڈیا مرتب کی تھی' جو برسوں تشنہ طباعت رہی' بعد میں اس کی چند جلدیں شائع ہوئیں' حضرت مولانا مفتی محمود صاحب ٹونکی رح اپنے علاقہ میں فتویٰ کے معاملہ میں بھی مرجع کی حیثیت رکھتے تھے اور مفتی محمد حسن اور مولانا محمود حسن اور مولانا حیدر حسن خاں صاحب کے استاد بھی تھے۔ الغرض مولانا

کا تعلق علمی خاندان سے تھا جن میں مفتی صاحب کے والد ماجد، جد امجد کے علاوہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث و مہتمم مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ جیسی معروف شخصیات شامل ہیں ؎

این سلسلہ طلائے ناب است

این خانہ ہمہ آفتاب است

تعلیم

حضرت مفتی صاحبؒ نے فارسی اور ابتدائی عربی کی کتابیں اپنے والد ماجد صاحبؒ سے پڑھیں، گیارہ سال کی عمر ہوئی کہ والد ماجد کا سایہ عاطفت سر سے اٹھ گیا، رمضان المبارک کی تعطیلات میں مولانا حیدر حسن خاں صاحب بغرض تعزیت ٹونک تشریف لائے، اور مفتی صاحب کو ندوہ لے جانے کی خواہش ظاہر کی، چنانچہ آپ دارالعلوم ندوہ میں داخل ہوئے اور چار سال رہ کر ندوہ کا چار سالہ نصاب ختم کیا، اس دوران مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ سے رجب کہ موصوف ظہر سے قبل طویل وضو فرماتے تھے، الفیہ ابن مالک کا کچھ حصہ اور منطق کے ایک دو رسالے بھی پڑھے۔

اس کے بعد ٹونک تشریف لائے کیوں کہ مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ بھی ندوہ سے الگ ہو کر ٹونک تشریف لے جا چکے تھے۔ ندوہ کے بعض اساتذہ نے حضرت مفتی صاحب کے متعلق مولانا حیدر خاں صاحب سے یہ سفارش بھی کی کہ اس کو ندوہ ہی میں رہنے دیا جائے مگر مولانا نے فرمایا کہ اسے پرانے طرز کا عالم بنانا ہے۔ چنانچہ مفتی صاحب نے ٹونک ہی میں رہ کر مولانا حیدر حسن خاں صاحب سے حماسہ، ملاحسن اور فلسفہ کی بعض کتابیں پڑھیں، تاآنکہ مولانا رہ کا بمرض فالج انتقال ہو گیا۔ پھر مفتی صاحب نے عدالت شرعیہ ٹونک میں ملازمت اختیار کر لی، اور اس دوران الٰہ آباد سے مولوی اور پنجاب سے مولوی عالم اور مولوی فاضل سے امتحانات دئے۔

مگر ابھی تک تشنگی علم باقی تھی اور علم حدیث و تکمیل درس نظامی کا شوق دامن گیر تھا۔ اس لیے ملازمت کو خیرباد کہہ کر "مظاہر علوم سہارنپور" تشریف لائے، یہاں کچھ عرصہ قیام کے بعد "دارالعلوم دیوبند" آئے، اور موقوف علیہ اور دورۂ حدیث کی تعلیم حاصل کی، بخاری اور ترمذی شیخ العرب والعجم حضرت اقدس مولانا حسین احمد مدنی رحمہ سے اور ابوداؤد و شمائل ترمذی مولانا اعزاز علی صاحبؒ سے، اور مؤطا، مولانا عبدالحق صاحبؒ سے اور بقیہ کتابیں مختلف اساتذہ سے پڑھیں۔

درس وتدریس

دیوبند سے فراغت کے بعد دوبارہ ٹونک تشریف لائے اور عدالت شرعیہ جسے سول قسم کے مقدمات کو فیصل کرنے کا حق تھا اس کے منصب افتاء وقضاء کو زینت بخشی اور تقسیم ہند تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ اس درمیان مفتی صاحبؒ نے اپنے جدامجد مولانا مفتی محمود صاحبؒ کے باقی ماندہ کام کے تکمیل کا آغاز بھی فرمایا، مگر تقسیم ہند کا وقت آگیا تو مفتی صاحبؒ نے پاکستان کے سفر کا فیصلہ کرلیا اور کراچی تشریف لے گئے۔ اس وقت کراچی میں دینی تعلیم کا ایک ہی مرکزی ادارہ تھا، جو کھڈہ کے علاقے میں "مظہر العلوم" کے نام سے معروف تھا، لیکن ظاہر ہے وہ تمام اہل علم کو اپنے اندر سمو نہیں سکتا تھا۔ اس لیے مفتی صاحب نے اس وقت پرنس روڈ پر واقع "میٹروپولیس ہائی اسکول" میں اسلامیات کے استاذ کی حیثیت سے کام شروع کیا۔

۱۹۵۰ء میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے آرام باغ کی باب الاسلام مسجد میں "امدادالعلوم" کے نام سے ایک چھوٹا سا مدرسہ قائم کیا جس میں حفظ وناظرہ کے علاوہ ابتدائی فارسی وعربی تک کی تعلیم کا انتظام تھا، مفتی صاحب مرحوم کے ایک رفیق درس اور دارالعلوم کراچی کے سابق ناظم مولانا نوراحمد صاحبؒ اس مدرسہ کی بنا، میں حضرت مفتی شفیع صاحبؒ کے دست وبازو کے طور پر کام کرتے تھے، موصوف چونکہ دارالعلوم دیوبند میں مفتی ولی حسن صاحبؒ کے ہم سبق رہ چکے تھے اور انھیں پوری طرح اندازہ تھا کہ علم وفضل کا یہ شہسوار درحقیقت کسی ہائی اسکول میں پڑھانے کے لیے نہیں، بلکہ اسلامی علوم کے کسی بڑے مرکز سے فیض رسانی کے لیے پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ انھوں نے ابتداء میں "امدادالعلوم" کے مدرسے سے ان کا رابطہ کرایا، اور جب ۱۹۵۱ء میں نانک واڑہ میں دارالعلوم کراچی کی بنیاد پڑی تو وہ مفتی صاحبؒ کو مستقل طور پر ہائی اسکول سے دارالعلوم لانے میں کامیاب ہوگئے اور دارالعلوم کراچی سے حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنے علمی خدمات کا آغاز فرمایا، اور وہاں پانچ سال تک تدریسی فرائض انجام دیتے رہے، تدریس کے ساتھ ساتھ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نے فتوی نویسی کی خدمات بھی جزوی طور پر مفتی صاحب کے سپرد کردی تھیں۔

۱۹۵۶ء میں جب دارالعلوم کراچی نانک واڑہ کی تنگ عمارت سے کورنگی کے ایک وسیع رقبہ زمین پر منتقل ہوا، چوں کہ یہ جگہ شہر سے دور ہے اس لیے روزانہ یہاں آمد ورفت بہت مشکل اور مشقت طلب تھی، دوسری طرف مفتی صاحب کو بعض ایسے گھریلو اعذار لاحق تھے جن کی وجہ سے

وہ مستقل طور پر دارالعلوم کے احاطے میں قیام سے بھی معذور تھے۔ اس لیے مفتی صاحب اس موقع پر دارالعلوم سے مستعفی ہو کر محدث جلیل حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ کے مدرسہ عربیہ ٹاؤن سے منسلک ہو گئے اور اسی سے اخیر تک وابستہ رہے۔

اوصاف و کمالات

حضرت مفتی صاحبؒ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو اپنے علم اور مطالعہ کو صرف درسیات کی حد تک محدود رکھتے تھے، بلکہ ان کا شب و روز کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ مطالعہ تھا، اور وہ ہر علم و فن کے بارے میں وسیع مطالعے کے حامل تھے، اور کتابوں کے بارے میں بھی ان کی معلومات نہایت وسیع تھی، جب کسی شخص کو کسی خاص موضوع پر مواد کی تلاش ہوتی، تو وہ حضرت مفتی صاحبؒ کے پاس پہنچ جاتا، اور حضرت اس کو برجستہ بہت سی کتابوں کے نام بتا دیتے اور اس سائل کا کام بن جاتا۔

یوں تو حضرت مفتی صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے لیکن انھوں نے ندوۃ العلماء لکھنؤ میں بھی تعلیم حاصل کی تھی، اس لیے مزاج لکھنؤ کے مطابق تاریخ اور ادب کے ساتھ بھی خصوصی وابستگی حاصل تھی، اس لیے ادب کا درس بھی بہت عمدگی اور خوش اسلوبی سے دیا کرتے تھے، بلکہ ابتداء عربی ہی سے طلبہ میں عربی تقریر و تحریر کا ذوق پیدا فرمایا کرتے تھے۔

حق تعالٰی نے مفتی صاحبؒ کو بڑی جامعیت اور اعلیٰ صلاحیت سے نوازا تھا، ہر فن پر کمال حاصل تھا مگر خاصۃً فقہ میں عجیب ملکہ حاصل تھا، گویا فقہ آپ کا خصوصی موضوع تھا، عام طور پر فقہ کی کتب کے مسائل کلیات سے سمجھا دیا کرتے، ہدایہ کے درس میں نہ صرف یہ کہ ہدایہ کے مباحث کو بڑے دل نشیں پیرایہ میں سمجھاتے بلکہ متعلقہ مسئلے کے اصولی پہلو پر بطور خاص روشنی ڈالتے۔ اور مسئلے سے نکلنے والی اصول ہدایات کی نشان دہی بھی فرماتے، اور بسا اوقات یہ بھی بتاتے کہ ان اصولی ہدایات سے وقت کے نوبہ نو مسائل میں کس طرح کام لیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی حضرت مفتی صاحبؒ عصر حاضر کی تمام فکری تحریکوں سے پوری طرح باخبر تھے اور جدید مسائل کے بارے میں اپنے آپ کو تازہ ترین معلومات سے مزین رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کے درس میں بھی یہ ساری معلومات اس طرح منعکس ہوتی تھیں کہ طالب علم کی فقہی بصیرت کو جلا اور ترقی ملتی تھی اور فقہ سے خصوصی دلچسپی پیدا ہوتی تھی۔

فقہ میں جو خاص ذوق آپ کو ودیعت ہوا تھا اسی کا نتیجہ تھا کہ دقیق سے دقیق مسائل بڑی آسانی سے حل فرمادیا کرتے تھے۔ جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن میں تدریس کے ساتھ ساتھ افتاء کی تمام تر ذمہ داری آپؒ ہی کے ذمہ تھی، آہستہ آہستہ اس شعبہ کے رفقاء کار میں اضافہ ہوتا رہا، اور مفتی صاحبؒ ۱۳۸۱ھ میں اس کے سربراہ اور رئیس ہو گئے۔

جامعہ میں درس نظامی کے ساتھ مختلف تخصصات کا اجراء عمل میں آیا تو حضرت مفتی صاحب کو تخصص فی الفقہ کا نگراں مقرر کیا گیا۔ اس تخصص کی نگرانی کے ذریعہ سینکڑوں طلبہ کو فیض پہنچایا،

حضرت بنوری رہ اور مفتی محمد شفیع صاحبؒ کو آپ کے تفقہ پر بڑا اعتماد تھا، مولانا مفتی احمد الرحمٰن صاحبؒ نے لکھا ہے کہ حضرت بنوری رہ نے آپ کو "فقیہ العصر" کا لقب دیا تھا، اسی اعتماد کی وجہ سے جدید مسائل میں اجتماعی غور و فکر کے لیے "مجلس تحقیق مسائل حاضرہ" کے نام سے ایک کمیٹی کی تشکیل وجود میں آئی تو حضرت مفتی صاحب پر نظر انتخاب پڑی بلکہ آپ اس مجلس کے رکن رکین تھے۔

خدا کرے حق تعالیٰ مفتی صاحبؒ کے فتاویٰ کے اشاعت کی کوئی صورت بنا دے اور کوئی قدرداں شاگرد اس عظیم کام کے لیے کمربستہ ہو جائے۔ میری فائل میں داڑھی کے متعلق مولانا رہ کا ایک فتویٰ نظر سے گذرا، اس کو نظر ناظرین کرتا ہوں۔

استفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ میں:

۱۔ داڑھی کترے حافظ کے پیچھے نماز خواہ فرض ہو یا تراویح ہو کیا حکم ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ داڑھی کی کوئی خاص اہمیت نہیں

۲۔ بعض مساجد میں انتظامیہ کی طرف سے ایسے حفاظ کو تراویح کی اجازت دی جاتی ہے۔ کیا انتظامیہ پر کسی قسم کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے

الجواب

باسمہٖ تعالیٰ

۱: بصورت مسئولہ ڈاڑھی رکھنا واجب ہے۔ ڈاڑھی منڈانا یا ایک مشت سے کم کرنا ناجائز و حرام ہے، ڈاڑھی کترا حافظا بے شک فاسق فاجر ہے جب تک کہ اس فعل سے توبہ نہ کرلے نیز مکروہ تحریمی پر عمل کرنا عملاً حرام ہے، جو شخص ڈاڑھی ایک مشت سے کم کراتا ہو اس کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی ہے۔ ڈاڑھی ایک مشت رکھنے پر چاروں مذاہب کا اتفاق ہے شامی، عالمگیری اور فقہ کی دوسری کتابوں میں یہ مسئلہ مذکور ہے۔ عالمگیری کی عبارت ہے،

"والقصر سنة فيها وهوان يقبض الرجل لحيته فان زاد منها على قبضة قطعة ذكر محمد۔"

۲: اس فعل قبیح کے ارتکاب میں انتظامیہ برابر کی شریک ہوگی۔

نیز تواریخ میں لکھا ہے کہ جب کسریٰ شاہ ایران نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا مکتوب مبارک پھاڑ کر اپنے ماتحت گورنر یمن باذان کو لکھا کہ دو آدمی حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجو، وہ جا کر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو میرے پاس بھیج دیں، باذان کے جب دو آدمی حضور علیہ السلام کے پاس حاضر ہوئے تو ان دونوں کی ڈاڑھیاں مونڈی ہوئی تھیں، اور بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔

" وكان على زى الفرس من حلق لحاهم واعفاء شواربهم فكره صلى الله عليه وسلم النظر اليهما وقال ويلكما من امركما بهذا؟ قال امرنا ربنا يعنيان كسرى فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم ولكن ربي قد امرني باعفاء لحيتي وقص شاربي۔"

ان دونوں مجوسیوں کی فیشن کے مطابق ڈاڑھیاں مونڈی ہوئی تھیں اور بڑی بڑی مونچھیں تھیں تو حضور علیہ السلام کو ان کی یہ مکروہ شکل بہت ہی ناپسند آئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تم پر ہلاکت ہو، تم کو کس نے یہ مکروہ شکل بنانے

کا حکم دیا ہے۔ انہوں نے کہا، ہمارے رب کسریٰ نے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لیکن میرے رب نے مجھے ڈاڑھی رکھنے اور مونچھیں کٹوانے کا حکم دیا ہے۔

غور کیجئے وہ دونوں مہمان تھے، کافر تھے، ہمارے مذہب کے پابند ہی نہ تھے مگر چوں کہ ان کی یہ بری صورت فطرت سلیمہ کے خلاف تھی، اور شیطان لعین کے حکم کے مطابق تھی۔ اس لیے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو ان کی یہ مکروہ شکل دیکھنی گوارہ نہ ہوسکی، ان سے منہ موڑلیا، اور ان کو بددعائیہ جملہ فرمایا کہ تم پر ہلاکت ہو، ساتھ ہی یہ بھی تصریح فرمادی کہ میرے رب تعالیٰ نے تو مجھے پوری ڈاڑھی رکھنے اور مونچھیں کٹانے کا حکم فرمایا ہے گویا جو ڈاڑھی اللہ تعالے کو پسند ہے اور جس کا اس نے حکم دیا ہے اس کی مقدار وہ ہے جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے خود رکھ کر بتائی کہ سینہ مبارک بھر دیتی تھی، پس آپ کے محب امتیوں کو غور کرنا چاہئے کہ جو لوگ ان مجوسیوں کی اتباع کرکے روزانہ ڈاڑھیاں منڈاتے ہیں اور ان کے یہ اعمال روزانہ فرشتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ حرکات دیکھ کر کتنا دکھ ہوگا۔ اور میدان قیامت میں حضور علیہ السلام کے امتی ایسی مکروہ صورت میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوں تو اس وقت اگر حضور صلے اللہ علیہ وسلم ان سے منہ موڑلیں تو کتنا بڑا خسارہ ہے۔

کتبہ
ولی حسن　　علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
دارالافتاء جامعۃ العلوم الاسلامیہ　　۱۲ر جمادی الثانی ۱۴۰۸ھ

جامعہ علوم اسلامیہ میں مفتی صاحب مرحوم نے تقریباً ہر فن کی کتابیں پڑھائیں، پھر اخیر میں جامع ترمذی اور بخاری شریف سالوں تک پڑھاتے رہے۔ جامع ترمذی پڑھانے سے قبل حضرت بنوری رح کے درس ترمذی میں دو سال تک خصوصیت سے شرکت فرماتے رہے اس کے بعد حضرتؒ نے ترمذی ان کے حوالہ کردی اور حضرت بنوری رح کی وفات کے بعد صحیح بخاری کی تدریس میں حضرت بنوری رح کی جانشینی کا شرف بھی آپ ہی کو حاصل ہوا۔ اس دوران ہزارہا شاگردوں نے فیض حاصل کیا اور اطراف عالم میں دینی وعلمی خدمات میں مصروف ہیں جو حضرت مفتی صاحبؒ

کا صدقہ جاریہ ہے۔ حق تعالیٰ کا احسان ہے کہ ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۹۸۰ء میں راقم الحروف کو آپ سے بخاری شریف و ترمذی پڑھنے کی سعادت نصیب ہوگئی۔ اس کے بعد مرض کی وجہ سے حضرت کا سلسلۂ تدریس موقوف ہوگیا، راقم الحروف دوران درس حضرت کی کچھ باتیں لکھ لیا کرتا تھا وہ امانت افادہ عام کے لیے ملفوظات کے عنوان سے حوالہ قرطاس کرتا ہوں۔ (آخر میں ملاحظہ فرمائیں)۔

حضرت رہ کا درس محدثانہ، فقیہانہ ہوتا تھا۔ درس ترمذی میں فقہی شان کا غلبہ ہوتا، اور درس بخاری میں محدثانہ رنگ غالب رہتا۔ بخاری کی بہ نسبت ترمذی میں تفصیلی کلام فرماتے کبھی کبھی مختلف کتابوں کے حوالے بتلا کر طلبہ سے وہ حوالجات نکلواتے اور فرمایا کرتے تھے کہ میرے شیخ حضرت مدنی رہ کا طرز بھی ایسا ہی تھا۔ راقم نے بارہا مفتی صاحبؒ سے سنا ہے کہ:

"حضرت مدنی رہ ترمذی بہت تحقیق سے پڑھاتے اور دوران درس حضرت کے سامنے بہت ساری کتابیں رہتیں، ان کے حوالے دیا کرتے اور طلبہ کو دکھایا کرتے، اور اہم مباحث کو بہت آسان کر کے سمجھاتے"۔

مفتی صاحبؒ کو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے والہانہ محبت تھی، ذکر مبارک سے اکثر اشکبار ہو جاتے، بعض مرتبہ کیفیت بکاء بے قابو ہو جاتی جس کا اثر شاگردوں پر بھی ظاہر ہو جاتا۔ استاذ کے آنسو کے ساتھ تلامذہ کی آنکھیں بھی اشک بار نظر آتیں۔

آپ کے عشق نبوی ص کا کچھ اندازہ اس وقت ہوا کہ ۴ر شوال ۱۴۰۰ھ بروز یکشنبہ بنوری ٹاؤن میں داخلہ کے لیے حضرت مفتی صاحبؒ نے ہماری جماعت کا امتحان لیا۔ مشکوٰۃ میں حجۃ الوداع کی طویل حدیث موضع امتحان تھی، ایک ساتھی نے یہ عبارت " ثم اذن فی الناس بالحج فی العاشرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حاج [مشکوٰۃ] پڑھی کہ مولانا رہ کی آنکھیں بے اختیار آنسو بھر لائیں، چوں کہ یہ پہلا موقع تھا، میں بہت متاثر ہوا پھر تو ایسے مواقع متعدد مرتبہ نظروں سے گذرے۔ خصوصاً کتاب التفسیر میں واقعہ افک کی عبارت جب طالب علم نے پڑھی، مفتی صاحبؒ کی حالت بکاء یہ ہوگئی کہ سبق نہ پڑھا سکے، دوسرے دن بڑی مشکل سے بھرائی ہوئی آواز میں درس دیا۔ ایسے موقع میں تقریباً سارے ہی طلبہ پر ایک ایسی کیفیت

طاری ہوتی، جو دیکھنے سے ہی تعلق رکھتی ہے۔

مفتی صاحبؒ کی زبان میں ہلکی سی لکنت تھی، لیکن آپ کا درس انتہائی دل نشین اور دلچسپ ہوتا تھا، طبیعت میں غضب کی ظرافت تھی جس سے زبان کی معصومانہ لکنت اس تقریر میں کمی کرنے کے بجائے اور اضافہ کردیتی تھی۔

تواضع اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحبؒ کو جن صفات وخصوصیات سے نوازا تھا وہ بمشکل ہی کسی ایک شخص میں جمع ہوتی ہیں، گویا یہ شعر آپ کے مطابق حال تھا ؎

لیس علی اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

ایک طرف تو فقہ وحدیث کے پہاڑ اور ادب عربی اور دیگر علوم کے بحر زخار مگر اس علم وفضل کے بلند مقام کے ساتھ ساتھ ان کی سادگی اور تواضع کا یہ عالم تھا کہ کوئی اجنبی دیکھنے والا پتہ بھی نہیں لگا سکتا کہ اس سادہ سے پیکر میں علم وفضل کے کیسے خزانے جمع ہیں، حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رہ ایک شعر پڑھا کرتے تھے ؎

تواضع کا طریقہ سیکھ لو مراحی سے
کہ جاری فیض بھی ہے اور جھکی جاتی ہے گردن بھی

یہی حال حضرت مفتی صاحبؒ کا بھی تھا۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی زندگی کا ایک بڑا اور امتیازی وصف یہ تھا کہ آپ اظہار حق میں بڑے نڈر واقع ہوئے تھے، ارباب تمول اور دنیوی عہدہ رکھنے والوں کے سامنے بے دھڑک اظہار حق کرنے میں "لایخافون فی اللّٰہ لومۃ لائم" کے مصداق تھے، ایک مرتبہ مساجد کے سلسلہ میں عدالت نے یہ فیصلہ کیا کہ ایسی مساجد منہدم کی جا سکتی ہیں جو کچی آبادی میں حکومت کی اجازت کے بغیر تعمیر کی گئی ہوں، حضرت مفتی صاحب نے عدالت کے خلاف انہدام مسجد کے عدم جواز کا فتویٰ دیا، جس پر ان کے خلاف توہین عدالت کا مقدمہ درج ہوا، چنانچہ عدالت میں پیشی ہوئی، اور حضرت سے طلب معافی کا مطالبہ ہوا، مفتی صاحبؒ نے ججوں کے سامنے بغیر کسی مرعوبیت کے فرمایا :

" میرا تعلق علماء دیوبند سے ہے اور علماء دیوبند کبھی بھی حکومت یا ارباب

اقتدار کے سامنے جھکا نہیں کرتے بلکہ بے دھڑک "الدین النصیحۃ" کے تحت حق بات کہا کرتے ہیں، میں اپنے فتویٰ پر قائم ہوں اور کبھی بھی معافی نہیں مانگوں گا"۔

جس پر حاضرین نے بھرپور داد دی، عدالت برخاست ہوئی، اور کراچی کے عوام کے جوش وخروش سے خائف ہوکر حکومت نے اسلام آباد میں پیشی کا فیصلہ کیا، مگر نصرت خداوندی شامل حال رہی اور بالآخر عدالت کو اپنے توہین عدالت کے مقدمہ میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

تصنیف وتالیف

وسعت مطالعہ اور تدریس وافتاء کے ساتھ حق تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب کو بہترین تحریری صلاحیت سے بھی نوازا تھا، غالباً ان کی سب سے پہلی کتاب "تذکرہ الاولیاء" شائع ہوئی تھی۔ پھر حکومت کے بنائے ہوئے خلافِ شریعت عائلی قوانین کے خلاف آپ کی فاضلانہ کتاب "عائلی قوانین شریعت کی روشنی میں" بڑی مقبول ہوئی۔ فتنۂ انکار حدیث کے خلاف بھرپور کام کیا اور اس موضوع پر "فتنۂ انکار حدیث" نامی کتاب لکھی، ان کے علاوہ "بیمۂ زندگی" "پرائیویڈنٹ فنڈ" اور "قربانی کے مسائل" کے نام سے تحقیقی وعلمی تصانیف مرحوم کی یادگار ہیں۔ اس کے علاوہ "بینات" "البلاغ" و دیگر ماہناموں میں آپ کے وقیع مقالات اور تحقیقی مضامین شائع ہوتے رہے۔ حضرت بنوری رہ کی سوانح حیات "بینات نمبر" میں محدث العصر کے عنوان سے مفتی صاحبؒ نے حضرت بنوری رہ کی خدمت علم حدیث پر جو تفصیلی مضمون تحریر فرمایا ہے وہ آپ کی غیر معمولی صلاحیت پر شاہد عدل ہے۔

بیعت وارشاد

حضرت مفتی صاحبؒ کا اصلاحی تعلق شروع میں حضرت مولانا حماد اللہ ہالیجوی رہ سے رہا اور کئی بار ان کی خدمت میں حاضری کی سعادت بھی نصیب ہوئی، موصوف کی وفات کے بعد برکۃ العصر حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی رہ سے بیعت ہوئے، اور ۱۴۰۱ھ ۱۹۸۱ء میں خلافت سے نوازے گئے جب کہ حضرت شیخ رہ جنوبی افریقہ میں معتکف تھے، مفتی صاحب کی کمال عبدیت کا یہ عالم تھا۔ فرماتے تھے "میں اپنے آپ کو حضرت شیخ کے لوگوں میں سب سے زیادہ گندہ نجس، نااہل سمجھتا ہوں"۔

مرض ووفات آج سے تقریباً چھ سال قبل مفتی صاحبؒ پر فالج کا شدید حملہ ہوا جس میں قوت گویائی بھی باقی نہ رہی، مسلسل علاج کے نتیجے میں اتار چڑھاؤ آتے رہے، لیکن معذوری کی سی جو کیفیت پیدا ہوگئی تھی اس میں کوئی ایسا نمایاں فرق نہ آیا جو حضرتؒ کو عملی زندگی میں دوبارہ لا سکے۔ بالآخر شب جمعہ ۲ رمضان المبارک ۱۴۱۵ھ کو داعی اجل کا پیغام آگیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اتنے عرصے سے رمضان اور جمعہ کے انتظار میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس ماہ مبارک کے پہلے ہی جمعہ میں انہیں اپنے پاس بلالیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم کی نماز جنازہ حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم نے پڑھائی، اور مرحوم کی حسب خواہش ووصیت دارالعلوم کورنگی کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔

نوٹ : مولانا مفتی صاحبؒ کے یہ حالات ماہنامہ بینات، (مارچ ۱۹۹۵ء) اور ماہنامہ البلاغ (اپریل ۱۹۹۵ء) اور " حضرت شیخ الحدیث اور ان کے خلفائے کرامؒ " سے ماخوذ ہیں

ملفوظات : استاذ محترم مولانا مفتی ولی حسن صاحب نور اللہ مرقدہ

۱: لوگ کشف وکرامت کے پیچھے پڑے ہیں حالانکہ سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ حسن خاتمہ کی دولت نصیب ہوجائے۔

۲: حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی نسبت بڑے آب وتاب کے ساتھ مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی طرف منتقل ہوئی۔ اسی طرح مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ کی نسبت منتقل ہوئی مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ مدظلہ کی طرف، اسی لیے مولانا نعمانی نے رد شیعیت پر بڑا کام کیا۔

۳: حضرت مدنی رہ مذاقاً فرمایا کرتے تھے " لکل شئ نصاب ونصاب الشتاى ثلاث " رواہ مسلم (یعنی راوی الحمد للہ مسلمان ہے)۔

۴: مولانا اعزاز علی صاحبؒ نے فرمایا کہ " باسی روٹی صبح کو شہد کے ساتھ دو تین نوالے کھالے اس کا حافظہ اچھا ہوگا۔

۵: حضرت شیخ الہند کے نواسے (تو مہاں) فرمایا کرتے تھے " جسے نیند نہ آتی ہو

وہ بھی سونگھا کرے۔

۶۔ حضرت بنوری رحمہ اللہ کے والد صاحبؒ سے کسی نے یہ سوال کیا کہ وضو میں پہلے کلی کرنے پھر ناک صاف کرنے کی کیا حکمت ہے۔ جواباً فرمایا: پہلے کلی کرکے ہم دیکھتے ہیں کہ پانی کا مزہ کیسا ہے اور ناک میں پانی ڈال کر ہم دیکھتے ہیں کہ پانی کی خوشبو کیسی ہے۔

۷۔ جو آدمی یہ آیت "سَیُهْزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ" تین سو تیرہ (۳۱۳) مرتبہ پڑھے وہ دشمن کے شر سے محفوظ رہے گا۔

۸۔ اس زمانے میں غسل خانے اور بیت الخلاء ایک ساتھ بنانے کا رواج ہوگیا تو ایسی جگہ پر وضو کے وقت مسنون دعائیں نہ پڑھے۔

۹۔ حدیث کی اردو کتابیں (ترجمہ) پڑھ کر لوگ منکر حدیث بن جاتے ہیں لیکن مظاہر حق بڑی اچھی کتاب ہے اس کو پڑھ کر کوئی گمراہ نہیں ہوگا۔

۱۰۔ حدیث کی علتوں کو جاننا بہت مشکل ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ اس فن کے امام تھے، ان کے بعد امام نسائی رحمہ اللہ پھر امام مسلم رحمہ اللہ پھر امام ابوداؤد رحمہ اللہ پھر امام ترمذی رحمہ اللہ۔

۱۱۔ ابواب سب سے بہتر بخاری کے ہیں، پھر نسائی کے، پھر ابوداؤد کے۔

۱۲۔ تقلید نہ کرنے سے آدمی دین سے نکل جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کو مدینہ منورہ میں مکاشفہ ہوا تھا کہ حنفی مسلک کی تقلید کرو، ورنہ مشکل ہوگا۔

۱۳۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے حدیث پڑھی شیخ ابوالطاہر المدنیؒ سے استاذ فرمایا کرتے تھے "ولی اللہ مجھ سے الفاظ سیکھتا ہے اور میں اس سے معانی سیکھتا ہوں۔

۱۵۔ ایک چیز ترش ہے ایک شیریں اور بعض کچھ ترش کچھ شیریں۔ اسی طرح ایک حدیث "حسن" ہے ایک "صحیح" ہے اور ایک "حسن صحیح" ہے

۱۶۔ علم حدیث کا ماخذ "واما بنعمة ربك فحدث" ہے (فتح الملہم)

۱۷۔ قرآن کی حفاظت اللہ نے کی اور حدیث کی حفاظت کا کام اللہ نے امت سے لیا محدثین نے بڑی محنت فرمائی۔ صرف حدیث کے راویوں کے بارے میں کام کیا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دس ہزار راویوں کے حالات ہمارے پاس

محفوظ ہیں۔

۱۸: گناہوں میں اعلیٰ درجہ معصیت ہے اور کمتر درجہ ذنب ہے۔

۱۹: جو بلا وضو نماز پڑھے اور ثواب کی نیت رکھے وہ کافر ہے اور جو مال حرام سے زکوٰۃ دے اور ثواب کی نیت رکھے وہ بھی کافر ہے۔

۲۰: عبادات اور عادات میں فرق کرنے والی چیز نیت ہے۔

۲۱: سب سے پہلے جس نے فقہ کو مدون کیا وہ امام محمدؒ ہیں، اور جس نے سب سے پہلے (صحیح) حدیث کو جمع کیا، وہ امام بخاری رہ ہیں، امام محمد رہ سے پہلے لوگوں نے جو کتابیں لکھیں وہ اکثر زہد میں تھیں۔

۲۲: ساری حدیثوں کا بابا آدم "زہری رہ" ہیں اور معترضین (منکرین حدیث) کو انہیں پر بڑا اعتراض ہے۔

۲۳: میرے استاذ فرمایا کرتے تھے "سیرۃ ابن ہشام" ایسی ہے جیسے بخاری۔

۲۴: یہ جو کہتے ہیں کہ بندر نے زنا کیا، اس کو دوسرے بندروں نے سنگسار کیا۔ حضرت مدنی رہ فرمایا کرتے تھے کہ وہ بندر نہیں تھے بلکہ جنات تھے۔

۲۵: یثرب موت کے کنویں کو کہتے ہیں چوں کہ گرمی کی وجہ سے لوگ بہت مرجاتے تھے اس لیے اس کا نام یثرب ہو گیا۔

۲۶: بعض لوگوں نے کہا، ابن جریر طبری کے نزدیک مسح علی القدمین جائز ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ ابن جریر رہ نے یہ کہا ہے کہ پاؤں محل شعائق ہے اس لیے جب دھوئے تو ہاتھ بھی پھیر لے، اس کو لوگوں نے غلط سمجھ لیا۔

۲۷: قرآن کو اہل ہند نے خوب اور زیادہ سمجھا گرچہ اترا ہے دوسری جگہ۔

۲۸: او: مولویو: حدیث کو صرف قال نہ بناؤ بلکہ حال بناؤ۔

۲۹: علم حدیث کی تین تعریفیں منقول ہیں:

(۱) "علم یعرف به اقوال النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم واحواله"
اس علم کا نام علم روایۃ الحدیث ہے۔

(۲) "علم يبحث منه عن كيفية اتصال الحديث بالنبي صلى الله عليه وسلم من حيث رواتها ضبطاً وعدلاً وبحيثية اتصالاً وانقطاعاً وغير ذلك" اس علم کا نام علم اصول الحدیث ہے۔ اس پر ابن صلاح نے بڑا کام کیا ہے۔

(۳) "علم باحث عن المعنى المفهوم من الفاظ الحديث وعن المراد مبيناً عن القواعد العربية والضوابط الشرعية" اس علم کا نام علم درایۃ الحدیث ہے۔

اس کا موضوع راوی اور مروی ہے اور غرض وغایت "الفوز بسعادة الدارين" ہے۔

۳۰: آج یورپ میں مسلمان لڑکی کی شادی کافر سے ہورہی ہے۔ ایک بزرگ نے فرمایا ایسی حالت میں مسلمانوں پر ضروری ہے کہ ہندوپاک واپس آجائیں اگرچہ پیدل سفر کرکے آنا پڑے، وہاں رہنے سے بہتر ہے۔

دار العلوم کی نئی جامع مسجد

اللہ تعالیٰ کا بیحد و حساب شکر ہے کہ دار العلوم دیوبند کی نئی جامع مسجد پروگرام کے مطابق تعمیری مراحل طے کرتے ہوئے پایۂ تکمیل کے قریب پہونچ رہی ہے اور اب اس کے اندرونی حصوں کو، دیواروں اور فرش کو سنگ مرمر سے مزید پختہ اور مزین کیا جا رہا ہے، یہ کام چونکہ اہم بھی ہے اور بڑا بھی اس پر رقم بھی کثیر خرچ ہوگی، محبین و مخلصین کی رائے ہوئی کہ آئے دن رنگ و روغن کرانے کے خرچ سے بچنے کیلئے بہتر یہ ہے کہ ایک ہی مرتبہ اچھی رقم لگا دی جائے، اسی احساس کے پیش نظر اتنا بڑا کام سرانجام دینے کا بوجھ اٹھا لیا گیا، ہمیں امید ہے کہ تمام حضرات معاونین نے جس طرح پہلے خصوصی تعاون دیکر مسجد کو تکمیل کے قریب پہنچایا ہے، اسی طرح بلکہ مزید سرگرمی کے ساتھ دست تعاون بڑھا کر اس مرحلہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ادارہ کی [illegible] فرمائیں گے

یہ مسجد بین الاقوامی اہمیت کی حامل درسگاہ دار العلوم دیوبند کی جامع مسجد ہے جس میں نہ جانے کس کس دیار کے نیک لوگ آکر نماز ادا کریں گے خوش قسمت ہیں وہ مسلمان جن کی کچھ بھی رقم اس مسجد میں لگ جائے، اسلئے اپنی جانب سے اور گھر کے ہر فرد کی جانب سے اس کارِ خیر میں حصہ لیکر عنداللہ ماجور ہوں اور دوسرے احباب و اقربا کو بھی اس کی ترغیب دیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمیں مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائیں اور دن دونی رات چوگنی ہمہ جہتی ترقیات سے نوازتے ہوئے تمام مصائب و آلام سے محفوظ رکھے، آمین

پتہ

ڈرافٹ و چیک کیلئے :- "دار العلوم دیوبند" اکاونٹ نمبر 30076 اسٹیٹ بینک آف انڈیا دیوبند

منی آرڈر کے لئے :- حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند پن کوڈ نمبر 247554

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

PH. NO. 22429
COD - 01336
PIN - 247554

جلد ۷۹ | ماہ جمادی الاول سنہ ۱۴۱۶ھ مطابق ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۹۵ء | شمارہ ۱۰

سالانہ : 60/-
فی شمارہ : 6/-

نگراں
حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر
حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی
استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ
دفتر ماہنامہ دارالعلوم
دیوبند، سہارنپور
یوپی

سالانہ بدل اشتراک
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۴۰۰ روپئے
پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۱۰۰
بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم -/۹۰
ہندوستان سے -/۶۰ ”

فہرست مضامین

حرف آغاز

حبیب الرحمٰن قاسمی

دور حاضر میں اسلامی اداروں اور دینی درس گاہوں کا ملک میں جس طرح سے جال پھیلا ہوا ہے وہ تاریخ کے کسی عہد میں نظر نہیں آتا اور بحمد اللہ اس میں روز بروز ترقی ہوتی جارہی ہے۔ آپ پورے ملک کا گھوم کر جائزہ لیں آپ کو ہر صوبہ اور صوبہ کے ہر ضلع اور ضلع کی اکثر بستیوں میں دینی مدارس ومکاتب ضرور ملیں گے اور ان میں ایک دو نہیں سیکڑوں مدرسے ایسے ملیں گے جن کا سالانہ بجٹ ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ہوگا۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان درس گاہوں اور علمی تربیت گاہوں کے مفید اثرات ظاہر بھی ہورہے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ پوری فراخ دلی سے ہمیں یہ بات تسلیم کرنی چاہئے کہ ان دینی مدارس اور جامعات سے پورے طور پر مطلوبہ فوائد حاصل نہیں ہورہے ہیں اور ملت کی تشکیل وتہذیب کے سلسلہ میں ان سے جو توقعات وابستہ ہیں وہ پوری نہیں ہورہی ہیں، اور مسلم معاشرہ بے چین اور مضطرب ہے کہ اسے صحیح طور پر رہنمائی نہیں مل پارہی ہے۔ عقائد و اعمال کی دیواریں متزلزل ہوتی جارہی ہیں، اخلاق وکردار کی قدریں دم توڑتی جارہی ہیں اور شعوری وغیر شعوری طور پر امت اپنی ڈگر اور صحیح راستہ سے ہٹتی جارہی ہے۔

حالانکہ ماضی میں ہمارے اسلاف نے انہیں مدارس اور دینی تربیت گاہوں سے ملت کے بھٹکے ہوئے قافلے کو صحیح سمت پر لگانے کے ساتھ مدارس کے انہیں زاویوں میں بیٹھ کر باطل کا مقابلہ بھی کیا تھا اور اس مؤثر انداز سے کہ اسے راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات کا جائزہ لیجئے کس طرح غیر ملکی اور بدیسی تاجروں نے اپنے مکر وفریب اور سازشوں کے ذریعہ ملک پر قبضہ جما لینے کے بعد اسلامی ملی شعائر وعلامات دینی عقائد ونظریات اور قومی روایات وتشخصات کو ختم کرنے کے لئے حکومتی سطح پر ایک طوفان برپا کر رکھا تھا اور ایسے حالات پیدا کردیے تھے کہ

صاف نظر آرہا تھا کہ اگر بروقت الحاد ولادینیت کے اس سیلاب بلاخیز کے آگے بند نہیں لگایا گیا تو ہمارے سارے ملّی و دینی تشخصات خس و خاشاک کی طرح اس کی رو میں بہ جائیں گے۔

بالآخر حضرات اکابر رحمہم اللہ رب قدیر کے اعتماد اور بھروسے پر اٹھے اور اس طوفان کے مقابلے میں دینی مدرسوں اور اسلامی تربیت گاہوں کی مستحکم اور مضبوط دیواریں کھڑی کر دیں اور نہ صرف اس بند کے ذریعہ طوفان کے رخ کو موڑ دیا بلکہ انہیں درس گاہوں کے بوریہ نشیں سپوتوں نے اپنے جوش عمل، جذبۂ حریت، اصابت فکر، دینی صلابت اور ایثار و قربانی سے ایک ایسا صالح انقلاب برپا کر دیا کہ اسلامی تہذیب و ثقافت کے مرجھائے ہوئے گلستاں میں بہار تازہ آگئی اور پھر ایک دن وہ وقت بھی آیا کہ ہندوستان سے مسلمانوں اور ان کی تہذیب کو مٹا دینے کا خواب دیکھنے والی قوم اپنی تمام تر قوت و شوکت اور حیلہ سازیوں کے باوجود ملک بدر ہونے پر مجبور ہو گئی۔

مقام حیرت و حسرت ہے کہ آج بھی وہی درس گاہیں ہیں، وہی ان کا نظام تعلیم و تربیت ہے، وہی قال اللہ و قال الرسول کی صدائے روح نواز ہے غرضیکہ بظاہر سب کچھ اسی منہاج اور ڈھرے پر موجود ہے۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ ان کے علمی و فکری سوتے خشک ہو گئے ہیں، ان کی کوکھیں بانجھ ہو گئی ہیں، مردم سازی کے انکے سارے آلات زنگ خوردہ اور بیکار ہو گئے ہیں کہ ان سے اب نہ تو حضرت شیخ الہند جیسا مردم ساز قائد پیدا ہو رہا ہے اور نہ حکیم الامت مولانا تھانوی جیسا مصلح و مربی، نہ کوئی انور شاہ کشمیری جیسا محدث و محقق نظر آرہا ہے اور نہ حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی جیسا مرد کامل مجاہد اور نہ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب جیسا ذہن ثاقب رکھنے والا مفتی دکھائی دے رہا ہے اور نہ حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی جیسا مضطرب اور امت کے غم میں بے چین داعی۔ اس روح فرسا صورت حال کا شدید تقاضا ہے کہ قافلۂ ملت کے حدی خواں حضرات علماء کرام اور مصلحین امت سر جوڑ کر بیٹھیں اور صورت حال کا مکمل بالغ نظری اور سوز قلبی کے ساتھ جائزہ لیں اور اصلاح حال کیلئے ایسا طریق کار اور لائحہ عمل مرتب فرمائیں جس سے ہماری دینی درسگاہوں کی متاع گم شدہ پھر انہیں واپس مل جائے اور مردم سازی کے یہ کارخانے از سر نو چاق و چوبند ہو کر رجال کار کی تیاری میں مصروف ہو جائیں۔

مقام شکر ہے کہ ہند و پاک کے علماء میں سے ایک طبقہ مدارس دینیہ کی اس زبوں حالی سے بے چین اور مضطرب نظر آرہا ہے اور حالات کی درستگی کی تدبیریں سوچ رہا ہے جس پر یہ حضرات بجا طور پر تبریک و تہنیت

کے مستحق ہیں لیکن اسی کے ساتھ اتنی گذارش بھی ہے کہ اس وقت تک حالات کی اصلاح کیلئے جتنی آوازیں بھی اٹھی ہیں وہ نصاب تعلیم تک محدود رہیں اگرچہ یہ بھی ایک محتاج توجہ امر ہے اور اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ نصاب تعلیم کو اسکے اصل منہاج و مقصد پر قائم رکھتے ہوئے حالات و اذہان کے تقاضوں کے مطابق بنایا جائے لیکن یہی سب کچھ نہیں ہے بلکہ اس سے اہم تر معاملہ تربیت کا ہے علوم دینیہ کی تحصیل کرنیوالوں سے جس تیزی کے ساتھ دینی مزاج اور ملت کے ساتھ شیفتگی کا جذبہ ختم ہو رہا ہے اس کے پیش نظر ضروری ہے کہ اس بات کی طرف پہلی فرصت میں غور کیا جائے، اور دیکھا جائے کہ وہ حضرات جو طلبہ کے معلم و مربی ہیں وہ مطلوبہ ریاضت و تقویٰ، اخلاص و اخلاق اور فہم و بصیرت کے معیار پر اتر رہے ہیں یا اس میں کمی اور نقص ہے پھر ان طلبہ کو دیکھا جائے جو ہمارے اداروں میں زیر تعلیم ہیں کہ کیا وہ طالب علمی کے تقاضوں کو پورا کر رہے ہیں یا نہیں پھر دل سوزی کے ساتھ ایسا طریقہ اور راستہ بتایا جائے جس سے اساتذہ و طلبہ دونوں کا دینی و اخلاقی احساس بیدار ہو اس سلسلے میں ذمہ داران مدارس کو بھی اپنا احتساب کرنا ہوگا کہ آیا وہ اپنی ذمہ داریوں کو اسلامی دائرہ میں رہتے ہوئے نباہ رہے ہیں یا نہیں غرضیکہ صرف نصاب تعلیم میں تغیر و تبدل سے مدارس کو صحیح طور پر فعال و متحرک نہیں بنایا جاسکتا بلکہ پورے نظام اور طریق کار پر غور کرنے کی ضرورت ہے، اس کے بغیر کسی مفید نتیجہ تک پہنچنا مشکل ہے۔ اس لئے کہ نصاب کے سہل الحصول بنانے سے ممکن ہے کچھ علمی فائدہ ہو جائے لیکن دینی معاملہ میں جو کمی آئی ہے ظاہر ہے کہ یہ کمی نصاب کی تبدیلی سے نہیں پوری کی جاسکتی ہے بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ جب تک صحیح دینی جذبہ بیدار نہیں ہوگا علمی استعداد بھی پیدا ہونا مشکل ہے۔

مفکر، فلسفی، زاہد، مورخ، رہنما، عالم ہماری درسگاہیں قوم کے معمار جنتی ہیں
مگر محروم ہو جاتی ہیں جب دین و دیانت سے تو پھر یہ قوم و ملت کیلئے اک عار بنتی ہیں

دارالعلوم دیوبند کے موجودہ اکابر نے اس صورت حال کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور اصلاح حال کی غرض سے گذشتہ سال ۲۰، ۲۱، ۲۲ محرم ۱۴۱۵ھ کو ملک گیر پیمانہ پر مدارس اسلامیہ کا ایک اجتماع منعقد کیا ارباب مدارس نے پوری دلچسپی کے ساتھ اس اجتماع میں شرکت کی اور رابطہ مدارس اسلامیہ کے نام سے کل ہند مدارس اسلامیہ کا ایک بورڈ تشکیل دیا نظام تعلیم و تربیت سے متعلق اہم تجویزیں منظور کیں اور ارباب مدارس سے سفارش کی کہ وہ اپنے اپنے مدارس کو اسی نظام کے تحت چلائیں اسی کے ساتھ یہ بھی طے کیا کہ کام کا جائزہ لینے کی غرض سے اہم مدارس کا سالانہ اجتماع دارالعلوم دیوبند میں ہوا کرے گا۔ طے شدہ تجویز کے مطابق انشاء اللہ یہ اجتماع جلد ہی منعقد ہوگا۔

اسلام میں منصب امامت

(از حضرت مولانا مفتی عبد الرحیم صاحب لاجپوری)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً و مسلماً۔

الجواب: اسلام میں منصب امامت کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ ایک باعزت، باوقار اور باعظمت اہم دینی شعبہ ہے۔ یہ مصلّٰی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مصلّٰی ہے۔ امام نائب رسول ہوتا ہے اور امام اللہ رب العزت اور مقتدیوں کے درمیان قاصد اور ایلچی ہوتا ہے اس لئے جو سب سے بہتر ہو اسے امام بنانا چاہئے۔ حدیث میں ہے۔ اگر تمہیں یہ پسند ہے کہ تمہاری نماز درجۂ مقبولیت کو پہونچے تو تم میں جو بہتر اور نیک ہو وہ تمہاری امامت کرے کہ وہ تمہارے اور تمہارے پروردگار کے مابین قاصد ہے۔ ان سرّکم ان تقبل صلوتکم فلیؤمکم علمائکم فانہم وفدکم فیما بینکم و بین ربکم رواہ الطبرانی وفی روایۃ الحاکم فلیؤمکم خیارکم وسکت عنہ (شرح نقایہ ۸۶) دوسری حدیث میں ہے کہ تم میں جو سب سے بہتر ہو اس کو امام بناؤ کیونکہ وہ تمہارے اور تمہارے پروردگار کے درمیان ایلچی ہے (حوالہ مذکورہ)

فقہ کی مشہور کتاب نور الایضاح میں ہے۔ فالاعلم احق بالامامۃ ثم الاقرأ ثم الاورع ثم الاسنّ ثم الأحسن خلقاً ثم الاحسن وجہاً ثم الاشرف نسباً ثمّ الاحسن صوتاً ثم الانظف ثوباً (ص ۸۳، ۸۴) امامت کا زیادہ حقدار وہ ہے جو دین کے امور کا زیادہ جاننے والا ہو (خصوصاً نماز سے متعلق مسائل سے سب سے زیادہ واقف ہو) پھر وہ شخص جو تجوید سے پڑھنے میں زیادہ ماہر ہو۔ پھر جو زیادہ متقی اور پرہیزگار ہو۔ پھر وہ جو عمر میں بڑا ہو۔ پھر وہ جو اچھے اخلاق والا ہو۔ پھر وہ جو خوبصورت اور باوجاہت ہو۔

پھر وہ جو نسباً زیادہ شریف ہو پھر وہ جسکی آواز اچھی ہو، پھر وہ جو زیادہ پاکیزہ کپڑے پہنتا ہو۔

اصلاً تو امامت پر اجرت اور تنخواہ (مشاہرہ) لینا جائز نہیں ہے کہ یہ طاعت ہے اور طاعت پر اجرت لینا جائز نہیں ہے۔ مگر متاخرین فقہاء نے ضرورت کے پیش نظر اجرت اور مشاہرہ لینے اور دینے کو جائز قرار دیا ہے۔ درمختار میں ہے۔ ولا لاجل الطاعات مثل الاذان والحج والامامة وتعليم القرآن والفقه ويفتى اليوم بصحتها لتعليم القرآن والفقه والامامة والاذان۔

(در مختار مع رد المحتار ۵/۴۶ باب الاجارة الفاسدة)

خادمان مساجد (امام وغیرہ) ومدارس کو ان کی حاجت، علمی قابلیت اور تقوی وصلاح کو ملحوظ رکھتے ہوئے مشاہرہ دینا چاہئے۔ مسجد سے متعلق وقف کی آمدنی میں گنجائش ہو تو اس میں سے۔ اور اگر گنجائش نہ ہو تو مسلمانوں کو چندہ کر کے ان کی ضرورت کے مطابق مشاہرہ کا انتظام کرنا چاہئے۔

درمختار میں ہے۔ ويعطى بقدر الحاجة والفقه والفضل فان قصر كان الله عليه حسيبا (زيلعى) وفى الحاوى المراد بالحافظ فى حديث لحافظ القرآن مأتا دينار هو المفتى اليوم۔

ردالمحتار میں ہے۔ (قوله ويعطى بقدر الحاجة) الذى فى الزيلعى هكذا ويجب على الامام ان يتقى الله تعالىٰ ويصرف الى كل مستحق قدر حاجته من غير زيادة فان تصر فى ذلك كان الله عليه حسيباً اه وفى البحر عن القنية كان ابوبكر رضى الله عنه يسوّى فى العطاء من بيت المال وكان عمر رضى الله تعالىٰ عنه يعطيهم على قدر الحاجة والفقه والفضل والاخذ بهذا فى زماننا احسن فتعتبر الامور الثلاثة اه اى فله ان يعطى الاحوج اكثر من غير الاحوج وكذا الافقه والافضل اكثر من غيرهما وظاهره انه لا تراعى الحاجة فى الافقه والافضل والّا فلا فائدة فى ذكرهما ويؤيده ان عمر رضى الله تعالىٰ عنه كان يعطى

من کان له زیادة فضیلة من علم او نسب او نحو ذلك اکثر من غیره و فی البحر ایضا عن المحیط والرأی الی الامام من تفضیل و تسویة من غیر ان یمیل فی ذلك الی هوی و فیه عن القنیة وللامام الخیار فی المنع والاعطاء فی الحکم اھ (درمختار ورد المحتار ۳/۳۸۹ فی مصارف بیت المال قبیل باب المرتد)۔

فی زماننا یہ ذمہ داری متولیان مساجد اور محلہ وبستی کے بااثر لوگوں کی ہے ان کو اس اہم مسئلہ پر توجہ دینا بہت ضروری ہے ۔ ائمہ مساجد کے ساتھ اعزاز واحترام کا معاملہ کریں ان کو اپنا مذہبی پیشوا اور سردار سمجھیں ان کو دیگر ملازمین اور نوکروں کی طرح سمجھنا منصبِ امامت کی سخت توہین ہے، یہ بہت ہی اہم دینی منصب ہے ۔ پیشہ ور ملازمتوں کی طرح کوئی ملازمت نہیں ہے ۔ جانبین سے اس عظیم منصب کے احترام، وقار، عزت اور عظمت کی حفاظت ضروری ہے ۔

متولی اور مہتمم عالم باعمل ہونا ضروری ہے ۔ اگر ایسا میسر نہ ہوسکے تو صوم وصلوٰۃ کا پابند امانتدار، مسائل وقف کا جاننے والا خوش اخلاق، رحم دل، منصف مزاج، علم دوست، اہل علم کی تعظیم وتکریم کرنے والا ہو جس میں یہ اوصاف زیادہ ہوں اسی کو متولی اور مہتمم بنانا چاہئے ۔ ان اوصاف کے حامل اگر متولی ہوں گے تو اچھے اور قابل اماموں کا انتخاب کریں گے اور مساجد کا نظام بھی بہتر سے بہتر ہوگا، آج کل نااہل متولیوں کی وجہ سے نااہل اماموں کی بھرمار نظر آرہی ہے اور مساجد میں بدنظمی ظاہر ہورہی ہے ۔

امام مسجد اگر حقیقتاً ضرورت مند ہو اور معقول مشاہرہ کے بغیر اس کا گذربسر مشکل ہورہا ہو تو مناسب انداز سے متولیان مسجد اور محلہ کے بااثر لوگوں کے سامنے اپنا مطالبہ بھی پیش کرسکتا ہے اور ذمہ داران مساجد اور بااثر لوگوں پر ہمدردی اور شفقت کے ساتھ اس طرف توجہ دینا بھی ضروری ہے ۔ اس صورت میں اماموں کو ایسا طریقہ اختیار کرنا جس سے منصبِ امامت کی توہین لازم آتی ہو ہرگز جائز نہ ہوگا ۔ امام منصب امامت کے وقار، عظمت اور قدر وقیمت کا محافظ اور امین ہے ایسا طریقہ جس سے منصب امامت کی تذلیل، تنقیص لازم آتی ہو ہرگز اس

کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

لہٰذا معقول مشاہرہ کی درخواست کے لئے اپنا معاملہ عدالت اور حکومت کے حوالہ کر دینا اور اس مقصد کے لئے ائمہ مساجد کی تنظیم (یونین) بنانا اور اس کا ممبر بننا کسی حال میں قابل مدح نہیں بلکہ قابل مذمت اور لائق ترک ہے۔ اس سے دور رس غلط نتائج پیدا ہونے کے شدید خطرات ہیں اور بہت سی خرابیوں کا دروازہ کھلیگا، اماموں کے تقرر کے سلسلہ میں ہمیں پابند ہو جانا پڑے گا اور ائمہ کے تقرر کے سلسلہ میں جو شرائط اور معیار ہے اس کی پابندی نہ ہو سکے گی وغیرہ وغیرہ۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے مسجد میں غیروں کا چندہ لینے کے متعلق جو تحریر فرمایا ہے وہ لائق عمل ہے۔ فرماتے ہیں "یہ حکم تو نفس اعطاء کا ہے لیکن نظرًا الی بعض العوارض الخارجیة کالا متنان علیٰ اھل الاسلام من اھل الکفر قبول کرنا مناسب نہیں"۔ فان الاسلام یعلو ولا یعلیٰ۔

نیز یہ عبارت بھی پیش نظر رہے۔ درمختار باب العاشر میں ہے۔ (ھوای العاشر حرٌ مسلم) بھذا یعلم حرمة تولیة الیھود علی الاعمال۔ ردالمحتار میں ہے۔ (قولہ ھو حر مسلم) ولا یصح ان یکون کافرًا لانہ لا یلی علی المسلم بالآیة (بحر) والمراد بالآیة قولہ تعالیٰ ولن یجعل اللّٰہ للکافرین علی المؤمنین سبیلاً۔ (درمختار وردالمحتار ۲/۵۱ - باب العاشر)

لہٰذا از خود اپنا معاملہ ان کے حوالہ کر کے دخل دینے کا موقع ہرگز فراہم نہ کیا جائے۔

فقط واللہ اعلم بالصواب

احقر الانام سید عبدالرحیم لاجپوری

۱۲ر شوال المکرم ۱۴۱۵ھ

ما قالہ المجیب المحقق المحترم فھو الحق والصواب وانا اتفق بھذا الفتیا کلّ الاتفاق۔　الاحقر اسمٰعیل وادی والا غفرلہٗ۔ (مفتی جامعہ حسینیہ راندیر)

۱۳ر شوال المکرم ۱۴۱۵ھ

بندہ اس جواب سے مکمل اتفاق کرتا ہے، ائمہ کی تنخواہوں کے معیار میں اضافہ کا کام مسلمانوں کی مؤثر تنظیموں اور جماعتوں کے ذریعہ انجام دیا جائے یہی مناسب ہے حکومت کو اس مقصد کے لئے استعمال کرنے سے اسکو دیگر خالص دینی اور مذہبی امور میں دخل کا موقعہ اور جرأت ہوگی جس کا ضرر اظہر من الشمس ہے۔ فقط

ھٰذا ھو الحق والصواب
(مفتی) عارف حسن عثمانی
۱۲ر شوال المکرم ۱۴۱۵ھ
(استاذ حدیث وفقہ دارالعلوم اشرفیہ راندیر)

العبد احمد عفی عنہ خانپوری
۱۸ر شوال المکرم ۱۴۱۵ھ
(مفتی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل)

اضافہ : اس فتویٰ کا اہم پہلو یہ ہے کہ ائمہ مساجد کی تنخواہ کے اضافہ کے سلسلہ میں حکومت سے تعاون حاصل کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ دوراندیشی اور غلط نتائج کو پیش نظر رکھتے ہوئے مندرجہ بالا فتویٰ لکھا گیا ہے، اور یہ بلادلیل نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔

انما یعمر مساجد اللہ من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر واقام الصلوٰۃ و اٰتی الزکوٰۃ ولم یخش الا اللہ فعسی اولٰئک ان یکونوا من المھتدین۔

ترجمہ : اللہ کی مسجدوں کو صرف وہی آباد کرتے ہیں جو خدا پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائیں اور نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور خدا کے سوا کسی سے نہ ڈریں تو امید ہے کہ یہ لوگ (فلاح وکامیابی کی) راہ پانے والے ہوں گے۔

مذکورہ آیت کی تفسیر میں امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ تحریر فرماتے ہیں: نیز یہ حقیقت بھی واضح کردی کہ خدائے پاک کی عبادت گاہ کی تولیت کا حق متقی مسلمان کو پہونچتا ہے اور وہی اسے آباد رکھنے والے ہوسکتے ہیں۔ یہاں سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ فاسق وفاجر آدمی مساجد کا متولی نہیں ہوسکتا کیونکہ دونوں کے درمیان کوئی مناسبت باقی نہیں رہتی بلکہ متضاد باتیں جمع ہوجاتی ہیں (وہ یہ کہ) مسجد خدا پرستی کا مقام ہے اور متولی خدا پرستی سے نفور۔ (ترجمان القرآن۔ بحوالہ فتاویٰ رحیمیہ ص ۱۶۵ جلد سوم)

جب فاسق فاجر مسلمان تولیت کا اہل نہیں تو غیروں کی تولیت اور مساجد پر ان کی بالادستی کا عدم جواز ظاہر ہے۔

امام کیسا ہونا چاہیئے اس کے متعلق بھی جو لکھا گیا ہے یہ پہلو بھی بہت ہی زیادہ قابلِ توجہ اور لائق اصلاح ہے۔ اس سلسلہ میں احقر کے برادر خورد مولوی سید عبد الاحد مرحوم نے اپنی مشہور کتاب "مسلمان کی ڈائری" میں اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

"مسجد کا امام عالم باعمل بزرگ ہونا چاہیئے اگر ایسا نہ ملے تو جسے قرآن زیادہ یاد ہو اور اچھا پڑھتا ہو ایسا امام رکھا جائے۔ آج کل ایسے امام ملنا چنداں مشکل نہیں لیکن اب ایسے امام کی تلاش زیادہ ہے جو متولی کے اشاروں پر چلے اور متولی ایسے ہوتے ہیں جو کسی طرح مسجد کے اہتمام کے اہل نہیں۔

آخر یہ کیا بات ہے کہ ہمیں اپنے معمولی سے کام کے لئے ملازم کی تلاش ہوتی ہے تو ہم بڑی احتیاط برتتے ہیں اور ہر طرح دیکھ بھال کر اپنی پسند کا ملازم رکھتے ہیں لیکن جب مسجد کے لئے امام کی ضرورت و تلاش ہوتی ہے تب ہم مسجد کے لائق نہیں بلکہ اپنے مطلب کا امام ڈھونڈتے ہیں۔ اس وقت نہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ امام سند یافتہ عالم نہ سہی ضروری مسائل سے واقف بھی ہے یا نہیں، قاری اور حافظ نہ سہی لیکن کم از کم قرآن بھی صحیح پڑھتا ہے یا نہیں، کس عقیدہ کا پیرو ہے اور کون سے مسلک کا حامی ہے۔ مقلد بھی ہے یا شتر بے مہار۔ نہ تحقیق ہے نہ تفتیش، نتیجہ یہ کہ جو مؤذن بنانے کا اہل نہیں وہ امام بن جاتا ہے اور جو دنیا میں کسی مصرف کا نہ ہو وہ مؤذن بنتا ہے۔

جب متولی مسجد کی ذمہ داری اٹھانے کا اہل نہیں ہوگا تو ظاہر ہے کہ وہ اپنی مرضی کا نا اہل امام ہی تلاش کرے گا۔ گھوم پھر کر دیکھ لیجئے تو نا اہل متولی اور نا اہل امام کی جوڑی آپ کو اکثر جگہ نظر آئے گی۔" (مسلمان کی ڈائری ص ۱۵۲)

اسلام میں مساجد کی بہت ہی اہمیت اور بہت ہی عظیم حیثیت ہے، مساجد مراکز اسلام اور شعائر اسلام ہیں، مساجد روئے زمین پر سب سے مقدس، سب سے پاکیزہ اور سب سے بہترین جگہ ہے، اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہے، دنیا میں جنت کے باغ ہیں، اسلام

کے قلعے اور اہل اسلام کے اجتماعی نظام کے لئے مرکز ہیں۔ لہٰذا مساجد کا نظام جس قدر بہتر ہوگا مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی پر اس کے نہایت خوش نما اثرات مرتب ہوں گے۔ مسلمانوں کا معاشرہ پاکیزہ بنے گا اور اسلام کی روح ان کی زندگیوں میں جلوہ گر نظر آئے گی۔

مساجد کا نظام اور آبادی صرف اس کی ظاہری تعمیر و تزئین، اس کے نقش و نگار اور اس کے فلک بوس مناروں سے نہیں ہے اس کی صحیح آبادی عبادت الٰہی اور ذکر الٰہی اور اعمال مساجد سے ہے، ان امور کے پیش نظر مساجد کا صحیح نظام خدا ترس امام، صالح مؤذن اور باصلاحیت و اہل متولیوں پر ہے۔

امام حقیقت میں پورے محلہ، پوری بستی اور پوری قوم کا پیشوا ہوتا ہے۔ لہٰذا امام بہترین عالم باعمل، مسائل و احکام نماز سے خوب واقف۔ قرآن مجید باتجوید اور صحیح پڑھنے والا، خوش الحان، سب سے زیادہ متقی پرہیز گار، خدا ترس، خوش اخلاق اور ملنسار ہونا چاہئے۔ امام ایسا ہو کہ اس کے اندر دین کا درد اور امت کا غم ہو اپنی اور قوم کی اصلاح کی فکر ہو اور اپنے دلسوز بیانات، مواعظ حسنہ اور تعلیم و تبلیغ کے ذریعہ مسلمانوں میں دین کا شوق، خوف خدا انابت، الی اللہ، عبادت کا ذوق و شوق اور عبادت صحیح و سنت طریقہ کے مطابق ادا کرنے کا جذبہ دنیا کی بے ثباتی اور فکر آخرت حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کرنے کی فکر پیدا کر دے۔ بلا خوف لومۃ لائم معروف (نیکی) کا حکم کرے اور نواہی و منکرات پر نکیر کرے، غمی کا موقع ہو یا خوشی کی تقریبات ہر موقع پر قوم کی صحیح رہنمائی اور اسلامی تعلیمات سے واقف کرے۔ بدعات اور رسومات کی نشاندہی اور برملا ان پر روک ٹوک کرے، خود بھی اسلامی احکامات اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم کی مبارک اور نورانی سنتوں پر سختی سے عمل کرے اور مسلمانوں کو بھی عمل کرنے کا عادی بنائے۔ مسلمانوں اور لوگوں کے ساتھ ایسی ہمدردی اور خوش اخلاقی سے پیش آئے کہ چھوٹے بڑے، مرد عورتیں، اپنے اور پرائے سب اس کے دل دادہ اور دل و جان سے اس پر قربان ہو جائیں حتی کہ اپنے نجی معاملات میں بھی اس سے مشورہ اور رہنمائی حاصل کر کے اس کے مطابق عمل کرنے لگیں، اپنے اعمال و اقوال سے لوگوں میں اسلام کی محبت اور دین کی ایسی عظمت پیدا کر دے کہ ان کو اپنی اور اپنے اہل و عیال

اور مسلمانوں کی اصلاح کی فکر پیدا ہو جائے، خود بھی دینی علم حاصل کرنے اور اس پر عمل کرنے کی فکر کریں اور ان میں اپنی اولاد کو بھی دینی تعلیم و تربیت سے آراستہ پیراستہ کرنے کا شوق اور جذبہ پیدا ہو جائے اور قوم کے بچے بچیوں کی بھی دینی تعلیم کی فکر پیدا ہو اور اس کا انتظام کریں، خواتین میں بھی دین پر عمل کرنے، نماز، قرآن کی تلاوت اور عبادت کا شوق اور پردہ کی اہمیت پیدا ہو جائے اور ہر مسلمان اپنے گھر سے برائیوں، ناچ گانے، ٹی وی اور وی، سی، آر کی نحوست کو ختم اور دور کرنے کی فکر اور کوشش کرنے لگے، غرض کہ امام کو اپنی ذمہ داری کا پورا احساس ہونا چاہئے اور اپنی ذمہ داری سمجھ کر محض رضائے الٰہی کے لئے (نہ کہ دنیا کے بے حیثیت چند ٹکوں کے لئے) ان تمام خدمات کو انجام دے۔ ہر مسجد میں اگر ایسے امام ہوں گے تو انشاء اللہ مسلمانوں کے معاشرہ میں اس کے بہترین اثرات آپ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔

اسی طرح مؤذن دیندار اور صالح ہونا چاہئے، جو شخص پابند شرع نہ ہو فاسق ہو اس کو مؤذن بنانا درست نہیں ہے۔ خدا کے گھر کا مؤذن دیندار، تعلیم، احکام دینیہ خصوصاً اذان و نماز کے مسائل سے واقف، اوقات نماز، صبح کاذب، صبح صادق، زوال، سایۂ اصلی، ایک مثل، دو مثل، شفق احمر و ابیض وغیرہ کا جاننے والا، بلند آواز، خوش الحان، اذان کے کلمات صحیح ادا کرنے والا ہونا چاہئے، حدیث شریف میں ہے "لیؤذن لکم خیارکم" یعنی تم میں جو صالح ہو وہ اذان کہے۔ (ابوداؤد شریف ص ۹۴ ج ۱) اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے: وینبغی ان یکون المؤذن رجلاً عاقلاً صالحاً تقیاً عالماً بالسنۃ۔ یعنی مؤذن عاقل سمجھدار، نیک، متقی اور طریقۂ سنت سے واقف ہونا چاہئے (ص ۵۳ ج ۱) اور کبیری میں ہے: وافاد ھذا ان الاولیٰ ان یتولی العلماء الاذان لانہ من باب الجماعۃ والدعاء الیہا فلا یفوض الی غیرھم علی ما مرّ وفی الخلاصۃ عن واقعات الاوزجندی المؤذن اذا لم یکن عالماً بالاوقات لا یستحق ثواب المؤذنین انتہیٰ (کبیری ص ۳۶۲)
(نور الایضاح ص ۴۵)

فی زماننا مؤذنوں میں یہ اوصاف مفقود ہیں۔ ارزاں اور کم سے کم تنخواہ والا مؤذن تلاش

کیا جاتا ہے، خواہ اذان صحیح نہ پڑھ سکتا ہو، اذان کے کلمات کہیں دراز اور کہیں مختصر کرکے اذان کی روح ہی کو فنا کر دیتا ہو جس کی وجہ سے اعادہ ضروری ہو جاتا ہے۔ مثلاً اَشْہَدُ کو اَشْدُ۔ حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ کو حَیَّ لَلصَّلٰوۃ۔ یا حَیَّا لَلصَّلٰوۃ۔ حَیَّ عَلَی الفَلَاحِ کو حَیَّ لَلْفَلَاحِ یا حَیَّا لَلْفَلَاحِ۔ اَللّٰہ کی جگہ آللّٰہ، اَکْبَرُ کی جگہ آکْبَر اور اَکْبَا ر اور اسی طرح حَیَّ میں بڑی ح کی جگہ چھوٹی ہ پڑھا جاتا ہے۔ اسی طرح اور بھی بہت سی غلطیاں کی جاتی ہیں، امام وغیرہ جاننے والے حضرات بھی اصلاح نہیں کرتے، اماموں پر اس کی بڑی ذمہ داری ہے، اذان صرف اعلان ہی کا نام نہیں ہے بلکہ اذان عبادت بھی ہے مہتم بالشان اسلامی شعار بھی ہے اسکو اسی کے شایان شان طریقہ سے ادا کیا جائے کہ اسلامی شان معلوم ہو اور سامعین کے قلوب متاثر اور متوجہ ہوں اور اس کی برکتیں ظاہر ہوں۔ ان الاذان شعار الاسلام (فتح الباری) اور فتح القدیر میں ہے لان الاذان من اعلام الدین (ص۹۳ ج۱) اذان دین کی علامتوں میں سے ہے۔ حق تعالیٰ متولیوں کو توفیق دے کہ اس کی اہمیت کو سمجھیں۔

مساجد کا نظام صحیح اور بہتر سے بہتر ہونیکا زیادہ تر دارو مدار عام طور پر متولیوں پر ہوتا ہے اس لئے متولی بہت ہی باصلاحیت ہونا چاہئے اور اس کیلئے سب سے بہتر عالم باعمل شخص ہے، اگر ایسا متولی میسر نہ ہو سکے تو کم از کم دیندار، صوم وصلوٰۃ کا پابند، امانتدار، مسائل وقف کا جاننے والا، خوش اخلاق، منصف مزاج، علم دوست اہل علم کی تعظیم وتکریم اور ان سے مشورہ کرکے کام کرنیوالا، دین اور اہل دین سے محبت اور دین کی فکر رکھنے والا ہونا چاہئے۔ اگر ایسا متولی ہوگا تو مندرجہ بالا اوصاف سے متصف امام ومؤذن تلاش کرکے ان کا تقرر کرے گا اور پھر انکی صحیح قدر اور انکو خدمت کرنیکا موقع فراہم کریگا، اور دینی کاموں کی انجام دہی میں ان کا معین ومددگار بنیگا۔ (مزید تفصیل فتاویٰ رحیمیہ اردو ص۱۶۴ تا ص۱۶۹ ج۲ میں ملاحظہ فرمائیں)۔

مندرجہ بالا اضافہ کا مضمون احقر کے درد دل کی آواز ہے اور دیرینہ تمنا ہے اور یہ صرف پڑھنے پڑھانے کے لئے نہیں ہے بلکہ عمل کیلئے ہے اگر عمل کیا گیا تو انشاء اللہ اس کی نورانیت اور اس کے برکات آپ خود دیکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہماری مساجد کا نظام بہتر سے بہتر بنادے اور ہر مسجد میں ایسے امام، مؤذن اور متولیوں کا تقرر ہو کہ جن سے مساجد کا نظام صحیح اور بہتر سے بہتر ہو اور مساجد سے مسلمانوں کو صحیح رہنمائی مل سکے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔ اللھم آمین بحرمۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم تسلیما کثیرا کثیرًا۔

تحریکِ استشراق

ایک تاریخی جائزہ

ڈاکٹر محمد سلیم (فاضل دارالعلوم دیوبند
لکچرر، شعبہ دینیات (سنی)
علیگڈھ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

عہد حاضر میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو اسلام کا تاریخی وثقافتی تعارف ایسے مغرب کے اہل علم کے ذریعہ ہوا جن کو نہ اسلام سے تعلق اور نہ مسلمانوں سے خلوص تھا بلکہ ان کے ذہنوں پر وہ صدیوں پرانی نفرت وعداوت کار فرما تھی جو صلیبی جنگوں میں ان کو مسلمانوں سے شکست کے نتیجہ میں ملی تھی جس کا بدلہ انہوں نے علمی میدان میں لینا چاہا چنانچہ انہوں نے پیغمبر اسلام کی حیاتِ طیبہ پر سینکڑوں بے بنیاد الزامات تراشے اور اسلام کے حسین اور معصوم چہرہ کو بگاڑنا چاہا۔ مغرب کے یہ اہل علم عام طور پر "مستشرقین" کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ جن کا مقصد بزعم خود اسلام کی کمزوریوں کو تلاش کرنا اور اس کو بدنام کرکے اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کے سوا کچھ نہ تھا، جس کے محرکات دینی، استعماری اور اقتصادی تھے۔ عام طور پر انہوں نے سیرت نبوی، حدیث، قرآن، فقہ، صحابہ، تابعین، محدثین، فن اسماء الرجال اور تدوین حدیث وغیرہ جیسے اسلام کے اہم موضوعات پر قلم اٹھایا اور اپنی مطلب برآری کے لئے ہر رطب ویابس سے کام لینے میں دریغ نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انکی تحقیق اور کتابوں میں اتنا تشکیکی مواد پایا جاتا ہے کہ ایک عام آدمی کے لئے اس کی زد سے بچکر نکلنا مشکل کام ہے۔ ان کے مطالعہ اور تحقیقات میں جو تحریفات اور فنّی غلطیاں پائی جاتی ہیں ان کو واضح کرنا اس وقت ہمارے دائرۂ موضوع سے خارج ہے۔ ہم یہاں اس تحریک کا تاریخی مطالعہ پیش کررہے ہیں۔

اس تحریک کی ابتدا اس وقت ہوئی جب عربوں نے اسپین اور سسلی کی سرزمین پر قدم رکھا اور عربوں کے اسلامی تعلیمات سے معمور، فلاحی اور انقلابی پیغام حیات اور ان کی علمی تحقیقات کے لئے

تجربے اور فکری رجحانات نے یورپ کو بیدار کیا جس کے نتیجہ میں مغرب میں اسلامی تہذیب و تمدن کو سمجھنے اور مسلمانوں کی سربلندیوں کا راز دریافت کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کی بنیاد کس نے ڈالی تاہم تاریخ سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ابتدا یورپ کے رہبانیت کے علم برداروں سے ہوئی* انھوں نے مسلم علماء کی مجلس میں رہ کر طب، فلسفہ اور ریاضیات میں مہارت حاصل کی اور پھر مغرب کے دوسرے ملکوں میں اس کو پھیلانا شروع کیا۔ ان راہبوں میں مشہور فرانسیسی راہب جربرٹ (JERBERT) (۹۳۸ — ۱۰۰۳ء) کا نام سرفہرست ہے جس نے اندلس میں رہ کر علوم حاصل کئے اور ۹۹۹ء میں روم کے کلیسا کا پادری مقرر ہوا، بطرس (PIERRE) (۱۰۹۲ — ۱۱۵۶ء)، ایڈلرڈ (ADELARD) (۱۰۷۰ — ۱۱۳۵ء)، گیرڈ ڈی کریمونا (GERARD DE CREMONA) (۱۱۱۴ — ۱۱۸۷ء)، ڈینل آف مارلے (DANIEL OF MARLEY) (۱۱۷۰ — ۱۱۹۰ء) (زمانہ شہرت) اور میکل اسکاٹ (MICHAEL SCOT) — (۱۱۷۵ — ۱۲۳۶ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں[1]۔ ان لوگوں نے عربی علوم سیکھنے کے لئے تعلیمی ادارے کھولے جن میں عربوں کی تصانیف نصاب کے طور پر پڑھائی جاتی تھیں[2]۔ اور عربی زبان اور اسلام کے مطالعہ پر زور دیا جس کے نتیجہ میں یوروپین ممالک کے طلبا تحصیل علم کے لئے اندلس میں آنا شروع ہوئے۔

صلیبی جنگیں اور مستشرقین

سن ایک ہزار تیرہ سے بارہ سو بانوے (۱۰۱۳ — ۱۲۹۲ء) تک کا زمانہ معرکہ ہائے صلیب و ہلال کا زمانہ رہا۔ جس میں ارباب کلیسا کو پے در پے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا اور ان کی عسکری طاقت پاش پاش ہوگئی تو انہوں نے اس جنگ کا رخ علمی میدان کی طرف موڑ دیا اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کو اسلام کو غیر مہذب اور وحشیانہ مذہب ثابت کرنے میں لگا دیا۔ چنانچہ اس زمانہ میں نہ جانے کتنے بیہودہ اور بے بنیاد الزامات اسلام اور پیغمبر اسلام کی ذات مبارک پر لگائے گئے۔ جس میں ان کو عیسائیت کا دفاع نظر آتا تھا۔

تحریک استشراق کا ارتقاء

پندرہویں صدی عیسوی میں مغرب میں صنعتی انقلاب آیا جس سے ان میں استعماری خواہشات جنم لینے لگیں لیکن

اس خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لئے ان کو اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کے افکار و خیالات کے مطالعہ کی ضرورت پیش آئی جس کے لئے انہوں نے لندن اور پیرس وغیرہ کی یونیورسٹیوں میں عربی شعبے کھولے اور اسلامی تاریخ کے مطالعہ کے پیش نظر علمی سرمایہ کو اسلامی ممالک سے سمیٹ کر لانے کی ضرورت محسوس کی۔

اٹھارویں اور انیسویں صدی میں مغرب کو سیاسی اور ثقافتی برتری حاصل ہونے لگی۔ ادھر انیسویں صدی تک پہونچتے پہونچتے عالم اسلام خستہ اور کمزور ہوگیا۔ یہ صورت مسلمانوں کے لئے نہایت اذیت ناک اور اقوام مغرب کے لئے خوش آئند ثابت ہوئی جس سے اس تحریک کو خوب پھلنے اور پھولنے کا موقع ملا۔ چنانچہ مستشرقین نے اسلامی تاریخ کا کوئی ایسا پہلو نہیں چھوڑا جس کو انہوں نے اپنی تحقیق کا ہدف نہ بنایا ہو، لیکن اس زمانے میں ان کے انداز فکر اور طرز تحقیق میں حیرتناک طور پر تبدیلی رونما ہوئی اور صلیبی جنگوں کے زمانے کا معاندانہ انداز مصلحتاً ترک کر دیا گیا۔ اور جس نوعیت سے انہوں نے تحقیق کے کام کو انجام دیا اس سے اسلام کی جڑ اور بنیاد ہی کو ہلا دینا چاہا۔ اب اسلام اور پیغمبر اسلام پر الزامات تراشنے کے بجائے شریعت اسلامیہ کے ماخذ و مصادر میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوششیں شروع کیں۔ چنانچہ اس زمانے میں مار آستین کی طرح مستشرقین نے اسلام کو جتنا نقصان پہونچایا تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

لیکن اس گروہ میں بعض ایسے افراد بھی شامل ہیں جنہوں نے تحقیقی کاموں میں صداقت اور دیانت داری کا ثبوت دیا، جن کی بدولت ہمارے اسلاف کی بہت سی نادر کتب سامنے آئیں جنہیں دیکھ کر مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا تھا کہ "تاریخ وادب کی وہ بے بہا کتابیں جنکو الگ کر دینے کے بعد عربی اور مسلمانوں کا کشکول خالی ہو جاتا ہے، صرف یوروپ کی سرپرستی سے نظر آتی ہیں[۳]"۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ ان لوگوں نے جس جفاکشی اور محنت سے اس کام کو انجام دیا ان کے لئے وہ شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔

لیکن اس علمی اعتراف کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے یہ کام مخلص ہو کر انجام دیا ہوگا بلکہ اپنے استعماری عزائم کو بروئے کار لانے کے لئے ان کو اقوام مشرق کے تاریخی و تہذیبی مطالعہ کی ضرورت نے اس کام پر مجبور کیا تاکہ اہل مغرب کو ان ممالک پر حکومت کرنا آسان ہو۔ اس کے

ساتھ وہ ان حالات اور تحریکات کا توڑ بھی کرتے رہے جو ان کی حکومتوں کے لئے دردِ سر بن سکتے تھے۔ اور ایسی ذہنی اور علمی فضا ہموار کرتے رہے جن میں ان کی حکومتوں کے متعلق مخالف خیال ہی نہ پیدا ہو، چنانچہ اس مقصد کے تحت مشرقی کتب خانوں کی بنیاد ڈالی اور ایسے ادارے عمل میں آئے جن سے اسلامی دنیا کے لئے عربی کتابیں اور رسائل و مجلات وغیرہ شائع ہوتے رہتے۔ جس سے ان کا بڑا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی تاریخ کے کسی بھی ایسے گوشے کو نہ چھوڑا جائے جس پر ان کی تحقیقات نہ ہوں، اور ان کو ذہنی طور پر اتنا مفلوج بنا دیا جائے کہ وہ صحیح سمت میں قدم نہ اٹھا سکیں بلکہ ہر قدم پر مغرب کے محتاج ہوں۔

بیسویں صدی اور مستشرقین

بیسویں صدی میں حالات نے کروٹ بدلی اور اسلامی ممالک ایک ایک کرکے ان کی گرفت سے آزاد ہو گئے۔ حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ مستشرقین کا طرزِ تحقیق اور اندازِ فکر بھی بدلا۔ اسلامی ممالک پر اپنی سیاسی برتری برقرار رکھنے کے لئے ان کی تحریروں میں اسلام کا احترام بڑھتا گیا۔ لیکن اسی کے ساتھ خاموشی سے وہ ایسے فتنوں کو بھی ہوا دیتے رہے جس سے اسلام کا شیرازہ بکھر جائے اور اسلامی وحدت پارہ پارہ ہو جائے۔ پھر جب اچانک عرب ممالک میں زرِ سیّال کے چشمے ابل پڑے اور ان کو سیاسی آزادی کے علاوہ اقتصادی آزادی بھی حاصل ہو گئی اور عالم اسلام پر اسلامی فکر و تہذیب کو برتری حاصل ہونے لگی اور یورپ کی مرعوبیت کے پھندے سے آزاد ہونے لگے اور اسلامی تحریک عہد حاضر کا ایک چیلنج بن کر ابھرنے لگی تو اب مغربی فکر اور اسلام دشمن تحریکوں کے منصوبے خاک میں ملتے نظر آئے تو ان کو اس فکر نے پریشان کر دیا کہ وہ اب کس حربہ سے اسلام کو بدنام کریں اور اس مقصد کے حصول کے لئے کون سی چالیں چلیں حالانکہ ان کے علمی اور تحقیقی "کاوشوں" کا پردہ چاک ہو چکا ہے مگر وہ اب بھی خاموش نہیں بیٹھے ہیں۔ وہ اسلام کو بدنام کرنے کے لئے اور اسلام کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روکنے کے لئے کبھی عربوں کو بدنام کرتے ہیں کبھی اسلام میں عورتوں کی مظلومیت کا واویلا مچایا جاتا ہے اور کبھی اسلام کے نظام سیاست کو غیر جمہوری قرار دیا جاتا ہے اور اب نیا حربہ یہ استعمال کیا جا رہا ہے کہ کچھ ایسے افراد کا انتخاب کیا جاتا ہے جو اگرچہ مسلم خاندان میں پیدا ہوئے ہیں مگر ان کی

تربیت مغرب میں یا غیر اسلامی ماحول میں ہوئی ہے، پہلے ذرائع ابلاغ کے ذریعہ ان کو شہرت دی جاتی ہے اور پھر ان کے ذریعہ اسلام کو بدنام کرنے کی مذموم کوشش کی جاتی ہے مگر آج مسلمان ان کی تمام چالوں کو سمجھ چکے ہیں، وہ آئندہ کسی دھوکے میں آنے والے نہیں۔

حوالہ جات

۱ـ نجیب العقیقی، المستشرقون/ ۱۲۰ ـ ۲۷، مصر، دارالمعارف ۱۹۶۴ء

۲ـ مصطفیٰ سباعی، المستشرقون والاسلام (اردو ترجمہ سلمان شمسی ندوی) /۳۰ ـ لکھنؤ ۱۹۷۱ء

۳ـ سید صباح الدین ـ اسلام اور مستشرقین ۲/ ۲۳، اعظم گڈھ ۱۹۸۶ء

۴ـ شبلی نعمانی، سیرۃ النبی ۱/ مقدمہ، دارالمصنفین، اعظم گڈھ

(بقیہ صفحہ ۵۵ کا)

شیخ الاسلام ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ قاضی عیاض کا قول بھی منافی دیدار نہیں بلکہ ان کے قول سے یہ صاف ظاہر ہے کہ دونوں حالتوں میں دیدار سے مراد دیدار حقیقی ہے۔ اور پہلی حالت میں خواب، محتاج تعبیر نہیں اور دوسری حالت میں محتاج تعبیر ہے۔ اور جن لوگوں کا یہ خیال ہو کہ بحالت خواب سرور عالم ﷺ کا دیدار صورت معلومہ کے ساتھ ہی دراصل خواب میں دیدار ہے۔ اور جس نے آپ ﷺ کو کسی اور صفتی صورت میں دیکھا تو وہ خواب میں دیدار سرور عالم ﷺ نہیں بلکہ اس کا خواب، خواب پریشاں ہے تو ایسے کلام زبان پر لانے والے تعلیم اور اسلامی تعلیم سے بے بہرہ ہیں واقعہ یہ ہے کہ سرکار ابد قرار ﷺ کا دیدار خواب میں اس طرح ہو جو حالات دنیا کے موافق نہ ہو تب بھی دیدار ہوا۔ اور شیطان کو کسی طرح بھی یہ قوت نہیں ہے کہ وہ معمولی طریقہ سے بھی آپ ﷺ کا مشابہ ہو سکے اگر وہ آپ ﷺ کی صورت کا ادنیٰ طریقہ سے بھی مشابہ ہو تو آپ ﷺ کے اس ارشاد عالی کے خلاف ہوگا کہ شیطان میری مماثلت اختیار نہیں کر سکتا۔ اور چونکہ رسول اکرم ﷺ کا حکم غلط نہیں ہو سکتا اس لئے مناسب یہی ہے کہ جس طرح سرکار ابد قرار ﷺ کو خود بذاتہ خواب میں دیکھنا دیدار ہے اسی طرح آپ ﷺ کی جانب امور منسوبہ کو دیکھنا بھی دیدار ہے اور اس میں کسی قسم کا وہم و شک نہ کرنا ہی مستحسن ہے۔

تحفۂ ابرار

حضرت مولانا شاہ ابرار الحق ہردوئی مدظلہ العالی کی ایک تقریر سے

ان ملفوظات کو مولانا محمد انیس صاحب مدرس امداد العلوم ہرسولی نے اخذ و مرتب کیا ہے اور خود حضرت مولانا ہردوئی صاحب نے اس کی اصلاح فرمائی ہے اور طباعت کی اجازت دی ہے

۱۔ فرمایا کہ آج کل ماموراتپر محنت ہو رہی ہے اس کے لئے ہمارے بزرگوں کی طرف سے جماعت کی صورت میں ایک نظام بھی قائم ہے ماشاء اللہ اس کے فوائد ظاہر ہو رہے ہیں مدارس و مکاتب کھل رہے ہیں، مساجد تعمیر ہو رہی ہیں، لیکن برائیوں کو مٹانے کے لئے جیسی محنت چاہئے ویسی نہیں ہو رہی ہے، یہ کام بھی فرض کفایہ ہے جس طرح مساجد اور مدارس کے انتظام کے لئے کمیٹیاں ہوتی ہیں، اسی طرح منکرات کی اصلاح اور برائیوں کے مٹانے کے لئے بھی جماعت ہونی چاہئے، اس کے لئے جماعتی محنت کرنا امت مسلمہ کے ذمہ ضروری ہے۔

۲۔ فرمایا کہ دینی اجتماعات اور جلسوں میں معمول ہے کہ پہلے قرآن پاک کی تلاوت ہوتی ہے ایسا کیوں ہے؟ عموماً ذہنوں میں یہ ہوتا ہے کہ جلسہ گاہ میں ابھی لوگ آئے نہیں اس لئے تلاوت ہو جائے تاکہ لوگ جمع ہو جائیں پھر بیان ہو۔ سوچنے کی بات ہے کہ جو کام آلہ مکبر الصوت کا تھا کہ اس کے ذریعہ لوگوں کو جمع کیا جائے وہ کام ہم احکم الحاکمین کے کلام سے لے رہے ہیں۔ قرآن پاک کے ساتھ یہ معاملہ ہو رہا ہے اسکی اصلاح کی ضرورت ہے۔ چنانچہ دینی تذکرہ میں جب جانا ہوتا ہے اس کی طرف توجہ دلاتا ہوں کہ پہلے تلاوت کیوں کی جاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ

جب زمین میں بیج ڈالتے ہیں تو پہلے اس کو نرم کر لیتے ہیں پانی ڈالتے ہیں جوتتے ہیں جب وہ نرم ہو جاتی ہے تو اس میں بیج ڈالتے ہیں اسی طرح یہاں بھی معاملہ ہے کہ پہلے تلاوت کی جاتی ہے تاکہ اس کی برکت سے دل کی زمین نرم ہو جائے۔ اس میں جو زنگ لگ گیا ہے وہ صاف ہو جائے اب اس کے بعد جب دین کی باتیں بیان ہوں گی تو پھر اس کا نفع ہوگا فائدہ ہوگا۔ اس لئے دینی اجتماعات میں پہلے تلاوت ہوتی ہے۔

۳ - فرمایا کہ نماز میں دل لگانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جو ارکان ادا کیے جائیں ان کو دھیان سے ادا کیا جائے جو پڑھا جائے اس کے الفاظ کو توجہ سے پڑھا جائے قرآن پاک کی تلاوت ہو، تسبیحات ہوں اسی طرح تشہد وغیرہ ان سب کو پڑھتے وقت یہ خیال کرے کہ اب یہ پڑھ رہے ہیں اب یہ پڑھ رہے ہیں، جن لوگوں کو اس کا ترجمہ معلوم ہے ان کو اس کی طرف توجہ کر کے نماز پڑھنی چاہیئے، اس سے انشاء اللہ نفع ہوگا۔

۴ - فرمایا نماز پڑھتے ہوئے برسوں ہو گئے لیکن نماز کی سنتیں معلوم نہیں سنت کے موافق نماز پڑھنے کا طریقہ نہیں جانتے، الحمد شریف کا ترجمہ نہیں معلوم اسی طرح جو اوراذکار ہیں ان کے معنیٰ سے واقف نہیں اس کو بھی سیکھنے کی ضرورت ہے۔ روزانہ ایک ایک سنت سیکھی جائے، نماز میں اکیاون سنتیں ہیں، اکیاون دن میں یاد ہو جائیں گی۔ ایک ایک لفظ کا ترجمہ یاد کیا جائے، دھیرے دھیرے سب کا ترجمہ معلوم ہو جائے گا۔

۵ - فرمایا کہ تلاوت کے تین اہم فائدے ہیں اور دو اہم آداب ہیں، فائدے یہ ہیں ۱ دل کا زنگ دور ہوتا ہے ۲ اللہ تعالیٰ کی محبت میں ترقی ہوتی ہے ۳ ہر ہر حرف پر دس دس نیکیاں ملتی ہیں بغیر سمجھے پڑھنے پر بھی اگر کوئی کہے بغیر سمجھے پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں، وہ شخص بددین ہے یا جاہل ہے۔ دو اہم آداب یہ ہیں۔ (۱) پڑھنے والا دل میں یہ خیال کرے کہ اللہ نے حکم دیا ہے کہ اس کو سناؤ کیا پڑھتے ہو۔ (۲) سننے والا خیال کرے کہ محسن اعظم اور احکم الحاکمین کا کلام پڑھا جا رہا ہے، انتہائی محبت اور عظمت کے ساتھ سنے۔

۶ - فرمایا کہ قرآن شریف کے چار حق ہیں، ۱ عظمت، ۲ محبت، ۳ تلاوت مع الہمت ۴ احکام کی

متابعت، حدیث شریف کے تین حق ہیں، ا عظمت، ۲ محبت، ۳ احکام کی متابعت۔

۷۔ فرمایا کہ کھانے کے آداب کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے عجیب عنوان دل میں ڈالا کہ کھانا یہ شیخ بطن ہے ایک شیخ باطن ہے جو باطن یعنی قلب کی اصلاح کرتا ہے اور کھانا شیخ بطن ہے کہ اس سے ظاہر یعنی جسمانی صحت ٹھیک رہتی ہے جب یہ شیخ بطن ہے تو اس کے بھی وہی حقوق و آداب ہیں جو شیخ باطن کے ہیں جو معاملہ شیخ باطن کے ساتھ کیا جاتا ہے وہی معاملہ اس کے ساتھ بھی کیا جائے گا۔ چنانچہ کسی شیخ کی مجلس کا کوئی وقت مقرر ہو تو جو لوگ شرکت کرنے والے ہیں وہ پہلے آتے ہیں پھر شیخ تشریف لاتے ہیں اسی طرح یہاں بھی یہی معاملہ ہوگا کہ پہلے کھانے والے آجائیں پھر کھانا لایا جائے۔ یہ نہیں کہ کھانا دسترخوان پر پہلے لگا دیا گیا پھر کھانے والے آئیں، یہ اس کے آداب کے خلاف ہے، شیخ کی مجلس میں جو لوگ شریک ہوتے ہیں وہ اس کی فکر کرتے ہیں کہ ہر بات کو توجہ سے سنیں کوئی بات بے فکری سے ضائع نہ ہو جائے اسی طرح یہاں بھی یہی حکم ہے کہ کھانے کا کوئی جز ضائع نہ جائے اس لئے دسترخوان بچھایا جاتا ہے تاکہ جو اجزا گریں ان کی حفاظت ہو وہ ضائع نہ ہو جائیں۔ شیخ کی مجلس جب وقت مقررہ پر ختم ہوتی ہے تو ایسا نہیں ہوتا کہ سب لوگ ایک دم سے اٹھ کر چلے جائیں اور شیخ اکیلے بیٹھے رہ جائیں۔ اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی کہ مجلس ختم ہونے پر سب لوگ ایک دم چلے گئے ہوں اور وہ تنہا بیٹھے رہ گئے ہوں بلکہ کچھ نہ کچھ لوگ تو بیٹھے ہی رہتے ہیں جو ان کے تشریف لے جانے کے بعد جاتے ہیں، اسی طرح یہاں بھی یہی حکم ہے کہ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد پہلے دسترخوان اٹھایا جائے پھر کھانے والے اٹھیں۔ حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے تھے کہ میں جب چارپائی پر کھانا کھاتا ہوں تو کھانے کو سرہانے کی طرف رکھتا ہوں اور خود پائینتی کی طرف بیٹھتا ہوں تاکہ کھانے کا احترام ملحوظ رہے۔

۸۔ فرمایا کہ حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی نور اللہ مرقدہٗ جب بسلسلہ علاج لکھنؤ تشریف لائے تھے اس موقع پر ایک صاحب نے سوال کیا کہ کھانے کے بعد جو دعا ہے اس میں ہے الحمد لله الذی اطعمنا وسقانا اس کا تو اس موقع پر پڑھنا سمجھ میں آگیا کہ یہ کھانے پینے

کا موقع ہے اس پر شکر ادا کیا گیا ہے. لیکن وجعلنا من المسلمین کہ ہمکو مسلمان بنایا اس پر شکر ادا کرنے کا یہ کیا موقع ہے. حضرت مولانا تھانوی نوراللہ مرقدہٗ نے اس سوال پر خوشی کا اظہار فرماتے ہوئے فرمایا کہ یہ سوال تو کسی عالم کو کرنا چاہئے تھا، پھر فرمایا کہ نعمتیں دو طرح کی ہوتی ہیں. ایک وہ ہیں جو تسلسل کے ساتھ مل رہی ہیں اور ایک وہ ہیں جو تسلسل کے ساتھ نہیں ہیں بلکہ وقفہ وقفہ کے ساتھ ملتی ہیں جو نعمتیں تسلسل کے ساتھ ملتی رہتی ہیں ان کے نعمت ہونے کا احساس بھی نہیں ہوتا جس کی بنا پر اس کا شکر بھی نہیں ہوتا جو نعمتیں وقفہ وقفہ کے ساتھ ملتی رہتی ہیں ان کے نعمت ہونے کا احساس بھی ہوتا ہے اور ان پر شکر بھی ادا کیا جاتا ہے اس طرح کی نعمتوں میں کھانا بھی ہے تو اس دعا میں وقفہ کے ساتھ ملنے والی نعمتوں کے ساتھ ایمان و اسلام جو سب سے بڑی نعمت ہے تسلسل کے ساتھ مل رہی ہے اس کو بھی شامل کر دیا گیا تاکہ اس کا بھی شکر ادا ہو جائے، اور یہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا کتنا عظیم احسان ہے کہ کھانے پینے کی نعمت پر شکر کے ساتھ اسلام کی نعمت پر بھی شکر کی تعلیم دی.

۹ - فرمایا کہ طلبۂ کرام یہ ضیف رسول اللہ ﷺ ہیں، ان کے ساتھ معاملہ بھی ویسا ہی کرنا چاہئے. ہمارے یہاں مہمان آجائے تو اس کی راحت و آرام کا اپنی حیثیت کے مطابق انتظام کرتے ہیں اور یہ تو مہمانِ رسول ہیں ان کا تو اور زیادہ خیال رکھنا چاہئے، کھانے پینے، رہنے سہنے کی سہولتوں کی فکر کرنی چاہئے، بیمار ہو جائیں تو ان کا علاج بہتر سے بہتر کرنا چاہئے، بیمار ہونے پر ان کی عیادت کرنی چاہئے. بعض مرتبہ ان سے ایسے کام لئے جاتے ہیں جن کو گھٹیا سمجھا جاتا ہے، یہ مناسب نہیں ہے، جو کام ہم خود نہیں کر سکتے اور اس کو کرنے پر عار محسوس کرتے ہیں. اس کو طلبا سے کیسے لے سکتے ہیں، سوچنے کی بات ہے کہ مہمانان رسول سے ایسے کام لینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ بعض مرتبہ تنبیہ و تادیب میں بھی زیادتی ہو جاتی ہے، بات یہ ہے کہ عموماً پڑھانے والے غصہ کے مریض ہوتے ہیں، غصہ کا علاج نہیں کراتے، اب جب وہ شرارت کرتے ہیں تو اس سے بالکل مغلوب الغضب ہو کر تنبیہ کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں سزا دی جائے گی تو حدود کی رعایت کیسے ہو سکتی ہے، اس طرح کے واقعات پیش آئے کہ ایسی پٹائی کی کہ اس کے نتائج برے ظاہر ہوئے،

اس لئے اس زمانہ میں جہاں تک ہو سکے تادیب ضربی سے احتیاط کی جائے، مقصد تو ان کو تنبیہ کرنا اور اصلاح کرنا ہے اس کی اور بھی شکلیں ہیں، ان کو اختیار کیا جائے، ہمارے یہاں الحمدللہ تادیب ضربی کا سلسلہ نہیں ہے بلکہ شرارت کرنے پر دوسری تدابیر اختیار کی جاتی ہیں، جس سے نفع بھی ہوتا ہے۔

۱۰۔ فرمایا کہ پیر یا وزیر کا بچہ ہمارے یہاں اگر پڑھے تو ہم اس کے ساتھ کیا برتاؤ کریں گے اس کی تعلیم و تربیت پر کیسی توجہ کریں گے، شرارت کرنے پر تنبیہ بھی کریں گے، مگر ڈرتے ڈرتے، کہیں پیر صاحب یا وزیر صاحب خفا نہ ہو جائیں، اس لئے اس کی بھی رعایت کریں گے، اسی طرح فقیر کے یعنی عام لوگوں کے بچہ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہونا چاہئے۔

۱۱۔ فرمایا کہ طلبائے کرام ہمارے محسن ہیں، معاش کے بھی اور معاد کے بھی، ان کی وجہ سے ہماری روزی کا بھی انتظام ہو جاتا ہے، اہل خیر حضرات ان کی وجہ سے مدرسہ کا تعاون کرتے ہیں، چندہ دیتے ہیں، یہ اگر نہ ہوں تو قوم کتنے دنوں تک بٹھا کر تنخواہ دے گی، پھر یہ کہ ہمارے علوم کی ترقی کا یہ ذریعہ ہیں، ان کی وجہ سے کتابوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے جس سے علم میں اضافہ ہوتا ہے، نئی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں، پڑھنے والے اگر نہ ہوں تو پھر کتابوں کو کون دیکھتا ہے اور کون مطالعہ کا اہتمام کرتا ہے، اسی کے ساتھ یہ ہمارے لئے صدقہ جاریہ بھی ہیں، ہماری آخرت بھی سنور رہی ہے، اجر و ثواب بھی مل رہا ہے، اس طرح ان کے محسن ہونے کو سوچا جائے تو پھر ان کی عظمت دل میں پیدا ہوگی اور شفقت کا برتاؤ ہوگا۔

۱۲۔ فرمایا کہ آج کل مسلمانوں میں یہ مرض ہو گیا ہے کہ اپنی چیزوں کو چھوڑ کر دوسروں کی چیزوں کو اختیار کرنے لگے ہیں، روزمرہ کی گفتگو میں دوسری زبان کے الفاظ استعمال کرتے ہیں مثلاً پروگرام، جبکہ اس کے لئے اردو میں اس کا بدل موجود ہے، اسی طرح اور بھی الفاظ ہیں، خطوط میں بجائے اسلامی تاریخ کے انگریزی تاریخ ہی کا رواج ہوتا جا رہا ہے۔ اسلامی تاریخ کا اہتمام کرنا چاہئے۔ ضرورت پر دوسری تاریخ کو بھی لکھا جائے اور اس کو اوپر لکھا جائے، اپنی چیز کو چھوڑ کر اوروں کی نقل جبھی ہوتی ہے کہ جب اس کی اہمیت اور عظمت دل میں نہیں ہوتی پھر یہ کہ اس پر روک ٹوک بھی نہیں کی جاتی۔

۱۳۔ فرمایا کہ ٹیلی ویژن کا نام میں نے سانپوں کا پٹارہ رکھا جس میں بہت سے سانپ بند ہیں اس کا ڈسا ہوا بچ نہیں سکتا، کتے کے زہر کی طرح اس کا معاملہ ہے، ہلکے ہلکے اس کا اثر ہوتا ہے پھر اس کا دورہ پڑتا ہے بڑی خطرناک چیز ہے جیسے زہریلے سانپ سے بچتے ہیں اسی طرح اس سے بھی بچنے کی ضرورت ہے۔

۱۴۔ فرمایا لوگ داڑھی کو اچھا تو سمجھتے ہیں لیکن ضروری نہیں سمجھتے حالانکہ داڑھی کا رکھنا ضروری ہے چاروں ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کسی کا اختلاف نہیں جس طرح وتر کی نماز ضروری ہے، عید و بقرعید کی نماز ضروری ہے، اسی طرح ایک مشت داڑھی رکھنا بھی واجب ہے بعض لوگ سامنے تو ایک مشت رکھتے ہیں اور دائیں بائیں کم رکھتے ہیں، یہ صحیح نہیں ہے، سامنے بھی ایک مشت ہونی چاہئے اسی طرح دائیں بائیں بھی ایک مشت ہونی چاہئے اور اپنی مٹھی کا اعتبار ہے نائی کی مٹھی کا نہیں کہ وہ پستہ قد ہو تو اس کی مٹھی بھی چھوٹی ہوگی اس سے معاملہ خراب ہو جائے گا۔

۱۵۔ فرمایا کہ ایک صاحب نے مجھ سے سوال کیا کہ حرمین شریفین کے لوگوں کا معاملہ داڑھی کے سلسلہ میں ایسا نہیں ہے، مقصد ان کا یہ تھا کہ پھر ہم لوگوں کو بھی انہیں کی نقل کرنا چاہئے تو میں نے کہا کہ ہم نہ حرمین والوں پر ایمان لائے ہیں اور نہ ہی ہم کو ان کی اقتدا کا حکم دیا گیا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے ہیں ہمیں آپ کی اقتدار و اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لئے آپ کا عمل ہمارے لئے حجت ہے کسی اور کا عمل ہمارے لئے دلیل نہیں ہے۔

۱۶۔ فرمایا کہ ہر عمل مقبول نہیں جب تک کہ اس میں اخلاص نہ ہو اسی طرح ہر اخلاص مقبول نہیں جب تک کہ مسائل کے تحت نہ ہو مثال کے طور پر ایک شخص کمرہ میں عصر کے بعد غروب شمس کے وقت تک دروازہ بند کرکے نفل پڑھتا ہے ظاہر ہے کہ یہ شخص مخلص تو ہے لیکن یہ اس کا عمل مقبول نہیں، اس لئے کہ مسائل کے خلاف ہے اسی لئے میں کہا کرتا ہوں فضائل کی تعلیم کے ساتھ مسائل کی بھی تعلیم ہونی چاہئے تاکہ فضائل سے اعمال کا شوق ہو اور مسائل سے اعمال کی صحت ہو، دونوں ہی چیزیں ہونی چاہئیں۔

۱۷۔ فرمایا تزکیہ نفس اور اخلاق کی اصلاح بہت ضروری ہے اس کی طرف سے عام طور پر غفلت

بھٹک سے ہے اول تو بزرگوں سے تعلق نہیں رکھتے اور اگر رکھتے بھی ہیں تو برائے نام ایسی صورت میں کیسے فائدہ ہو سکتا ہے کیسے اصلاح ہو سکتی ہے جسمانی علاج کا جو معاملہ ہے وہی معاملہ یہاں بھی ہے، اب ایک شخص بیمار ہے وہ طبیب کے پاس نہیں جاتا یا جاتا تو ہے مگر اسکو اپنا مرض نہیں بتلاتا یا مرض کو تو بتلاتا ہے لیکن حکیم صاحب نے جو نسخہ تجویز کیا اور جو پرہیز بتلایا اس پر عمل نہیں کرتا تو ایسی حالت میں اس کا علاج کیسے ہو سکتا ہے اور اس کا مرض کیسے دور ہو سکتا ہے علاج کے لئے اپنی حالت کی اطلاع اور معالج کی ہدایات پر عمل یہ اصل اور بنیاد ہے اس پر جو لوگ عمل کرتے ہیں وہ چند دن میں صحت یاب ہو جاتے ہیں ایسے ہی یہاں بھی ہے جس سے اصلاح کا تعلق ہے اس کو اطلاع حالات اور اس کی ہدایات کی اتباع کی جائے اس کی پابندی کرنے سے انشاء اللہ جلد مقصود حاصل ہو جائیگا اسی کو خواجہ صاحب نے فرمایا ہے

چار شرطیں لازمی ہیں استفادہ کے لئے۔ اطلاع و اتباع اعتقاد و انقیاد۔

۱۸۔ فرمایا کہ اس زمانہ میں شیطان عوام سے تو فارغ ہو گیا ہے انکو فرائض سے غافل کر دیا ہے اور گناہوں میں مبتلا کر دیا ہے، مدارس اور دینی خدام کے پیچھے پڑا ہوا ہے، چنانچہ اس کا اثر یہ ہے کہ ان مراکز سے مختلف قسم کے فتنیں پیدا ہو رہے ہیں، اور ایک بیماری تو عام ہوتی جا رہی ہے کہ ایک مدرسہ والا دوسرے مدرسہ والوں کے مقابلہ میں اپنی بڑائی اور اچھائی بیان کرتا ہے دینی خدام آپس میں ایک دوسرے میں تقابل کرتے ہیں، حالانکہ دوسرے کی تحقیر تو جائز بھی نہیں پھر دینی خدام اور ان کے کام کی یہ تو اور بھی بری بات ہے، پھر یہ کہ دین کے مختلف شعبے ہیں جو جس شعبہ میں ہے وہ دین کا کام کر رہا ہے، آپس میں تعاون ہونا چاہئے، نہ کہ تقابل و تفاضل یہ تو صحیح نہیں۔

۱۹۔ فرمایا بعض اوقات انسان دینی اعتبار سے اپنے کو صحیح سمجھتا ہے، اب یہ کہ خود وہ کہتا ہے اس کے لئے ضرورت ہے کہ کسی ماہر کے پاس جا کر اپنے کو دکھلائے، تب معلوم ہوگا کہ تندرست ہے کہ نہیں، بعض مرتبہ انسان بیمار ہوتا ہے اسکو اپنی بیماری سمجھ میں نہیں آتی اور اپنے کو تندرست سمجھتا ہے، حالانکہ جب طبیب اسکو دیکھتا ہے تو وہ بتلاتا ہے کہ اس میں کیا مرض ہے، چنانچہ

اس طرح کے واقعات ہوتے ہیں، ایک صاحب بظاہر تندرست و توانا تھے، وہ اپنی اہلیہ کو طبیب کے پاس لے گئے اتفاق سے حکیم صاحب کا ہاتھ ان کی نبض پر پڑ گیا تو انہوں نے کہا کہ حکیم صاحب میں بیمار نہیں ہوں میری اہلیہ بیمار ہیں ان کو دکھانا ہے، وہ حکیم صاحب بڑے نباض تھے اور ماہر تھے، انہوں نے کہا کہ ٹھیک آپ اپنی اہلیہ کو دکھانے کے لئے آئے ہیں مگر آپ کو بھی شکر کی بیماری ہے کسی ڈاکٹر سے اس کو دکھا لیجئے، چنانچہ جب انہوں نے دکھلایا تو وہ بیماری ان پر نکلی، تو یہ صاحب اپنے کو تندرست سمجھ رہے تھے۔ مگر جب معالج کے پاس گئے تو معلوم ہوا کہ بیمار ہیں، اسی طرح دین میں بھی اس کے جو معالج اور مصلح ہیں ان سے اپنی جانچ کرائے جب معلوم ہوگا کہ بیماری ہے یا نہیں، اگر بیماری ہے تو پھر کیا ہے۔

۲۰ - فرمایا کہ سنت کے موافق اذان واقامت اکثر جگہوں پر نہیں ہوتی، میں جہاں کہیں جاتا ہوں تو اس کو غور سے سنتا ہوں، بالخصوص لفظ اللہ کے سلسلے میں تو عام طور پر اس کو خوب کھینچتے ہیں، جو کہ صحیح نہیں ہے اور بات یہ کہ روک ٹوک کا سلسلہ بھی کم ہے، سیکھنے سکھانے کا اہتمام نہیں، بس ایک رواج چلا آرہا ہے، دیکھا دیکھی نقل کرتے چلے آرہے ہیں، حالانکہ کوئی مشکل نہیں ہے، تھوڑی سی فکر و کوشش سے تصحیح ہو سکتی ہے۔ ماشاء اللہ ہمارے ساتھ عبدالرحمٰن صاحب انجینیر ہیں سرکاری ملازم بھی ہیں فکر ہوئی اپنی اذان واقامت اور قرآن پاک سب درست کرلیا، ایسے ہی بھوپال کے ایک وکیل صاحب ہمارے یہاں قرآن پاک کی تصحیح کے لئے آتے تھے، ماشاء اللہ کچھ دنوں میں محنت کی صحیح ہوگیا، بنگلہ دیش سے علماء کی ایک جماعت آئی تھی، اس میں کوئی شیخ الحدیث، کوئی ناظم مدرسہ، کوئی ناظم تعلیمات تھا تھوڑے دن اہتمام کیا، محنت کی، کوشش کی تھوڑے دنوں میں اذان اقامت کی تصحیح اور دیگر چیزوں کی درستگی ہوگئی۔
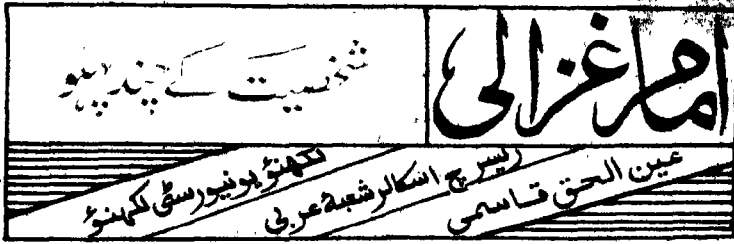
امام غزالی ان بڑے لوگوں میں ایک تھے جنہیں زمانہ کبھی فراموش نہیں کرتا، پوری دنیا ان کی عظمت و عبقریت کی معترف ہے، وہ ایک بڑے عالم دین، معلم و مدرس، مصنف و مؤلف خطیب و واعظ، مفتی و قاضی اور زبردست صوفی بزرگ کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں، ان کی اس جامعیت نے انہیں مرجع خلائق بنا دیا تھا جہاں سے خلق کثیر نے علم و فضل کی دولت پائی اور نام روشن کیا۔

امام غزالی سنہ ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء میں خراسان کے ضلع طوس کے ایک شہر طابران میں پیدا ہوئے، ان کا نام ابوحامد محمد بن محمد بن احمد، لقب حجۃ الاسلام اور عرف غزالی ہے، ان کے والد صوف بنتے اور بیچتے تھے اس لئے غزالی کہلائے[1]۔

علمی پایہ

امام صاحب طالب علمی کے زمانے سے ہی نہایت ذہین و فطین واقع ہوئے تھے عقل و فراست ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی، چنانچہ تھوڑی ہی مدت میں تحصیل علم سے فارغ ہو کر اپنے معاصرین میں ممتاز و نمایاں ہو گئے، ان کے استاذ امام الحرمین کے حلقۂ درس میں چار سو طلبہ تعلیم پاتے تھے، ان میں تین سب میں ممتاز تھے۔ کیا ہراسی، احمد بن محمد خوافی اور امام غزالی، چنانچہ امام الحرمین کہا کرتے تھے کہ "غزالی دریائے ذخار ہے اور کیا شیر درندہ اور خوافی آتش سوزاں"۔ لیکن کیا اور خوافی کی ہمسری طالب علمی ہی کے زمانہ تک تسلیم کی جاسکتی ہے، ورنہ بالآخر امام غزالی نے جو مقام حاصل کیا وہ امام الحرمین کو بھی نصیب نہیں ہوا[2]۔

۱ـ معجم المطبوعات العربیہ۔ ص ۱۴۰۹

۲ـ شبلی نعمانی، الغزالی۔ مطبع تحفہ جنہ، دہلی ۱۹۱۹ء۔ ص ۱۲

اس زمانے میں نامور علماء کے یہاں یہ معمول تھا کہ جب وہ درس دے چکتے تھے تو شاگردوں میں جو سب سے زیادہ لائق ہوتا تھا وہ باقی طالب علموں کو دوبارہ درس دیتا تھا اور استاذ کے بتائے ہوئے مضامین اچھی طرح ذہن نشین کراتا تھا یہ منصب جس کو حاصل ہوتا تھا اس کو "معید" کہتے تھے۔ چنانچہ امام غزالی کو بھی یہ منصب حاصل ہوا اور معید کہلائے۔ [1]

مورخین نے لکھا ہے کہ امام صاحب اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی صاحب تصنیف ہوگئے تھے چنانچہ جب انہوں نے اصول فقہ میں اپنی کتاب "منخول" لکھی اور اسے اپنے استاذ امام الحرمین ابوالمعالی الجوینی کی خدمت میں پیش کیا تو انہوں نے فرمایا:

"دفنتني وانا حي، فهلا صبرت حتى اموت لان كتابك غطى على كتابي"۔ [2]

تو نے تو مجھے جیتے جی دفن کر دیا، میرے مرنے تک صبر کیوں نہیں کیا کہ تیری کتاب نے تو میری کتاب پر پردہ ڈال دیا۔

محمد لطفی جمعہ اپنی کتاب "تاریخ فلاسفة الاسلام" میں امام غزالی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ غزالی کا شمار عرب کے بلند اسلامی مفکرین میں ہوتا ہے اور وہ دنیوی اور دینی علوم کے اہل بحث ائمہ میں سے ہیں، مورخین نے آپ کا لقب حجۃ الاسلام رکھا ہے اور یہ خطاب امر واقعی ہے اس میں کسی قسم کا مبالغہ نہیں ہے"۔ [3]

علمی خدمات

امام غزالی نے تدریسی اور تصنیفی دونوں میدانوں میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں، تعلیم سے فراغت کے بعد امام صاحب نے نظام الملک کے دربار کا رخ کیا تھا جہاں بڑے بڑے علماء موجود تھے، نظام الملک نے ان کے درمیان مناظرہ و مباحثہ کی مجلسیں منعقد کیں کہ یہی اس زمانے میں علمی صلاحیت و استعداد کے جانچنے کا عام طریقہ تھا، چنانچہ ہر معرکہ میں امام صاحب ہی غالب رہے اس پر نظام الملک نے ان کو مدرسہ نظامیہ

---

[1] شبلی نعمانی: الغزالی۔ مطبع تحفہ جینہ، دہلی ۱۹۱۹ء ص ۱۲

[2] عبدالکریم العثمان: سیرۃ الغزالی۔ دمشق۔ ص ۱۴۸

[3] تاریخ فلاسفۃ الاسلام۔ ص ۹۷

کا مدرس اعظم منتخب کرلیا جو اس وقت کا سب سے بڑا اعزاز تھا۔

ان کی علمی شہرت اور درس کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ ہر طرف سے منتہی درجہ کے طلبہ نیز علماء اور رؤسا تک ان کے درس میں شریک ہوتے تھے جن کی تعداد بیک وقت تین سو یا اس سے کچھ زائد ہوتی تھی۔

درس کے علاوہ وعظ بھی فرماتے تھے، بقول علامہ شبلی نعمانیؒ:

"اور چونکہ وہ وعظ میں ہمیشہ علمی مطالب بیان کرتے تھے، یہ وعظ بھی درحقیقت علمی لکچر ہوتے تھے، چنانچہ ان وعظوں کو شیخ صاعد بن الفارس المعروف بابن اللبان قلمبند کرتے جاتے تھے، اس طرح ایک سو تراسی ۱۸۳ وعظ قلمبند کیے گئے، جن کا مجموعہ دو ضخیم جلدوں میں تیار ہوا، امام صاحب نے اس مجموعہ پر نظر ثانی کی اور اس نے "مجالس غزالیہ" کے نام سے شہرت پائی"۔[۱]

جہاں تک تصنیفی خدمات کا تعلق ہے تو اس باب میں علامہ شبلی فرماتے ہیں:

"تصنیفات کے لحاظ سے امام صاحب کی حالت نہایت حیرت انگیز ہے، انہوں نے کل ۵۴، ۵۵ برس کی عمر پائی، تقریباً بیس برس کی عمر سے تصنیف کا مشغلہ شروع ہوا، دس، گیارہ برس صحرانوردی اور بادیہ پیمائی میں گذرے، درس و تدریس کا شغل ہمیشہ قائم رہا اور کبھی کسی زمانے میں ان کے شاگردوں کی تعداد ڈیڑھ سو سے کم نہیں رہی، فقر و تصوف کے مشغلے جلا، دور دور سے جو فتاوے آتے تھے ان کا جواب لکھنا الگ، بایں ہمہ سیکڑوں کتابیں تصنیف کیں جن میں سے بعض بعض کئی کئی جلدوں میں ہیں اور گوناگوں مضامین سے پر ہیں اور جو تصنیف ہے اپنے باب میں بے نظیر ہے، سچ ہے۔ ع۔ ایں سعادت بزور بازو نیست[۲]"

ایک دوسری جگہ رقمطراز ہیں:

"علامہ نووی نے بستان میں ایک مستند شخص سے نقل کیا ہے کہ میں نے امام غزالی کی تصنیفات اور ان کی عمر کا حساب لگایا تو روزانہ اوسط چار کراسہ پڑا، کراسہ چار صفحوں کا ہوتا ہے اس حساب سے ۱۶ صفحے روزانہ ہوئے۔ اور یہ مقدار امام صاحب کے اور مشاغل کے ساتھ

---

[۱] الغزالی۔ ص ۱۷ ۔ [۲] ایضاً ص ۳۱

درحقیقت حیرت انگیز ہے۔ علامہ طبری وابن جوزی وسیوطی کی تصنیفات کا روزانہ اوسط اس سے بھی زیادہ ہے لیکن ان بزرگوں کی تصنیفات میں منقولات کا حصہ بہت ہے جس میں وہ جز کے جز دوسروں کی عبارت نقل کرتے چلے جاتے ہیں"۔ [1]

مورخین نے ان کی کتابوں کی تعداد مختلف بتائی ہے، چنانچہ کسی نے ننانوے [۹۹]، کسی نے اٹھہتر [۷۸] اور کسی نے انہتر [۶۹] بتائی ہے، بہرحال ان سب اقوال سے ان کا کثیر التصانیف ہونا ثابت ہوتا ہے۔

پادری ایس، ایم زویمر لکھتا ہے کہ:

"بعضوں نے غزالی کو سب مسلمان مصنفوں پر فوقیت دی ہے، اسمٰعیل ابن آل جعفر کا بیان ہے کہ محمد ابن عبداللہ سرور انبیاء، محمد ابن ادریس الشافعی سرور اماماں لیکن محمد ابن محمد الغزالی سرور مصنفین ہیں"۔ [2]

امام صاحب کی اسی تبحر علمی کو دیکھتے ہوئے ان کے استاذ امام الحرمین ان کو "بحر مغرق" [3] (ڈبونے والا سمندر) کہتے تھے۔

تصنیفات امام صاحب نے جن علوم و فنون کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور کارہائے نمایاں انجام دیئے ان میں فقہ، اصول فقہ، منطق، فلسفہ، کلام اور تصوف و اخلاق خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ بالا علوم و فنون میں آپ کی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں۔

فقہ فقہ میں آپ کی مشہور ترین کتاب بسیط، وسیط اور وجیز ہیں جو فقہ شافعی میں ہیں علاوہ ازیں بیان القولین للشافعی، تعلیقہ فی فروع المذہب، خلاصۃ الرسائل، اختصار المختصر، غایۃ الغور، اور مجموعہ فتاوی ہیں۔

اصول فقہ اصول فقہ میں امام صاحب کی پہلی تصنیف "منخول" ہے جو بڑے معرکہ کی کتاب ہے، آغاز شباب میں لکھی گئی ہے، امام صاحب نے اس کو کسی

---

[1] الغزالی، ص ۳۵۔ [2] پادری ایس، ایم زویمر: الغزالی۔ ص ۱۳۷۔ [3] الدکتور عبدالحلیم محمود: المنقذ من الضلال مع ابحاث فی التصوف و دراسات عن الامام الغزالی۔ ص ۸۔

امام یا مجتہد کا پابند ہوکر نہیں لکھا ہے، جو کچھ لکھا ہے انتہائی بے باکی اور آزادی سے لکھا ہے، اسی کتاب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب اپنے استاذ الجوینی کی خدمت میں پیش کیا تو انہوں نے فرمایا: "دفنتنی وانا حی فہلا صبرت حتی اموت لان کتابک غطی علی کتابی" جیسا کہ مذکور ہوا۔ علاوہ ازیں اس فن میں آپ نے تحصین المأخذ، شفاء العلیل، منتحل فی علم الجدل، المستصفی، ماخذ فی الخلافیات، مفصل الخلاف فی اصول القیاس لکھیں۔

منطق | معیار العلم، محک النظر، میزان العمل۔

فلسفہ | مقاصد الفلاسفہ، اس کو امام صاحب نے "تہافۃ الفلاسفہ" (جو علم کلام میں آپ کی مشہور تصنیف ہے) کے مقدمہ کے طور پر لکھا ہے، اس میں فلسفیوں کی آراء سے بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ علم فلسفہ کے چار موضوع ہیں، ریاضیات، الٰہیات، طبعیات اور منطقیات۔

علم کلام | المنقذ من الضلال، اس میں امام صاحب نے اپنے مذہبی رجحانات وخیالات کے تغیرات اور نبوت کی حقیقت اور دیگر گوناں گوں مسائل پر بحث کی ہے۔ ایک اعتبار سے یہ کتاب ان کی خود نوشت سوانح عمری بھی ہے جس میں انہوں نے اپنے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ علاوہ ازیں تہافۃ الفلاسفہ، الجام العوام، اقتصاد، مستظہری، فضائح الاباحیۃ، حقیقۃ الروح اور الرسالۃ القدسیۃ مشہور ہیں۔

تصوف واخلاق | تصوف واخلاق میں امام صاحب کی سب سے گرانقدر اور مفید عام کتاب "احیاء العلوم" ہے جس کو بے انتہا شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی اور واقعی اس کتاب نے نہ صرف اسلامی دنیا بلکہ ساری علمی واخلاقی دنیا کو فائدہ پہنچایا، یورپ نے خاص طور سے اس کتاب سے استفادہ کیا ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ "اگر اسلام پر لکھی ہوئی جملہ کتب تلف ہوجائیں اور صرف "احیاء العلوم" باقی رہ جائے تو یہ تمام تلف شدہ کتابوں کی جگہ لے سکتی ہے"۔

یہ چار بڑے عنوانوں پر مشتمل ہے۔ عبادات، عادات، مہلکات، منجیات۔

علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ: "امام صاحب نے فلسفہ اور مذہب دونوں کو ترتیب دے کر احیاء العلوم تصنیف کی جس نے تمام نقص پورے کردیئے اور وہ مقبولیت حاصل کی کہ ایک طرف تو

---

[1] معجم المطبوعات العربیہ۔ ص...

ائمہ اسلاف اس کو "الہامات ربانی" سمجھتے ہیں اور دوسری طرف ہنری لوئیس نے تاریخ فلسفہ میں اس کی نسبت یہ لکھا ہے کہ "اگر ڈیکارٹ (جو یورپ میں اخلاق کے فلسفۂ جدید کا بانی خیال کیا جاتا ہے) کے زمانہ میں احیاء العلوم کا ترجمہ فرنچ زبان میں ہوچکا ہوتا تو ہر شخص یہی کہتا کہ ڈیکارٹ نے احیاء العلوم کو چرالیا ہے"۔

پھر آگے لکھتے ہیں کہ "احیاء العلوم میں یہ عام خصوصیت ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل پر عجیب اثر ہوتا ہے ہر فقرہ نشتر کی طرح دل میں چبھ جاتا ہے، ہر بات جادو کی تاثیر کرتی ہے. ہر لفظ پر وجد کی کیفیت طاری ہوتی ہے، اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ یہ کتاب جس زمانہ میں لکھی گئی خود امام صاحب تاثیر کے نشہ میں سرشار تھے. بغداد میں ان کو تحقیق حق کا شوق پیدا ہوا، تمام مذاہب کو چھانا کسی سے تسلی نہیں ہوئی، آخر تصوف کی طرف رخ کیا لیکن وہ قال کی چیز نہ تھی بلکہ سرتاپا حال کا کام تھا اور اس کا پہلا زینہ اصلاح باطن اور تزکیہ نفس تھا. امام صاحب کے مشاغل اس کیفیت کے لئے بالکل سدراہ تھے، قبولیت عام، ناموری، جاہ ومنزلت، مناظرات ومجادلات اور پھر تزکیہ نفس ع شتان ما بینہما" [1]

احیاء العلوم کے علاوہ تصوف واخلاق میں امام صاحب نے جو کتابیں لکھی ہیں ان کے نام یہ ہیں: کیمیائے سعادت (فارسی)، اخلاق الابرار، جواہر القرآن، جواہر القدس فی حقیقۃ النفس، مشکوٰۃ الانوار منہاج العابدین، معراج السالکین، نصیحۃ الملوک (فارسی)، ایہا الولد، بدایۃ الہدایۃ، المقصد الاقصیٰ۔

اندازِ تحریر امام غزالی کا اندازِ تحریر انتہائی شگفتہ ہے، گوکہ وہ ادیب کی حیثیت سے مشہور نہیں ہوئے تاہم ان کی تحریروں میں ادب کی چاشنی موجود ہے، جس کا اعتراف ان کے ناقدین کو بھی ہے، ان کے ناقدین میں ڈاکٹر زکی مبارک کا نام علمی حلقے میں معروف ہے، انھوں نے اپنی کتاب "الاخلاق عند الغزالی" میں جہاں ان کے فلسفۂ اخلاق پر زبردست تنقیدیں کی ہیں وہیں ان کے اندازِ تحریر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"غزالی کی تصنیفات میں اندازِ تحریر بڑا ہی دلکش وحسین ہے، وہ جس مذہب پر نقد کرتا

---

[1] الغزالی۔ ص ۴۲، ۴۳

چاہتے ہیں پہلے اس کی پوری تشریح کرتے ہیں۔ ان کا انداز تحریر کچھ امتیازی حیثیت رکھتا ہے، وہ یہ کہ جب وہ کسی چیز کی فضیلت بیان کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اس سے متعلق تمام قرآنی آیات پیش کرتے ہیں، پھر اس باب کی تمام حدیثیں لاتے ہیں، پھر اخبار پھر آثار اور اس کے بعد قصص و حکایات بیان کرتے ہیں اس طرح بات قاری کے ذہن میں بیٹھ جاتی ہے اور اس کے دل میں متعلقہ چیز کی فضیلت جاگزیں ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی جب رذائل میں سے کسی رذیل چیز کا ذکر کرتے ہیں تو یہی طرز اپناتے ہیں۔ میں نے بہت سے ادبا کو دیکھا کہ انہوں نے اس طرز تحریر کو ناپسند کیا ہے مگر ان کی ناپسندیدگی بالکل بے بنیاد ہے جس کو سمجھنے کے لئے ایک انگریز مصنف سیمیلز المتوفی ۱۶؍اپریل ۱۹۰۴ء کی کتابوں کا مطالعہ کافی ہوگا، نیز اس سے یہ معلوم ہوگا کہ معاصرین کی نظر میں اس طرز تحریر کو کس قدر بہتر حسین اور پسندیدہ سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ سیمیلز نے مکارم اخلاق کی ترغیب کے لئے قصوں کی بھرمار کر دی ہے لیکن کسی نے اس انداز کو ناپسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا۔

پھر یہ کہ امام غزالی کی اخلاقیات پر لکھی ہوئی کتابیں اپنی جگہ نمایاں مقام رکھتی ہیں اس اعتبار سے کہ وہ ہر قاری کے لئے یکساں سودمند ہیں۔ کیونکہ مصنف نے انہیں کسی خاص جماعت کے لئے نہیں لکھا ہے بلکہ جمہور مسلمین کے لئے لکھا ہے۔ ایسے ہی امام صاحب کی بے شمار خصوصیات ہیں ایک یہ بھی ہے کہ ان کی باتیں براہِ راست دل کو چھو لیتی ہیں، دوسرے یہ کہ حسن و قبح کی تصویر کشی اس قدر انوکھے انداز میں اور فنی خوبیوں کے ساتھ کرتے ہیں کہ عقلیں حیران رہ جاتی ہیں اور دل فریفتہ ہو جاتے ہیں۔" [۱]

علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ:

"ہر فقرہ نشتر کی طرح دل میں چبھ جاتا ہے، ہر بات جادو کی تاثیر کرتی ہے، ہر لفظ پر وجد کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔" جیسا کہ مذکور ہوا۔

نمونۂ تحریر یہاں ہم نمونۂ تحریر کے طور پر ان کے کچھ اقوال زریں پیش کرتے ہیں جو حکمت و موعظت سے پُر ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے دلکش انداز تحریر

---

[۱] الاخلاق عند الغزالی۔ ص ۷۴، ۷۵۔

کا منہ بولتا ثبوت بھی ہیں۔ دیکھئے جو علم انہوں نے حاصل کیا تھا اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

طلبنا العلم لغیر اللّٰه فابی ان یکون الا للّٰه (ہم نے علم اللہ کے لئے نہیں سیکھا تھا مگر وہ اللہ ہی کے لئے ہو کر رہا)۔

سعادت وشقاوت کے مفہوم کی معجز بیانی دیکھئے۔

السعادة کلها فی ان یملك الرجل لنفسه والشقاوة کلها فی ان تملکه نفسه (کل سعادت اس میں ہے کہ آدمی اپنے نفس پر قابو پالے اور کل شقاوت اس میں ہے کہ نفس اس پر قابو پا جائے)۔

اباحیت پسندی بسا اوقات ارتکاب محظورات کا باعث بن جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو فرماتے ہیں:

النفس اذا لم تمنع بعض المباحات طمعت فی المحظورات (نفس کو جب بعض مباح چیزوں سے نہیں روکا جائے گا تو وہ ممنوع چیزوں کی طرف راغب ہو گا)

تقویٰ کی حقیقت یوں بیان کرتے ہیں:

لیس الورع فی الجبهة حتی تقطب، ولا فی الخدّ حتی یصفر، ولا فی الظهر حتی ینحنی، ولا فی الرقبة حتی تطاطی، ولا فی الذیل حتی یضم انما الورع فی القلوب، اما من تلقاه ببشر فیلقاك بعبوس یمن علیك بعلمه فلا اکثر اللّٰه فی المسلمین من مثله (تقویٰ پیشانی میں نہیں خواہ وہ شکن آلود ہو جائے اور رخسار میں نہیں خواہ وہ زرد ہو جائے اور پیٹھ میں نہیں خواہ وہ جھک جائے اور گردن میں نہیں خواہ وہ پست ہو جائے اور دامن میں نہیں خواہ وہ لمبا ہو جائے۔ بلکہ تقویٰ دلوں میں ہوتا ہے، وہ شخص جس سے تم خوش دلی سے ملو تو وہ تم سے ترش روئی سے ملے تمہارے اوپر اپنے علم کا احسان جتائے تو اللہ تعالےٰ ایسے لوگوں کو مسلمانوں میں زیادہ نہ کرے۔

ایک دوسری جگہ رقمطراز ہیں:

اَورَع الناس واتقاهم واعلمهم من لا ینظر الناس کلهم إلیه بنظر واحد بل بعضهم بعین الرضا وبعضهم بعین السخط، وعین الرضا

عن كل عيب كليلة (لوگوں میں سب سے زیادہ متقی، پرہیزگار اور دانشمند وہ ہے جس کو تمام لوگ ایک ہی نظر سے نہ دیکھتے ہوں، بلکہ کچھ لوگ پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہوں تو کچھ لوگ ناپسندیدگی کی نظر سے۔ اور پسندیدگی کی آنکھ ہر عیب سے غافل ہوتی ہے)۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:

مهما رأيت انسانا سيئ الظن بالله طالبا للعيوب فاعلم انه خبيث في الباطن والمؤمن سليم الصدر في حق كافة الخلق (جب تم کسی انسان کو اللہ سے بدگمان (لوگوں کے) عیوب ڈھونڈنے والا دیکھو تو جان لو کہ اس کا باطن خبیث ہے، اور مومن تو تمام مخلوق کیلئے صاف دل ہوتا ہے)

دنیا و آخرت کی حقیقت یوں بیان کرتے ہیں:

دنياك وآخرتك عبارتان عن حالتين من احوال القلب فالطرف الداني منهما يسمى دنيا وهي كلها قبل الموت والمتاخر يسمى آخرة وهي ما بعده، وكل مالك فيه حظ وشهوة عاجلة قبل الموت فهي الدنيا في حقك[1]۔ (تمہاری دنیا اور تمہاری آخرت نام ہے دل کے احوال میں سے دو حالتوں کا پس ان میں سے قریبی حالت کا نام دنیا ہے جو موت سے پہلے ہے اور دوسری حالت کا نام آخرت ہے جو موت کے بعد ہے اور وفات سے پہلے کی ہر وہ حالت جس میں تمہارے لئے وقتی لذت و رغبت ہو وہی تمہارے حق میں دنیا ہے)۔

وفات

امام صاحب نے زندگی کے آخری ایام وطن واپس آکر گذارے اور وہیں آپ نے ظاہری و باطنی دونوں علوم کے لئے خانقاہ اور مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور تادم وفات یہاں سے نہیں ہٹے، کہا جاتا ہے کہ ۵۰۰ھ میں دوبارہ آپ کو بغداد کے مدرسہ نظامیہ کی صدر مدرسی کے لئے پیش کش کی گئی لیکن آپ نے قبول نہیں کیا، آخر عمر میں آپ نے حدیث نبوی کی طرف پوری توجہ کی، کیونکہ ابھی تک آپ حدیث کی طرف ایسی توجہ نہیں کرسکے تھے جیسی علوم عقلیہ اور بعض علوم نقلیہ کی طرف کر چکے تھے، چنانچہ اپنی اس کمی کا احساس ہوا تو ایک مشہور محدث حافظ عمر بن ابی الحسن الرواسی کو اپنے یہاں مہمان رکھ کر ان سے صحیح بخاری و مسلم کا درس لیا اور سند حاصل کی۔ اس طرح آخری وقت حدیث کے مطالعہ اور اشتغال میں گذرا جیسا کہ ابن عساکر کہتے ہیں:

"وكانت خاتمة امره اقباله على حديث المصطفى ومجالسة اهله ومطالعة

---

[1] یہ اور اس طرح کے مزید اقوال کے لئے ملاحظہ ہو: سیرۃ الغزالی، از عبدالکریم العثمان دمشق ص ۱۷۲ تا ۱۸۰

الصحیحین البخاری ومسلم الذین ھما حجۃ الاسلام[1] (ان کی زندگی کا آخری کام یہ تھا کہ وہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پوری طرح متوجہ ہوئے اور علمار حدیث کی ہم نشینی اختیار کی اور صحیحین بخاری ومسلم کا مطالعہ شروع کیا جو اسلام میں سند کا درجہ رکھتی ہیں)۔

اس طرح زندگی کے یہ بابرکت ایام خیر وخوبی کے ساتھ گذر رہے تھے کہ وقت موعود آپہونچا۔ موت سے کچھ پہلے وصیت کی درخواست کی گئی تو فرمایا "علیك بالاخلاص" اخلاص ضروری ہے۔ بار بار یہی کہتے رہے۔ آپ کے چھوٹے بھائی احمد الغزالی کا بیان ہے کہ پیر کے دن ۱۴ جمادی الاخریٰ ۵۰۵ھ ۱۱۱۱ء کو صبح کے وقت بستر خواب سے اٹھے، وضو کرکے نماز پڑھی، پھر کفن منگوایا اور آنکھوں سے لگا کر کہا "آقا کا حکم سر آنکھوں پر" یہ کہہ کر قبلہ رو لیٹ گئے، لوگوں نے دیکھا تو روح پرواز کر چکی تھی۔[2] انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس طرح ۵۵ سال پہلے یہ آفتاب علم وعرفان جہاں سے طلوع ہوا تھا وہیں ہمیشہ ہمیش کے لئے غروب ہوگیا۔ ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

امام صاحب کا انتقال دنیائے اسلام کے لئے ایک بڑا سانحہ تھا، دور دراز ملکوں میں آپ کا سوگ منایا گیا، شعرار نے عربی، فارسی میں بے شمار مرثیے لکھے، ابو المظفر الابیوادی کا عربی مرثیہ بہت مشہور ہوا جس کے دو شعر یہ ہیں:

بکیٰ علی حجۃ الاسلام حین ثری — من کل حی عظیم القدر اشرفہ
مضیٰ فاعظم مفقود فجعت بہ — من لا نظیر لہ فی الناس یخلفہ[3]

حجت الاسلام (غزالی) جب سپرد خاک کئے گئے تو ہر قبیلے کا سردار رو پڑا وہ تو گذر گئے وہ مرنے والوں میں سب سے عظیم تھے، میں دکھی ہوں، اب ان کی جگہ لینے والا کوئی نہیں رہا۔

---

[1] سید ابوالحسن علی ندوی: تاریخ دعوت وعزیمت۔ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ ۱۹۹۲ء ج ۱ ص ۱۸۹

[2] عبد الکریم العثمان: سیرۃ الغزالی۔ دمشق۔ ص ۱۴۸

[3] انوار الحسن: امام غزالی کے تعلیمی نظریات واصلاحات۔ لاہور۔ ص ۲۰۱

استدلالات غریبہ کا
عجائب خانہ

یوں تو یہ پوری کتاب استدلالاتِ غریبہ کا عجائب خانہ ہے کسی بحث کو کہیں سے پڑھیے، کوئی بات ڈھنگ اور قرینے کی نہیں ملتی، آوارگی ذہن وفکر کی اس سے واضح مثال ملنی مشکل ہے، اگر ہر ایک بحث پر گفتگو کی جائے، تو اس کے لئے بہت فالتو وقت چاہیے، جتنا کچھ لکھ دیا گیا ہے اور یہی کتاب مصنف کے علمی وعقلی جغرافیہ کو جاننے کے لئے کافی ہے، تاہم چند بحثوں پر کلام کرنا ضروری ہے کیوں کہ مصنف نے ان پر بہت زور صرف کیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خطبہ زانی محصن کے حق میں رجم کے ثبوت کے لیے جو روایتیں کتابوں میں مذکور ہیں ان پر مصنف نے بہت اہتمام سے بحث کی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے مشہور حضرت عمرؓ کا ایک خطبہ ہے جو انھوں نے اپنے زمانۂ خلافت میں ایک اہم موقع پر ایک بڑے مجمع میں دیا تھا، یہ پورا خطبہ بخاری شریف میں باب رجم الحبلی من الزنا اذا احصنت کے تحت کتاب الحدود میں موجود ہے۔ یہ ایک طویل خطبہ ہے جس میں انھوں نے رجم کا بھی تذکرہ کیا ہے اس خطبہ کو کلاً یا جزاً امام بخاری رہ ومسلم کے علاوہ دوسرے بیشتر محدثین نے اپنی اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔ مصنف نے اس روایت کو مسلم شریف کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں،

"قال عمر بن الخطاب وهو جالس على منبر رسول الله صلى الله عليه وسلم: ان الله قد بعث محمداً صلى الله عليه وسلم بالحق وانزل عليه الكتاب، فكان مما انزل عليه آية الرجم قرأناها ووعيناها وعقلناها. فرجم رسول الله صلى الله عليه وسلم ورجمنا بعده فاخشى ان طال بالناس زمان ان يقول قائل ما نجد الرجم في كتاب الله فيضلوا بترك فريضة انزلها الله وان الرجم حق على من زنى اذا احصن من الرجال والنساء، اذا قامت البينة اوكان الحبل او الاعتراف (صحیح مسلم کتاب الحدود باب رجم الثیب فی الزنا) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک روز فرمایا جب کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے منبر پر جلوہ افروز تھے اللہ نے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو حق دے کر بھیجا اور آپ پر کتاب نازل فرمائی تو آپ پر جو چیزیں نازل ہوئیں ان میں سے آیت رجم بھی تھی، ہم نے اسے پڑھا اسے محفوظ کیا اور اسے اچھی طرح سمجھا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے رجم کرایا ہے اور آپ کے بعد ہم نے بھی رجم کرایا ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ

اگر لوگوں پر ایک لمبا زمانہ گذرا، تو کہنے والے یہ نہ کہیں کہ ہم کتاب اللہ میں رجم نہیں پاتے، اس طرح وہ گمراہ ہو جائیں گے، ایک ایسے فریضہ کو چھوڑکر جسے اللہ نے نازل فرمایا ہے۔ بلاشبہ اللہ کی کتاب میں رجم حق ہے مردوں اور عورتوں میں سے، اس پر جو زنا کرے جب کہ وہ محصن ہو، اور بینہ ثابت ہو جائے یا حمل قرار پاجائے یا اقبال جرم ہو جائے“ ص۱۴۲۔

اس خطبہ پر متعدد اشکال وارد کر کے مصنف نے یہ تأثر دیا ہے کہ گویہ روایت بخاری ومسلم اور دوسری معتبر کتب احادیث میں ہے اور گو اس کے راوی سب ثقہ اور قابل اعتبار ہیں مگر پھر بھی موضوع ہے۔ یہ حضرت عمرؓ کا ارشاد ہرگز نہیں ہو سکتا، اس پر مصنف نے چھ باتیں تحریر کی ہیں۔ ہم بالترتیب سب پر کلام کرتے ہیں۔

لکھتے ہیں کہ:

پہلی بات

”پہلی بات تو یہ کہ جس آیت رجم کا اس روایت میں ذکر آتا ہے باتفاق محدثین اس سے مراد یہ آیت ہے، الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ نکالا من اللہ واللہ عزیز حکیم، روایت سے معلوم ہوتا ہے، پہلے یہ قرآن پاک کی آیت تھی، بعد میں اس کی تلاوت تو منسوخ ہوگئی البتہ اس کا حکم باقی ہے“

اس پر سبیل السلام کے کسی محشی کا قول نقل کیا ہے کہ جب رجم شریعت میں باقی ہے اور فرض ہے تو اس کی آیت منسوخ کیوں ہو جائے گی، اس کو مصنف نے نہایت زبردست اشکال قرار دیا ہے، حاصل اس کا یہ ہے کہ جس حکم شریعت کی حکمت سمجھ میں نہ آئے، وہ حکم قابلِ انکار ہے ورنہ اس کی حکمتیں تو شروح حدیث میں موجود ہیں لیکن آپ کی سمجھ کا حال معلوم ہو چکا ہے۔ خیر یہ تو مانگا ہوا اشکال ہے، خود صاحبِ نظر مصنف کا اشکال ملاحظہ فرمائیں:

”اس آیت میں الشیخ والشیخۃ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جس کے معروف معنی بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کے ہیں“ ص۱۴۳۔

یہاں تک معاملہ غنیمت ہے معروف معنی ذکر کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کوئی غیر معروف معنی بھی ہوگا، مگر پھر فوراً ہی اس بات کو یوں بدلتے ہیں:

"یہ لفظ ہمیشہ اسی معنی میں استعمال ہوتا آیا ہے اس کے علاوہ کسی اور معنی میں اس کا استعمال ثابت نہیں ہے۔"

ملاحظہ فرمایا پینترا کتنی جلد بدل گیا، پہلے یہ بات کہی کہ بوڑھا اور بوڑھی معروف معنی ہیں پھر دوسرا قدم یہ کہ ہمیشہ اسی معنی میں استعمال ہوتا آیا ہے پھر آخری اور حتمی فیصلہ کہ اس کے علاوہ کسی اور معنی میں اس کا استعمال ثابت نہیں ہے۔ یہ ہے ہمارے صاحب نظر مصنف کی ہوشیاری اور قلابازی۔

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ یہ لفظ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کے لیے استعمال ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ زانی محصن کے حق میں رجم کی بنیاد محض یہی آیت منسوخہ نہیں ہے بلکہ اس کے لیے مدار تو سنت متواترہ ہے تاہم مصنف کے اس دعویٰ کو کہ اس کے علاوہ کسی اور معنی میں استعمال ہوتا ہی نہیں، پرکھ لینا چاہیے۔

قاموس میں جہاں شیخ کا مذکورہ بالا معنی لکھا ہے وہیں یہ بھی لکھا ہے کہ والشیخ شجرة وللمرأة زوجها شیخ ایک درخت کو بھی کہتے ہیں اور عورت کے لیے اس کا شوہر بھی شیخ کہلاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کبھی شیخ دوسرے کسی معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور استاذ یا بزرگ کے معنی میں تو اس کا استعمال بہت عام ہے۔ بس مصنف کا دعویٰ انحصار غلط ہے۔

پھر لکھتے ہیں کہ:

"یہ حقیقت سامنے رکھتے ہوئے اگر اس روایت پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ بات ایک طالب حدیث کے لیے بڑی الجھن کا باعث ہوتی ہے کہ اگر اس روایت کی اصل یا اس کی اساس یہی آیت ہے تو اس روایت میں یہ بات کہاں سے آگئی کہ شادی شدہ زانی کی سزا رجم ہے، جب کہ آیت میں یہ بات موجود نہیں یہ آیت بوڑھے زانی یا بوڑھی زانیہ کا حکم تو بتاتی ہے لیکن شادی شدہ زانی

کے سلسلے میں بالکل خاموش ہے اس سے کوئی تعرض نہیں "

یہ الجھن اور یہ اعتراض قطعاً بے محل ہے کیوں کہ زانی کے احصان کی شرط کے لیے اس آیت سے استدلال نہیں کیا گیا ہے کہ الجھن ہو، احصان کا ثبوت دوسرے دلائل سے ہوتا ہے، اس آیت سے صرف اس بات پر استدلال کیا گیا ہے کہ کتاب اللہ میں رجم کا تذکرہ موجود تھا، مصنف خود سے ایک بات فرض کرتا ہے، اور اس پر الجھتا ہے ۔

دوسری بات

لکھتے ہیں کہ :

" دوسری چیز جو اس روایت میں قابل غور ہے اس کے یہ الفاظ ہیں وان الرجم فی کتاب اللہ حق علی من زنی اس عبارت میں قابلِ غور چیز یہ ہے کہ وہ زبان کے عام استعمالات کے خلاف ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ (حق) کا لفظ جب بصلہ (علی) استعمال ہوتا ہے تو وہاں حق فرض اور واجب کے معنی میں ہوتا ہے، یعنی اس کے ذریعے کسی فعل کے فرض یا واجب ہونے کا اعلان ہوتا ہے اور اس صورت میں اس فرد یا اس گروہ پر داخل ہوتا ہے، جو اس فعل کا ذمہ دار ہوتا ہے یا جس کے ذمہ یہ واجب ہوتا ہے کہ وہ اس کام کو انجام دے یا اس حکم کا نفاذ کرے " ص۱۴۲ ۔

پھر چند مثالوں سے اپنا مدعا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس کے بعد لکھتے ہیں :

" یہ چند مثالیں ہیں جو اس اسلوب کو اور اس کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں، یہ اسلوب اور اس کا یہ مفہوم سامنے رکھتے ہوئے اگر ہم متذکرہ بالا عبارت وان الرجم فی کتاب اللہ حق علی من زنی کا ترجمہ کریں تو اس طرح ہوگا، اور رجم اللہ کی شریعت میں اس کے ذمے واجب ہے جو زنا کرے، اب یہاں قابل غور چیز یہ ہے کہ کیا رجم کرنا زانی کے ذمے واجب ہوتا ہے یا امام، قاضی اور حاکم وقت کے ذمے ....

اس لحاظ سے دیکھا جائے کہ متذکرہ بالا عبارت زبان وبیان کے معیار پر پوری نہیں اترتی، اب اس کے بعد یہ باور کرنا کسی طرح ممکن نہیں رہ جاتا

کہ یہ خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رض کا جملہ ہوگا جو اپنے عہد میں زبان وبیان
کے تاجداروں میں تھے" ص۱۴۴۔

ماشاء اللہ آپ صرف قرآن وسنت ہی کے امام نہیں ہیں، زبان وبیان پر بھی مجتہدانہ قدرت رکھتے ہیں، کتنی دور کی کوڑی لائے ہیں، اور ایک ایسے نکتے کا پتہ دیا ہے جس کی خبر شاید آپ سے پہلے کسی کو نہ تھی، آپ کی شان اہل زبان سے بھی بڑھ کر ہے۔ اچھا چند مثالیں ہم آپ کو کلمہ (حق) بصلہ (علی) استعمال کی دیتے ہیں، ان کا مفہوم اپنے بنائے ہوئے نکتہ کے مطابق ہمیں سمجھادیں، یا انھیں بھی زبان وبیان کے معیار سے گرا ہوا کہہ دیں۔

حق تعالےٰ کا ارشاد ہے: ولکن حقت کلمۃ العذاب علی الکفرین (سورہ زمر ایت نمبر) اور لقد حق القول علی اکثرھم فھم لا یومنون (سورہ یٰسین ایت نمبر)، ویحق القول علی الکفرین (سورہ یٰسین ایت نمبر) وکذلك حقت کلمۃ ربك علی الذین فسقوا (سورہ یونس ایت نمبر) ، وکذلك حقت کلمۃ ربك علی الذین کفروا (سورہ مومن ایت نمبر)۔

ان سب آیات میں کلمہ حق بصلہ علیٰ آیا ہے، تو کیا آپ فرمائیں کہ کلمۂ عذاب کے نافذ کرنے کے ذمہ دار کفار ہیں وغیرہ۔ آخر آپ کا بتایا ہوا نکتہ ان آیات پر کیسے منطبق ہوگا اور اگر نہیں ہوگا، تو کیا آپ کی ہمت ہے کہ اسے بھی معیار سے گرا ہوا کلام قرار دے دیں، کچھ تو قرآن پڑھا ہوتا صاحب نظر مصنف نے۔

تیسری بات "تیسری چیز جو اس روایت کے تعلق سے قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ اس میں استقرار حمل کو بھی ان اسباب میں شمار کیا گیا ہے جن کی بنا پر رجم واجب ہوجاتا ہے جب کہ امام ابوحنیفہ رہ، امام شافعی رہ اور جمہور علماء نے اس سے انکار کیا ہے ص۱۴۶ ...... یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان علماء کرام اور ائمۂ عظام کا ظہور حمل کے باب میں اس روایت سے ہٹ کر ایک دوسرا موقف اختیار کرنا اس بات کی غمازی نہیں کرتا کہ وہ کم ازکم روایت کے اس جزء کو غیر محفوظ سمجھتے تھے اور اگر روایت کا یہ جزء غیر محفوظ ہے تو کیا ضمانت

ہے اس بات کی کہ روایت کے بقیہ اجزاء بالکل محفوظ ہیں" ص۱۴۵!

یہاں مصنف نے حدیث کی صحت وسقم کے لیے ایک ایسا قاعدہ وضع کیا ہے جس کا پتہ اب تک کسی محدث اور عالم کو نہیں تھا، ہمارا شیر ہر فن میں مجتہد ہے آپ نے کبھی نہ سنا ہوگا کہ امام ابوحنیفہؒ نے یا فلاں یا فلاں عالم نے فلاں روایت کے اتنے جزکو نہیں اختیار کیا جب کہ اس کے سب رواۃ ثقہ ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کے نزدیک وہ خبر غیر محفوظ ہے۔ اور پھر اس کی غیر محفوظیت کے باعث پوری روایت ہی مشکوک ہے، بالکل جدید علم ہے تازہ قاعدہ! اہل علم کی ضیافت کا سامان! اگر اس اصول کو بروئے کار لایا جائے، تو نقد رجال کا قصہ ہی تہ کرکے رکھ دینا چاہیئے، پھر اسماء الرجال کا ایک بڑا حصہ سرے سے ناقابل اعتنا ہو جائے گا۔

چوتھی بات

"چوتھی چیز جو اس روایت کے تعلق سے قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن پاک میں ابتداءً رجم کی آیت موجود تھی، بعد میں اس آیت کے الفاظ تو منسوخ ہو گئے لیکن اس کا حکم باقی رہا اس طرح گویا اس روایت کے بموجب رجم کا حکم نص قرآن سے ثابت ہے اس کے بالمقابل حضرت علی رضی اللہ عنہ کا وہ مشہور قول ہے جو انھوں نے شراحہ ہمدانیہ کا واقعہ پیش آنے پر فرمایا تھا کہ جلدتہا بکتاب اللّٰہ ورجمتہا بسنۃ رسول اللّٰہ اس سے صاف ظاہر ہے کہ رجم کا حکم قرآن پاک میں موجود نہیں ہے وہ سرتاسر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ماخوذ ہے" ص۱۴۵۔

اس پر عرض ہے کہ اس بات کے لیے حضرت علی رضؓ کے قول سے استدلال کی کیا ضرورت ہے یہ تو واقعہ ہے کہ پورے قرآن میں رجم کا حکم کہیں مذکور نہیں ہے، یہ تو ہر پڑھنے والا جانتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فرمان ہی سے تو یہ بات معلوم ہوتی، کہ کتاب اللہ میں آیت رجم موجود تھی، گویا اس آیت رجم کا ثبوت اسی روایت سے ہے پھر اگر حضرت علی رضؓ اس کے سلسلے میں قرآن کا حوالہ نہ دیں تو کیا اس سے وہ روایت غیر معتبر ہو جائے گی، انھوں نے بجا فرمایا کہ میں نے سنت رسول اللہ سے اسے رجم کیا ہے کیوں کہ کتاب اللہ میں یہ آیت موجود ہی نہیں ہے، پھر

اس کا حوالہ کیوں کر دیتے، یہ تو آپ کا کمال ہے کہ رجم کا حکم باوجودیکہ کتاب اللہ میں موجود نہیں ہے لیکن بڑے طمطراق سے دعویٰ کرتے ہیں کہ الرجم حقیقۃ جاء بہا الکتاب، اپنے استنباط کو قرآن کی نص قطعی بنا دینے کا فن آپ ہی کو آتا ہے۔

پانچویں بات پانچویں بات کو پڑھ کر ہم حیران ہو گئے کہ اسے تحریر کرنے کی کیا ضرورت تھی؛ بالکل لغو اور بے ضرورت! لہٰذا اس سے صرف نظر کرنا ہی مناسب ہے۔

چھٹی بات چھٹی بات کے لیے علامہ انور شاہ کشمیری کا حوالہ دیا ہے کہ:

"یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ رجم کا حکم یا تو قرآن ہی کا حکم ہے یا اس کا حکم نہیں ہے۔ اب اگر وہ قرآن کا ہی حکم ہے تو حضرت عمرؓ کے لیے یہ جائز نہ تھا کہ وہ اسے قرآن میں نہ لکھیں، اور اگر وہ قرآن کا حکم نہیں ہے، تو ان کے لیے یہ جائز نہ تھا کہ وہ اسے قرآن میں لکھ دیں" صفحہ ۱۵۰۔

یہ اشکال ظاہر ہے کہ روایت زیر بحث پر نہیں ہے، اس لیے اس کو اس جگہ لانا بے موقع بات ہے، ایک دوسری روایت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ منقول ہیں لولا ان یقول الناس زاد عمر فی کتاب اللہ لکتبتہا بیدی، ان کا مطلب یہ تھا کہ مجھے اس آیت کے نزول کا اور اس کے حکم کے باقی رہنے کا اس درجہ یقین ہے کہ اگر لوگوں کے یہ کہنے کا اندیشہ نہ ہوتا کہ عمرؓ نے کتاب اللہ میں اضافہ کر دیا تو میں اسے اپنے ہاتھ سے لکھ دیتا، اس پر مذکورہ اشکال وارد ہوتا ہے مگر اس کا حل آسان ہے، وہ یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تسلیم کرتے ہیں کہ اب یہ الفاظ قرآن میں نہیں ہیں، اگر لکھ دیئے جائیں گے تو لوگ سمجھیں گے کہ یہ بھی قرآن پاک کا جزء ہے، اور کچھ لوگ کہیں گے کہ عمرؓ نے اس میں اضافہ کر دیا، اس لیے انھوں نے لکھنے کا ارادہ ہی نہیں کیا۔

یہ پانچ باتیں، مصنف نے اپنی دانست میں ایسی ذکر کی ہیں جن کی روشنی میں مذکورہ خطبہ کا موضوع ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ناظرین غور کریں کہ کس بات میں کتنا دم ہے۔

دورِ جاہلیت اور دورِ اسلام

ایک تقابلی مطالعہ

قسط ۳

مولانا ابوجندل قاسمی

طبقہ واریت اسلام سے پہلے یعنی دورِ جاہلیت میں اکثر ممالک میں ذات پات کی تفریق، نسلی امتیاز اور طبقاتی تفاوت اس قدر دیکھنے میں آتا ہے جو ناقابل بیان ہے، کسی قوم کے لئے تعلیم کو خاص کر دیا گیا۔ کسی کے لئے حکومت و دولت کو اور کسی کے لئے تجارت و زراعت وغیرہ اعلیٰ قوموں کا پیٹ بھرنے کو اور کسی کے لئے ان اعلیٰ قوموں کی خدمت کو۔ غرض کہ عجیب طرح کے غیرعادلانہ قوانین تھے جن پر ان نچلی ذاتوں کے لئے عمل کرنا ضروری تھا۔

ہندوستان مثلاً ہندوستان کے قدیم قانون (جس کی ترتیب و تفصیل کا سہرا منوجی کے سر ہے جنہوں نے اس قانون کو تین سو سال قبل مسیح ہندوستان میں برہمنی تہذیب کے نقطۂ عروج کے وقت مرتب کیا تھا) منو شاستر میں ہے کہ چار ذاتیں ہیں (۱) برہمن (۲) چھتری (۳) ویش (۴) شودر۔ قانون کے اندر بالتفصیل ہر ایک کے فرائض و مقاصد بھی الگ الگ بیان کئے گئے۔ مثلاً برہمن کے لئے وید کی تعلیم خاص کی گئی ہے۔ اور دان لینا دینا وغیرہ۔ چھتری کیلئے خلقت کی حفاظت ضروری قرار دی گئی ہے وغیرہ۔ ویش کیلئے ضروری ہے کہ مویشی کی سیوا کرے۔ تجارت و زراعت کرے۔ اور بدقسمت شودر کیلئے قادرِ مطلق نے صرف ان تینوں کی خدمت فرض قرار دی ہے (منو شاستر" از ص۸ تا ص۹۱ بحوالہ "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج الخ" ص۱۴۵)

برہمن کو دوسری تمام قوموں پر اس قدر فوقیت دی گئی کہ انہیں دیوتا کے ہمسر بنا دیا گیا۔ دنیا کی کل چیزیں اس کی ملکیت قرار دی گئیں۔ جس برہمن کو وید یاد ہو گیا اس کو گناہ سے بالکل پاک قرار دیا گیا۔ اگرچہ وہ کتنا ہی بڑا گناہ کیوں نہ کرے۔

اور چھتری اگرچہ دوسری دونوں ذاتوں کی بنسبت بلند مرتبہ رکھتا ہے لیکن برہمنوں کے مقابلہ میں وہ بھی بے حیثیت ہے۔

اور رہے اچھوت شودر وہ تو کسی درجہ میں ہیں ہی نہیں۔ وہ تو کتے، بلی سے بھی زیادہ ذلیل ہیں۔ چنانچہ بقول منوجی "کتے، بلی، مینڈک، چھپکلی، الو اور شودر کے مارنے کا کفارہ برابر ہے" (تفصیل کے لئے دیکھئے "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" مصنفہ مولانا علی میاں صاحب ندوی مدظلہ ص۵۴، ۵۵)

ایران، بازنطینی و رومی

اور صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ تمام بڑی سلطنتوں کا یہی حال تھا۔ مثلاً ایران اور بازنطینی و رومی سلطنتوں میں بھی یہی ذات پات کی تمیز اور سوسائٹی کے مختلف طبقوں کے درمیان ناقابل عبور فاصلہ اور خستہ حالی و امتیازی سلوک رائج تھا۔ اور پورا معاشرہ سخت قسم کی ظالمانہ طبقہ واریت کے شکنجہ میں کسا ہوا تھا۔ (تفصیل کے لئے "دنیا کے بڑے مذہب" ملاحظہ ہو)

دونوں سلطنتوں میں عہدے بڑے خاندانوں کے لئے جو جاہ و حشم اور حکومت میں رسوخ رکھتے تھے مخصوص تھے۔ کسانوں کا تعلق زمینداروں کے ساتھ ایسا تھا جیسا کہ غلاموں کا آقا کے ساتھ۔ یہ عہدہ دار و حکام اور زمیندار عوام کے ساتھ بڑی سختی اور بے دردی کا برتاؤ کرتے، نہ ان کی جان و مال کی پرواہ تھی، نہ عزت و آبرو کا پاس۔

اسلام

اس کے برخلاف مذہب اسلام نے اپنے پیروکار اور متبعین میں بے نظیر الفت و محبت پیدا کی۔ مسلمانوں کی آسمانی کتاب (قرآن کریم) میں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں جابجا اخوت و محبت اور مساوات کا درس دیا گیا۔

چنانچہ ارشاد باری ہے:

انما المؤمنون اخوۃ — مسلمان تو سب (آپس میں) بھائی ہیں۔

ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے درمیان دین و ملت کا ایک بہت بڑا رشتہ ہے۔ کیسا ہی بڑے سے بڑا کافر اور سخت دشمن ہو جب وہ اللہ و رسول پر ایمان لایا تو ہمارا دینی و مذہبی بھائی بن گیا۔

ارشاد ربانی ہے:

فان تابوا واقاموا الصلوٰة و اٰتوا الزکوٰة فاخوانکم فی الدین۔
(سورۂ توبہ آیت ۱۱)

اگر یہ لوگ (کفر سے) توبہ کرلیں (یعنی مسلمان ہوجائیں اور (اُس اسلام کو ظاہر بھی کردیں مثلاً) نماز پڑھنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہوجاویں گے۔ (بیان القرآن۔ مختصراً)

اور دینی بھائیوں کو اللہ کے رسول ؐ نے کیا تعلیمات فرمائی مختصراً چند ملاحظہ ہوں۔ چنانچہ آپ ؐ نے منیٰ میں وہ تاریخی خطبہ دیا جو ایک دستاویز ہے۔ اسی میں آپ نے فرمایا:

(۱) فان دماءکم واموالکم واعراضکم علیکم حرام کحرمة یومکم ھذا فی بلدکم ھذا فی شھرکم ھذا۔
(بخاری ص ۲۳۴ ج ۱ مسلم ص ۳۹۷ ج ۱ وغیرہ)

بلاشبہ تمہارے خون اور تمہارے اموال اور تمہاری آبروئیں تم پر اسی طرح حرام ہیں جیساکہ تمہارے اس دن کی حرمت وعزت تمہارے اس شہر میں اور تمہارے اس مہینے میں۔

یعنی جس طرح تم آج کے اس دن کی اور اس شہر کی اور مہینے کی عزت کرتے ہو اور ان میں قتل وقتال حرام سمجھتے ہوں اسی طرح تم پر آپس میں ایک دوسرے کے اموال وخون اور آبروئیں حرام اور باعزت ہیں۔ چنانچہ علامہ عینی ؒ فرماتے ہیں:

انما شبہھا فی الحرمة بھذہ الاشیاء لانھم کانوا لا یرون استباحة تلک الاشیاء وانتہاک حرمتھا بحال۔ (حاشیہ بخاری ص ۲۳۴ ج ۱)

ان چیزوں (اموال، خون، آبروئیں) کو حرمت میں ان چیزوں (یوم النحر، مکہ معظمہ، ذوالحجہ) کے ساتھ تشبیہ دی۔ کیونکہ وہ لوگ ان چیزوں کی ہتکِ حرمت کو کسی بھی حالت میں جائز نہیں سمجھتے تھے

فتح الباری میں بھی بالتفصیل اس کو بیان کیا گیا ہے۔ (دیکھئے فتح الباری ص ۳۵ ج ۳ کراچی)

اور ارشاد فرمایا:

(۲) المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویدہ۔ (بخاری ص ۶ ج ۱ ومسلم ص ۴۸ ج ۱)

کامل اور پکا سچا مسلمان وہ ہے جسکی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔

یعنی مسلمان اس سے ہر قسم کی تکلیف مثلاً برا بھلا کہنا، کسی کو گالی دینا، مذاق اڑانے کے طریقہ پر زبان نکالنا، کسی کے مال پر بغیر حق کے قبضہ کرلینا اسی طرح دوسری تمام طرح کی

تکلیفوں سے محفوظ رہیں۔ (فتح الباری ص۴۳ ج۱ کراچی و حاشیہ ترمذی ص۸۶ ج۲)

(۳) لا یؤمن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ۔ (بخاری ص۶ ج۱ مسلم ص۵۰ ج۱)

تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک مومن کامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے (دینی) بھائی کیلئے وہی چیز پسند کرے جو کچھ وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

یہ حدیث صاف طور سے یہ بات بتاتی ہے کہ تم دینی بھائی آپس میں مساوات اور برابری اختیار کرو۔ (فتح الباری ص۷۹ ج اول کراچی)

(۴) المسلم اخو المسلم لا یخونہ ولا یکذبہ ولا یخذلہ۔ کل المسلم علی المسلم حرام عرضہ و مالہ و دمہ التقوی ھھنا بحسب امرئ من الشران یحتقر اخاہ المسلم۔ (ترمذی ص۱۵ ج۲ مسلم ص۳۱۷ ج۲)

وفی روایۃ مسلم، لا یظلمہ ولا یخذلہ ولا یحقرہ۔

ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا (دینی) بھائی ہے نہ وہ اس کے ساتھ خیانت کا معاملہ کرے، نہ اسکے ساتھ جھوٹ بولے اور نہ اسکو بے مدد چھوڑے مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حرام ہے یعنی اس کا خون، اس کا مال اور اس کی آبرو۔ تقویٰ یہاں ہے (اور آپؐ نے اپنے سینہ کی طرف اشارہ فرمایا، جیسا کہ مسلم کی روایت میں ہے) آدمی کے برا ہونے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر و تذلیل کرے۔

اور مسلم کی روایت میں ہے: "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ نہ تو اس پر ظلم کرے اور نہ اس کی ترک مدد کرے اور نہ اسکو ذلیل کرے۔"

"تقویٰ یہاں ہے"، کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو ذلیل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اس سے تقویٰ کی نفی کر رہا ہے۔ حالانکہ تقویٰ کا محل دل ہے جو آنکھوں سے پوشیدہ ہے، لہٰذا کسی سے تقویٰ کی نفی وانکار روا نہیں ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ تقویٰ کا محل دل ہے تو جس کے دل میں خوف خدا اور تقویٰ ہوگا وہ کسی مسلمان کی تذلیل نہیں کرے گا۔ اس لئے کہ متقی کسی مسلمان کو ذلیل نہیں کرتا۔ (حاشیہ ترمذی ص۱۵ ج۲ بحوالہ "مجمع البحار")۔

(۵) المسلمون کرجل واحد إن اشتکی عینه اشتکی کله وان اشتکی رأسه اشتکی کله۔
(مسلم ص۳۲۱ ج ۲)

تمام مسلمان ایک مرد کی طرح ہیں کہ اگر اس مرد کی آنکھ بیمار ہو جائے تو اس کا پورا بدن بیمار ہو جاتا ہے (ایسے ہی) اگر اس کا سر بیمار ہو جائے تو اس کا پورا بدن بیمار ہو جاتا ہے۔

یعنی اسی طرح تمام مسلمان ہیں کہ ان کا کوئی ایک فرد بھی بیمار ہو جائے یا اس کو کوئی تکلیف پہنچ جائے تو تمام مسلمانوں کی جن کو اس کی اطلاع مل جائے نیند حرام ہو جائے وہ تمام اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف محسوس کریں۔ نہ یہ کہ اپنی شقاوت و بدبختی سے اس پر خوش ہوں۔ اس موقع پر پانچ حدیثوں پر اکتفا کیا گیا ہے ورنہ ذخیرۂ احادیث میں بے شمار احادیث ہیں، جن میں مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مساوات و برابری اور حفاظتِ مال و آبرو نیز اخوت و محبت کا درس دیا گیا ہے۔

کافروں اور دشمنوں کے ساتھ حسنِ سلوک

اور صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کو غیروں کے ساتھ بھی حسنِ اخلاق اور اچھا سلوک کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ طوالت کے خوف سے صرف ایک آیتِ قرآنی اور دو حدیثوں پر اکتفاء کرتا ہوں۔ چنانچہ ارشادِ ربانی ہے۔

لا ینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم أن تبروھم وتقسطوا الیھم۔ ان اللہ یحب المقسطین۔
(ممتحنہ آیت ۸)

اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑتے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔ اللہ تعالیٰ انصاف کا برتاؤ کرنیوالوں سے محبت رکھتے ہیں۔
(حضرت تھانویؒ)

اس آیت میں صاف طور سے بتایا گیا کہ جو لوگ مسلمان نہیں ہوتے اور نہ مسلمان ہونے والوں سے ضد اور پرخاش رکھتے ہیں اور نہ دین کے معاملہ میں ان سے لڑتے جھگڑتے ہیں، نہ ان کو ستانے اور نکالنے میں ظالموں کے مددگار بنتے ہیں۔ اس قسم کے

کافروں کے ساتھ بھلائی اور خوش خلقی سے پیش آنے کو اسلام نہیں روکتا۔ جب وہ تمہارے ساتھ نرمی اور رواداری سے پیش آتے ہیں تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ تم بھی ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور دنیا کو دکھلا دو کہ اسلامی اخلاق کا معیار کس قدر بلند ہے۔

اب ارشادات نبوی ملاحظہ ہوں۔

(۱) المؤمن من امنه الناس علی دمائهم واموالهم۔ (ترمذی شریف ص ۵۸ ج ۲)

مؤمنِ کامل وہ ہے جس سے تمام لوگ اپنے خونوں اور مالوں پر مامون و بے خوف رہیں۔

یعنی تمام لوگ اس سے بے خوف رہیں کہ ان کو نہ اس کا خوف ہے کہ وہ ان کے نفس و جان پر ہاتھ ڈالے گا اور نہ اس کا ڈر کہ ان کے مال چھین چھین کر اپنے پیٹ میں بھرے گا۔

(۲) لا تكونوا إِمَّعَةً تقولون إن حسن الناس أَحْسَنَّا وان ظلموا ظَلَمْنَا ولكن وطّنوا انفسكم إن حسن الناس ان تحسنوا وإن ساؤا فلا تظلموا۔ (ترمذی شریف ص ۲۱ ج ۲)

تم دوسروں کی دیکھا دیکھی کام کرنے والے نہ بنو کہ کہنے لگو کہ اگر اور لوگ احسان کرینگے تو ہم بھی احسان کریں گے۔ اور اگر دوسرے لوگ ظلم کا رویّہ اختیار کریں گے تو ہم بھی ویسا ہی کریں گے۔ بلکہ اپنے دلوں کو اس پر پکا کرو کہ اگر لوگ احسان کریں گے تب بھی تم احسان کرو اور اگر لوگ برا سلوک کریں تب بھی تم ظلم اور برائی کا رویّہ اختیار نہ کرو۔ (بلکہ احسان ہی کرو۔)

مطلب یہ ہے کہ دنیا میں خواہ احسان اور حسن سلوک کا چلن ہو یا ظلم اور بدسلوکی کا دور دورہ ہو، اہل ایمان کو چاہیے کہ ان کا رویّہ دوسروں کے ساتھ احسان اور حسنِ سلوک ہی رہے۔ نیز یہ احسان صرف انہی لوگوں کے ساتھ نہ کیا جائے جو ہمارے ساتھ احسان کرتے ہوں، بلکہ جو لوگ ہمارے ساتھ برا سلوک کریں، ان کے ساتھ بھی ہمارا رویہ احسان اور خوش خلقی کا ہی رہے۔

قبائل اور قومیں رہے مسلمانوں کے آپسی قبائل اور قومی تفاوت تو اس کے بارے میں صراحت کے ساتھ قرآن کریم ناطق ہے۔ کہتا ہے:

یاایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ وجعلناکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللّٰہ اتقاکم۔	اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ اللہ کے نزدیک تم سب میں بڑا شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔
(حجرات آیت ۱۳)	(حضرت تھانوی)

اصل میں انسان کا بڑا یا چھوٹا ہونا، معزز و حقیر ہونا، ذات پات اور خاندان و نسب سے تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ جو شخص جس قدر نیک خصلت، مؤدب اور پرہیزگار ہو اسی قدر اللہ تعالیٰ کے ہاں معزز و مکرم ہے۔ اگرچہ کم ذات کا ہو، اور جس میں تقویٰ و پرہیزگاری نہیں اس کی اللہ کے یہاں کوئی حیثیت و عزت نہیں اگرچہ ذات کتنی ہی اعلیٰ ہو۔ بلکہ نسب و خاندان کی حقیقت تو یہ ہے کہ سارے آدمی ایک مرد اور ایک عورت یعنی آدم و حوّا کی اولاد ہیں۔

بلا شبہ کسی شریف اور معزز گھرانے میں پیدا ہو جانا ایک حق تعالیٰ کا موہوب شرف ہے جس کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ اور شکر میں سے یہ بھی ہے کہ اس موہوب شرف کو غرور و تفاخر، کمینہ اخلاق اور بری خصلتوں سے خراب نہ ہونے دے۔ بہرحال مجد و شرف اور فضیلت و عزت کا اصل معیار نسب نہیں، تقویٰ و طہارت ہے، نری ذات کسی کام کی نہیں ؎

بندۂ عشق شدی ترک نسبت کن جامی کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

تنبیہ: ایک طرف تو قرآن و حدیث کی یہ مبارک تعلیمات ہیں اور دوسری طرف ہمارا معاشرہ اور روزمرّہ کی زندگی کے حادثات و واقعات ہیں جن سے آج کا مسلمان دوچار ہے۔ اگر اسلام کی تعلیمات اور اس کے اخلاقی نظام کو دیکھا جائے تو "الیوم اکملت لکم دینکم" میں قطعاً کوئی شبہ نہیں رہ جاتا لیکن اگر موجودہ مسلمانوں پر نظر ڈالی جائے تو "اولٰئک کالانعام بل ھم اضل۔ الخ" (وہ ایسے ہیں جیسے چوپائے بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ۔ وہی لوگ غافل ہیں)۔ کا پیکر نظر آتے ہیں۔ کہ اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات سے اپنی تمام قوتوں دل و دماغ، آنکھ، کان، ناک وغیرہ کو موڑ کر محض دنیوی لذائذ اور مادّی خواہشات

کی پیروی میں لگے ہوئے ہیں۔

حاصل کلام خلاصہ کلام یہ کہ اس چند روزہ فانی اور دنیائے دوں میں ہم لوگوں کیلئے ضروری ہے کہ ایک بار پھر معیاری اخلاق اور آپس میں اخوت و محبت اور صحابہؓ کا سا تعلق پیدا کر کے پوری دنیا کو دکھا دیں کہ اسلام کی تعلیمات اور اصحاب رسولؐ کے واقعات بالکل بلاشک وشبہ صحیح ہیں۔ اس لئے کہ "لَنْ يُصْلِحَ آخرَ هذه الامة الا بما صَلَحَ به اوّلها" اس امت کے آخری لوگوں کی اصلاح و درستگی اسی چیز سے ممکن ہے جس سے پہلے لوگوں کی اصلاح ہوئی ہے۔ لہٰذا ہم لوگ اگر صرف "پدرم سلطان بود" کی طرح صحابہ کرام کے اعمال واخلاق بیان کریں اور ڈینگیں مارتے رہیں تو اس وقت تک کچھ حاصل نہیں جب تک اپنے کو اسی سانچہ میں نہ ڈھال لیں۔ یہ نعرہ تو آج تک نہ کسی کے کام آیا اور نہ کبھی آئے گا۔

خلاف پیمبر کسے رہ گزید — کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی — کیں رہ کہ تو میروی بترکستان است (سعدیؒ)

اللہ تعالیٰ ہم تمام مؤمنین کے درمیان بے مثال الفت واخوت، تعلق ومحبت اور ایمانی صفات پیدا فرمائے۔ تعلیمات اسلام پر حتی الوسع عمل کرنے کی توفیق بخشے۔

آمین یارب العالمین

(جاری)

دیدار سرور عالم ﷺ

شیخ عبدالحق محدث دہلوی

مواہب لدنیہ میں مذکور ہے رسول اکرم ﷺ کی خصوصیت ہے کہ جس نے خواب میں آپ ﷺ کا دیدار کیا تو اس نے حقیقتاً آپ ﷺ ہی کا جمال جہاں آرا دیکھا کیونکہ شیطان آپ کی شکل اختیار نہیں کر سکتا۔

صحیح مسلم میں حضرت قتادہ کی زبانی مرقوم ہے "رسول اکرم ﷺ نے فرمایا جس نے خواب میں مجھے دیکھا تو اس نے یقیناً میرا ہی دیدار کیا" نیز حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی زبانی یہ حدیث لکھی ہے۔ "جس نے خواب میں مجھے دیکھا تو اس نے یقیناً میرا دیدار کیا کیونکہ میری شباہت اختیار کرنا شیطان کے بس سے باہر ہے۔

بخاری میں ابوسعیدؓ کی زبانی لکھا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شیطان، مجھ جیسا نہیں ہو سکتا۔ یعنی میری شباہت اختیار نہیں کر سکتا۔ نیز ابو قتادہ کی زبانی تحریر ہے "وہ میری صورت میں دکھائی نہیں دے سکتا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ شیطان میں اتنی قوت نہیں ہے کہ وہ میری شباہت اختیار کر سکے" اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ شیطان کو مختلف صورتیں بدل لینے کی طاقت دی ہے وہ جو صورت چاہے بدل لیتا ہے مگر اس میں رسول اکرم ﷺ کی صورت و شبیہ اختیار کرنے کی طاقت نہیں ہے

بعض کہتے ہیں جمال جہاں آرا کے دیدار کا اقتضاء یہ ہے کہ جب کوئی شخص خواب میں سرکار ابد قرار ﷺ کا دیدار کرے تو اس کو آپ ﷺ کی وہ صورت نظر آنا چاہیئے جو حالت صحت میں تھی۔

بعض تنگ نظر کہتے ہیں دیدار کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ آپ ﷺ کی وہ صورت دیکھے جس میں آپ ﷺ نے وصال فرمایا اور اس دیدار میں آپ ﷺ کے موئے مبارک کا شمار بھی معتبر ہے جن میں وصال کے وقت تک بیس ۲۰ موئے مبارک سفید ہو گئے تھے۔ یعنی زمانہ علالت میں جو صورت آپ ﷺ کی تھی اس کا دیدار خواب میں ہو سکتا ہے۔

حماد بن زید کا بیان ہے" محمد ابن سیرین سے جب کوئی شخص دیدار سرکار ابد قرار کو بیان کرتا تو وہ کہتے تم نے جو صورت دیکھی ہے اس کی کیفیت بیان کرو۔ دیدار ﷺ کا اقراری اگر وہ صورت بیان

کرتا جس سے محمد ابن سیرین ناواقف ہوتے تو جواب دیتے تم نے ہرگز ہرگز رسول اکرمؐ کا دیدار نہیں کیا (اس روایت کی اسناد صحیح ہیں)۔

حاکم نے عاصم بن کلیب کے حوالہ سے ان کے والد کی زبانی یہ روایت لکھی ہے کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ سے کہا۔ میں نے رسول اللہؐ کا خواب میں دیدار کیا ہے انہوں نے کہا کیفیت دیدار بیان کرو چنانچہ میں نے رسول اکرمؐ کی صورت کو حضرت حسنؓ ابن علیؓ کی صورت کے مشابہ بتایا جس پر حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا تم نے یقیناً جمال سرور عالمؐ کا دیدار کیا۔ اگرچہ اس روایت کی اسناد جیّد ہیں لیکن اس روایت کے معارض ہے جو ابن عاصم نے ایک دوسری سند کے ساتھ ابوہریرہؓ کی زبانی یوں بیان کی ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے جس نے خواب میں میرا دیدار کیا تو اس نے یقیناً میرا ہی دیدار کیا کیونکہ میں ہر صورت میں نظر آتا ہوں۔ اس روایت کے راویوں میں ابن تومہ بھی ہے جو ضعیف راوی اس لئے ہے کہ اس کے ہوش و حواس باقی نہیں رہے تھے۔ اور مندرجہ بالا روایت اس کی زبانی اس زمانہ کی ہے جبکہ وہ ہوش و حواس سے ہاتھ دھو چکا تھا۔ باقی اللہ تعالیٰ ہی سب سے زیادہ جانتا ہے۔

قاضی ابوبکر ابن عربی نے لکھا ہے سرور عالمؐ کے معلومہ صفات کے ساتھ آپؐ کا دیدار ہونا دراصل ادراک حقیقی ہے اور غیر معلومہ صفات کے ساتھ جمال جہاں آرا کا دیدار کرنا ادراک مثالی ہے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ انبیاء کے جسم کو زمین متغیر نہیں کرتی۔ اس لئے سرکار ابد قرار کی ذات عالی وقار کا دیدار، حقیقتاً آپؐ کا دیدار ہے اور آپؐ کی صفات کا علم و نظر آنا یہ مثالی ادراک یعنی مثال نظر آتا ہے

قاضی عیاض نے لکھا ہے رسول اکرمؐ نے جو فرمایا ہے کہ "جس نے خواب میں مجھے دیکھا اس نے یقیناً میرا دیدار کیا" اس کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہو سکتا کہ جس نے آپؐ کو اس معلومہ صورت میں دیکھا جس میں آپؐ حیات طیبہ کی صورت میں جلوہ گر تھے تو خواب کا ایسا دیدار حق ہو اور جس نے آپؐ کو کسی دوسری صورت میں دیکھا تو اس دیدار کی تاویل کی جاوے۔ خلاصہ یہ کہ جس نے آپؐ کو خواب کی حالت میں دیکھا اس نے یقیناً سرکار ابد قرارؐ کا دیدار کیا۔

امام نوویؒ نے بھی یہی لکھا ہے کہ جو کوئی آپؐ کو معلومہ صورت میں یا انجانی شکل میں دیکھے تو اس نے حقیقتاً دیدار کیا۔

(بقیہ صـــ۱۹ـــ پر)

دارالعلوم کی نئی جامع مسجد

اللہ تعالیٰ کا بیحد وحساب شکر ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی نئی جامع مسجد پروگرام کے مطابق تعمیری مراحل طے کرتے ہوئے پایۂ تکمیل کے قریب پہونچ رہی ہے اور اب اس کے اندرونی حصوں کو، دیواروں اور فرش کو سنگ مرمر سے مزید پختہ اور مزین کیا جارہا ہے۔ یہ کام چونکہ اہم بھی ہے اور بڑا بھی اس پر رقم بھی کثیر خرچ ہوگی۔ محبین ومخلصین کی رائے ہوئی کہ آئے دن رنگ وروغن کرانے کے خرچ سے بچنے کیلئے بہتر یہ ہے کہ ایک ہی مرتبہ اچھی رقم لگادی جائے، اسی احساس کے پیش نظر اتنا بڑا کام سرانجام دینے کا بوجھ اٹھالیا گیا ہے، ہمیں امید ہے کہ تمام حضرات معاونین نے جس طرح پہلے خصوصی تعاون دیکر مسجد کو تکمیل کے قریب پہنچایا ہے، اسی طرح بلکہ [illegible] سرگرمی کے ساتھ دست تعاون بڑھاکر اس مرحلہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ادارہ کی [illegible] فرمائیں گے۔

یہ مسجد بین الاقوامی اہمیت کی حامل درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی جامع مسجد ہے جس میں نہ جانے کس کس دیار کے نیک لوگ آکر نماز ادا کریں گے خوش قسمت ہیں وہ مسلمان جن کی کچھ بھی رقم اس مسجد میں لگ جائے، اسلئے اپنی جانب سے اور گھر کے ہر فرد کی جانب سے اس کارِ خیر میں حصہ لیکر عنداللہ ماجور ہوں اور دوسرے احباب واقربا کو بھی اس کی ترغیب دیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمیں مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائیں اور دن دونی رات چوگنی ہمہ جہتی ترقیات سے نوازتے ہوئے تمام مصائب وآلام سے محفوظ رکھے، آمین۔

پتہ

ڈرافٹ وچیک کیلئے :- "دارالعلوم دیوبند" اکاؤنٹ نمبر 30076 اسٹیٹ بینک آف انڈیا دیوبند

منی آرڈر کے لئے :- (حضرت مولانا) مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند پن کوڈ نمبر 247554

ماہ جمادی الثانی سنہ ۱۴۱۶ھ مطابق ماہ نومبر سنہ ۱۹۹۵ء

جلد نمبر ۸۰	شمارہ نمبر ۱۱	فی شمارہ -/۶	سالانہ -/۶۰

نگراں	مدیر
حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی
مہتمم دارالعلوم دیوبند	استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم - دیوبند، سہارنپور

سالانہ بدل اشتراک:
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۲۴۰ روپئے
پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۱۰۰
بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم -/۸۰
ہندوستان سے -/۶۰

PH. NO. 22429 COD - 01336 PIN - 247554

فہرست مضامین

ختم خریداری کی اطلاع

- یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے
- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چوں کہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے، اس لیے دی، پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کردیں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔
- بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس الرحمٰن سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

۱۸۵۷ء ہندوستان کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مغلیہ سلطنت جو اپنے تمام تر امتیازات وتشخصات کے باوجود ہندوستان کی سیاسی وحدت کی ضامن تھی یہاں پہنچ کر دم توڑ دیتی ہے۔ اور اسکے ملبہ پر ایک جدید حکومت کا قصر عمارت تعمیر ہوتا ہے، اس انقلاب کو چشم ظاہر بیں نے اگرچہ ایک سیاسی کھیل سمجھا جسے سیاست واقتدار کے بازی گر زندگی کی فیلڈ میں کھیلتے رہتے ہیں۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب وروز تماشا مرے آگے

لیکن ارباب بصیرت اور سیاسی عروج وزوال کے عوامل ومحرکات پر نگاہ رکھنے والے واضح طور پر سمجھ رہے تھے اور کھلی آنکھوں دیکھ رہے تھے کہ یہ محض سیاسی بازی گری اور اقتدار کا تبادلہ نہیں ہے۔ بلکہ اسکے عوامل نہایت دوررس اور ہمہ گیر ہیں۔ یہ انقلاب زندگی کے پورے محور کو بدل کر رکھ دے گا۔ اسکی طوفانی موجیں معیشت ومعاشرت، تہذیب وتمدن، افکار ونظریات اور اعمال واخلاق کی پرانی قدروں کو ملیامیٹ کر دیں گی۔ سیاسی انقلاب کی اس ہمہ جہت شکست وریخت کو قرآن حکیم نے اپنے بلیغ اور معجزانہ اسلوب میں ملکۂ سبا بلقیس کی زبانی یوں واضح کیا ہے "قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَ جَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً" وہ بولی بادشاہ جب کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اسے خراب کر دیتے ہیں اور بنا دیتے ہیں اس کے سرداروں کو ذلیل۔ اب مسلمان ارباب فکر وعلم کے سامنے دو راستے تھے یا تو وہ حالات کے سامنے سرنگوں ہو کر اس سے سمجھوتہ کر لیتے اور اطمینان وسکون سے اسی ڈگر پر چل پڑتے جس پر اس وقت کے حالات انہیں لے جا رہے تھے۔ چنانچہ ایک مصلحت پسند مفکر قوم کو اسی بات کی تلقین کرتا ہے۔

سدا ایک ہی رخ نہیں ناؤ چلتی چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

اور یا تو "زمانہ با تو نسازد تو بازمانہ ستیز" کے جرأت مندانہ فلسفہ پر عمل کرتے ہوئے حالات کو بدلنے کے لئے اس سے برسرپیکار ہو جاتے۔

تاریخ شاہد ہے کہ ہمارے اسلاف نے اسی دوسرے راستے کا انتخاب کیا حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہ کا فتویٰ دارالحرب حالات سے نبرد آزمائی کا ایک کھلا ہوا اعلان تھا۔ "دارالحرب" تو

دیکھنے میں ایک چھوٹا سا فقرہ ہے لیکن جو لوگ اسکی اصطلاحی حقیقت اور ہندوستان کی دینی، علمی اور سیاسی بساط خاندان ولی اللّٰہی کے اثرات سے واقفیت رکھتے ہیں وہ اس کی اہمیت اور وسعت کو خوب سمجھتے ہیں۔ حضرت سید احمد شہید بریلوی قدس سرہٗ کی تحریک کی بنیاد درحقیقت حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا یہی فتویٰ تھا۔ سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور ان کے دونوں اصحاب حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور قطب ارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اسرارہم کو اسی فتویٰ نے مجبور کیا تھا کہ وہ تلوار لے کر شاملی کے میدان میں نکل پڑیں۔ یہی وہ فتویٰ ہے جس کے مقتضیات کو بروئے کار لانے کے لئے دیوبند میں ایک مرکز قائم کیا گیا۔ جسے آج دنیا "دارالعلوم دیوبند" کے نام سے جانتی پہچانتی ہے۔ یہی فتویٰ ہے جو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ کو آمادہ کرتا ہے کہ وہ ریشمی رومال کی تحریک مرتب فرمائیں اور اسے موثر بنانے کے لئے ضعف پیری اور کثرت امراض کے باوجود طول طویل اسفار کی مشقتیں برداشت کریں اور پھر مالٹا میں اسیری کی زندگی گذاریں۔ یہی وہ فتویٰ ہے جو حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ کو بے چین کرتا ہے کہ وہ مدرسہ وخانقاہ کے گوشۂ عافیت سے نکل کر خارزار سیاست کی بادیہ پیمائی کریں اور قید وبند وغیرہ کے دل فگار مصائب وآلام سے ہنستے ہوئے گزر جائیں۔

مقام فیض کوئی راہ میں جنچا ہی نہیں جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

برٹش حکومت جو ملک عزیز پر تسلط قائم کر لینے کے بعد یہ خواب دیکھنے لگی تھی کہ یہاں کے باشندوں کے مذہب ومسلک کو تبدیل کر کے سب کو اپنے مزاج ومذاق کے مطابق بنالے چنانچہ لارڈ میکالے نے ۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو تعلیمی کمیٹی کی صدارت کرتے ہوئے جو رپورٹ پیش کی تھی اس پر وہ صاف طور پر لکھتا ہے۔

ہمیں ایک ایسی جماعت چاہئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہئے جو خون ورنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے الفاظ اور سمجھ (فکر) کے اعتبار سے انگریز ہو۔ (علماء حق۔ ج ۱ ص ۳۹)

زمانہ گواہ ہے کہ حضرات اکابر رحمہم اللہ نے اپنی پامردی، استقامت، جوش عمل اور جہد مسلسل

سے نہ صرف یہ کہ اس ظالم حکومت کے خواب کو شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دیا بلکہ ایک دن وہ بھی آیا کہ اپنی تمام تر قوت وشوکت کے باوجود اس جابر ومتکبر قوم کو بے نیل مرام یہاں سے جانا پڑ گیا۔ اور اس طرح سے ایسے عظیم فتنہ سے جس میں ملت اسلامیہ گھر گئی تھی اور قوی خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ اس سیلابِ بلاخیز میں وہ اپنے امتیازات وتشخصات کو محفوظ نہ رکھ سکے گی نجات ملی (شکر اللہ سعیہم وجزاہم عنی وعن سائر المسلمین جزاءً حسنًا)۔

آج کل کے حالات بتا رہے ہیں کہ اسلام مخالف طاقتیں ایک بار پھر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف محاذ آرائی کے درپے ہیں۔

آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے ۔۔۔ کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

اسلام دشمن طاقتوں کو ملک عزیز میں مسلمانوں کا وجود کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے اور اس کانٹے کو نکالنے کے لئے وہ پوری قوت سے میدان میں آگئی ہیں۔ مسلمانوں کو اقتصادی، سیاسی، علمی اور دینی اعتبار سے بے جان کرکے انہیں ہضم کرنے کی فکر میں ہیں اسی لئے مسلمانوں کے اقتصادی مرکز کو تاک تاک کر نشانہ بنایا جارہا ہے اور دیکھتے دیکھتے لاکھوں اور کروڑوں کی املاک کو خاکستر کے ڈھیر میں بدل دیا جاتا ہے اور یہ عمل ایسے مرتب اور منظم طریقے پر انجام دیا جاتا ہے کہ ایک جگہ کے مسلمان ابھی سنبھلنے نہیں پاتے کہ دوسری جگہ خاک وخون کا کھیل شروع ہوجاتا ہے۔ جو کچھ ہوا ہے وہ کھلا ہوا ثبوت ہے کہ یہ سب ایک مرتب اسکیم اور طے شدہ منصوبے کے تحت ہو رہا ہے۔ بابری مسجد کی شہادت کا المیہ ملت کے قلب میں ناسور بن چکا ہے۔ اور اب مزید متھرا اور بنارس کی مشہور اور قدیم مساجد پر بھی نگاہیں اٹھنے لگی ہیں۔ اور باقاعدہ تنظیم کے تحت یہ کوشش کی جارہی ہے کہ ان مسجدوں کی تاریخی، دینی ومذہبی حیثیت کو ختم کرکے انہیں اپنے قبضہ میں لے لیا جائے مسلم اوقاف کا جو حشر ہو رہا ہے وہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ مسلم پرسنل لا خطرے کی زد سے محفوظ نہیں ہے تعلیمی اور سیاسی اداروں سے مسلمانوں کو جس طرح بے دخل رکھا جارہا ہے وہ سب پر عیاں ہے یہ تمام کارروائیاں ایک عظیم طوفان کا پتہ دے رہی ہیں۔

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو ۔۔۔ تمہارا تذکرہ تک بھی نہ ہوگا داستانوں میں

ان حالات میں ہمارے سامنے بھی وہی دو راستے ہیں ایک یہ کہ ہم حالات کے سامنے

سر تسلیم خم کریں اور ہوائے زمانہ جس سمت لے جانا چاہتی ہے بغیر کسی مزاحمت کے ہم اسی رخ پر چل پڑیں۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ اپنے دین اور اپنی تہذیب و تمدن اور اپنی جان و مال کی حفاظت اور بقاء کیلئے اپنے اکابر و اسلاف کے اسوہ کے مطابق استقامت و پامردی اور ہمت جرأت کے ساتھ ہر مخالف قوت کا مقابلہ کریں۔

بطور خاص حضرات علماء کرام کو فیصلہ کرنا ہے کہ وہ ملت کی کشتی کو کس سمت لے جائیں گے۔ کیونکہ خودرائی و خودپسندی کی عمومی فضا کے باوجود آج بھی بڑی حد تک ملت کی زمام قیادت علماء ہی کے ہاتھ میں ہے اور انہیں کے سامنے اپنے اکابر کے جہد و عمل کی مکمل تاریخ بھی ہے۔ اس لئے شدید ضرورت ہے کہ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور وقت کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے ایثار و قربانی اور استقامت و پامردی کی تاریخ کو پھر سے زندہ کریں یہی اسلاف کا راستہ ہے اور یہی اور صرف یہی حیات و نجات کا راستہ ہے۔

یہ مصرع کاش نقش ہر در و دیوار ہو جائے جسے جینا ہو مرنے کے لئے تیار ہو جائے

(بقیہ صـ۲۷ کا)

اور ماحول اس کو شکل دیتے ہیں، آپ اسے سخت سردی پہنچائیں تو وہ منجمد ہو جائے گا، پتھر کی طرح ٹھوس شکل اختیار کرلے گا. گرمی میں لے آئیں تو یہی ٹھوس شکل ہوا میں تبدیل ہو جائیگی غرضیکہ پانی سے فائدہ اٹھانا آپ کا کام ہے۔ آپ اس کو استعمال میں لائیں یا ضائع کر دیں، ہر دو امر آپ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ یہی حال بزرگوں کے ملفوظات و ارشادات کا ہے، آپ ان کو عقیدت و محبت کے ساتھ پڑھیں اور خلوص دل سے اس کا مطالعہ کریں تو یہ آپ کی زندگی کے اندر انقلاب پیدا کرنے میں کیمیا اثر ثابت ہوں گے اور اگر اس کے برخلاف بغیر عقیدت کے قصہ کہانی کی کتاب سمجھ کر آپ نے ان کا مطالعہ کیا تو نہ کوئی خاص اثر و فائدہ مرتب ہوگا اور نہ بزرگوں کے انوار و برکات حاصل ہوں گے۔

الحاصل بزرگوں کے ملفوظات و ارشادات روح کی تسلی اور قلب کی طمانینت کیلئے نسخۂ کیمیا اور اصلاح ظاہر و باطن کے لئے بہترین تریاق بے غرض مشیر اور بے لوث مفید ناصح و مرشد کے قائم مقام ہیں۔

مسلمانوں کے زوال کے اسباب

مولانا اختر امام عادل قاسمی

ایک وقت وہ تھا جب مسلمانوں کی ایجادات واختراعات نے یورپ کی آنکھیں چکاچوند کردی تھیں۔ مسلمانوں کے علوم وفنون نے ساری دنیا سے اپنا سکہ منوالیا تھا، لوگ دور دراز کا سفر کرکے اسلامی ممالک پہونچتے تھے۔ کہ دیکھیں اور سراغ لگائیں کہ وہ اسباب وعلل کیا ہیں؟ جن کی بنا پر مسلم قوم کو ہر میدان میں زبردست کامیابیاں مل رہی ہیں، اور وہ کیسے زینے ہیں؟ جن پر چڑھ کر اسلامی ممالک ترقی کے آسمان سے باتیں کررہے ہیں ــــ اس جذبے نے یورپ کی کھیپ درکھیپ کو اسلامی اندلس اور دوسرے مسلم ممالک کا راستہ دکھایا۔ یہاں تک کہ ایک وہ وقت بھی آیا کہ عرب کی روشنی نے مغرب کا راستہ صاف کیا جہالت کی تاریکیاں اور نفرت وتعصب کی رکاوٹیں دور کردیں۔ اور ایک مغربی مصنف زیگرہیڈ ہونگی نے اپنی کتاب میں عنوان قائم کیا، کہ:

"عرب کا آفتاب اب مغرب پر طلوع ہو رہا ہے"

زوال کا آغاز

پھر کیا ہوا؟ ہوا یہ کہ وہ آفتاب ہمیشہ کے لئے مغرب ہی میں قید ہوکر رہ گیا، ہمارا آفتاب جو اس کو روشنی دینے گیا تھا مغرب نے اپنی تدبیروں سے اس کو اپنے پاس ہی روک لیا۔ آج روشنی اس کے پاس پھیل رہی ہے اور ہم دور دراز سے چھن چھن کر آنے والی شعاعوں کی مدد سے مستقبل کی تاریک راہوں کو ڈھونڈ رہے ہیں۔

بارہویں صدی عیسوی سے جو مسلمانوں کے علم وفن کا زوال شروع ہوا، وہ چودہویں صدی کے وسط تک نقطۂ آخر تک پہونچ گیا جس قوم نے طب، جغرافیہ، فلکیات، ریاضیات،

الجبرا، اور طبیعیات میں سے کسی کو اپنی طبع آزمائی سے آزاد نہ چھوڑا تھا، چودھویں صدی تک آہستہ آہستہ سب چھوڑ دیا، یہاں تک کہ طبیعیات جن کی ترقی سے یورپ ایجادات کے موجودہ معیار تک پہونچ سکا ان سے دل چسپی یہ کہہ کر کم کر دی گئی کہ ان کا تعلق چونکہ ہمارے دین و مذہب سے نہیں ہے اس لئے ان کو چھوڑ دینا ہی بہتر ہے۔

علامہ ابن خلدون چودھویں صدی عیسوی ہی کے مورخ ہیں وہ اپنے دور کے حالات مسلمانوں کے اجتماعی مسائل اور علوم وفنون کے ارتقارات پر بحث کرنے کے بعد آخر میں مسلمانوں کا مشترکہ احساس طبعیات کے بارے میں نقل کرتے ہیں۔

بید ان مسائل الطبعیات لم تکن موضع اهتمام لنافی شئوون دیننا ولذلك كان علینا ان نترکها جانبًا۔ (مقدمہ ابن خلدون)

"مگر یہ کہ طبعیات کے مسائل کا تعلق ہمارے دینی امور سے نہیں ہے اس لئے ہمیں ان کو چھوڑ دینا ہی چاہئے،،

مسلمانوں نے فکری بزدلی کا یہ راستہ کیوں اختیار کیا، بظاہر اس کے دو قسم کے اسباب معلوم ہوتے ہیں۔

فکری انحطاط کے اسباب

(۱) خارجی اسباب۔ (۲) داخلی اسباب

(۱) خارجی اسباب سے مراد یہ ہیں کہ چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کی قیادت میں تاتاریوں کے مسلسل اور خطرناک حملوں نے مسلمانوں کے ہوش وحواس گم کر دیئے اور وہ اپنے بنیادی مسائل کو بھی سوچنے کے قابل نہ رہے۔ دوسری طرف صلیبی جنگوں نے مسلمانوں کو عرصہ تک پریشان رکھا، تیسری جانب بہت سے جغرافیائی انکشافات نے مغرب کو عربوں سے آگے بڑھ جانے پر آمادہ کیا۔

ان تمام اسباب نے ایک ساتھ مل کر مغرب کو آگے بڑھایا اور مسلمانوں کے اندر فکری بزدلی کا احساس پیدا کر دیا۔

(۲) اور داخلی اسباب یہ تھے۔ کہ انگریزوں کی دسیسہ کاریوں، اور سازشوں سے مسلمانوں میں فرقہ بندیاں پیدا ہوئیں، مغرب کے تمام وسائل مسلمانوں کی اندرونی طاقتوں کو کھوکھلا

کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ اور مسلمانوں میں فکری، مذہبی، اور سیاسی انتشار پیدا کرنے کی انتھک کوششیں ہو رہی تھیں۔ مگر مسلمانوں کا انٹلی جنس اس قدر غافل اور بیوقوف ہو گیا تھا۔ کہ اس کو ان اندرونی سازشوں کا کوئی علم ہی نہ تھا، یا علم رکھتے ہوئے بھی اپنے ضمیر کا سودا کر چکا تھا۔ آخر مسلمان مذہبی لحاظ سے بھی سیکڑوں فرقوں میں بٹ گئے۔ اور سیاسی اعتبار سے بھی وہ انتشار کا شکار ہو گئے جس کے نتیجے میں سلطنت عباسیہ کمزور ہو گئی، عالم اسلام ٹکڑوں میں بٹنے لگا، امت کے قائدین جن کی محنتیں سیاسی، اور فکری اتحاد پیدا کرنے میں صرف ہونی چاہئے تھیں۔ وہ ملکی اور گروہی مسائل کو حل کرنے میں لگی ہوئی تھیں، دجلہ و فرات کے کناروں پر جب صنعتی فیکٹریاں کھولنے کی ضرورت تھی تو اس وقت وہاں مناظرہ اور مشاعرہ کی محفلیں گرم تھیں۔ مثلاً ؎

ابن مریم مرگیا یا زندۂ جاوید ہے؟　　　ہیں صفاتِ ذاتِ حق حق سے جدا یا عین ذات
آنے والے سے مسیح ناصری مقصود ہے　　　یا مجدد جس میں ہوں فرزند مریم کے صفات

اس کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
امت مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات

یہ صورت حال مسلمانوں میں مدتوں باقی رہی۔ ترکی میں خلافت عثمانیہ، ایران میں خلافت صفویہ اور ہندوستان میں مغل بادشاہوں کی تاریخ الٹ کر دیکھئے کہ مسلمان فکری اور علمی لحاظ سے کس قدر محدود اور منتشر نظر آتے ہیں۔

آخر کار مسلمانوں کی فکری صلاحیتوں نے دم توڑ دیا اور مسلم قوم پوری کی پوری یورپ کی غلام بن کر رہ گئی اور شیطان کا وہ کھیل پورا ہو گیا۔ جو اس نے ان نتائج کو پیدا کرنے کے لئے شروع کیا تھا۔ ؎

تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

آج اگر ہم صرف ہندوستان کا نہیں ۔ بلکہ پورے عالم اسلام کا جائزہ لیں، تو مسلمانوں بنیادی روگ ،فکری انحطاط اور قوت عملیہ کا زوال نظر آئیگا ۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کے حقیقی اسباب سے تو خدا ہی واقف ہے ۔ لیکن ظاہری طور پر اس کے چند اسباب و عوامل نظر آتے ہیں ۔

موجودہ زوال کے چند عوامل

۱۔ قرآن پاک اور اس کی تعلیمات سے دوری قرآن نے مسلمانوں کے اندر جس حرکت علم و عمل کی بنیاد ڈالی تھی وہ آج ان سے مفقود ہے ۔

۲ ۔ مسلمانوں کی اجتماعی محنتوں کا رخ تبدیل ہو جانا ، اسلامی اداروں ، اور حکومتوں کو اپنے جو وسائل تجدیدی اور اختراعی علوم پر خرچ کرنا چاہئے تھا ۔ اور جن کی بدولت علم وفن کے نئے زاویے پیدا کئے جا سکتے تھے وہ آج عام رائج الوقت ،علوم ،وافکار کی ترویج و اشاعت پر خرچ ہو رہے ہیں جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی اختراعی فکر اور ایجاداتی صلاحیت مردہ ہو کر رہ گئی ۔

۳ ۔ اصول تعلیم و تربیت میں مغرب کا پابند ہو جانا ، مسلمان اپنی ذہین نسلوں کو انگریزی جامعات اور اداروں میں داخل کر کے انہی کے نہج پر تعلیم دلاتے ہیں ۔ اس کے بغیر ان کے نزدیک تعلیم مکمل ہی نہیں ہوتی اور نہ ان کی دماغی تربیت ہو پاتی ہے ۔ حیرت تو یہ ہے کہ خود مسلمان جو کالج اور یونیورسٹیاں قائم کرتے ہیں ان کا نصاب تعلیم بھی مغرب سے ہی مستعار ہوتا ہے جس کی بنا پر مسلمانوں کے اندر استقلالی ذہنیت اور اختراعی صلاحیت فنا ہوتی جا رہی ہے ۔

۴ ۔ مسلم اداروں بلکہ پورے عالم اسلامی سے آزادئ ضمیر کا فقدان ۔ اسلامی اداروں اور ممالک میں علمی وفکری کام کرنے والوں کے لئے جو آزادئ ضمیر ہونی چاہئے ۔ اور جس طرح کا تعاون ان کو ملنا چاہئے وہ موجود نہیں ہے ۔ بلکہ گہری اور سنجیدہ فکر رکھنے والوں کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے ۔ ضمیر کی آواز کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ کوئی شخص ان کے نزدیک آزادی کے ساتھ اپنے خیالات ظاہر نہیں کر سکتا ، علمی مراکز اور تحقیقی اداروں کے ساتھ

بے التفاتی برتی جاتی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان خود اپنوں ہی کے ہاتھوں اپنے ہی ماحول میں گھٹتے اور لٹتے جا رہے ہیں۔

آہ! ع

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

۵۔ عالم اسلام کو منتشر اور باہم برسرپیکار رکھنے کی مغربی سازش بھی ایک بڑا سبب ہے مغرب کی چال ہر دور میں یہ رہی ہے کہ مسلمان آپس میں اتحاد کے ساتھ نہ رہیں۔ ایک ملک دوسرے ملک کے ساتھ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے ساتھ، ایک خاندان دوسرے خاندان کے ساتھ ایک فرقہ دوسرے فرقہ کے ساتھ، یہاں تک کہ ہر فرد دوسرے فرد کے ساتھ برسرجنگ رہے۔ اور ان کی طاقتیں آپس میں ٹکرا کر فنا ہوتی رہیں۔ کیونکہ اہل مغرب خوب جانتے ہیں کہ جس دن مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو جائے گا وہ دن ان کے لئے منحوس ترین دن ہوگا اور تاریخ صلاح الدین ایوبی کا عہد دوہرانے لگے گی۔ اس لئے وہ مختلف عنوانات سے آپس میں جنگیں کراتے ہیں، ہر ایک کو اپنے تعاون کا یقین دلاتے ہیں جنگ کے ہتھیار فراہم کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو ہاتھ باطل کی گردن پر پڑنا چاہئے تھا اور جس تلوار سے دشمن کی شہ رگ کاٹنی چاہئے تھی۔ وہ اپنے ہی مسلم بھائیوں کی گردنیں کاٹتے اور ان ہی کی لاشیں تڑپانے میں مصروف ہیں۔ اور اس پر مغرب ان کی پیٹھ ٹھونکتا ہے تو وہ پھولے نہیں سماتے۔ فیا اسفاہ۔ ؎

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے

امت پہ تیری آکے عجب وقت پڑا ہے

۶۔ اسلحۂ جنگ اور دوسری مصنوعات کے لحاظ سے مسلمانوں کا خود کفیل نہ ہونا مسلمان استعمال کی چیزوں اور جنگ کے ہتھیاروں کے باب میں بالکلیہ یورپ کے محتاج ہیں جبکہ اسلامی ممالک میں تمام خام ذخائر موجود ہیں اور انہی ذخائر سے یورپ اپنے یہاں ہتھیار اور اسباب تیار کر رہا ہے۔ مگر مسلمان ان سے خود کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے جو دولت یہ ہتھیاروں اور مصنوعات کو خریدنے میں صرف کرتے ہیں اتنی مقدار میں وہ بہترین افراد اور

اچھی صنعتی فیکٹریاں تیار کرسکتے ہیں جن میں دنیا کی ہر طرح کی چیزیں اور ہر قسم کے معیاری اسلحۂ جنگ تیار ہو سکتے ہیں مگر مسلمان محنت کرنا نہیں چاہتے وہ راحت پسند ہو گئے ہیں جس کا نتیجہ ہے کہ وہ دوسروں کے دست نگر بن کر رہ گئے ہیں۔

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے غافل مسلمانو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

۷۔ مسلمانوں میں سچے ہمدردوں اور بہی خواہوں کی کمی آج یہ مسلمانوں کی بڑی دردناک تاریخ بنی ہوئی ہے۔ یہ مسلمان اپنوں اور غیروں کے درمیان تمیز کرنے کا شعور نہیں رکھتے وہ غیروں کو اپنا اور اپنوں کو غیر سمجھ لیتے ہیں۔ جو ان کے ارتقاء اور استقلال کی کوشش کرتے ہیں ان کو یہ اپنا باغی تصور کرتے ہیں اور جو ان کو ہر طرح سے معطل کر کے اپنا غلام بنائے رکھنا چاہتے ہیں ان کو یہ اپنا ہمدرد، بہی خواہ، نجات دہندہ اور نہ معلوم کیا کیا سمجھنے لگتے ہیں۔ آج اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ سچے مخلصوں اور ہمدردوں کی خدمات سے محروم اور غیروں کی سازشوں اور گندی پالیسیوں کے شکار ہیں۔

بتوں سے تجھکو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

۸۔ مسلمانوں کی نگاہ سے خود ان کا اپنا مقام اوجھل ہو جانا مسلمان اس سے بالکل غافل ہو گئے ہیں کہ ان کو خیر امت بنا کر کیوں بھیجا گیا تھا۔ قرآن کا یہ پیغام ان کے کانوں کے لئے اب بالکل اجنبی اور نامانوس بن چکا ہے کہ:

کنتم خیر امة اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنکر۔ (الآیہ)

تم سب سے بہتر امت ہو جس کو لوگوں کے لئے بھیجا گیا ہے تاکہ تم نیکی کا حکم دو اور برائیوں سے روکو۔ اگر مسلمان اپنے اس منصب سے واقف ہوتے اور قرآن کی اس آواز کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت ہوتی تو وہ آپس میں الجھنے کے بجائے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے پلیٹ فارم پر جمع ہو جاتے پھر خدا کی مدد ان پر نازل ہوتی، غیروں کی سازشیں ان پر کھل

جاتیں، کفر کی ظلمتوں کا سایہ ان کے آفاق سے چھٹ جاتا اور یہ غیروں کے محتاج ہونے کے بجائے بلکہ پورے عالم کے خود مختار حکمراں ہوتے مگر شیطان نے ان کے جوہری مقام ہی کو ان کی نگاہ سے اوجھل اور مرکزی صلاحیت ہی کو نکما کر دیا ہے جس سے لازماً وہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے جو آج ہمارے سامنے ہے۔ ؎

روشن اس ضو رسے اگر ظلمتِ کردار نہ ہو
خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام

شیطان کا منصوبہ۔ ؎

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

مختصر طور پر یہ وہ چند اسباب ہیں جن کی بنا پر مسلمان روز افزوں زوال کے شکار ہیں اگر ان اسباب کا ازالہ نہ کیا گیا اور ہماری قوم کے قائدین اس طرف متوجہ نہ ہوئے تو کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس قوم کا مستقبل کیا ہوگا؟ تقدیر پر ایمان اپنی جگہ مگر کوئی بھی انقلاب اچانک عدم کی گود سے برآمد نہیں ہوجاتا بلکہ اس کے لئے علم وفن اور حرکت وعمل کی ضرورت ہوتی ہے، ظاہری طور پر مسلمان اس وقت تک خود کفیل اور باعزت نہیں بن سکتے جب تک کہ وہ خود علم وعقل کے تمام شعبوں پر حاوی نہ ہوجائیں، غیروں کی غلامی چھوڑ کر خود مختار نہ بننا چاہیں اور راحت پسندی اور تعطل کا راستہ ترک کرکے محنت وجفاکشی کی راہ اختیار نہ کریں، کیونکہ ؎

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

عورت کی حیثیت اقوام قدیمہ میں یعنی مذہب اسلام سے پہلے تمام قوموں میں عورت کو ایک ادنیٰ درجہ کی مخلوق قرار دیا گیا تھا۔ اخلاقی نظریہ، قانونی حقوق اور معاشرتی برتاؤ ہر ایک حیثیت سے عورت کو گرا ہوا سمجھا جاتا تھا عصمت و عفت کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔ مثلاً:

یونان میں عزت کا مقام مرد کے لئے مخصوص تھا۔ معاشرت کے ہر پہلو میں عورت کا مرتبہ گرا ہوا تھا۔ اس کو شیطان کی بیٹی اور برائی و بدی کا اصل سمجھا جاتا تھا۔ اس کے لئے نہ تہذیب و ثقافت تھی اور نہ حقوق مدنیت۔ غرض ہر طرح سے اس کو محکوم اور حقیر و ذلیل سمجھا جاتا تھا۔

روم اہل یونان کے بعد جس قوم کو دنیا میں عروج نصیب ہوا وہ اہل روم تھے۔ مگر وہ جب تاریخ کے روشن منظر پر نمودار ہوتے ہیں تو ان کے بھی نظامِ معاشرت کا نقشہ یہ ہوتا ہے کہ مرد اپنے خاندان کا سردار ہے۔ اس کو اپنے بیوی بچوں پر پورے مالکانہ حقوق حاصل ہیں۔ بلکہ بہت سے حالات میں وہ بیوی کو قتل کر دینے کا بھی مجاز ہے۔ نہ عورت کے جانی حقوق کا تصور ہے اور نہ مالی حقوق کا۔ اس کی قسمت میں ذلت و تحقیر کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور حد یہ ہے کہ جہلاء تو درکنار علماء اور پیشوایانِ مذہب میں مدتوں یہ سوال زیر بحث رہا کہ عورت انسان بھی ہے یا نہیں؟ خدا نے اس کو روح بھی بخشی ہے یا نہیں؟

ہندوستانی سماج ہندوستانی سماج اور برہمنی زمانہ و تہذیب میں عورت کو ہمیشہ

کمزور اور بے وفا نیز حقیر و ذلیل سمجھا گیا۔ شوہر مر جاتا تو عورت گویا جیتے جی مر جاتی اور زندہ درگور ہو جاتی۔ وہ کبھی دوسری شادی نہ کر سکتی، اس کی قسمت میں طعن و تشنیع اور حقارت و ذلت کے سوا کچھ نہ تھا۔ بیوہ ہو کر شوہر کے رشتہ داروں کے لئے بالکل خادمہ بن جاتی، اکثر بیوائیں اپنے شوہروں کے ساتھ ستی ہو جاتیں۔ سسرالی رشتے ذلیل سمجھے جاتے تھے حتیٰ کہ سسرے اور سالے کے الفاظ اسی جاہلی تخیل کے تحت آج تک گالی کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں۔ بہت سی قوموں میں اسی ذلت سے بچنے کے لئے ان کو قتل کرنے کا رواج ہو چلا تھا۔ بودھ مت میں بھی عورت سے تعلق رکھنے والے کے لئے نروان اور چھٹکارے کی کوئی صورت نہ تھی۔

عرب جاہلیت اہل عرب میں بھی زمانۂ جاہلیت میں عورت کے ساتھ ظلم و بدسلوکی کا عام رواج تھا۔ اس کے حقوق پامال کئے جاتے۔ اس کا مال مرد اپنی ملکیت سمجھتا۔ ترکہ و میراث میں وہ کچھ حصہ نہ پاتی۔ شوہر کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد اس کو اجازت نہیں تھی کہ اپنی پسند سے دوسرا نکاح کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کا ممانعتی حکم نازل فرمایا (سورۂ بقرہ آیت ۲۳۲)۔ ایسے ہی دوسرے سامانوں اور حیوانات کی طرح وہ بھی وراثت میں منتقل ہوتی رہتی۔ اس سے بھی اللہ نے منع فرمایا۔ (سورہ نساء آیت ۱۹) کھانے میں بہت سی چیزیں مردوں کے لئے خاص تھیں۔ اور عورتیں ان سے محروم تھیں۔ ارشاد باری ہے:

وقالوا ما فی بُطونِ ھٰذہ الانعامِ خالصَۃٌ لِذُکُورنا و محرّمٌ علیٰ ازواجنا وان یکن مَیْتَۃً فھم فیہ شرکاءُ۔

(الانعام۔ آیت ۱۳۹)

اور کہتے ہیں: جو بچہ ان مواشی کے پیٹ میں ہے اس کو تو خاص ہمارے مرد ہی کھادیں اور وہ حرام ہے ہماری عورتوں پر۔ اور جو بچہ مُردہ ہو تو اس کے کھانے میں سب برابر ہیں۔ (شیخ الہندؒ)

دامادی ایک عیب تصور کیا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے لڑکیوں کا پیدا نہ ہونا ہی بہتر سمجھا جاتا تھا۔ قرآن کریم اس جاہلی ذہنیت کو نہایت بلیغ انداز میں بیان کرتا ہے۔ ارشاد باری ہے:

واذا بُشِّرَ اَحَدُهم بالانثیٰ ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وهو كظيم ۝ يتوارىٰ من القوم من سوٓءِ ما بُشِّرَ به اَيُمْسِكُهٗ عَلیٰ هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فى التراب الا سآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ۔ (النحل۔ آیت ۵۸۔۵۹)

اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی خبر دی جاوے تو سارے دن اس کا چہرہ بے رونق رہے اور وہ دل ہی دل میں گھٹتا رہے جس چیز کی اس کو خبر دی گئی ہے اس کی عار سے لوگوں سے چھپا چھپا پھرے۔ آیا اس کو ذلت پر لئے رہے یا اس کو مٹی میں گاڑ دے۔ خوب سن لوان کی یہ تجویز بہت ہی بری ہے۔ (حضرت تھانویؒ)

لڑکیوں سے نفرت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ باپ نہایت سنگدلی اور بے رحمی سے اس کو زمین میں زندہ گاڑ دیتا تھا۔ قرآن کریم کہتا ہے۔

واذا المَوْءٗدَةُ سئلت بأىِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ۔ (التکویر۔ آیت ۸۔۹)

اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائیگا کہ وہ کس گناہ پر قتل کی گئی تھی۔ (حضرت تھانویؒ)

فرزدق شاعرؒ کے دادا صعصعہ بن ناجیہ نے اسلام آنے تک تین سو لڑکیوں کو زندہ درگور ہونے سے بچایا تھا۔ (نفحۃ العرب ص۴۲)

اسلام لانے کے بعد بعض عربوں نے اس سلسلہ کے بڑے اندوہناک اور رقت آمیز واقعات بیان کئے ہیں ــــ ایران، چین اور مصر اور تہذیب انسانی کے دوسرے مرکزوں کا حال بھی قریب قریب ایسا ہی تھا۔ صدیوں کی مظلومی، محکومی اور عالمگیر حقارت کے برتاؤ نے خود عورت کے ذہن سے بھی عزت نفس کا احساس مٹا دیا تھا۔ وہ خود بھی اس امر کو بھول گئی تھی کہ دنیا میں وہ کوئی حق لے کر پیدا ہوئی ہے یا اس کے لئے بھی عزت کا کوئی مقام ہے۔ مرد اس پر ظلم وستم کرنا اپنا حق سمجھتا تھا اور وہ اس کے ظلم کو سہنا اپنا فرض جانتی تھی۔ غلامانہ ذہنیت اس میں اس حد تک پیدا کر دی گئی تھی کہ وہ فخر کے ساتھ اپنے آپ کو شوہر کی "داسی" کہتی تھی۔ "پتی ورتا" اس کا دھرم تھا یعنی شوہر اس کا معبود اور دیوتا ہے۔ کہیں اس کے زخموں کا درماں اور علاج نہ تھا۔

اس ماحول میں جس نے نہ صرف قانونی اور عملی حیثیت سے بلکہ ذہنی حیثیت سے بھی ایک عظیم انقلاب برپا کیا

وہ اسلام ہے

اسلام ہی نے عورتوں اور مردوں دونوں کی ذہنیتوں کو بدلا ہے۔ اسلام ہی نے عورت کی عزت اور اس کے حق کا تخیل انسان کے دماغ میں پیدا کیا ہے۔

آج حقوق نسواں اور تعلیم نسواں اور بیداری اناث کے جو الفاظ آپ سن رہے ہیں یہ سب اسی انقلاب انگیز صدا کی بازگشت ہیں جو رحمۃ للعالمین فخر دوعالم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بلند ہوئی تھی اور جس نے افکار انسانی کا رخ ہمیشہ کے لئے بدل دیا۔

قرآن و حدیث میں عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم

وہ اسلام ہی ہے جس نے مرد کو خبردار کیا اور عورت میں بھی یہ احساس پیدا کیا کہ جیسے حقوق مرد کے عورت پر ہیں ویسے ہی حقوق عورت کے مرد پر ہیں۔ ارشاد ہے۔

۱؎ وَلَهُنَّ مثل الذی علیهن. (البقرہ ۲۲۸؎)

اور عورتوں کے بھی حقوق ہیں جو کہ مثل ان ہی حقوق کے ہیں جو ان عورتوں پر ہیں۔

(حضرت تھانوی رح)

اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے مردوں کو حکم کیا کہ عورتوں کو ذلت و حقارت کی نظر سے نہ دیکھو۔ ظلم و بدسلوکی اور ناانصافی نہ کرو۔ ان کے حقوق کا خیال کرو۔ اس کی عزت و آبرو سے کھلواڑ مت کرو۔ بلکہ:

۲؎ وعاشروهن بالمعروف فان کرهتموهن فعسیٰ ان تکرهوا شیئا و یجعل الله فیه خیرًا کثیرًا۔ (النساء آیت ۱۹؎)

اور عورتوں کے ساتھ خوبی کے ساتھ گذران کیا کرو۔ اور اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ممکن ہے کہ تم ایک شی کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ اس کے اندر کوئی بڑی منفعت رکھ دے۔ (مثلاً وہ تمہاری خدمت گذار اور آرام رساں اور ہمدرد ہو یہ تو دنیا کی منفعت ہے، یا اس سے کوئی اولاد پیدا ہو کر بچپن میں مرجاوے یا زندہ رہے اور صالح ہو جو ذخیرۂ آخرت ہو جاوے،

یا اقل درجہ ناپسند چیز پر صبر کرنیکی فضیلت تو ضرور ہی ملے گی) (حضرت تھانویؒ)

اسلام ہی نے عورت کو بتایا کہ ایمان اور عمل صالح کے ساتھ روحانی ترقی کے جو درجات مرد کو مل سکتے ہیں وہ عورت کو بھی مل سکتے ہیں۔ مرد اگر ابراہیم بن ادہمؒ بن سکتا ہے تو عورت کو بھی رابعہ بصریہ بننے سے کوئی شئی روک نہیں سکتی ہے۔ اس طرح دونوں کو ایک ہی صف میں اسلام نے کھڑا کیا۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

ع۳ للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنسآء نصیب مما اکتسبن ط (النساء آیت ع۳۲)

مردوں کے لئے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے اور عورتوں کیلئے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے۔ (حضرت تھانویؒ)

ماں کے ساتھ حسن سلوک

اسلام ہی نے بیٹے کو بتایا کہ خدا اور رسول کے بعد سب سے زیادہ عزت اور قدر و منزلت اور حسن سلوک کی مستحق تیری ماں ہے۔

ع۱ عن ابی هريرة رضی الله عنه قال: جاء رجل الی رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال: یارسول الله من احق الناس بحسن صحابتی؟ قال: امّك، قال: ثمّ من؟ - قال: امّك. قال: ثم من؟ - قال: امّك - قال: ثم من؟ - قال: ابوك - (بخاری ص۸۸۳ ج۲ ومسلم ص۳۱۲ ج۲)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اور عرض کیا یارسول اللہ میرے اچھے برتاؤ کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ - آپؐ نے فرمایا: تمہاری ماں، کہا پھر کون؟۔ فرمایا: تمہاری ماں، کہا پھر کون؟۔ فرمایا: تمہاری ماں۔ کہا پھر کون؟۔ آپ نے (چوتھی دفعہ) ارشاد فرمایا: تمہارے باپ۔

اسلام نے ماں باپ کو جنت کا بہترین دروازہ قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے۔

ع۲ الوالد اوسط ابواب الجنة۔ (ترمذی ص۱۲ ج۲)

ماں باپ جنت کے دروازوں میں سے بہترین دروازہ ہے۔

ایک حدیث میں ارشاد ہے:

ان اللّٰہ حرم علیکم عقوق الامّھات۔ بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی حرام کر دی ہے۔
(بخاری ص۲ ج۱ ومسلم ص۵ ج۲)

بیٹی کے ساتھ حسن سلوک

اسلام ہی نے باپ کو بتایا کہ بیٹی کا وجود تیرے لئے ننگ وعار اور حقارت کی بات نہیں ہے بلکہ اس کی پرورش، اس کی تعلیم وتربیت اور اس کی حق رسانی تجھ کو جنت کا مستحق بناتی ہے۔ ارشاد ہے:

ع۴ من عال جاریتین حتی تبلغا جاء یوم القیٰمۃ انا وھو کھا تین وضمّ اصابعہ۔ (مسلم ص۳۳ ج۲)
جس نے دو لڑکیوں کی پرورش کی یہانتک کہ وہ بلوغ کو پہنچ گئیں تو قیامت کے روز میں اور وہ ان دو انگلیوں کی طرح آئیں گے۔ اور آپؐ نے اپنی انگلیوں کو ملا دیا۔

ایک حدیث میں ارشاد ہے:

ع۵ من ابتلی من ھذہ البنات بشیٔ فاحسن الیھن کنّ لہ سترًا من النار۔ (بخاری ص۱۹۰ ج۱ ومسلم ص۳۳ ج۲)
جو شخص ان لڑکیوں میں سے کسی کے ذریعہ آزمایا جائے اور وہ ان سے اچھا سلوک کرے تو وہ لڑکیاں اس کے لئے آگ سے پردہ بن جائیں گی۔

ایک اور حدیث میں ارشاد ہے:

ع۶ من کانت لہ ثلاث بنات أو ثلاث اخوات أو ابنتان أو اختان فاحسن صحبتھن واتقی اللہ فیھن فلہ الجنۃ۔ (ترمذی ص۱۳ ج۲)
جس شخص کی تین بیٹیاں یا تین بہنیں ہوں یا دو بیٹیاں یا دو بہنیں ہوں پھر وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے اور ان کے حقوق کی ادائیگی کے سلسلہ میں اللہ سے ڈرے تو اس کیلئے جنت ہے۔

بیوی کے ساتھ حسن معاشرت

اسلام ہی نے مرد کو باخبر کیا کہ نیک بیوی تیرے لئے دنیا میں سب سے بڑی نعمت ہے۔

ع۷ الدنیا متاع وخیر متاعھا
دنیا ایک سامان ہے۔ اور دنیا کا سب سے

المرأة الصالحة۔ (مسلم ص۴۷۵ ج۱) بہترین سامان نیک عورت ہے۔

ایک حدیث میں ارشاد ہے:

ع۸۔ خیارکم خیارکم لنسائہم۔ (ترمذی) تم میں اچھے اور خیر کے زیادہ حامل وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے حق میں زیادہ اچھے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ آدمی کی اچھائی اور بھلائی کا خاص معیار اور نشانی یہ ہے کہ اس کا برتاؤ اپنی بیوی کے حق میں اچھا ہو۔

ایک حدیث میں ارشاد ہے۔

ع۹۔ لا یَفْرَكْ مؤمن مؤمنة إن كره منها خُلُقًا رضي منها آخر. (مسلم ص۴۷۵ ج۱) کسی مؤمن (شوہر) کو مؤمنہ (بیوی) سے نفرت نہیں کرنی چاہئے۔ اگر اس کی کوئی عادت ناپسندیدہ ہوگی تو دوسری کوئی عادت پسندیدہ بھی ہوگی۔

مطلب یہ ہے کہ اگر شوہر کو اپنی بیوی کی عادات واطوار میں سے کوئی بات مرضی کے خلاف اور ناپسندیدہ معلوم ہو تو اس کی وجہ سے اس سے نفرت اور بے تعلقی کا رویہ اختیار نہ کرے۔ اور نہ طلاق وغیرہ کے بارے میں سوچے، بلکہ اس میں جو خوبیاں ہوں ان پر نگاہ کرے اور ان کی قدر وقیمت سمجھے۔ یہ بات مومن شوہر کی صفتِ ایمان کا تقاضا ہے۔ گذشتہ آیت (وعاشروهن بالمعروف الخ) کی یہ حدیث تشریح کرتی ہے۔

ایک حدیث میں ارشاد ہے:

ع۱۰۔ استوصوا بالنساء خيرا فانّهن خلقن من ضِلَعٍ وانّ اعوج شيءٍ في الضلع اعلاه۔ فان ذهبت تقيمه كسرته وان تركته لم يزل اعوج. فاستوصوا بالنساء. (بخاری ص۴۶۹ ج۱ ومسلم ص۴۷۵ ج۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگو! بیویوں کے ساتھ بہتر سلوک کرنے کے بارے میں میری وصیت مانو اس لئے کہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں۔ اور زیادہ کجی پسلی کے اوپر کے حصہ میں ہوتی ہے۔ اگر تم اس ٹیڑھی پسلی کو (زبردستی) سیدھا کرنے کی کوشش کروگے تو وہ ٹوٹ جائیگی۔ اور اگر یونہی اپنے

حال پر چھوڑ دو گے تو پھر وہ ہمیشہ ویسی ہی ٹیڑھی رہے گی۔ اس لئے بیویوں کے ساتھ بہتر سلوک کرنے کی میری وصیت قبول کرو۔ یعنی اگر کوئی شخص زبردستی اور تشدّد سے عورت کی مزاجی کجی نکالنے کی کوشش کرے گا اور مردوں کی طرح اسکو سیدھا کرنے کی جدوجہد کریگا تو وہ کامیاب نہ ہو سکے گا، بلکہ ہوسکتا ہے کہ افتراق اور علیحدگی کی نوبت آجائے۔ اس لئے دماغ وزبان میں کجی ان کی فطرت ہے۔ اگر تم ان سے کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہو تو اسی فطرت پر قائم رکھ کر اٹھالو۔ اس لئے مردوں کو چاہئے کہ وہ عورتوں کی معمولی غلطیوں اور کمزوریوں کو نظرانداز کرتے ہوئے ان کے ساتھ بہتر سلوک اور دل داری کا برتاؤ کریں۔ لفظ "استوصوا الخ" سے ہی آپ نے کلام شروع فرمایا تھا اور اسی لفظ پر ختم فرمایا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آپ کو عورتوں کے ساتھ حسن معاشرت اور بہتر سلوک کرنے کا کتنا اہتمام تھا۔

اس طرح درحقیقت اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے عورت کی نسبت نہ صرف مرد کی، بلکہ خود عورت کی اپنی ذہنیت کو بھی بدل دیا۔ اور جاہلی ذہنیت کی جگہ ایک نہایت صحیح اور معتدل ذہنیت پیدا کی جس کی بنیاد جذبات پر نہیں بلکہ خالص علم وعقل پر تھی۔ اور باطنی اصلاح کے ساتھ ساتھ قانون کے ذریعہ سے بھی عورتوں کے حقوق کی حفاظت کا انتظام کیا۔

حاصل کلام اسی اخلاقی اور قانونی اصلاح کا نتیجہ ہے کہ اسلامی سوسائٹی میں عورت کو وہ بلند حیثیت حاصل ہوئی جس کی نظیر دنیا کے کسی معاشرہ وسماج اور سوسائٹی میں نہیں پائی جاتی۔ مسلمان عورت دنیا اور دین میں مادّی، عقلی اور روحانی حیثیات سے عزت اور ترقی کے ان بلند سے بلند مدارج تک پہنچ سکتی ہے جن تک مرد پہنچ سکتا ہے۔ اور اس کا عورت ہونا کسی مرتبہ میں بھی حائل نہیں ہے۔ آج اس بیسویں صدی میں بھی دنیا، اسلام سے کوسوں دور ہے۔ افکار انسانی کا ارتقاء اب بھی اس مقام تک نہیں پہنچا جس پر اسلام پہنچا ہے۔ بلکہ پندرہ سو سال پہلے پہنچا تھا۔ مغرب نے عورت کو جو کچھ دیا ہے عورت کی حیثیت سے نہیں دیا بلکہ مرد بنا کر دیا ہے۔ عورت درحقیقت اب بھی اس کی نگاہ میں

ویسی ہی ذلیل ہے جیسی پرانے دورِ جاہلیت میں تھی۔ گھر کی ملکہ، شوہر کی بیوی، بچوں کی ماں ایک اصلی اور حقیقی عورت کے لئے اب بھی کوئی عزت نہیں ہے۔ اگر عزت ہے تو اس مرد مؤنث یا زنِ مذکر کے لئے ہے جو جسمانی حیثیت سے تو عورت ہو مگر دماغی اور ذہنی حیثیت سے مرد ہو اور تمدن و معاشرت میں مرد ہی کے سے کام کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ انوثت کی عزت نہیں بلکہ رجولیت کی عزت ہے۔

یہ کام **اسلام** اور صرف **اسلام** نے کیا ہے کہ عورت کو تمدن و معاشرت اور تہذیب وثقافت میں اس کے فطری مقام پر رکھ کر عزت و شرف عطا کیا ہے۔ اور صحیح معنوں میں انوثت کے درجہ کو بلند کر دیا۔ اسلامی تمدن عورت کو عورت اور مرد کو مرد رکھ کر دونوں سے الگ الگ وہی کام لیتا ہے جس کے لئے مالک دوجہاں نے اس کو پیدا کیا ہے۔ **اسلام** کے نزدیک مرد و عورت دونوں یکساں مفید اور یکساں قدر کے مستحق ہیں۔ اس کے نزدیک نہ رجولیت میں کوئی شرف ہے نہ انوثت میں کوئی ذلت۔

ہم مسلمانوں کے لئے بھی واجب اور ضروری ہے کہ عورت کو اس کے پورے حقوق دیں۔ ان پر ظلم و زیادتی نہ کریں، ان کے ساتھ حسن سلوک کریں اور حسن اخلاق سے پیش آکر کمالِ ایمان کا ثبوت دیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

(جاری)

ملفوظات

مولانا ابوسعدان محمد سعیدی صاحب مدرس مظاہر علوم وقف سہارنپور

ملفوظ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں پھینکا ہوا، از روئے لغت اس کے حقیقی معنی کی نوعیت اس کے لغو اور بیکار ہونے کی طرف مشعر ہے مگر اس کے یہ معنی علی الاطلاق نہیں۔

ملفوظ کے اصطلاحی اور التزامی معنی جو عام طور پر مستعمل اور عرفاً متداول ہیں۔ وہ زبان سے پھینکی ہوئی (ادا کی ہوئی) بات کے ہیں خواہ وہ کلمہ ہو یا کلام، جیسے مجلس کہ اس کے اصلی معنی بیٹھنے کی جگہ کے ہیں، لیکن اب وہ بزم، محفل، انجمن اور پارٹی، کے معنی میں آتا ہے اور عوام تو کجا خواص کا ذہن بھی اس کے حقیقی معنی کی طرف سبقت نہیں کرتا یہی امر ملفوظ کے اندر بھی کارفرما ہے۔

ملفوظ سے اظہار مافی الضمیر اور دل کی ترجمانی ہوتی ہے، گویا یہ نطق و گویائی کا دوسرا نام ہے، جو انسان کے شرف و عظمت کا طرۂ امتیاز ہے، دنیا کی کوئی بات اور کوئی تذکرہ بغیر ملفوظ ممکن نہیں، بنظر غائر دیکھا جائے تو بلاشبہ یہ حقیقت واشگاف ہوتی ہے کہ یہ حق تعالیٰ شانہ کی بہت بڑی نعمت ہے اس کے بغیر نہ افادہ و استفادہ ممکن ہے اور نہ ارشاد و استرشاد۔

انسان کی تمام گفتگو ملفوظات ہی کے ذیل میں آتی ہے۔ پھر بعض ملفوظات وقیع اور بعض غیر وقیع ہوتے ہیں، درحقیقت اس کا مدار صاحب ملفوظ پر ہے، غیر وقیع اور غلط قسم کے افراد کے ملفوظات کی بھی کوئی حقیقت نہیں اور نہ وہ اس لائق ہوتے ہیں کہ ان کو نوک زبان و قلم اور صفحہ قرطاس پر لایا جائے۔ اگرچہ ممکن ہے کہ اس قسم کے ملفوظات میں

کبھی علم وحکمت کی کوئی بات آجاتی ہو لیکن با ایں ہمہ بعض عام لوگوں کے اقوال خرافات اور کفریات پر مشتمل ہونے کے سبب باری تعالیٰ کے اس ارشاد کے مصداق ہیں۔

مثل کلمۃٍ خبیثۃٍ کشجرۃٍ خبیثۃٍ اجتثت من فوق الارض مالہا من قرار۔

خبیث وردی کلمہ کا حال خبیث وردی درخت کی طرح ہے جو زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ لیا گیا ہو اس کے لئے کوئی قرار د استحکام نہ ہو۔ (سورہ ابراہیم)

علمی وعرفانی طور پر وقیع ارفع واعلیٰ اور مثالی شان کے حامل علمائے عارفین اور صوفیائے کاملین کے ملفوظات وارشادات ہی ہوتے ہیں جو فی الواقع لائق دید وشنید اور خاص وعام کے لئے مفید ہوتے ہیں۔ ان کی مثال کلمۂ طیبہ کی سی ہے جس کے لئے ارشاد باری ہے۔

ومثل کلمۃٍ طیبۃٍ کشجرۃ طیبۃٍ اصلہا ثابت وفرعہا فی السماء۔

اور اچھے کلمہ کا حال اچھے درخت کی طرح ہے جس کی جڑ زمین میں مضبوط اور ثابت ہو۔ اور اس کی شاخیں آسمان سے ملی ہوں۔ (ایضاً)

بزرگان دین کے ملفوظات کا یہ سلسلہ بہت قدیم زمانے سے جاری وساری ہے ہر دور اور ہر زمانے میں یہ مبارک سلسلہ مخلوق خدا کے لئے قلوب کی تازگی اور روح کی جلاء وبالیدگی کا سامان بہم پہنچاتا رہا ہے۔ میرے نزدیک فرامین الٰہی، احادیث رسول، آثار صحابہ، اقوال ائمہ، ملفوظات بزرگان، اور ارشادات مشائخ سب ایک ہی سلسلۃ الذہب کی مختلف کڑی ہیں۔ جو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ومربوط اور یکے بعد دیگرے ہر ایک حسب مرتبہ اپنی نوعیت کی ایک خاص افادیت واہمیت کی حامل ہے، یہ الگ بات ہے کہ فرامین الٰہی کو کلام اللہ سے، فرامین رسول کو احادیث سے اور بزرگان دین کے اقوال کو ملفوظات یا ارشادات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

علمائے عارفین اور حضرات مشائخ کے ملفوظات وارشادات جو وقتاً فوقتاً ان کے پاکیزہ دہن اور شیریں زبان سے۔ رشد وہدایت بن کر نکلتے رہتے ہیں، مناطقہ اور فلاسفہ کی طرح

پُر پیچ وخم عبارات، شعرا کی طرح دور از کار تشبیہات و استعارات سے بھر پور معانی ومفاہیم نہ ہوتے بلکہ یہ روشن ضمیر پاکیزہ صورت وسیرت حضرات اہل اللہ کے انتہائی صاف وشفاف عام فہم الفاظ میں، علم وحکمت، پند وموعظت، عبرت ونصیحت اور اصلاح وصلاح کا وہ خزانہ وسرمایہ ہوتے ہیں جو سادہ سے سادہ اور عام سے عام آدمی کے دل میں اثر کر اپنی خود بنالیتے ہیں اور بے تکلف وزحمت بآسانی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ان میں عقائد عبا معاملات، تہذیب اخلاق، تزکیۂ نفس اور اصلاح باطن کے بارے میں ایسی بیش قیمت ہوتی ہیں جن کے جاننے اور سننے سے ایمان تر وتازہ ومضبوط ہوتا ہے، عبادات کا ل لگتی ہیں حسن اخلاق پیدا ہوتا ہے، دنیا کی حقیقت منکشف ہوتی ہے۔اس کی طرف دل سرد ہو جاتا ہے اور آخرت کی فکر غالب آجاتی ہے، تبلیغی وتذکیری مساعی کے فائد سامنے آتے ہیں، اعلائے کلمۃ اللہ اور اس کی نشر واشاعت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، عمل صا داعیہ اور امنگ قلب میں بیدار ہوتی ہے۔نیز اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کی ترجم دینی دعوت، سلوک واحسان کی جانب راہنمائی، ذکر اللہ کی تلقین دنیا کے زوال آخر بقار کا یقین پیدا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی بے حساب نعمتوں کی یاد دہانی اور قناعت وتوکل نصیب ہوتی ہے، ان میں ہر قسم کے دینی، علمی، تمدنی، معاشی، اقتصادی اور سیاسی مقو ملتے ہیں، جن سے روحوں کی درستگی اور اخلاق وعادات کے سدھارنے میں مدد ملتی ہے ا کے اصول معلوم ہوتے ہیں، بالفاظ دیگر ان میں ہر موقعہ کی قیمتی، ٹھوس جچی تلی آرا اور نص سے بھر پور اقوال ہوتے ہیں، جو انسان کے لئے زندگی کے مختلف نشیب وفراز میں مشعل کا کام دیتے ہیں، اس لحاظ سے بزرگوں کے فرامین وارشادات کلام الملوک ملوک الکلام (با کا کلام کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے) کا مصداق ہیں۔

سلامتی۔جو ایک گوہر نایاب ہے جو تلاش بسیار کے بعد بھی بمشکل میسر ہوتی۔ مل سکتی ہے تو گوشۂ گمنامی اور خلوت نشینی میں یا پھر بزرگوں کے ان ملفوظات وارشا میں۔چنانچہ حضرت جعفر صادق فرماتے ہیں۔

"سلامتی بہت نادر وکمیاب چیز ہے یہاں تک کہ اس کے تلاش کی جگہ بھی پوشیدہ

ہے وہ کہیں مل سکتی ہے تو ممکن ہے گوشۂ گمنامی میں ملے۔ اگر تم اس کو گوشۂ گمنامی میں ڈھونڈو اور نہ ملے تو ممکن ہے خلوت نشینی میں ملے۔ اور گوشۂ تنہائی گوشۂ گمنامی سے مختلف ہے یہاں بھی نہ ملے تو سلف صالحین کے اقوال میں ملے گی۔" (کلمات اکابر ص ۳)

امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی فرماتے ہیں کہ "کامل بنانے والے شیخ کی صحبت کبریت احمر (سرخ گندھک) اور اس کی باتیں شفا رہیں۔" (مکتوبات ۹۳/۱)

مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی تحریر فرماتے ہیں کہ:

"بزرگان سلف کے حالات و واقعات اور ملفوظات و معمولات بلاشبہ علم و عمل کی روح، دنیا میں ذکر آخرت کے لئے رہبر، خلوت کدہ کے مونس، غمزدہ کے انیس، ہر دینی و دنیوی مشکل کا حل، اور نور ایمان کو بڑھانے والے ہوتے ہیں۔" (روح تصوف ص ۱۷)

سیدی و سندی، مرشدی و مولائی، فقیہ الاسلام حضرت مولانا مفتی مظفر صاحب رقمطراز ہیں:

"(بزرگوں کے) ان ارشادات و ملفوظات میں جہاں احکام خداوندی، احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح و تفسیر اور ان کے مبہم و مغلق مقامات کی تعیین و توضیح ہوتی ہے وہیں ان میں ہر دور کے حالات و مقتضیات کے لحاظ سے مریدین و مسترشدین اور دیگر طالبین کے لئے کچھ ایسی نفع بخش ہدایات اور بصیرت افروز تصریحات بھی ہوتی ہیں، جن سے ایمان کو تازگی، روح کو بالیدگی اور مردہ دل انسان کو حیات جاودانی نصیب ہوتی ہے۔ . . . . . .

ہمارے دور کے بزرگوں میں حضرت تھانوی قدس سرہ العزیز کے مواعظ و ملفوظات کو اس بارے میں خاص امتیازی شان حاصل ہے، ان میں قرآنی اسرار و رموز، حدیثی معارف و عوارف، سلوک و تصوف کے اہم حقائق و دقائق، فقہی احکام و مسائل اور دیگر علوم و فنون کا قیمتی سرمایہ اور بیش بہا خزانہ موجود ہے۔" (تقریظ بر معارف مسیح الامتؒ)

الحاصل۔ ملفوظات اپنی جگہ بڑے طاقتور اور بڑے پراثر ہوتے ہیں۔ ملفوظات کی تاثیر اس تمثیل سے بڑی آسانی کے ساتھ سمجھ میں آسکتی ہے کہ:

ایک طبیب اپنے مریضوں کا بڑے عجیب اور نہایت حیرت انگیز طریقے سے علاج کرتا تھا، جب کوئی مریض اس کے پاس آتا اور اپنے مرض کی کیفیت ذکر کرتا تو وہ طبیب بغور خوض اس کی کیفیت سننے کے بعد کچھ الفاظ پڑھ کر سناتا اور کہدیتا کہ ان الفاظ کو باربار دہراتے رہو، شفا پاؤ گے۔ ایک فلسفی نے جب یہ خبر سنی تو حیران و ششدر رہ گیا اور سوچنے لگا کہ الفاظ کے تکرار سے بھلا مرض کیسے دور ہو سکتا ہے، چنانچہ وہ اس طبیب کے پاس آیا اور اس سے اس طرح گویا ہوا کہ:

"کیوں صاحب آپ لوگوں کو دھوکہ کیوں دیتے ہیں بھلا الفاظ کے تکرار سے کہیں مرض دور ہو سکتا ہے"

طبیب نے کہا کیوں نہیں؟ بحث شروع ہو گئی، کچھ دیر بعد طبیب نے فلسفی کو برا بھلا کہنا شروع کیا، فلسفی کو بہت غصہ آیا، غصہ کی وجہ سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا اسے اپنی نبض کی رفتار کا اندازہ نہیں رہا، اس کے بعد طبیب نے اپنا طرز تکلم بدلا اور بڑے نرم لہجے میں فلسفی سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ تو الفاظ کی تاثیر کے قائل نہیں تھے؟ فرمائیے آپ نے ملاحظہ فرمالیا الفاظ میں کتنی طاقت ہوتی ہے، فلسفی نے دست بستہ عرض کیا حضور میں پہلی مرتبہ الفاظ کی قوت کا قائل ہوا۔

اس تمثیل سے مطلق الفاظ کی تاثیر معلوم ہوتی ہے جب مطلق الفاظ کا یہ حال ہے تو پھر بزرگان دین اولیاء اللہ اور مشائخ و صوفیاء (جن کے قلوب انوار الٰہی سے مزین اور فیضان نبوت سے آراستہ و پیراستہ ہوتے ہیں) کے ملفوظات وارشادات کس قدر تاثیر یہ تو بہ کے مالک ہوں گے کسی نے حضرت حمدون (بزرگ) سے پوچھا کہ اگلے بزرگوں کا کلام کیوں بااثر ہے فرمایا۔

"ان کا کلام اللہ کی خوشی، نفس کی نجات، اسلام کی عزت واشاعت کے لئے تھا۔ اور ہم لوگوں کا کلام لوگوں کو خوش کرنے، دنیا کمانے اور اپنی عزت کے لئے ہے۔ پھر اثر کیسے ہو"

(آئینہ اولیاء صفحہ ۱۳۵)

ملفوظات کی مثال پانی کی سی ہے۔ پانی کی بذات خود اپنی کوئی شکل نہیں ہوتی، حالات

(بقیہ صفحہ ...پر)

چین کی راجدھانی بیجنگ میں ہونے والی سب سے بڑی عالمی خواتین کانفرنس اختتام پذیر
ہوگئی۔ لیکن اس کی افادیت اور عدم افادیت پر بحث وگفتگو کا آغاز ہوگیا ہے انعقادِ کانفرنس
، امید کی جو کوئی لکیر بنی اور ناامیدی کا جو سیاہ دھواں اٹھا تھا۔ اب تک یہ فیصلہ نہیں
یا جاسکا ہے کہ امید کی کرن اور ناامیدی کے دھویں میں سے کس کی مقدار زیادہ ہے؟
لیکن آنکھیں گڑا کر دیکھنے سے بہرحال کچھ نہ کچھ حقائق نظر آہی جاتے ہیں۔

بیجنگ عالمی خواتین کانفرنس کے تعلق سے بہت سے سوالات اٹھائے گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ چین نے اتنی بڑی خواتین عالمی کانفرنس کرنے کی اجازت کیوں دی اور نہ صرف اجازت دی بلکہ دعوت دی۔ مختلف ممالک کی خواتین نے کچھ ایسے مظاہرے بھی کیے جو حکومت چین کی پالیسی سے میل نہیں کھاتے تھے۔ لیکن اس نے خلاف توقع اور اپنا سخت گیر رویہ اپنانے کے بجائے مظاہرین کے ساتھ نسبتاً نرم رویہ اپنایا۔ آخر کیوں؟ ہمارے خیال میں اس طرح کے سوالات زیادہ اہمیت نہیں رکھتے ہیں۔ اصل اہم سوال تو یہ ہے کہ اقوام متحدہ کے سایہ تلے خواتین کے جن اعلان شدہ مقاصد ومسائل کے حصول وحل کے لئے کانفرنس منعقد کی گئی تھی، ان میں کہاں تک کامیابی ملی، اور آئندہ

کس حد تک کامیابی ملنے کے امکانات ہیں؟ اور یہ کہ یہ کانفرنس سابقہ تین کانفرنسوں سے کس معنی میں الگ ہے؟ اس کے ساتھ ایک سوال یہ بھی جوڑا جا سکتا ہے کہ انعقادِ کانفرنس کا مقصد و منشاء کیا تھا۔ اور کس منصوبے اور سوچ کی پیداوار ہے؟ کانفرنس کے کرتا دھرتاؤں نے جو منشاء و مقصد ظاہر کیا تھا۔ واقعتاً وہی ہے۔ یا وہ جو ظاہر نہیں کیا گیا۔ یہ آخری سوال بہت ہی بنیادی نوعیت کا ہے۔ جس کے صحیح جواب پر مسئلے کی اصل تفہیم مبنی ہے۔

بیجنگ عالمی خواتین کانفرنس کے اغراض و مقاصد یہ بتائے گئے تھے • ان مسائل کی نشاندہی کرنا جن سے پوری دنیا میں عواتین دوچار ہیں • اور مختلف ممالک کے حالات کے مدنظر ان کا حل تلاش کرنا۔ عورتوں کے مالی و دیگر مسائل حیات کی فراہمی کے ساتھ ساتھ ان کی حقوق کے تحفظ کے لئے حکومتیں قوانین بنائیں۔ اور ان کے موثر اور یقینی نفاذ کے لئے کمیٹیوں کی تشکیل • خواتین کے تعلق سے جو پریشان کن حالات پیدا ہوتے ہیں ان پر نظر رکھنے اور پیدا شدہ خرابیوں کو ختم کرنے کے لئے فعال مشینری تنظیموں کا قیام۔

جہاں تک خواتین کو درپیش مسائل و مشکلات کا تعلق ہے تو کانفرنس میں ان کی نشاندہی خوب تفصیل اور رحم کر کی گئی۔ بعض افریقی ممالک میں لڑکیوں کا ختنہ، جہیز کے لئے جلایا جانا، نسبندی، زبردستی اسقاطِ حمل، جنسی تشدد اور دیگر مظالم پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی۔ رپورٹیں پیش کی گئیں۔ اور ساتھ ہی اس کے دوسرے رخ یعنی آزادیٔ نسواں، حقوقِ نسواں، معاملاتِ نسواں، تحفظاتِ نسواں اور مفاداتِ نسواں کے بھی چرچے خوب رہے۔

کانفرنس کا یہ اجمالی پہلو بڑا خوبصورت نظر آتا ہے۔ لیکن تفصیلات میں وہ خوبصورتی نظر نہیں آتی ہے۔ اور جو نظر آتی ہے۔ وہ دھندلی دھندلی سی ہے۔ مسائل و مشکلات کی نشاندہی تو کر دی گئی لیکن ان کے حل کے لئے سنجیدہ کوششوں کا دور دور تک اتہ پتہ نہیں چلتا ہے۔ البتہ "مسائل کی نشاندہی" سے یہ ضرور ہوا کہ وہ نام نہاد ترقی یافتہ ممالک بھی حقایق کے حمام میں ننگے نظر آئے جو عورتوں کے حقوق آزادی، سماج میں معقول نمایندگی، اور ان کی تحفظات و مفادات کے تحفظ

دیہاتی کا ڈھنڈورہ پیٹتے رہتے ہیں۔ اور مشرقی ممالک خصوصاً مسلم ممالک میں خواتین کے حقوق وحریت کی پائمالی کا رات دن رونا روتے رہتے ہیں۔ خود داعی ملک چین میں عورتوں کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ ہے۔ وہاں لڑکیوں کی پیدائش پر ایک طرح سے پابندی ہے جس کی وجہ سے چین میں لڑکا لڑکی کے مابین پیدائش کا تناسب و توازن بری طرح بگڑ کر رہ گیا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق چین میں لڑکیوں کی تعداد لڑکوں کے بالمقابل تقریباً سات کروڑ کم ہے۔ اقتصادی سرگرمیوں میں عورتوں کا تناسب صرف ۲۲،۳ ٪ ہے۔ عورتوں کو مردوں کے مقابلے ۳۰ تا ۴۰ فی صد تنخواہ کم ملتی ہے۔ عورتوں میں شرح ناخواندگی ۳۲،۶ ہے معاشی طور پر ان کا بہت ہی برا حال ہے۔ پہلے کے مقابلے عورتوں کے ساتھ تشدد میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ ان کے ساتھ آج بھی چین میں یہ افسوس ناک سلوک کیا جاتا ہے کہ انہیں بہلا پھسلا کر دور دراز کے علاقوں میں لے جاکر جسم فروشی کا دھندہ کرایا جاتا ہے۔

دوسرا اشتراکی ملک روس کا حال بھی چین سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ یو، این، ڈی، پی کی چھٹی رپورٹ میں عورتوں کے تعلق سے جو تفصیلات دی گئی ہیں۔ ان سے امریکہ سمیت دیگر مغربی، یوروپی ممالک بھی پوری طرح بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ جو امریکہ پوری دنیا میں "نیا عالمی نظام" قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہاں ہر پانچویں عورت زنا بالجبر کا شکار ہو جاتی ہے اور ہر چھ منٹ پر عصمت دری کا ایک واقعہ ہوتا ہے۔ ابھی حال ہی میں امریکی محکمۂ انصاف کی طرف سے شائع شدہ رپورٹ کے مطابق امریکہ میں ہر سال پانچ لاکھ عورتیں جنسی تشدد کا شکار ہوتی ہیں۔ ان میں ایک لاکھ ستر ہزار وہ عورتیں بھی ہیں جن کے ساتھ مرد زور زبردستی منھ کالا کرتے ہیں۔ ایک دوسری رپورٹ کے مطابق ہر سال سات لاکھ عورتیں مردانہ ہوس کا شکار ہوتی ہیں۔ امریکہ، فرانس میں علی الترتیب بن بیاہی ماؤں کے ذریعے پیدا ہونے والے بچوں کی تعداد ۳۰٪ اور

۴۲ رفی صد ہے۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ ۵۰ رفی صد سے زاید نوعمر مائیں بغیر ازدواجی زندگی کے بچے پیدا کر رہی ہیں۔ ۱۷ تا ۱۸ فی صد عورتیں اپنے مرد ساتھی کے جنسی تشدد کا شکار ہوتی ہیں ــــ رہی زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایندگی کی بات تو عورتوں کی نمایندگی تمام شعبہ ہائے جات میں مردوں کے مقابلے بہت ہی کم ہے۔ ترکی، پاکستان، بنگلہ دیش، جیسے مسلم ممالک اور سری لنکا اور ہندوستان میں خواتین کو وزارت عظمیٰ کی کرسی پر براجمان تو دیکھتے ہیں۔ لیکن امریکہ میں آج تک کوئی خاتون صدرِ مملکت تو کیا نائب صدر بھی نہیں ہو سکی ہے۔ مشرق خصوصًا مسلم ممالک میں مذہبی سماجی وجوہ کے باوجود خواتین وزارت عظمیٰ کے عہدے تک پہنچ رہی ہیں۔ تو پھر آخر امریکہ جیسے آزادی نسواں کے علمبردار ملک میں کسی خاتون کے صدرِ مملکت بننے میں کیا رکاوٹ ہے۔ بات وہی ہے کہ نعرے اور عمل میں فرق ہوتا ہے۔ عورتوں کی آزادی کا نعرہ ان کو واجبی حقوق دینے کے لئے نہیں لگایا جاتا ہے، بلکہ ان کا ہر سطح پر استحصال کرنے کے لئے لگایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خواتین کے مسائل حل ہونے اور مشکلات میں کمی ہونے کی بجائے روز بروز ان میں مزید اضافہ ہو رہا ہے۔ پہلی گذشتہ تین خواتین کانفرنسوں کے مقابلے حالیہ عالمی خواتین کانفرنس میں عورتوں کے تعلق سے جو رپورٹ پیش کی گئی ہے۔ اس کے مطابق عورتوں کے ساتھ جنسی تشدد، زبردستی اسقاطِ حمل وغیرہ کے معاملے میں ۵، ۷ گنا اضافہ ہوا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں عالمی یا مقامی خواتین کانفرنسوں کے انعقاد کی افادیت بڑی حد تک مشکوک ہو کر رہ جاتی ہے۔

چوتھی بیجنگ عالمی خواتین کانفرنس کو اگر عورتوں کے مسائل و مشکلات کی نشاندہی کے تناظر میں دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ بہت ہی کامیاب کانفرنس تھی۔ لیکن اگر حلِ مسائل و مشکلات کے تناظر میں دیکھا جائے تو اسے نتیجہ خیز نہیں کہا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ عورتوں کے تعلق سے مرد و عورت دونوں کا غیر سنجیدہ رویہ اور مسائل و مشکلات کے حل کے لئے اپنائے جانے والے غیر فطری طریق کار ہیں۔ مسئلے کی نشاندہی تو ہو گئی۔ لیکن وسائلِ حیات

کی فراہمی۔ قوانین سازی، کمیٹیوں کی تشکیل اور فعال مشینری تنظیموں کا قیام وغیرہ سب ہونے ابھی باقی ہیں۔ کچھ قوانین اور کمیٹیاں تقریباً تمام ممالک میں پہلے ہی سے موجود ہیں لیکن عورتوں کے حقوق و تحفظات اور وقار کی بحالی و بقا کا مسئلہ جوں کا توں باقی ہے۔ کانفرنسوں کا انعقاد اور حقوقِ نسواں کے مطالبات ایک معمول کی چیز بن کر رہ گئے ہیں۔ مرد عورت دونوں یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ کچھ ہونا ہوانا تو ہے نہیں۔ لہٰذا زیادہ سنجیدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے؟

یہی وہ سوچ ہے جو بیجنگ عالمی خواتین کانفرنس پر بھی چھائی رہی۔ ہندوستانی خواتین کے وفود نے کانفرنس کے ایجنڈے پر غور و فکر کرنے اور بحث و مباحثہ کرنے سے زیادہ سیر سپاٹے، شاپنگ، خرید و فروخت کرنے میں دلچسپی لی، نتیجتاً ان کی نمائندگی کسی بھی فیصلہ کن کمیٹی یا معاملے میں نہیں کے برابر رہی۔ دیگر ممالک کی عورتوں کے وفود کی نمائندگی تو رہی لیکن وہ کوئی ایسا لائحہ عمل نہیں پیش کر سکے جس کو سامنے رکھتے ہوئے خواتین زندگی کا کامیاب اور قابل اطمینان سفر کر سکیں۔ حالیہ کانفرنس میں زیر بحث تقریباً تمام تر وہی مسائل و امور تھے۔ جو پہلے بھی اٹھائے جا چکے ہیں۔ پہلے کی طرح اس بار بھی حقوق و مسائل اٹھائے گئے۔ لیکن عورتوں کی ذمے داریوں اور فرائض پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت حال میں سماج میں مردوں عورتوں کے مابین تناؤ و تصادم تو پیدا ہو سکتا ہے۔ باہمی تعاون و اشتراک، محبت و تعلق اور ایثار و قربانی پر مبنی باعتماد و پرسکون معاشرے کی تشکیل و تعمیر نہیں۔ فرائض اور ذمے داریوں کو نظر انداز کر کے صرف حقوق کا مطالبہ ہمیشہ ملک و سماج میں عدم توازن کو بڑھاوا دیتا ہے۔ چاہے مالک مزدور کا معاملہ ہو۔ یا سرکاری ملازمین کا، یا میاں بیوی کا۔ اگر کانفرنس کے ذمے دار، منتظمین اور مرد و عورت شرکا اس نکتے پر غور کرتے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ کانفرنس کے انعقاد و اختتام کے بعد مسائل و مشکلات حل ہونے کے بجائے کیوں مزید الجھ اور بڑھ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ کو پالینا شاہ کلید کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ ہے فرائض و حقوق کو یکساں طور پر اہمیت و حیثیت دینا۔ بلکہ خوش گوار اور پائدار ازدواجی تعلقات میں مرد عورت دونوں کے تعلق سے حقوق کے مقابلے میں فرائض کی زیادہ اہمیت ہے۔

لیکن مادہ پرستانہ یک رخے اور خود غرضانہ سوچ نے ذمے داریوں اور فرائض بلکہ کچھ قدم آگے بڑھ کر ایثار و قربانی کو نظرانداز کرکے صرف حقوق کو ابھار دیا ہے جس کی وجہ سے عورتوں میں مردوں کے تئیں نفرت و حقارت پیدا ہو گئی ہے۔ اور بہت سی عورتیں تو "مرد مار" سوچ کی ڈگر پر چل پڑتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال میں مرد عورت دونوں میں انتقامی سوچ، نیچا دکھانے کی ذہنیت اور چڑچڑاپن پیدا ہوگا۔ اور باہمی تعاون و اشتراک کے بجائے ایک دوسرے کی تذلیل محبوب مشغلہ بن جائے گی۔ بیجنگ کانفرنس میں بھی ذہن چھایا رہا کہ عورتوں کو جہاں تک ہو سکے مردوں سے پیچھا چھڑا لینا چاہئے۔ ہر مرد چالاک مطلبی ہوتا ہے۔ اس نے ہمیشہ عورتوں کو غلط استعمال کیا ہے۔ یہاں یہ عورتیں یہ سمجھنے سے قاصر رہیں کہ بے جا حریت، جنسی آزادی اور تولید کے اختیار کلی عورتوں کے ہاتھوں دینے کا نعرہ انہیں چالاک اور مطلبی مردوں کا گھڑا ہوا ہے۔ یہ مطلب پرست غیر قانونی آزاد جنسی تعلق قائم کرکے اپنی جنسی ہوس کی تکمیل تو کر لیتے ہیں۔ اور اسقاط حمل کی جان لیوا ذمے داری عورت پر ڈال کر نو دو گیارہ ہو جاتے ہیں۔ کیسی خوبصورتی سے اپنا الّو سیدھا کیا گیا ہے۔ اسقاط حمل کی آزادی کا تعلق تو جوڑ دیا گیا ہے عورت کے ساتھ اور مطلب اپنا نکال رہے ہیں — کاش کہ اسے بے جا آزادی پسند خواتین سمجھ لیتیں!

بیجنگ عالمی خواتین کانفرنس کے بارے میں اپنے اپنے طور پر لوگوں کے مختلف تجزیے اور نقطہائے نظر ہو سکتے ہیں۔ لیکن کانفرنس کے مقاصد و تفصیلات کی گہرائی میں جانے سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ قاہرہ تحدید آبادی کانفرنس کی طرح بیجنگ عالمی خواتین کانفرنس بھی صہیونی سوچ پر مبنی مغربی نظام زندگی کو مشرق پر مسلط کرنے کی منصوبہ بند کوشش کا ایک اہم حصہ تھا۔

قاہرہ تحدید آبادی کانفرنس تحدید آبادی، ترقی و معاشی اور تعلیمی مسائل حل کرنے کے نام پر منعقد کی گئی تھی۔ لیکن عملاً شرکائے کانفرنس نے جنسی آزادی اور اسقاط حمل کو فروغ دینے پر ساری توجہات مرکوز کر دیں۔ یہی کچھ عملاً بیجنگ کانفرنس میں کیا گیا۔ کانفرنس کے اہم عنوانات، عورتوں کے سیاسی، سماجی حقوق، ان کی صحت، تعلیم جیسے مسائل تھے لیکن جس

انداز میں جنسی آزادی، اسقاط حمل اور تولید عدم تولید کے اختیارات، ہم جنسی، اور جسم فروشی، کو قانونی حیثیت دینے کے مطالبے اور باتیں کی گئیں۔ اس سے یہ اندازہ لگانا کوئی زیادہ مشکل نہیں ہے کہ بیجنگ کانفرنس کے انعقاد کے پیچھے جنسی انارکی، اباحیت پسندی، مشرقی اقدار و روایات خصوصاً اسلامی قدروں کو مجروح کرنے، رشتوں کے احترام کا خاتمہ، اور خاندانی نظام کے درہم برہم کرنے کے مذموم مقاصد کام کر رہے ہیں۔ روزنامہ ڈان کراچی کی رپورٹ کے مطابق امریکہ سے آنے والی پیشہ ور طوائف نورما المودوار (Norma Almadowar) نے خطاب کرتے ہوئے کہا "طوائف کی حیثیت سے ایک "دیانت دار پیشہ" اپنانے سے قبل میں دس برس امریکہ کی پولیس میں ملازم رہی ہوں، اور میں سمجھتی ہوں کہ دنیا میں ہر عورت کو یہ موقع ملنا چاہئے کہ وہ اپنی پسند سے یہ پیشہ اختیار کر سکے۔"... اپنی پسند سے طوائف بننے کی خواہش خواتین پہ پابندی عائد کرنا سراسر ظلم ہے۔ اس سے عورتوں کے اپنے پیشے کے انتخاب کی نفی ہوتی ہے۔"

مزید یہ کہ دستاویز بیجنگ میں خواتین کو ہم جنسی کی اجازت دینے کی سفارش درج ہے جسم فروشی کو قانونی تحفظ دینے کے ساتھ شادی شدہ زندگی کی حوصلہ شکنی بھی کی گئی ہے شادی کا حوالہ دیئے بغیر مرد عورت کے مابین "ذمے دارانہ" جنسی تعلق کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ اگر جنسی بے راہ روی سے جنسی بیماریاں پیدا ہو جائیں تو ان کے علاج و معالجے اور صحت پہ توجہ دینے کی بات کہی گئی ہے۔ ماں بیٹی بہن کے مشرقی روایتی کردار کو نشانۂ تنقید بنایا گیا ہے لگے ہاتھوں مذہبی بنیادوں پر چوٹ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ہندوستان، ایران اور بنگلہ دیش میں شدت پسند مرد مذہب کو اپنے سیاسی مفادات کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ ہفت روزہ تکبیر بابت ۱۴ ستمبر ۱۹۹۵ء کی اطلاع کے مطابق دہلی کی ایک کارکن خاتون زرینہ کھٹی نے کہا کہ یہ انتہا پسند مرد ہوتے ہیں اور ان کا تعلق مذہبی حلقوں سے ہے۔

ان دستاویز کی اطلاعات و تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ مغرب اور عالمی صیہونیت مسلمان عورتوں کو تاریخ دیگر تمام اقوام عالم کو جنسی غلام بنا دینا چاہتی ہے مسئلے کے اس پہلو پر مشرقی میڈیا کوئی روشنی نہیں ڈال رہا ہے۔ مشرقی ممالک

خصوصاً ہندوستان کے اخبارات ورسائل عرصے سے کوئی توجہ ہی نہیں دے رہے ہیں۔ البتہ ممالک عربیہ کے اخبارات ورسائل پوری توجہ دے رہے ہیں اور پوری شدت کے ساتھ اس مسئلے کو اٹھا رہے ہیں مکہ مکرمہ سے شائع ہونے والے ہفت روزہ جریدہ "العالم الاسلامی" نے اپنے تازہ شمارے کے عربی انگریزی حصے میں بیجنگ کانفرنس پر تفصیلی رپورٹ شائع کی اور مضبوط حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ موجودہ عالمی خواتین کانفرنس عالمی صیہونیت کا جزء ہے۔ اور اقوام متحدہ کے جنرل سکریٹری بھی یہودیت وصیہونیت کا ایک پرزہ ہیں۔ اگرچہ ہندوستان، پاکستان، ایران جیسے مشرقی ممالک سے کانفرنس میں شریک ہونے والی بہت سی خواتین نے دستاویزی اعلانات ومقاصد سے اختلاف کیا۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ "نیا عالمی نظام" کے تحت مغرب اور عالمی صیہونیت جنسی انارکی اور اباحیت پسندی کا پیغام بھیجنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوگئی۔

لیکن مشرقی اقدار وروایات اور اسلام کی پاکیزہ ومستحکم نظریاتی بنیادوں کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ مغرب اور عالمی صیہونیت کو مسلم ممالک میں اپنے انداز کی جنسی انارکی اور اباحیت پسندی وغیرہ کو اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود پھیلانے میں خاطر خواہ کامیابی نہیں مل پائے گی۔ اور جس شدت سے سعودی عرب جیسے مسلم ملک میں بیجنگ کانفرنس کے مضمرات ومقاصد کے خلاف مخالفانہ لہر چل رہی ہے۔ اور بیداری کا ثبوت دیا جارہا ہے اسے دیکھتے ہوئے مستقبل قریب تو کیا مستقبل بعید میں جنسی انارکی، اباحیت پسندی، ہم جنسی اور جسم فروشی پر مبنی مغرب اور عالمی صیہونیت کے نظام زندگی کو جڑ جمانے کے بعد حد تک کوئی آثار نظر نہیں آرہے ہیں۔ البتہ ہندوستان میں عورتوں کے تولیدی [illegible] مغرب کے لئے کسی حد تک کامیابی کا امکان ہے۔ لیکن مسلم ممالک میں موجود [illegible] مغرب کی کامیابی کے امکان کی سطح پر بھی تسلیم کرنا مشکل ہے۔ [illegible] وعدم تولید، جنسی تعلقات کی آزادی اور [illegible] کیا جاتا ہے۔ اسلام اور مسلم سماج انہیں [illegible]

کی دین ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مذکورہ جیسے متعلقہ مسائل سرے سے مسائل ہی نہیں ہیں۔ ذمے دارانہ سماج کے شریف شہری ہونے کے ناتے مرد عورت کے یہ مذہبی سماجی رشتۂ ازدواج میں بندھے بغیر آزادانہ جنسی تعلق قائم کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ البتہ اگر مرد عورت مذہبی سماجی ضابطے کے تحت جنسی تعلق کا جواز پیدا کر لیتے ہیں تو دونوں پر ایک دوسرے کے یکساں حقوق و فرائض عائد ہوں گے۔ لہٰذا دونوں کے جنسی ملاپ کے نتیجے میں عورت کے پیٹ میں جو تیسرا وجود وجود پذیر ہوگا اس پر دونوں کا یکساں حق ہوگا۔ اس کے باوجود صرف عورت کو تولید عدم تولید، اسقاط حمل کا حق واختیار دے دینا مقصدیت پر مبنی نہیں کہا جا سکتا ہے۔ یہ بلاشبہ صریح نامعقولیت ہے جس کی اسلام جیسے دین فطرت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا اس کے ماننے والی امت مسلمہ سے بھی جنسی آزادگی اور اباحیت پسندی پر مبنی مغرب کی حیوانی تہذیب کو قبول کرنے کی نامعقول اور بے ہودہ توقع نہیں رکھی جانی چاہئے۔ ہاں اگر محترم مذہبی سماجی قدروں اور ثقافتی وحدتوں کو بکھیرے بغیر خواتین کے حقیقی مسائل و مشکلات کے حل کے لئے کوئی بھی سنجیدہ اور متوقع نتیجہ خیز سعی و اقدام ہوتا ہے تو بہرحال اس کی تائید و حمایت کی جانی چاہئے۔ کیوں کہ خواتین ہر سماج کا نصف اور لازمی حصہ ہوتی ہیں۔ انہیں نظرانداز کر کے کوئی بھی ملک یا سماج آگے نہیں بڑھ سکتا ہے۔
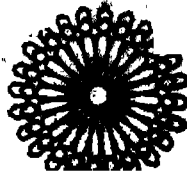
اس مضمون کا عنوان "بانگِ درا" میں اقبال کی نظم "فلسفۂ غم" کے پہلے بند کے درجِ ذیل شعر کا ایک مصرعہ ہے جس میں اقبال نے فلسفۂ غم پر بہت حکیمانہ طور پر، قرآن کے پسِ منظر میں، روشنی ڈالی ہے ؎

موجِ غم پر رقص کرتا ہے حبابِ زندگی
ہے الم کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی

اقبال نے یہ نظم لاہور کے ایک بیرسٹر میاں سرفضل حسین صاحب کے نام لکھی تھی۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ ان دونوں کی پیدائش ۱۸۷۷ء کی ہے مگر میاں سرفضل حسین صاحب کی وفات ۱۹۳۶ء میں ہوئی اور اقبال کی ۱۹۳۸ء میں۔

اس نظم میں اقبال نے انسان کی زندگی میں غم کا حصہ زیادہ پائے جانے پر اسی طرح بصیرت افروز اشعار کہتے ہیں جس طرح موت کے فلسفہ پر "بانگِ درا" کی نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" میں۔ ان دونوں نظموں کا پس منظر اقبال نے قرآن سے فراہم کیا ہے۔

اقبال نے متذکرہ بالا شعر میں الم کو بطور صفتِ ایہام استعمال کیا ہے۔ قرآن میں یہ حروفِ مقطّعات کے تحت آتا ہے۔ قرآن کی کل ۱۱۴ سورتوں میں حروفِ مقطّعات ۲۹ درجِ ذیل سورتوں کے آغاز میں پائے جاتے ہیں جن سورتوں کے نمبر شمار ہیں:

۲-۳-۷-۱۰-۱۱-۱۲-۱۳-۱۴-۱۵-۱۹-۲۰-۲۶-۲۷-۲۸-۲۹-۳۰-۳۱-۳۲-
۳۶-۳۸-۴۰-۴۱-۴۲-۴۳-۴۴-۴۵-۴۶-۵۰-۶۸۔

ان ۶ سورتوں میں پانچ درجِ ذیل سورتوں میں الٓمٓ کے حروفِ مقطعات آتے ہیں جن سورتوں کے نمبر شمار یہ ہیں:

۲ - ۳ - ۲۹ - ۳۰ - ۳۱ - ۳۲ -

اقبالؔ نے دانستہ طور پر صفتِ ایہام پیدا کرنے کے لئے الم کو عربی رسم الخط میں لکھا ہے۔ ایہام شاعری میں ایک صنعتِ معنوی ہے۔ یہ ایسے لفظ کو کہتے ہیں جس کے دو معنی ہوں۔ ایک قریب دوسرے بعید۔ سننے والا کا ذہن قریب کے معنی کی طرف منتقل ہو، مگر کہنے والے کی مراد معنیٔ بعید سے ہو اور قریب معنی سے بھی مناسبت رکھتا ہو۔ چونکہ یہ ایہام ہے اس لئے فارسی رسم الخط میں "الم" بھی پڑھ سکتے ہیں جو پھر بھی عربی لفظ ہے مگر اس کے معنی رنج غم اور دُکھ کے ہیں۔ مگر اس کی صورت الف۔ لام۔ میم سے مشابہ ہے۔ اسی لئے اقبالؔ نے الم کے ساتھ سورہ کا لفظ استعمال کیا ہے تاکہ ایہام کا رنگ پیدا ہو جائے۔

اس مصرعہ میں الم، سورہ، جزو اور کتاب کے الفاظ لاکر اقبالؔ نے دوسری صنعتِ معنوی "مراعات النظیر" پیدا کی ہے جس میں ایسے الفاظ جمع کئے جاتے ہیں جو آپس میں مناسبت رکھتے ہوں، جیسے گل و خار، تیر و کمان، اسی طرح اس مصرعہ میں جزو اور کتاب کے الفاظ مستعمل ہوئے ہیں۔

اس مصرعہ میں اقبالؔ ایہام اور مراعات النظیر کی صنعتیں لاکر یہ بتاتے ہیں کہ جیسے الم کتاب یعنی قرآن کا جزو یعنی پارہ یا حصہ ہے اُسی طرح "الم" انسان کی زندگی کا حصہ ہے جو غم کے گرد رقص کرتی ہے۔ اس لئے الم بھی انسان کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جس قدر عشرت و راحت۔ اسی لئے اس شعر کے قبل کے شعر میں اقبالؔ اس نکتہ کو اس طرح ذہن نشیں کراتے ہیں ؎

گو سراپا کیفِ عشرت ہے شرابِ زندگی
اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سحابِ زندگی

اور اس پہلے بند میں تمثیل اور استعارے کی زبان میں تیسرے اور آخری شعر میں الم کے نکتہ کو اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گل ہی نہیں
جو خزاں نادیدہ ہو بلبل، وہ بلبل ہی نہیں

اقبالؔ نے الم کو "جزوِ کتابِ زندگی" کہا ہے اور "کیفِ عشرت" کو بہار کے مترادف قرار دیتے ہوئے غم کے لئے خزاں کی بات لاکر انسانی زندگی میں ان دونوں کے پائے جانے پر درجِ ذیل آیات کی یاد دلائی ہے۔ فرمایا گیا:

"جس (ربِّ برتر) نے نباتات اُگائیں پھر ان کو سیاہ کوڑا کرکٹ بنا دیا"۔

(سورۃ الاعلیٰ ۸۷۔ آیات ۴ اور ۵)

اِن آیات میں یہ بات ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ کسی کو یہاں اس غلط فہمی میں نہ رہنا چاہئے، کہ وہ دنیا میں صرف بہار ہی دیکھے گا اور اُسے خزاں سے سابقہ پیش نہ آئے گا۔ اس معاملہ میں ایک موقع پر خدائے تعالیٰ نے اپنی سنت یہ بتائی ہے کہ:

"کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جو زمین میں یا تمہارے اپنے نفس پر نازل ہوتی ہو اور ہم نے اس کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب (یعنی نوشتۂ تقدیر) میں لکھ نہ رکھا ہو، ایسا کرنا اللہ کے لئے بہت آسان کام ہے"۔ (سورۃ الحدید ۵۷۔ آیت ۲۲)

اقبالؔ کے نزدیک رنج و غم کے بغیر انسانیت کامل نہیں ہوسکتی۔ عقلمند آدمی اس داغ کو جو اس کے سینہ میں ہے چراغ تصور کرتا ہے اور آہ و نالہ کو اپنی روحانی ترقی کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ غم سے انسانی فطرت اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچتی ہے اور رنج و ملال سے دل کے آئینہ پر صیقل ہو جاتی ہے۔ ان سارے نکتوں کو اقبالؔ اسی نظم "فلسفۂ غم" کے دوسرے بند میں اس طرح ذہن نشین کراتے ہیں:

آرزو کے خون سے رنگیں ہے دل کی داستاں — نغمۂ انسانیت کامل نہیں غیر از فغاں
دیدۂ بینا میں داغِ غم چراغِ سینہ ہے — روح کو سامانِ زینت آہ کا آئینہ ہے
حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال — غازہ ہے آئینۂ دل کے لئے گردِ ملال
غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے — ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے
طائرِ دل کے لئے غم شہپرِ پرواز ہے — راز ہے انساں کا دل، غم انکشافِ راز ہے

غم نہیں غم، روح کا اک نغمۂ خاموش ہے — جو سرودِ بربطِ ہستی سے ہم آغوش ہے

اقبال کا زیرِ تجزیہ شعر اگر مندرجہ بالا قرآنی آیات کا ترجمان ہے تو اس کا دوسرا بند مندرجہ ذیل روایات پر بھی مبنی ہے جو "حیات الصحابہؓ" کے حصہ ہفتم سے نقل کیے جا رہے ہیں:

(۱) "حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک درد پیش آیا۔ آپؐ فریاد کرتے اور بستر پر کروٹیں بدلتے تھے۔ حضرت عائشہؓ نے آپؐ سے عرض کیا کہ اگر ہم میں سے بعض آدمی ایسا کرتا تو آپؐ اُس پر خفا ہوتے۔ آپؐ نے فرمایا کہ مومن پر سختی ہی کی جاتی ہے اور کوئی مومن ایسا نہیں کہ جسے کوئی مصیبت پہنچے خواہ کانٹا لگا ہو یا کوئی درد، مگر اللہ پاک اسکی وجہ سے اس کی خطا کا کفارہ کر دیتا ہے اور اس کی وجہ سے اس کیلئے درجہ میں بلندی ہوتی ہے۔"

(۲) "جب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو اپنے بھائی عقبہؓ کی وفات کی اطلاع ملی تو انکی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا اٹھیں اور انہوں نے کہا کہ یہ رحمت ہے جسکو اللہ پاک نے بنایا ہے۔ ابنِ آدم اس کا مالک نہیں۔"

(۳) "حضرت اُمِّ سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک روز ابو سلمہؓ میرے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے تشریف لائے تو فرمایا کہ میں نے حضورؐ سے ایک ایسی بات سُنی ہے جسکی وجہ سے میں بہت خوش ہوا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جب مسلمانوں میں سے کسی کو مصیبت پہنچائی جاتی ہے تو مسلمان اس مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ (سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۱۵۶) پڑھے اور کہے: اَللّٰهُمَّ اجِرْنِیْ مُصِیْبَتِیْ وَاخْلُفْ لِیْ خَیْرًا مِّنْهَا۔ (اے میرے اللہ! مجھے میری مصیبت میں اجر دے اور اس سے بہتر میرے لئے خلیفہ کر)

"ہے الم کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی"، پر اس مضمون میں مذکور ساری قرآنی آیات اور روایات کی روح اسی نظم "فلسفۂ غم" کے درجِ ذیل تیسرے بند میں اقبال نے سمو دی ہے:

شام جس کی آشنائے نالۂ "یا رب" نہیں — جلوہ پیرا جس کی شب میں اشک کے کوکب نہیں
جس کا جامِ دل شکستِ غم سے ہے نا آشنا — جو سدا مستِ شرابِ عیش و عشرت ہی رہا
ہاتھ جس گلچیں کا ہے محفوظ نوکِ خار سے — عشق جس کا بے خبر ہے ہجر کے آزار سے
کلفتِ غم گرچہ اس کے روز و شب سے دور ہے — زندگی کا راز اس کی آنکھ سے مستور ہے
اے کہ نظمِ دہر کا ادراک ہے حاصل تجھے — کیوں نہ آساں ہو غم و اندوہ کی منزل تجھے

دورِ حاضر میں یورپ اور امریکہ عریانیت وفحاشی کا گہوارہ بنا ہوا ہے، بے خدا تہذیب نے انسانیت کی گاڑی کو دلدل میں لاکھڑا کیا ہے بلکہ ایسے چوراہے پر پہونچا دیا ہے کہ جس کی کوئی منزل نہیں، مغربی تہذیب نے زندگی سے ایمانی روح اور حلاوت سلب کر لی ہے، مسلمانانِ مشرق جو اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر مغرب میں آبسے ہیں ان کی ایک بڑی تعداد اس ناگفتہ بہ تہذیب وتمدن کے رو میں بہہ رہی ہے۔ مسلمانوں کا مغربی تہذیب سے مرعوبیت کا یہ عالم ہے کہ اس کی اہمیت وعظمت نے بکریوں کے ریوڑ کی طرح انہیں ہانکنا شروع کر دیا ہے، ہوش وحواس اتنے باختہ ہو چکے ہیں کہ اس تہذیب کی کوئی چیز بھی نئی آتی ہے تو فوراً اس کی طرف لپک پڑتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔ دین اسلام کے واضح احکامات پر بے جھجک اعتراض وتنقید معمول بن گیا ہے۔ مرد وزن کا مخلوط اجتماع ایک فیشن ہو گیا ہے۔

اس تاریک تہذیب کی اندھی تقلید نے حالات یہاں تک پہونچا دیئے ہیں کہ بہت سے گھرانوں کی زندگی اجیرن ہو چکی ہے۔ راحت وآسائش کے تمام وسائل فراہم ہیں لیکن دل کا سکون ندارد، اعلیٰ قسم کے بستر موجود ہیں لیکن میٹھی نیند سے محروم ہیں، نیند لانے کے لئے خواب آور گولیوں کا استعمال عام ہے۔ ان افسوس ناک حالات کا حل تلاش کرنا نہایت ضروری ہے تاکہ بھٹکے ہوئے مسلمانوں کو راہ راست ملے اور نور اسلام کی روشنی میں اپنی عاقبت سنواریں۔

اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ اسلام کے نام لیوا اور اس کے پروانوں کے مقابلہ میں اسلام کے مخالفین و معاندین کی تعداد اور مختلف قسم کے فتنوں کا شیوع ہر دور اور ہر زمانہ میں زیادہ ہی رہا ہے۔ لیکن اس تاریخی حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ علمار اسلام اور صلحار امت نے ان تمام فتنوں کا پامردی سے مقابلہ کیا اور دشمنان اسلام کو ہر محاذ پر شکست دے کر اور ان کی ہر کوشش کو ناکام بنا کر اسلام کے کارواں کو آگے بڑھایا ہے۔ آج کے دور میں مغربی تہذیب بھی بہت بڑا فتنہ ہے جس کی سرکوبی کے لئے علمار کرام کا قافلہ برسرمیدان نظر آتا ہے۔

علمار امت کے اسی قافلہ کے سپہ سالار اور قطب زمانہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا قدس سرہ کی ذات گرامی کو آج سے تقریبًا ربع صدی قبل اس بات کا فکر لاحق ہوا کہ یہ مغربی تہذیب مسلمانان یورپ کو گمراہی کی طرف نہ لے جائے اور آنے والی نسل اس تہذیب سے متأثر ہو کر دین و ملت ہی کو فراموش نہ کر بیٹھے، چنانچہ حضرت شیخ الحدیث نور اللہ مرقدہ نے اپنے محبوب خلیفہ حضرت مولانا یوسف متالا مدظلہ کو اس طرف توجہ دلائی۔ مولانا نے اپنے دور شباب میں یورپ کی دھرتی پر ایک ایسے ادارے کے قیام کا عزم فرمایا جہاں مسلمانوں کی نسل حصول علم کے ساتھ چوبیس گھنٹہ اساتذہ کی نگرانی میں رہ کر روحانی تربیت بھی پا سکے۔ پھر اس ادارے کی تربیت یافتہ جماعت یورپ میں پھیل کر اشاعت اسلام اور اصلاحی خدمات انجام دے اور اس طرح مغربی تہذیب کے اثر سے فرزندان اسلام کی حفاظت کی جاسکے۔

چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے موصوف کو اس عظیم مقصد میں کامیابی سے ہمکنار فرمایا اور انگلینڈ کے شمال میں اپنی نوعیت کا منفرد ادارہ دارالعلوم العربیۃ الاسلامیۃ کے نام سے قائم کیا جو اپنی مثال آپ ہے۔ یہ دارالعلوم انگلینڈ کے مشہور شہر مانچسٹر کے قریب بری شہر میں واقع ہے۔ محل وقوع دل کو لبھانے والا ہے۔ یہاں کی تعلیم وتربیت کا انداز بھی نرالا ہے۔ یہاں سے فارغ ہونے والے بعض طلبہ اعلیٰ ڈگری کے حصول کے لئے ازہر و مدینہ یونیورسٹی کی طرف روانہ ہوتے ہیں، باقی دین متین کی خدمت کی طرف لگ جاتے ہیں۔

خدائے بالا و برتر نے حضرت مولانا یوسف متالا صاحب مدظلہ کو بہت سے کمالات

سے نوازا ہے۔ آپ کی ذات عزم واستقلال، اخلاص وللّٰہیت، زہد وورع، تحمل وبردباری اور اخفائے حال جیسے اوصاف عالیہ سے متصف ہے۔ حضرت مولانا نے دارالعلوم کی بنا کے بعد لڑکیوں کے لئے بھی اسی طرز کے ادارے کی ضرورت محسوس فرمائی۔ چنانچہ ایک وسیع وعریض جگہ کا انتخاب فرما کر طالبات کے لئے بھی مثالی ادارہ قائم کیا جہاں سے اب تک بحمدہٖ تعالیٰ سو سے زائد طالبات سند فراغت حاصل کر کے انگلینڈ کے مختلف شہروں میں پھیل گئی ہیں اور اپنی اپنی قیامگاہ پر دینی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ دارالعلوم العربیۃ الاسلامیۃ میں جب طلبہ کے لئے مزید گنجائش نہ رہی تو موصوف نے تیسرا ادارہ مدینۃ العلوم الاسلامیۃ کے نام سے قائم فرمایا تاکہ تعلیم وتربیت کے پیاسوں کی تشنگی کو بجھایا جا سکے۔ حضرت مولانا نے تین تین اداروں کی بنیاد ڈال کر اہل برطانیہ پر احسان عظیم فرمایا ہے۔ (دارالعلوم کا قیام اس وقت عمل میں آیا ہے (یعنی ۱۹۷۴ عیسوی میں) جب برطانیہ میں بلکہ پورے مغرب میں کہیں بھی ایسے ادارے کا وجود نہیں تھا۔ اب تو بفضلہٖ تعالیٰ برطانیہ میں مزید ادارے قائم ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو ترقیات سے نوازے۔) خداداد عزم واستقلال کا یہ عالم ہے کہ موصوف دیگر مغربی ممالک میں بھی اسی طرز کے قیام کا عظیم الشان ارادہ رکھتے ہیں۔ (ابھی کچھ عرصہ ہوا پرتگال کے شہر لزبن میں آپ ہی کے زیر سرپرستی ایک ادارہ قائم ہو چکا ہے اور حضرت مولانا ہی کے مرید اور دارالعلوم بری کے فاضل مولوی رضوان کے زیر اہتمام چل رہا ہے۔) مولانا کی بے لوث خدمت کا یہ حال ہے کہ روز اول سے تمام تر خدمات لوجہ اللہ اور توکلاً علی اللہ کرتے چلے آرہے ہیں اور آج تک ایک پائی بھی ان اداروں سے حاصل نہیں کی۔ فجزاہم اللہ احسن الجزاء۔ اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت مولانا کا سایہ تا دیر سلامت رکھے۔ آمین۔

احقر جو موصوف ہی کے مدرسہ کا ایک طالب علم ہے پانچ سال قبل ۱۹۹۰ عیسوی میں حضرت مولانا ہی کے مشورے سے کینیڈا آیا۔ کینیڈا کے مغرب میں واقع ایڈمنٹن شہر کی ایک مسجد میں بطور امام تقرر ہوا۔ یہاں پہونچتے ہی عوام میں دینی محنت اور بچوں میں اسلامی مزاج اجاگر کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، چنانچہ بڑوں میں درس ووعظ کا پروگرام شروع کیا اور بچوں کے لئے مکتب کا انتظام کیا۔

مغربی ممالک میں اسکول کی تعلیم لازمی ہے اور صبح سے شام تک بچہ غیر مسلموں کے سایہ میں پلتا ہے، صرف شام کو دو ایک گھنٹہ مدرسہ میں حاضری دیتا ہے جس سے تھوڑی بہت تعلیم تو حاصل ہو جاتی ہے لیکن تربیت کے لئے چنداں وقت نہیں ہوتا، لہذا ایسے کل وقتی ادارے کی ضرورت محسوس ہوئی جہاں دینی و دنیوی دونوں قسم کی تعلیم کا انتظام ہو اور طلبہ اسلامی ماحول میں رہ کر دینی و روحانی تربیت پا سکیں۔

امریکہ اور کینیڈا مل کر شمالی امریکہ کہلاتا ہے جس کی کل آبادی تیس کروڑ بتائی جاتی ہے۔ ایڈمنٹن شمالی امریکہ کے مغرب میں واقع ہے۔ شہر کی چھ لاکھ کی آبادی میں مسلمانوں کی تعداد کم و بیش پندرہ ہزار ہے۔ یہ شہر اس لحاظ سے ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے کہ پورے شمالی امریکہ میں خدا کے گھر کی سب سے پہلی تاسیس اسی شہر میں ۱۹۳۸ عیسوی میں ہوئی تھی جو الرشید کے نام سے معروف ہے۔

شمالی امریکہ کی طرف بھی قطب الاقطاب حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی نظر پہونچی اور اپنے خلیفہ حضرت مولانا مظہر عالم صاحب مدظلہ کو اس اعلیٰ مشن کیلئے کینیڈا روانہ فرمایا۔ چنانچہ موصوف نے آج سے تقریباً دس سال قبل دینی ادارے کی بنیاد ڈالی۔ یہ ادارہ معہد الرشید الاسلامی کے نام سے مشہور ہے اور کینیڈا کے مشرقی شہر مونٹریال کے قریب واقع ہے۔ درحقیقت یہ ادارہ اس اعتبار سے سب سے پہلا ہے جہاں تعلیم و تربیت کیلئے دارالاقامہ کی سہولت بھی فراہم ہے۔

اس کے بعد کینیڈا ہی کے مشہور شہر تورنٹو کے قریب ہمارے محترم دوست مفتی عبدالماجد صاحب نے بھی اسی طرز کے ادارے کی بنیاد ڈالی جو جامعۃ العلوم الاسلامیۃ کے نام سے موسوم ہے۔ نیز امریکہ کے مشرق میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا قدس سرہٗ ہی کے خلیفہ حضرت ڈاکٹر اسماعیل صاحب مدظلہ نے بھی بفیلو شہر میں تین سال قبل دارالعلوم المدنیۃ کے نام سے کل وقتی ادارے کی بنیاد ڈالی اور اپنے لائق فرزندان مولوی منصور و مولوی ابراہیم کے ساتھ مل کر اسے ایک معیاری ادارہ بنا رہے ہیں۔ (آپ کے دونوں صاحبزادگان حضرت مولانا یوسف متالا صاحب مدظلہٗ ہی کے مدرسہ کے فارغ التحصیل ہیں اور موصوف ہی سے

بیعت وارادت کا تعلق رکھتے ہیں۔) معلوم ہوا ہے کہ حضرت ڈاکٹر صاحب اور مفتی عبدالماجد صاحب اپنے اپنے علاقے میں لڑکیوں کی تعلیم کے لئے بھی انتظام کر رہے ہیں جق جل مجدہ ان تمام مدارس کو دن دوگنی رات چوگنی ترقیات سے نوازے۔

یہ تینوں مذکورہ مدارس شمالی امریکہ کے مشرق میں پانچ سات گھنٹہ کی مسافت پر واقع ہیں، البتہ شمالی امریکہ کا مغربی حصہ جو مشرق سے ہزاروں میل دور ہے مذکورہ طرز کے اداروں سے خالی تھا۔ حضرت مولانا یوسف متالا صاحب مدظلہ کے مشورے سے اس طرف بھی فل ٹائم دینی ادارے کی کوشش شروع ہوئی۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے ایڈمنٹن میں بفضلہ تعالیٰ ساٹھ ہزار مربع فٹ عمارت کو مع بیس ایکڑ اراضی کے خرید لیا گیا ہے۔ یہ انگریزی اسکول تھا جو انشاء اللہ اب مرکز رشد و ہدایت بنے گا۔ خدا کی ذات سے امید ہے کہ یہاں کا تربیت یافتہ نوجوان نہ صرف یہ کہ اپنے گھر اور سوسائٹی کے سنورنے کا سبب بنے گا بلکہ پوری قوم اور ملک کے لئے راہ مستقیم کے ہموار ہونے کا بھی باعث بنے گا۔

ہمیں یہ ذکر کرتے ہوئے نہایت مسرت ہو رہی ہے کہ بفضلہ تعالیٰ ۴ر ربیع الآخر ۱۴۱۶ھ مطابق ۳۰ر اگست ۱۹۹۵ء بروز بدھ چالیس طلبہ سے دارالعلوم کا افتتاح ہو گیا اور حسن اتفاق سے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ کے جانشین و فرزند ارجمند حضرت مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ کی انہی دنوں ہمارے یہاں آمد ہوئی اور موصوف کی دعاؤں سے دارالعلوم کا آغاز ہوا۔

طلبہ شمالی امریکہ کے مختلف گوشوں سے آئے ہوئے ہیں اور چالیس طلبہ سے ابتداء کو ہم نیک فالی سمجھتے ہیں۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا نوراللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ احوال کے تغیر و تبدل میں چالیس عدد کو خاص دخل ہے کہ حدیث سے یہی مفہوم ہوتا ہے چنانچہ بزرگوں کے یہاں چلہ کا بڑا اہتمام رہتا ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ اس دارالعلوم کو شمالی امریکہ میں ایک اچھے انقلاب کا ذریعہ بنائے آمین۔ ثم آمین۔

درس نظامی، تحفیظ القرآن اور انگریزی تعلیم کے علاوہ اس ادارے میں دیگر دینی و

اصلاحی شعبے قائم کرنے کا پروگرام ہے۔ مثلاً:

۱۔ سالانہ اسلامی سیمینار اور دینی کانفرنسوں کا انعقاد۔

۲۔ اسلامی دشمن قوتوں اور اسلام کے روپ میں اسلام ہی کے خلاف سازش کرنیوالی طاقتوں سے مسلمانوں کو آگاہ کرنا۔ نیز روزمرہ پیش آنے والے فتنوں کا تعاقب کرنا اور اس کی سرکوبی کے لئے لائحہ عمل تیار کرنا۔

عجیب اتفاق ہے کہ خدا تعالیٰ نے جس جگہ کو مرکز اسلام کے لئے منتخب فرمایا اس کے قریب ہی پانچ منٹ کے فصل پر آج سے چھ سال قبل مرزائیوں نے پچیس ایکڑ اراضی اس ارادے سے خرید لی تھی کہ مستقبل میں وہاں اپنا مرکز بنائیں گے لیکن خدا کی قدرت دیکھئے کہ ان کے ناپاک عزائم کے پورا ہونے سے قبل ہی اسی جگہ کے قریب اسلام کا مرکز قائم فرما دیا، فللّٰہ الحمد والمنۃ۔ انشاء اللہ اس مرکز کی برکت سے باطل بھاگے گا اور حق کا بول بالا ہوگا۔ جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقا۔

۳۔ نوجوان جو اپنے ماں باپ سے روٹھ کر بچھڑ گئے ہیں یا جو چرس وغیرہ کے عادی ہوکر زندگی سے مایوس ہو چکے ہیں ان کے لئے بھی ایک شعبہ قائم کرنے کا پروگرام ہے تاکہ انہیں اس مصیبت کدہ سے نکال کر زندگی کی حقیقت سے روشناس کرایا جائے اور ان کے مستقبل کے لئے کوئی لائحہ عمل تیار کیا جائے۔

۴۔ میاں بیوی کے درمیان جھگڑوں کا حل تلاش کرنا۔

نزاع بین الزوجین مغربی دنیا کا ایک عام مرض ہے جو مغربی آزادی کا پیدا کردہ ہے ایسے پریشان حال مسلمانوں کی خدمت کے لئے بھی ایک شعبہ قائم ہوگا تاکہ سہ بار گھر کو آباد کیا جاسکے۔

۵۔ دعوت اسلام اور نومسلموں کی تربیت۔

یہ بھی خدا کی عجیب قدرت ہے کہ مغربی دنیا میں کفار اور عیسائیوں کی بڑی تعداد جو راہ حق کی متلاشی ہے حلقہ بگوش اسلام ہو رہی ہے۔ بفضلہ تعالیٰ گذشتہ تین سالوں میں پانچ انگریز اس ناچیز کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہو چکے ہیں۔ ان نومسلموں کی رہنمائی مسلمانوں کا

اہم فریضہ ہے۔ چنانچہ اس ادارے میں نومسلموں کے لئے تربیتی شعبہ کے قیام کا پروگرام ہے تاکہ یہ امریکی نومسلم تربیت پاکر جب اپنے ہم قوم و ہم وطن کے پاس داعی اسلام بنکر جائیں تو ان کی قوم تلقی بالقبول کے ساتھ انہیں خوش آمدید کہے۔

یہ ہیں دارالعلوم کے قیام کے مقاصد جن کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کی خداوند قدوس سے مدد طلب کرتے ہیں۔

ناسپاسی ہوگی اگر اپنے والد محترم اور استاذ مکرم حضرت مولانا محمد آدم صاحب مدظلہٗ کا ذکر خیر نہ کروں کہ جن کے حوصلہ افزا مشوروں نے اس اہم مشن کے بیڑا اٹھانے میں بہت مدد دی ہے۔ موصوف دارالعلوم دیوبند کے مایۂ ناز فرزند ہیں۔ پہلے افریقہ اور ۱۹۷۰ عیسوی سے انگلینڈ کے شہر لسٹر کی جامع مسجد میں خطابت و امامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ آپ کے اصلاحی مواعظ سے بے شمار لوگوں کی زندگی میں انقلاب آیا ہے۔ احقر نے والد محترم ہی سے قرآن کریم حفظ کیا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کے سایہ کو تادیر سلامت رکھے، خداوند قدوس اس نااہل و نابکار کو بھی صلاحیت و استعداد اور اخلاص وللّٰہیت کی دولت سے نوازے۔ آمین یارب العالمین وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد و آلہ و صحبہ و بارک وسلم۔

احقر الانام احمد علی غفرلہ
خادم دارالعلوم الاسلامیہ
ایڈمنٹن، کینڈا

حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھی فاضل دارالعلوم دیوبند

پیدائش تقریباً ۱۳۱۹ھ • وفات ۲۴ جمادی الثانی ۱۴۰۹ھ

مدت عمر تقریباً ۹۰ سال

از: مولانا اسماعیل بن مولانا مرغوب احمد ڈیوزبری

حضرت مولانا میرٹھیؒ کو امام العصر حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ اور مشاہیر علمائے دیوبند سے شرف تلمذ حاصل تھا۔

تدریسی خدمات فراغت کے بعد مدرسہ امینیہ میں تدریسی خدمات انجام دیں، ساتھ ساتھ دارالمصنفین سے بھی متعلق رہے۔ سرکاری امتحانات کی تیاری کے لئے دہلی میں "ادارہ شرقیہ" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، جو مدتوں خدمات انجام دیتا رہا جس سے ایک بڑی جماعت نے فائدہ اٹھایا اور عربی، اردو، فارسی کی معیاری تعلیم حاصل کی، قیام پاکستان کے بعد جب مولانا پاکستان تشریف لے گئے تو کراچی میں بھی اسی طرز کا ادارہ قائم فرمایا، یہاں بھی سینکڑوں افراد نے استفادہ کیا۔ حضرت اقدس مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے دارالعلوم کورنگی کی بنیا درکھی تو وہاں سلسلہ تدریس شروع فرمادیا، مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ نے مرحوم کے اسی دور کا خوب ذکر فرمایا ہے۔ مولانا رقمطراز ہیں:

"یہ وہ وقت تھا جب ۱۳۷۷ھ (۱۹۵۷ء) میں دارالعلوم نانک واڑہ کی قدیم عمارت سے حالیہ جدید عمارت میں منتقل ہوا تھا، اس وقت دارالعلوم کے آس پاس نہ کورنگی کی آبادی تھی نہ اس کا کوئی تصور، دارالعلوم کی زمین جنگلی جھاڑیوں اور ریتیلے ٹیلوں کے درمیان دو پختہ اور ایک زیر تعمیر عمارت پر مشتمل تھی قریب میں ایک قدیم شرافی گوٹھ کے سوا کوئی آبادی نہ تھی، نہ بجلی تھی نہ پانی، نہ ٹیلیفون، اور شہر سے رابطہ کے لئے بس بھی

ایک میل کے فاصلے پر ملی تھی، اور یہ پورا فاصلہ لق ودق صحرا پر مشتمل تھا، مولانا کے لئے ادارۂ شرقیہ کی ذمہ داریوں کو یک لخت چھوڑنا ممکن نہیں تھا، اور اس لئے وہ دارالعلوم میں مستقل قیام بھی نہیں فرما سکتے تھے چنانچہ انہوں نے دارالعلوم میں تدریس کے لئے روزانہ آمد ورفت کا سلسلہ شروع کیا، شہر سے روزانہ دو بسیں بدل کر لانڈھی پہنچنا، اور وہاں سے ایک ڈیڑھ میل کا فاصلہ اس طرح پیدل طے کرنا کہ ساتھ کتابیں بھی ہوتیں، اور چونکہ مولانا چائے اور پان کے نہ صرف عادی بلکہ بلانوش تھے اس لئے ساتھ چائے کا تھرماس بھی ہوتا، اور پان کا سامان بھی، اور پھر کئی گھنٹے جم کر درس دینا، اور بعد میں اسی طرح شہر واپس جانا، اور وہاں جاکر ادارہ شرقیہ کی ذمہ داریاں نبھانا روزمرہ کا معمول تھا جسے دیکھ کر ہم نوجوانوں کو بھی پسینہ آتا تھا، اور یہ معمول ایک دو دن یا چند ماہ نہیں مسلسل چار سال تک جاری رہا اور اس ساری مشقت کے صلے میں مولانا نے کوئی مالی معاوضہ لینا گوارہ نہیں فرمایا"۔

آگے تحریر فرماتے ہیں:

"دارالعلوم کے اس دورافتادہ مقام کا، اور اس بے سروسامانی کے دور میں روزانہ شہر سے آکر کئی گھنٹے پڑھانا یقیناً مولانا کے لئے ایک شدید مجاہدہ سے کم نہ تھا لیکن مولانا نے یہ مجاہدہ کئی سال جاری رکھا، پھر بالآخر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ میں جو اب جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے نام سے معروف ہے تدریس شروع فرمادی"۔

جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں آمد اور آخر تک یہی خدمت

دارالعلوم کورنگی سے مولانا مرحوم بنوری ٹاؤن میں تشریف لے آئے اور زندگی کے آخری دن تک اسی مدرسہ میں رہکر حضرت بنوریؒ سے کیا ہوا وعدہ پورا فرمایا، حضرت مولاناؒ کو چونکہ نسبت انوری کے سبب علامہ محمد یوسف بنوریؒ سے والہانہ عقیدت ومحبت تھی اسلئے مولاناؒ نے یہ عزم کررکھا تھا زندگی کے آخری سانس تک حضرت بنوری کی دائمی رفاقت اور حضرت کے مدرسہ سے دائمی نسبت رکھوں گا، حضرت اقدس مولانا بنوریؒ کی وفات پر مولاناؒ نے ایک مضمون "نابغۃ العصر" کے عنوان سے لکھا

میں تحریر فرماتے ہیں:

"باقی یہ عہد بدستور ہے کہ زندگی بھر حضرت مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار مدرسہ عربیہ اسلامیہ کو سینے سے لگائے رہونگا اور مدرسہ کے علاوہ کسی بھی دوسری جگہ کام نہ کرونگا گرچہ وہاں دنیاوی منافع کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہوں"

ایک مرتبہ "البینات" کی ادارت سے مولانا عبدالرشید نعمانی صاحب کے استعفی پر یہ سوال پیدا ہوا کہ مدیر مسئول کے لئے کس کی پسندگی ہو۔ اس پر مولانا نے حضرت بنوریؒ سے عرض کیا کہ:

"اگر آپ ایسے شخص کو مدیر مسئول بنانا چاہتے ہیں جس کا فیصلہ یہ ہو کہ میں مدرسہ سے قبرستان ہی جاؤں گا تو میرا نام دیدیجئے"

جامعۃ العلوم الاسلامیہ میں درس و تدریس کے ساتھ تخصص فی الحدیث کے نگران بھی رہے، اس کے علاوہ انتظامی امور میں بھی حضرت بنوری کے معاون تھے۔

وفاق المدارس اور مولانا

مولانا کے دل میں یہ تڑپ عرصہ سے تھی کہ دینی مدارس جو درحقیقت برصغیر میں اسلام کے قلعوں کی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں تعلیم کا نظم و ضبط مستحکم اور معیاری ہونا چاہئے اور اس معاملہ میں مختلف مدارس کے درمیان جو تفاوت پایا جاتا ہے اس کو کم کرنا چاہئے چنانچہ جب اس غرض سے وفاق المدارس العربیہ کا قیام عمل میں آیا تو اگرچہ اس تنظیم کے رسمی مناصب پر تو اس وقت کے مشاہیر علماء حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسے حضرات فائز رہے، لیکن اس بات کا اعتراف ان سب حضرات نے بارہا کیا کہ عملی طور پر وفاق کے کرتا دھرتا درحقیقت حضرت مولانا ادریس صاحب ہی تھے۔ ہر تنظیم کی طرح وفاق بھی اپنی ابتداء میں وسائل کی قلت کا شکار تھا، اور مولانا محرّری سے لے کر ڈاک کی ترسیل تک تمام کام تن تنہا انجام دیتے تھے اور راتوں کو جاگ جاگ کر یہ کام نمٹائے۔

چنانچہ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد باتفاق آپ ہی کو

وفاق المدارس کا صدر منتخب کیا گیا، اور آپ اس عہدہ پر آخر تک فائز رہے (البلاغ کراچی)
مولانا محمد یوسف لدھیانوی تحریر فرماتے ہیں:
"جب "وفاق المدارس العربیہ" کی تنظیم عمل میں آئی تو حضرت مولانا کو اس کا ناظم مقرر کیا گیا اور جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ حضرت مرحوم ہی کی شخصیت تھی جس نے وفاق کو خون جگر سے سینچ کر پاکستان میں دینی مدارس کے لئے شجرۂ طوبیٰ بنا دیا، اس ضمن میں ان کے واقعات وسوانح کی ایک تاریخ ہے" (البیّنات، شعبان ۱۴۰۹ھ)

مولاناؒ کا انداز درس وتدریس

اوصاف وکمالات اس سلسلہ میں مولانا محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں:

"برادر محترم جناب مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب اور احقر کو یہ شرف حاصل ہے کہ..... ہم نے دیوان حماسہ حضرت مولانا سے پڑھا، مولانا بڑے لطیف ادبی مذاق کے حامل تھے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ان کے دیوان حماسہ کے درس کی حلاوت ۳۲ سال گذر جانے کے بعد بھی قلب وذہن میں اسی طرح تازہ ہے، اور دیوان حماسہ کے اشعار ان کے مخصوص انداز و آہنگ اور آواز کی اسی گھن گرج کے ساتھ آج بھی کانوں میں گونجتے ہیں، اور بہت سے اشعار کی تشریحات اور اس کے ذیل میں بتائے ہوئے افادات اس طرح یاد ہیں، جیسے کل ہی ان سے یہ درس لیا ہو، درس کی یہ تاثیر بہت کم اساتذہ کے حصہ میں آتی ہے کہ طالب علم کو سالہا سال گذرنے پر بھی اس کی چھوٹی چھوٹی باتیں ہی نہیں استاذ کا لب ولہجہ بھی مستحضر رہ جائے۔

مولانا اپنے حماسہ کے درس میں الفاظ کی لغوی تحقیق اور نحوی ترکیب کے علاوہ شعر کے مختلف ممکن معانی پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالتے، اور اس کے ذیل میں عربوں کی معاشرت ان کی تاریخ، انکی عادات ونفسیات، اور بالخصوص جاہلی اور اسلامی عہد کے درمیان پیدا ہونے والے فرق کی ایسی وضاحت فرماتے کہ طلبہ کے سامنے عرب کی خانہ بدوش اور قبائلی زندگی کا نقشہ کھنچ جاتا، جاہلیت کی شاعری میں مشاہدہ کی جو قوت اور ذہنوں کی نفسیاتی کیفیت کا جو بے ساختہ بیان پایا جاتا ہے، اس سے خود بھی لطف لیتے، اور پڑھنے والے کو اس لطف میں حصہ دار بناتے، چنانچہ اسی وقت سے حماسہ کے بیشتر اشعار جو مولانا سے پڑھے تھے کسی کوشش "

کے بغیر آبدیدہ ہوگئے تھے، اور آج بھی جب کبھی وہ اشعار پڑھتا ہوں تو مولانا کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔"

حضرت الاستاذ کا طریقہ تربیت

مولاناؒ چونکہ علوم مروجہ میں پختہ استعداد کے حامل تھے عربیت کا خاص ذوق تھا، اور مختلف تجربات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ دین کی خدمات کے مختلف شعبوں میں اپنے اسلاف و اساتذہ کے طرز پر چل کر کسی مدرسہ ہی سے متعلق ہو کر روایتی طریقے سے علوم اسلامیہ کی درس و تدریس ضروری ہے چنانچہ مولاناؒ نے بڑی قربانیوں کے ساتھ ادارہ شرقیہ کی ذمہ داری کو نبھاتے ہوئے اولاً دارالعلوم کراچی میں پھر جامعۃ العلوم الاسلامیہ میں تدریس کے فرائض انجام دیئے حتی کہ بنوری ٹاؤن آکر آپ نے ادارہ شرقیہ کے مشغلہ کو بالکل ہی ختم کردیا، اور ہمہ تن درس و تدریس ہی کے ہو کر رہ گئے۔

تدریس کی مشغولی کے ساتھ مولاناؒ کو طلبہ کی تربیت کی بڑی فکر تھی، یہ بات قطعاً برداشت نہیں فرماتے کہ طلبہ اپنا قیمتی وقت ضائع کردیں. کڑی نگرانی رکھتے، مطالعہ کی مقدار پوچھتے، کبھی کبھی کسی خاص موضوع پر مذاکرہ فرماتے، ہدایات ارشاد فرماتے اور ذوق مطالعہ کی ترغیب دے کر دلچسپی بڑھاتے۔

طلبہ سے مضامین لکھوانے کا ایک عجیب جذبہ تھا، طالب علم کوئی مضمون لکھتا تو خوشی کا اظہار فرماتے، ملاحظہ فرماتے، اصلاح فرماتے، اور مفید مشوروں سے نوازتے تھے، مضمون نویسی کی تربیت میں اس بات کا اہتمام فرماتے طلبہ محض نقال نہ بنیں فرمایا کرتے تھے کہ:

"کسی کا کوئی اقتباس نقل کرو تو اس کے متعلق اپنی رائے ضرور ظاہر کرو، تنقید یا تبصرہ کرو محض نقال نہ بنو، نقل کوئی کمال نہیں۔"

نماز اور بیت اللہ سے محبت

مولانا مرحوم کو حق تعالٰے نے جن صفات و کمالات سے نوازا تھا ان میں ایک نمایاں وصف نماز کا خاص ذوق اور جماعت کا اہتمام تھا، آخری عمر میں جبکہ ضعف و ناتوانائی اور معذوری جس میں چند قدم چلنا بھی دشوار تھا، اس کے باوجود صف اول کا ایسا اہتمام تھا جس کی مثالیں بہت کمیاب ہیں،

انہیں دنوں، ہفتوں، یا مہینوں نہیں بلکہ برسوں تک کبھی مسبوق دیکھنے کی نوبت نہیں آتی تھی نماز میں انہماک و خشوع و خضوع خوب تھا، جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو دنیا و مافیہا سے کٹ کر پروردگار کے حضور میں اپنی عبودیت کا نذرانہ پیش کرتے۔ حدیث شریف میں آتا ہے "ان المصلی یناجی ربہ فلینظر ما یناجیہ بہ" (مشکوٰۃ صـ) (بے شک نمازی اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے پس اسے اس چیز کو دیکھنا چاہئے جس کے ساتھ وہ اللہ سے سرگوشی کرتا ہے) مولانا مرحوم کی کیفیت صلوٰۃ ایسی ہی تھی کہ دیکھنے والوں کو "فانما یناجی ربہ" کی جھلک نظر آجاتی۔

حضرت الاستاذ حدیث نبوی "اقرب مایکون العبد من ربہ و ھو ساجد فاکثروا الدعاء" (بندے کو اپنے رب کا سب سے زیادہ قرب سجدہ کی حالت میں ہوتا ہے لہٰذا کثرت سے دعا کیا کرو) (صحیح مسلم مشکوٰۃ صـ۸۴)۔ اور "واذا سجد تم فاجتھدوا فی الدعاء فانہ قمن ان یستجاب لکم" (اور جب سجدے میں جاؤ تو دعا میں خوب کوشش کرو، کیونکہ یہ اس لائق ہے کہ اسے قبول کیا جائے۔ نسائی صـ۱۶۸) کی بنا پر نماز کے سجدے میں دعائیں کرنے کے عادی تھے، جب بھی کوئی تکلیف یا مصیبت آجاتی تو سجدے میں دعاؤں کا اہتمام فرماتے۔ ایک بار فرمایا کہ مجھے پیشاب کی تکلیف ہوگئی ہے میں نے نماز سے سجدے میں یہ دعا شروع کر دی ہے "ربّ انی مسّنی الضر وانت ارحم الرحمین" انشاء اللہ جلد شفا ہو جائے گی۔

نماز کے بعد مولاناؒ کو سب سے زیادہ شوق اور والہانہ ذوق حرمین شریفین کی حاضری کا تھا، اور اس کی قابل رشک توفیق بھی ملی تھی، زندگی کے آخری پچیس تیس سال سے ان کا یہ معمول قضا نہیں ہوا تھا کہ رمضان حرمین شریفین میں گذارتے اور ذوالحجہ میں دوبارہ حج کے لئے تشریف لے جاتے۔ اس طرح سال میں دو مرتبہ یہ سعادت جو بڑے بڑے دولت مندوں اور عرب باشندوں تک کو حاصل نہیں ہوتی وہ آپ کی زندگی کا لازمۂ زندگی بن گئی تھی، دیکھنے والے مادی تصور سے اس بات کو دیکھ کر حیران ہوتے ہونگے سال بھر کی معمولی تنخواہ ان اسفار کی کفالت کیسے کرتی ہوگی۔ ساتھ ہی انتظامی مجبوریاں

کیسے مانع نہ بنتی ہوں مگر چونکہ آپ فنائی ذات اللہ والکعبہ تھے اور حق تعالیٰ کی ذات مسبب الاسباب ہے ساری رکاوٹیں دور فرماکر اس عاشق کو اپنے در پہ بلاکر تسکین دی، حج اور عمرہ کا وقت آتا تو ویزا کے انتظار میں مولاناؒ بے چینی و بے قراری میں رہتے مگر جب ویزا کی منظوری کی اطلاع آجاتی تو یکایک وہ بے قراری مسرت و شادمانی میں تبدیل ہوجاتی، وفات سے کچھ عرصہ قبل احباب کی یہ رائے ہوئی حضرت کی کمزوری و ناتوانی اب حج کی مشقتوں کی متحمل نہیں، اس لئے اس سال ویزا نہ لیا جائے چنانچہ جب مولاناؒ کو ویزا نہ ملنے کی اطلاع دی گئی تو ان پر غم واندوہ کی ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ دیکھنے والوں کو رحم آنے لگا۔ مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانویؒ نے صحیح لکھا ہے۔

”حج اور عمرہ کے شائقین تو بہت دیکھے ہیں اور بعض خوش نصیبوں کو اس بارگاہ اقدس کی حاضری کا شرف بھی بار بار حاصل ہوتا ہے، لیکن بیت اللہ سے عشق اور حج اور عمرہ کے لئے سوز وگداز عشق وانجذاب اور فریفتگی ووالہیت کی جو کیفیت حضرت مولانا میں دیکھی وہ اپنی مثال آپ تھی۔ فرماتے تھے:“بس دو چیزوں کے لئے زندہ ہوں، ایک حرمین شریفین کی حاضری، دوسرے حدیث وتفسیر کا درس“

مولانا مرحوم کو حرمین شریفین کی حاضری میں خصوصیت کے ساتھ حفاظت اوقات کا بڑا اہتمام رہتا وہ وہاں کے قیمتی اوقات کا ایک ایک لمحہ وصول کرنا چاہتے تھے، اس لئے اس حاضری میں مولاناؒ کا مجاہدہ بہت بڑھ جاتا تھا۔ فرمایا کرتے تھے:

”قطع نظر اس سے کہ یہاں کے اوقات بہت قیمتی ہیں، میں یہ سوچتا ہوں کہ ہم نے اس سفر پر کتنے گرانقدر مصارف برداشت کئے ہیں ہمارا یہاں کا ایک ایک دن ہزار ہزار روپے میں پڑتا ہے، اس قدر مصارف برداشت کرکے بھی ان اوقات کو ضائع کرنا کس قدر افسوسناک حرکت ہے“

مولاناؒ کے چند خصائل

حضرت مولاناؒ کے مزاج میں طبعاً سختی تھی، طلبہ اور ماتحتوں سے خوب بازپرس کرتے۔ انتظاماً ہر ایک آپ کے رعب سے مرعوب تھا، آپ کے سامنے کسی کو مناقشہ کی ہمت نہ تھی، تاہم کسی پر کوئی زیادتی نہیں کی نہ کسی کو اس کے حق سے محروم رکھا۔ اپنی ذمہ داری کو نبھانا اور جو کام مولانا کے سپرد ہوتا اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانا یہ آپ کی ایک لائق رشک خصوصیت تھی، مخلصانہ دینی جذبہ کے ساتھ بے پناہ قوت عمل کے حامل تھے ان کے یہاں عزیمت ہی عزیمت تھی وہ مشکل سے مشکل وقت میں بھی رخصت پر عمل کرنے کے قائل

نہیں تھے، مولاناؒ کو فضولیات اور مجلس آرائی سے سخت نفرت تھی وہ اپنے لمحات زندگی مفید کاموں میں مشغول رکھتے تھے۔ باوجودیکہ آپ حضرت بنوری سے عمر میں کم نہ تھے مگر حضرت بنوریؒ کو اپنے شیخ علامہ کشمیریؒ کا آئینہ سمجھتے تھے اور آپ سے بے انتہا محبت فرماتے اور عقیدت مندانہ برتاؤ فرماتے تھے۔ مولانا بڑے بلند آواز بزرگ تھے، طلبہ درس گاہ سے دور دارالاقامہ میں آپ کی آواز سن کر آپ کی تشریف آوری پر مطلع ہو جاتے۔

چائے اور پان کے بڑے عادی تھے فرماتے تھے کہ "بھئی چائے اور پان دیئے جاؤ پھر جتنا چاہو بٹھائے رکھو"

تصنیف وتالیف | حق تعالیٰ نے مولانا مرحومؒ کو تحریر کا بھی عمدہ ملکہ عنایت فرمایا تھا، گوناگوں دینی وعلمی خدمات میں مولاناؒ کی تصنیفات بھی آپ کی خدمات کا ایک سنہرا باب ہے جس کی فہرست درج ذیل ہے

(۱) "اسلام میں سنت کا تشریعی مقام" یہ ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی المصریؒ کی اہم ترین اور مستشرقین کے رد میں لاجواب کتاب "السنة ومکانتها فی التشریع الاسلامی" کا سلیس ترجمہ ہے۔ جو شائع ہو چکی ہے اور اس کتاب سے سینکڑوں افراد کے حدیث کی تشریعی حیثیت کے متعلق شبہات دور ہوئے۔ (۲) علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ کی مشہور زمانہ تصنیف "اکفار الملحدین" کا بامحاورہ ترجمہ مولاناؒ نے تین چار سال کی شب وروز کی سعی کے بعد فرمایا جو مجلس علمی کراچی کی طرف سے شائع ہوا۔ (۳) شرح اردو ریاض الصالحین" یہ ناتمام تصنیف اگر پایہ تکمیل تک پہنچ جاتی تو ریاض الصالحین کی ایک بہترین اردو شرح ہو جاتی۔ (۴) "ترجمہ حصن حصین مع تشریح"۔

ان کے علاوہ مولاناؒ کے قابل قدر مضامین ماہنامہ "بینات" میں شائع ہوتے رہے، صدر پاکستان محمد ایوب خان مرحوم کے دور میں ادارۂ تحقیقات اسلامیہ، اسلام آباد، اور اس کے ڈائریکٹر فضل الرحمٰن کی تجدد پسندانہ تحقیقات سامنے آئیں، جو درحقیقت تحریف دین کی سرحدوں کو چھو رہی تھیں تو مولاناؒ نے "بینات" میں اس تجدد کے اژدہا کا سر کچلنے کے لئے اس کے خلاف بڑے وقیع علمی مقالے تحریر فرمائے۔

مرض ووفات | سالہا سال سے ذیابیطس کے مرض میں تو مبتلا تھے، پچھلے چند سالوں سے ضعف

بہت بڑھ گیا تھا چند قدم چلنا بھی دشوار ہوگیا تھا، ۲۴ جمادی الثانیہ کو طبیعت زیادہ ناساز تھی، نماز فجر بھی گھر ہی پر ادا کی، ڈاکٹر کو بلایا، انہوں نے آرام کا مشورہ دیا، ڈاکٹر کے جانے کے بعد نو بجے کے قریب جلالین شریف کے درس کے لئے نیچے تشریف لائے اور فرمایا کہ ڈاکٹر نے منع کیا تھا مگر قلب پر سبق کا ترک شاق گذرا۔ سورۂ مطففین کا درس دیا یہ مولانا کے آخری دن کا آخری درس تھا۔ گیارہ بجے کے قریب غنودگی سی کیفیت طاری ہوئی، تیمارداروں نے خیال کیا کہ شاید رات میں نیند نہ آنے کے سبب آرام کا تقاضا ہے مگر ڈاکٹر صاحب نے دیکھ کر فرمایا کہ آخری وقت ہے، چنانچہ پونے بارہ بجے روح پرواز کرگئی۔

عجیب اتفاق ہے کہ مولانا کے آخری درس میں اس منزل کا تذکرہ تھا جس کے حصول کے لئے مؤمن عمر بھر تگ و دو جاری رکھتا ہے۔ یعنی "ان الابرار لفی نعیم"

تجہیز و تکفین کے بعد حضرت مولانا مفتی احمد الرحمن صاحب دامت برکاتہم کی امامت میں بعد نماز مغرب جنازہ کی نماز ادا کی گئی، اور دارالعلوم کورنگی کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

صد شکر کہ آ پہنچا لب گور جنازہ　　　لو بحر محبت کا کنارہ نظر آیا

حق تعالیٰ شانہ استاذ محترم کے ساتھ رحمت و عنایت کا خاص معاملہ فرمائیں، اور درجات عالیہ نصیب فرمائیں۔ آمین

اللھم اکرم نزلہ و وسع مدخلہ، وابدلہ داراً خیراً من دارہ، واھلاً خیراً من اھلہ۔

احقر کا حضرت مولانا سے تعلق

راقم الحروف کو حضرت مولانا سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ وفات سے تقریباً ۹ ماہ قبل صحیح مسلم شریف بندہ نے مولانا سے پڑھی۔ اگرچہ یہ زمانہ حضرت مولانا کے انتہائی ضعف و پیرانہ سالی کا تھا پوری توجہ کے باوجود بھی حضرت کی درسی تقریر اچھی طرح سنائی نہ دیتی مگر حضرت مولانا مرحوم کے طفیل امام العصر علامہ کشمیری سے بیک واسطہ شرف تلمذ ایک ایسی نعمت آئی تھی جو اسی درس سے حاصل ہوئی اس لئے پورے ذوق و شوق سے درس میں حاضری دیتا تھا اور کامل توجہ سے حضرت کے افادات کو سننے و سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ فالحمد للہ علی ذلک۔

ماہ رجب المرجب سنہ ۱۴۱۶ھ مطابق ماہ دسمبر سنہ ۱۹۹۵ء

جلد نمبر ۸۰	شمارہ نمبر ۱۲	فی شمارہ -/۶	سالانہ -/۶۰

نگراں	مدیر
حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب	حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی
مہتمم دارالعلوم دیوبند	استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم۔ دیوبند، سہارنپور (یوپی)

سالانہ بدل اشتراک

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۲۰۰ روپے

پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۱۰۰

بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم -/۸۰

ہندوستان سے -/۶۰

PH. NO. [illegible] COD - [illegible] PIN - [illegible]

فہرست مضامین

ختم خریداری کی اطلاع

○ یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے، اس لئے وی، پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کردیں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔
- بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس الرحمن سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ شانتی نگر ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

ہمارے ملک ہندوستان نے آزادی کے تقریباً ۴۸ سال پورے کر لئے ہیں۔ قوموں اور ملکوں کے عروج وزوال ارتقاء وانحطاط میں یہ مدت اگرچہ کوئی فیصلہ کن حیثیت نہیں رکھتی، پھر بھی یہ ایک ایسا لمبا وقفہ ہے جس میں بچے جوان اور جوان بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ملک کی تعمیر وترقی اور پستی وگراوٹ کا جائزہ لیتے وقت اسے یکسر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

آزادی کے اس ۴۸ سالہ عہد میں باستثناء ڈیڑھ دو سال کے ملک کی زمام اقتدار "کانگریس" ہی کے دستِ تصرف میں رہی ہے۔ اور آج بھی بلاشرکتِ غیرے وہی اس پر قابض ومتصرف ہے۔ بلاشبہ اس مدت میں ہندوستان نے علم وسائنس، صنعت وحرفت تجارت وزراعت وغیرہ میدانوں میں قابلِ ذکر پیش رفت اور ترقی کی ہے۔ اور بلاشبہ ان میدانوں میں آج اسے اپنے پڑوسی ملکوں پر واضح برتری اور نمایاں فوقیت حاصل ہے۔ اپنی اس کامیابی پر کانگریسی حکومت بجا طور پر فخر کرسکتی ہے۔

لیکن علمی، صنعتی اور زراعتی میدانوں میں اس خوش آئند پیش قدمی پر اظہارِ مسرت کے ساتھ حکمراں طبقہ کو اس تلخ حقیقت کا بھی اعتراف کرنا چاہئے کہ ۴۸ سال کے اس عرصہ میں ہمارا ملک اخلاقی اعتبار سے پستی اور گراوٹ کی انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ انارکی، لاقانونیت جھوٹ، فریب، لوٹ، کھسوٹ، تعصب، منافرت، جھگڑا فساد، اور قتل وغارت گری ملک کے معاشرے کا لازمی جزو بن چکے ہیں۔ دفتر کے معمولی چپراسیوں سے لے کر عزت مآب وزراء تک قانون اور اخلاق سے بالاتر ہو کر زراندوزی میں لگے ہوئے ہیں۔ سرکاری عدالتوں میں دن دھاڑے عدل وانصاف نیلام ہوتا ہے۔ اور وہ ملک جو امن وآشتی کا گہوارہ اور

محبت واخوت کا سدابہار چمنستان تھا جس کی رواداری وصلح جوئی پورے عالم میں مشہور تھی۔ عدم تشدد اور اہنسا جس کا قومی آئیڈیل تھا آج وہی ملک منافرت وتعصب کی آماجگاہ اور ظلم وتشدد کی رزمگاہ بنا ہوا ہے۔ سال کا کوئی مہینہ اور مہینہ کا کوئی ہفتہ ایسا ہیں گذرتا جس میں مذہب یا ذات برادری کے نام پر فساد، غارت گری اور خون ریزی کا بازار گرم نہ ہوتا ہو جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ملک کی اقلیتیں اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگی ہیں اور ان کے اندر اپنی مدافعت کے لئے ہتھیار سنبھال کر میدان میں نکل آنے کا رجحان بڑھتا جارہا ہے۔

اگر ملک کے یہی لیل ونہار رہے اور جبر وتشدد کے اس سیل رواں کے آگے بند لگانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ تو اس کی سرکش موجیں نہ صرف صنعتی ومعاشی ترقیات کو خس وخاشاک کی طرح بہالے جائیں گی بلکہ ملک کی سالمیت اور استحکام کی بنیادوں کو بھی اکھاڑ پھینکیں گی۔ اور اس تباہی وبربادی، انتشار واختلال کی تمام تر ذمہ داری تنہا کانگریس پارٹی اور اس کی حکومت کے سر آئے گی۔ اس لئے حکومت وقت کو اگر ملک کا استحکام، اس کی سالمیت اور اپنی نیک نامی نہیں بلکہ اپنا وجود وبقا عزیز ہے تو اُسے پہلی فرصت میں دہشت گردی اور تشدد پسندی کے رجحان کو جس طرح بھی ممکن ہو ختم کرنا چاہئے، کیونکہ کوئی بھی حکومت چاہے وہ اقتصادی ومعاشی اعتبار سے کتنی ہی مستحکم ومضبوط کیوں نہ ہو، ظلم وجور کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتی۔ ؎

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را
چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

ہٹلر اور مسولینی کی قوت اور شوکت اور رعب ودبدبہ سے کون واقف نہیں ہے۔ لیکن ظلم وتشدد نے انہیں ذلت ونکبت کے ایسے گڑھے میں پہنچا دیا ہے کہ آج عزت کے ساتھ ان کا نام لینے کا بھی کوئی روادار نہیں ہے۔ برطانوی سامراج کی سبق آموز اور عبرت خیز داستان نگاہوں کے سامنے ہے۔ ایک وقت وہ تھا کہ اس کی حدود سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ مگر مکر وفریب اور ظلم وستم کی خوئے بد نے انہیں آج ایک محدود خطے میں محصور

ہو جانے پر مجبور کر دیا ہے۔

ارباب اقتدار کو ان واقعات سے سبق لینا چاہئے۔ اور اس غلط فہمی میں ہرگز رہنا نہیں چاہئے کہ فسطائی اور دہشت پسند طاقتوں کا رُخ ہمارے بجائے اقلیتوں کے ایک خاص طبقہ کی جانب ہے، اور ان کے ہاتھوں جان و مال کا جو زیاں ہو رہا ہے۔ اس سے ملک یا ہماری حکومت کو کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا ہے۔ نہیں نہیں مظلوموں کا خون ایک نہ ایک دن ضرور رنگ لائے گا۔ اور اُن کے جھلستے ہوئے جسموں کا دھواں برق سوزاں بن کر تمہارے خرمنِ اقتدار کو خاکستر کر دے گا۔ ؎

نہ سمجھو گے تو مٹ ہو جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہارا تذکرہ تک بھی نہ ہوگا داستانوں میں

(بقیہ صـ۵۶ـ کا)

دعا کی کہ اللہ تعالےٰ آپ کی کوششوں کو کامیاب کرے۔ ورلڈ ایسوسی ایشن آف قازق کے نائب صدر سلطان علی بلغا بائف نے بھی انہی جذبات کا اظہار کیا۔ ممتاز دینی تنظیموں کے راہ نماؤں، ائمہ مساجد اور پاکستانی و قازق شہریوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کے سلسلے میں اپنا کردار ادا کریں گے اور اس کو مشن کے طور پر اپنائیں گے۔

قازقستان کے ممتاز عالم دین شیخ خلیفہ الطائی کے مختصر تعارف کے بغیر میرا یہ سفر نامہ نامکمل رہے گا۔ شیخ خلیفہ الطائی کا تعلق قازق قوم سے ہے۔ وہ چین میں ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ کمیونسٹ انقلاب کے بعد ترکی آ گئے۔ انہوں نے پہلے بھوپال میں پھر راولپنڈی جامعہ تعلیم القرآن میں تعلیم حاصل کی۔ مولانا غلام اللہ خان مرحوم کے شاگرد ہیں۔ اردو بولتے ہیں، عربی اور قازق پر عبور حاصل ہے۔ قازق زبان میں انہوں نے قرآن کریم کا ترجمہ و تفسیر لکھی جو خادم الحرمین الشریفین الملک فہد بن عبد العزیز نے شائع کی۔ قازق زبان کا یہ واحد ترجمہ ہے جو قازقستان میں مفت تقسیم ہو رہا ہے۔ قازق زبان میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ۸۰ سال تقریباً عمر ہے لیکن اس کے باوجود بڑی تندہی سے خدمات انجام دیتے ہیں اور روزانہ دفتر جاتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ انہیں صحت کاملہ سے نوازے۔

ضرورت رسالت

من امالی شیخ الاسلام حضرت مولانا السید حسین احمد المدنی قدس اللہ سرہم

اس کتاب کا تعلق فن حدیث سے ہے تو مباحث کتاب شروع کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کا موضوع کیا ہے اور غایت کیا ہے (اور حدیث کسے کہتے ہیں) ورنہ طلب مجہول لازم آوے گی اسلئے سب سے پہلے یہ غور کرنا چاہئے کہ جس عالم میں ہم موجود ہیں وہ حادث ہے کہ اس کا وجود ضروری نہیں ہے۔ اسلئے انسان حیوانات، نباتات اور فلکیات سب کے سب اپنے وجود کیلئے کس کے محتاج ہیں تو ان کیلئے کوئی (مرکز وجود اور) محدث ضروری ہے اور وجود ہی تمام نعمتوں کی اصل ہے تو اللہ تعالی مبدأ عالم ہے اس نے تمام موجودات کو وجود بخشا ہے اسلئے وہی موجد وہی محدث عالم ہے۔ ظاہر ہے کہ وجود عطا کرنے والی ذات خود بھی موجود ہوگی اور اس کا وجود وجوبی ہوگا امکانی نہیں ہوگا کیونکہ عقلاً ہر چیز کی انتہا ایک ایسی چیز پر ماننی پڑتی ہے جس کا وجود بالذات ہو اور وہ سب کو وجود بخش سکتی ہو اپنے وجود میں کسی کا محتاج نہ ہو، اپنے کمال میں ناقص نہ ہو، (جیسے روشنی کے لئے سورج، پانی کیلئے سمندر، شرارت کیلئے شیطان) یہ ایک عقلی مسئلہ ہے اس پر علم کلام میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ تو ایسی ذات جس کا وجود ذاتی ہو اور وہ صفات کاملہ میں اس قدر کامل ہو کہ اس میں کوئی نقص نہ ہو، اس ذات کو ہم اللہ کہتے ہیں وہی تمام صفات کمالیہ سے متصف ہے اور وہی کائنات کی تمام نعمتوں کا مرجع ہے اسلئے ضروری ہے کہ ہر طرح کی عاجزی کا اظہار اس سے ہو اور عبادت اسی کی کی جائے یہ ہے مقدمہ اولی۔

مقدمہ ثانیہ یہ ہے کہ جو بھی منعم ہو اس کا شکریہ بقدر انعام واجب ہے یہ اصول سب کا مسلمہ ہے۔ اللہ تعالی ہمارا محسن ہے بلکہ محسن اعظم ہے اس کا انعام جس قدر انسان پر ہے کسی دوسری نوع پر نہیں ہے۔

پہلا انعام اس کا پہلا عظیم انعام یہ ہے کہ اس نے ہمیں وجود بخشا، وجود وہ نعمت ہے جس کی خواہش ہر چیز کے اندر ہے اور عدم سے ہر ایک کو نفرت ہے چاہے کتنا ہی پریشان ہو عدم کیلئے تیار نہیں ہوتا۔

دوسرا انعام اس کا دوسرا عظیم انعام یہ ہے کہ اس نے اشرف المخلوقات بنایا۔ انسان چونکہ مادی ہے اسلئے عناصر کا محتاج ہے اور مادیات میں بڑا درجہ نباتات کا ہے جس میں نشوونما موجود ہے۔ اس سے بھی اعلیٰ درجہ حیوانات کا ہے جس میں احساس موجود ہے حرکت بالارادہ کی طاقت موجود ہے پھر اس سے اگر ترقی کرے تو عقل و فہم پاکر انسان بن جائے تو قدرت کا بڑا احسان ہے کہ اس نے انسان بنایا اور خود اس کی حیثیت واضح کردی کہ ولقد کرمنا بنی آدم وحملنا ھم فی البر والبحر۔ پھر انسان کی اس حیثیت پر تنبیہ کرنے کیلئے باری تعالےٰ نے چار قسمیں کھا کر فرمایا ہے والتین والزیتون وطور سینین وھذا البلد الامین تب فرمایا لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔

آیت کا اندازِ بیان دیکھئے کہ قد کے ساتھ لام تاکید لایا گیا ہے اور خلقت کی جگہ خلقنا فرمایا ہے کیونکہ جب کوئی (صاحب حیثیت) آدمی اپنی بڑائی ظاہر کرنا چاہتا ہے تو اپنے لئے جمع کا صیغہ استعمال کرتا ہے کہ ہم نے یہ کام کر دیا ہے۔ اگر وہ کہے کہ میں نے یہ کیا ہے تو وہ تعظیم نہ ہوئی جو مقصود تھی پھر یہاں فی لائے جو ظرفیت بتلاتی ہے اور ظرف مظروف کو ہر طرف سے گھیرے رہتا ہے کہ احسنیت انسان کے ہر جز میں موجود ہے ہر طرف ہے اگر مع احسن تقویم ہوتا تو یہ مبالغہ نہ ہوتا، نیز مفضل علیہ کو حذف کر دیا تو اس سے عموم پیدا کر دیا کہ احسن من کل شئ۔ اتنی تاکید کے بعد احسنیت انسان سے بڑھ کر یا اس کے برابر کس میں ہوسکتی ہے اس سے ثابت ہوا کہ جتنا احسان خالق نے انسان پر کیا ہے اتنا کسی پر نہیں ہے۔

قوموں کی گمراہی بہت سی قوموں کو اشکال ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے کہ نہیں؟ اسی وجہ سے انھوں نے غیر انسان کے سامنے سر جھکانا شروع کر دیا حتیٰ کہ بعض بیوقوفوں نے اشجار اور احجار تک کی عبادت کر ڈالی، لیکن عقل سلیم نے اس بات کو کبھی تسلیم نہیں کیا ہے، (اور اب تو سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ الوہیت کائنات کی کسی شئ میں نہیں ہے تو لا الٰہ ثابت ہے، الا اللہ ثابت ہونا باقی ہے، اور مسلمانوں پر دنیا کا قرض ہے کہ ثابت کر دیں)۔

شرافت انسانی نقلاً بھی ثابت ہے کہ انسان سب سے اشرف اور اعلیٰ ہے چنانچہ (قرآن شاہد ہے کہ شیطان نے جب اپنی اصلیت اور انسان کی اصلیت) کو دیکھ کر اپنے کو افضل سمجھا اور اس حد تک سمجھا کہ اس کو خدا کی طرف سے سجدے کا حکم دیا گیا تو انکار کر دیا اور اس کی وجہ بتائی کہ خلقتنی من نار وخلقتہ من طین۔ ظاہر ہے کہ آگ عناصر میں سب سے قوی اور برتر ہے

اور مٹی سب سے اسفل اور کمزور ہے اور جس کی اصل قوی ہوگی اس کی فرع قوی ہوگی جس کی اصل کمزور ہوگی اس کی فرع کمزور ہوگی۔ اسی اصل کو اس نے معیار سمجھ کر اپنے آپ کو بڑا سمجھ لیا مگر باری تعالیٰ نے اس (نظریے) کو رد کر دیا اور فرمایا "ما منعك ان تسجد لما خلقت بيدیّ" کہ انسان کی خصوصی حیثیت یہ ہے کہ اسکو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے (تو نے اس حیثیت کو نظر انداز کر دیا۔

کرشمۂ قدرت ہاتھوں سے قدرت کا اظہار ہوتا ہے (قدرت دو طرح کی ہے قدرت ظاہرہ قدرت باطنہ) قدرت ظاہرہ کا مظاہر فلکیات، حیوانات اور نباتات ہیں اور قدرت باطنہ کے مظاہر وہ ہیں جو ہمارے ادراک سے باہر ہیں مثلاً ملائکہ، جنات (ارواح) یا کوئی اور ہوں۔

باری تعالیٰ نے انسان کی خلقت میں اپنی دونوں قدرتوں کا مظاہرہ فرمایا ہے (ایک سے جسمانی قوتیں ہیں دوسری سے روحانی قوتیں) تو باری تعالےٰ کا خلیفہ وہی ہو سکتا ہے کہ جو ان دونوں کا جامع ہو اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کا جامع نہ ہو تو وہ خلیفہ نہیں ہو سکتا۔ کسی شہنشاہ کا وزیر اعظم وہی بن سکتا ہے جو سلطنت کے تمام امور سے واقف ہو۔ سب کے اغراض و مقاصد جانتا ہو، سب میں تصرف کر سکتا ہو اسلئے خدا کا خلیفہ وہی ہو سکتا تھا جو کائنات کے تمام اسمار سے واقف ہو، چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کو بنانے کے بعد انکو تمام اسمار سے واقف فرمایا۔

خیال ہو سکتا تھا کہ ملائکہ اللہ تعالےٰ کی پوری مملکت کا نظام چلاتے ہیں کوئی پانی برساتا ہے کوئی جان قبض کرتا ہے کوئی دوسرے زمین و آسمان کے کام انجام دیتا ہے پھر فرشتوں میں کسی قسم کی احتیاج نہیں ہے جبکہ انسان میں ہر طرح کی احتیاج ہے۔ اس لئے فرشتوں کو انسان پر برتری حاصل ہے ان ہی کو خدائی خلافت ملنی چاہیے۔

چنانچہ یہ شبہ ظاہر کیا گیا اور خود ملائکہ نے کیا اور بہت قوت سے کیا کہ نحن نسبح بحمدك ونقدس لك اور اس کے بعد اس شبہ کی تائید میں انسان کے حالات پیش کئے کہ انسان اپنے منعم حقیقی کا بے وفا ہوگا اور اپنے ابنار جنس سے بے وفائی کرے گا حتیٰ کہ قتل کرے گا انہوں نے کہا اتجعل فيها من يفسد فيها ويسفك الدماء افساد اگرچہ ظاہر ہے مگر اس کی تفسیر خونریزی سے کی گئی ہے، تو جناب باری تعالےٰ نے فرشتوں کو اس شبہ پر جھڑک دیا اور فرمایا انی اعلم ما لا تعلمون

خدائی انٹرویو اگر کسی میں کسی نظام کے سنبھالنے کی صلاحیت نہیں ہے تو اس کو وہ نظام دینا عقل کی بات نہیں ہے۔ میزان ومنشعب پڑھانے والے کو بخاری دیدینا حماقت ہے۔
باری تعالیٰ کے یہاں بخل نہیں ہے لیکن مبدأ فیاض کا فیض باعتبار استعداد کے ہے ملائکہ کو انکی استعداد کے مطابق تعلیم دی گئی تھی، آدم کو ان کی استعداد کے مطابق، اسلئے فرشتوں سے (مقابلہ کرانے کیلئے) کہا گیا انبئونی باسماء ھٰؤلآء ان کنتم صادقین (تو وہ عاجز ہو گئے اور انہوں نے اپنی لاعلمی تسلیم کر لی قالوا لاعلم لنا الا ماعلمتنا)۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں ہر کام کے لئے الگ الگ شعبے ہیں اور ہر شعبے کو اس کے ماہر فن کے سپرد کرنا حکمت ہے اگر کسی کو زراعت سے مناسبت ہے تو اسے وزیر زراعت بنانا چاہئے اور کسی میں تجارت کا سلیقہ ہے تو اسے تجارت سپرد کرنی چاہئے اسی طرح یہاں (مقابلہ کا) امتحان اس مقصد سے لیا گیا کہ خلیفہ بننے کی صلاحیت کون رکھتا ہے۔ آدم یا ملائکہ؟

دونوں سے ان کی اس استعداد کے مطابق جو مبدأ فیاض نے ان میں رکھی تھی امتحان لیا گیا تو ثابت ہوا کہ خلیفہ بننے کی صلاحیت آدم رکھتے ہیں ملائکہ نہیں رکھتے (اور صلاحیت کا دارو مدار علمی استعداد پر ہے) اس علم کے بعد فرشتوں نے سر جھکا دیا لیکن شیطان اس (حقیقت) کو نہیں سمجھا (اور اپنے نظریے پر قائم رہا اور) مردود ہوا۔

تیسرا انعام تیسرا عظیم انعام یہ ہے کہ ہمارے لئے زمین سے آسمان تک مسخر کر دیا ارشاد ہے وسخر لکم الشمس والقمر نیز فرمایا گیا ہے وخلق لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض جمیعا۔ یعنی ہمارے لئے جمادات نباتات اور حیوانات ہی کو نہیں بلکہ عنصریات و فلکیات کو بھی مسخر کر دیا ہے۔

خدمت کرنے والے چار قسم کے ہوتے ہیں ایک ملازم، دوسرا مزدور، تیسرا غلام، چوتھا بیگار۔ اگر ملازم کو تنخواہ نہ دیجئے تو حکومت سے شکایت کریگا، مزدور کو مزدوری نہ دیجئے تو وہ بھی شکوہ شکایت کرے گا، غلام اگرچہ ان سب سے کم رتبہ ہے مگر وہ بھی روٹی کپڑے اور مکان کا مطالبہ کرتا ہی ہے لیکن بیگار اور مسخر تم سے کسی مطالبے کا حق نہیں رکھتا۔ تو باری تعالیٰ نے انسان کے لئے تمام مخلوقات کو بیگار بنا دیا ہے۔ سورج چاند تمہارے مشغلے ہیں۔ بادل تمہارے کھیتوں، باغوں وغیرہ کو سیراب کیا کرتے

ہیں۔ اسی طرح ساری چیزیں تمہارے لئے اپنی اپنی ڈیوٹی دیا کرتی ہیں۔ اور بیگار بن کر کام کرتی ہیں۔ ما فی السموٰت وما فی الارض۔ اسی وجہ سے کہ تم کو سب سے افضل بنایا ہے مگر تم نے اپنی حیثیت نہیں سمجھی اس لئے چاند سورج کی پوجا کرنے لگے، شہنشاہ کو چھوڑ کر سپاہی کے سامنے جھک گئے اس سے زیادہ عقل ودماغ کی کمزوری اور کیا ہو سکتی ہے حتیٰ کہ اس پتھر کو پوجنے لگے جسے اپنے ہاتھوں سے گڑھ لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پھر سزا بھی سخت سے سخت دی گئی۔ ارشاد ہے ثم رددناہ اسفل سافلین۔

اور یہ سزا اس وجہ سے سخت دی گئی ہے کہ معمولی آدمی کے بالمقابل وزیر اعظم غلطی کرے تو سخت سزا کا مستحق ہوتا ہے جس انسان پر خدا نے اتنے عظیم الشان احسانات کئے وہ ناشکری کرے۔ احسان فراموشی کرے اور دوسروں کے سامنے جاکر جھک جائے تو یہ اس کی غداری اور نمک حرامی ہے۔ ان الانسان لربہ لکنود اور وانہ لظلوم کفار۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے۔

چوتھا انعام یہ ہے کہ ہماری حفاظت کے لئے ملائکہ مقرر کر دیئے ہیں، ارشاد ہے: "ان علیکم لحافظین" کراماً کاتبین، نیز رحم مادر میں جنوں وغیرہ کی شرارتوں سے حفاظت کا بھی انتظام کر دیا ہے۔ ارشاد ہے۔ ان کل نفس لما علیہا حافظ، اور لہ معقبات من بین یدیہ۔

نیز فرشتوں میں سب سے بڑا درجہ حاملین عرش کا ہے مگر وہ بھی انسان کے لئے دعائیں کرتے ہیں اور مسلمانوں کے لئے استغفار، اور صرف مسلمان مردوں کے لئے نہیں بلکہ ان کی عورتوں اور بچوں کے لئے استغفار کرتے ہیں۔ تو ملأ سافل کے فرشتے جس طرح آپ کے کام میں لگے ہیں اسی طرح ملأ اعلیٰ کے فرشتے آپ کی خدمت، حفاظت اور استغفار کیا کرتے ہیں۔ اسلئے ارشاد ہے۔ ان اللّٰہ بالناس لرؤف رحیم۔ لام تاکید کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے لئے راحت و رحمت کثرت سے ہوتی رہتی ہے لیکن اس راحت و رحمت پر کوئی بھول میں نہ پڑ جائے کیونکہ اس غفور رحیم کی جب کسی قوم نے مسلسل نافرمانی اور ناشکری کی ہے تو وہ برباد کر دی گئی ہے جیساکہ قوم عاد و ثمود، قوم نوح اور قوم لوط وغیرہ نے غداری کی اور تباہ کر دی گئیں۔

چھٹا انعام ان تمام انعامات کے ساتھ انسان کو یاد رکھنا چاہئے کہ وہ قطرہ منی سے پیدا کیا گیا جو

سب سے نجس قطرہ ہے۔ پاخانہ پیشاب نکلے تو اطراف و جوانب دھونے سے پاک ہو جاؤ مگر قطرہ منی نکل آئے تو تمام بدن کو دھونا پڑے گا۔ تو اس سے زیادہ غلیظ کوئی نجاست نہیں ہے پھر حیض کا خون بھی نجس ہے اور ایسا نجس کہ عورت روزہ نماز کی نہیں رہ جاتی تم اس سے جماع نہیں کر سکتے اس قدر نجاست و غلاظت کے باوجود اسی قطرہ منی اور اسی دم حیض سے اولیاء و انبیاء تک بنائے گئے اور نو ماہ تک بچہ اس سے بنتا رہتا ہے اسی کو ہضم کرتا رہتا ہے مگر کس قدر کمال ہے اس بنانے والے کا کہ اسی سے اتنا باکمال انسان بنا دیا کرتا ہے۔

سونے سے زیور سب بنا سکتے ہیں مگر مٹی اور راکھ سے زیور بنا دینا کمالِ فن کا مظاہرہ کرنا ہے اس کے بعد عقل ایسی عظیم نعمت عطا کر دی کہ اس سے تم عقول مجردہ میں بحث و اختراع کرنے لگے علوم و فنون کے انبار لگائے طرح طرح کی چیزیں ایجاد و اختراع کرنے لگے حالانکہ یہ وہی دم حیض وہی قطرہ منی۔

عقل کا تقاضا تھا کہ تم اپنی ہستی پر بھی غور کرتے مگر بھول جاتے ہو اسلئے قرآن کے نزول کے مقاصد میں سب سے بڑا مقصد تذکیر بالاء اللہ ہے کہ پرانی باتوں کو یاد کر کے آدمی اپنی قدر پہچانے مگر انسان غیر ضروری باتوں میں پڑ کر اپنا مقصود بھول جاتا ہے اس لئے اس کو بار بار یاد دلانا پڑتا ہے مختلف پیرایوں سے سمجھایا جاتا ہے کیونکہ یہ بھی قرآن کا مقصود ہے۔

انعامات کا تسلسل پھر یہ نہیں کہ انسان پر جو انعامات کئے گئے وہ ختم ہو گئے نہیں بلکہ ہر ہر منٹ فیضانِ رحمت ہوتا رہتا ہے اور ہر وقت صحت و عافیت عطا ہوتی رہتی ہے۔ حفاظت کا سامان بھی ہوتا رہتا ہے اور مسلمانوں کے لئے تو ہر وقت جنت تک تیار رہتی ہے اس لئے انسان پر ہر وقت شکر کرنا واجب ہے۔

پھر نعمتیں چونکہ لاتعداد و لاتحصیٰ ہیں اس لئے شکر بھی اسی قدر ہونا چاہئے۔ جب نعمتیں زیادہ ہیں، تو ذمہ داریاں اور حقوق بھی زیادہ ہوں گے۔ پہلا حق یہ ہے کہ کفرانِ نعمت نہ کرے، دوسرا حق یہ ہے کہ خدا کے شکر سے غافل نہ ہو ورنہ یہی انسان ظلوم کفار کہلانے کا مستحق ٹھیریگا۔

رسول کی ضرورت ادائے شکر کے لئے ضروری ہے کہ منعم کی مرضی معلوم کی جائے کہ وہ کن چیزوں سے خوش ہوتا ہے کن چیزوں سے ناخوش، تاکہ مرضیات کا اہتمام کریں نامرضیات سے احتراز کریں تب جاکر ہم منعم کے لائق جو شکر ہے اسے ادا کر سکیں گے، پھر منعم کی مرضیات

معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ منعم کی طرف سے اخبار ہو کہ ہم فلاں فلاں چیزوں سے راضی ہیں فلاں فلاں چیزوں سے ناراض، یا پسندیدہ ناپسند، ظاہر ہے کہ باری تعالٰے اپنی جلالت شان کی وجہ سے نہ ہر ایک کو اس کی خبر دے سکتا ہے نہ ہر ایک اس کا تحمل کر سکتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ کسی کو اپنا مخصوص و مقرب بنا کر ہمیں خبر دے ایسے ہی شخص کو ہم نبی اور رسول کہتے ہیں۔ اور اسی کی شخصیت واسطہ ہو گی ہمارے درمیان اور منعم حقیقی کے درمیان، جیسے عام بادشاہ اور امراء اپنے احکام اپنے خاص وزیروں اور حکام کو دیتے ہیں اور وہ اس حکم کو سارے ملک میں پہنچایا کرتے ہیں۔

اسی طرح باری تعالٰے نہ زید و بکر کو اپنی بات بتا سکتا ہے نہ ابوجہل و ابوطالب کو، بلکہ کسی ایسے شخص کو منتخب کر کے پیغام پہنچاتا ہے جو اس کے نزدیک معتمد، دیانت دار اور قابل اعتبار ہو اس لئے عقلاً ضروری ہے کہ رسالت کو تسلیم کیا جائے، اسی وجہ سے جس کو یہ خدمت سپرد ہوتی ہے سے ابتداءً منتخب کر لیا جاتا ہے جیسا کہ حضرت موسٰی سے کہا گیا واصطنعتك لنفسي ایسے ہی کو مجتبٰی کہا جاتا ہے (اور خود اس کی نگرانی اور تربیت کرائی جاتی ہے ارشاد ہے لتصنع علی عيني) ایسے شخص کے اندر نافرمانی کا مادہ ہی نہیں ہوگا اس لئے وہ معصوم ہوتا ہے۔

دلائل نبوت

(نبی و رسول جب مبعوث ہوتا ہے تو اپنی نبوت و رسالت کا اعلان کرتا ہے پھر) اپنے دعوی پر دلائل و شواہد پیش کرتا ہے مگر اس کے امتیاز کا کوئی سلسلہ ہونا چاہیئے تاکہ ہر بوالہوس نبوت کا دعوی نہ کر سکے تو جن باتوں سے امتیاز حاصل ہوتا ہے وہ معجزات ہیں اور ہر معجزہ خرق عادت سے ہوتا ہے کہ عام مخلوق سے اس کا صادر ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے معجزہ نبی کے لئے بطور سند اور سرٹیفیکٹ ہوتا ہے جیسے امتحان کی کامیابی پر سند اس کی نشانی ہوتی ہے اسی طرح باری تعالٰے کسی بندے کے ہاتھوں سے ایسے افعال کا صدور کراتا ہے جو عام انسانوں کے لئے محال ہوں۔

معجزات رسالت

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو معجزات عطا کئے گئے وہ دس ہزار تھے ان میں سے سات ہزار علمی معجزات تھے باقی عملی، آپ کے علمی معجزات میں قرآن کی آیات بھی شامل ہیں کیونکہ قرآن پاک آپ کا سب سے بڑا علمی معجزہ ہے۔ وہ اہل عرب جو ۵۰۰ برس سے عربی ادب میں بڑی مہارت پیدا کر چکے تھے اور نثر و نظم دونوں پر بڑی قدرت رکھتے

تھے اور اپنی فصاحت و بلاغت کے قصیدے پڑھا کرتے تھے لیکن جب قرآن نے بطور تحدی انہیں للکارا ہے تو سارا عرب خاموش ہوگیا اور آج تک قرآن کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہے۔ حضور کا یہ معجزہ اب تک زندہ ہے کہ حضرت موسیٰ کا عصا اور ید بیضا اور حضرت عیسیٰ کی شفا ابکہ وابرص ختم ہو گئی۔

امت کیلئے نعمتِ عظمیٰ

قرآن امت محمدیہ کے لئے خدا کی عظیم ترین نعمت ہے۔ اتنی بڑی دولت کسی امت کو کبھی نہیں دی گئی کیونکہ باری تعالےٰ نے حضور کی نبوت ثابت کرنے کے لئے قرآن کی شکل میں اپنی صفت کلام عطا کردی ہے۔ باری تعالیٰ کی صفت کلام نفسی ہے مگر امت کی خاطر اسے کلام لفظی کے لباس میں کرکے ہمیں سپرد کردیا ہے۔ کیونکہ انسان کلام نفسی کا ادراک نہیں کرسکتا تھا یہ خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے جو انسان کو عطا کی گئی ہے یہ اس امت کی اہم ترین خصوصیت ہے لیکن بدقسمتی سے ہم اس کی طرف توجہ نہیں کرتے، نہ ترجمہ دیکھتے ہیں نہ تفسیر پڑھتے ہیں نہ تلاوت سے لذت حاصل کرتے ہیں۔

شواہد رسالت

بہرحال جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تسلیم کرنے کے لئے بہت سے عقلی و نقلی دلائل موجود ہیں، بہت سے واقعات کا اس طرح ظہور ہوا جس طرح آپؐ نے پیشین گوئی فرمائی تھی، ان کی پیش گوئی کے مطابق قیصر و کسریٰ تباہ ہو گئے، مقوقس ختم ہو گیا، مصر و ایران کی سلطنتیں تہ و بالا ہو گئیں اور آپؐ کے جانشین زمانے میں پھیل گئے تو جس نے مقابلہ کیا تباہ ہو گیا۔

نبوت کے کارنامے

خدا کی مرضیات و نامرضیات بتانے والے کا نام رسول ہے۔ اسی سلسلے میں خدا نے آپ کیلئے چار وظیفے مقرر کئے تھے یتلوا علیھم اٰیٰتک و یعلمھم الکتاب والحکمۃ، اور یزکیھم۔ (۱) ان میں سے تلاوت یہ ہے کہ جو آیات آپ پر اترتی ہیں انہیں لوگوں کو خود سنا دیں (اور برابر سنایا کرتے رہیں) چنانچہ ساری عمر آپ نے اس وظیفہ کو اس قدر ادا کیا کہ اب تک تلاوت کا تسلسل جاری ہے۔ (۲) تعلیم کتاب یہ ہے کہ آیات کے معانی سمجھائے جائیں (سوال یہ ہے کہ اہل عرب کو عربی سمجھانے کی کہاں ضرورت تھی) تو اس کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ جس امت کو یہ کتاب دی گئی تھی اگرچہ وہ اسی کی زبان میں دی گئی کیونکہ کبھی کوئی نبی کسی قوم میں غیر قومی زبان کا نہیں بھیجا گیا اسلئے عرب میں قرآن آیا تو عربی میں آیا مگر

محاورات میں جو زبان استعمال کی جاتی ہے اس میں ایک معانی اولیہ ہوتے ہیں جو ہر صاحب زبان سمجھ لیتا ہے لیکن جو معانی ثانویہ ہوتے ہیں ان کا سمجھنا ہر شخص کیلئے آسان نہیں ہوتا ہے مثلاً کثیر الرماد کہے تو اس کے معانی اولی ہیں بہت راکھ والا، حالانکہ متکلم کی مراد یہ نہیں ہے، محاورہ ہے اور اس میں معانی ثانویہ مراد ہیں۔ یعنی بڑا مہمان نواز (کہ کثرت طعام سے راکھ کا ڈھیر لگ جاتا ہے) تو کلام اللہ اور کلام الرسول میں معانی اولیہ کم مراد لئے جاتے ہیں۔ معانی ثانویہ زیادہ مراد ہوتے ہیں اسلئے الفاظ سے متکلم کی منشا و مراد سمجھنا آسان کام نہیں ہے بہت ذکی و فہیم ہو تب سمجھ سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ ابن عباسؓ کو بہت پاس بٹھایا کرتے تھے اور اپنی مجلس میں شریک رکھتے تھے کیونکہ بہت ذکی و ذہین تھے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے فرمایا کہ ان کے برابر تو میرے بیٹے اور پوتے ہیں آپ انہیں ہمارے ساتھ بٹھاتے ہیں۔

حضرت عمر فاروقؓ سن کر ٹال گئے جواب نہیں دیا کیونکہ ان کے رتبے سے واقف تھے مگر ایک مرتبہ مجلس میں لوگوں سے سوال کیا کہ اذا جاء نصر اللہ والفتح کا مقصد نزول کیا ہے جتنے صحابہ موجود تھے سب نے اس کے معانی اولیہ بتائے لیکن معانی ثانویہ جو مراد متکلم ظاہر کرے کسی نے نہیں بتائے تو حضرت عمر نے حضرت ابن عباس سے پوچھا جو اپنی عمر میں قریب البلوغ تھے کہ اکذا انزل۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ اس سے حضور کے وصال کی اطلاع دی گئی ہے اس پر حضرت عمر بولے کہ اس سے زیادہ میں بھی نہیں جانتا ہوں۔ مگر یہ ایسے معانی تھے جو حضرات صحابہ بھی نہیں سمجھ سکے (حالانکہ اہل زبان بھی تھے صحابی بھی) لیکن حضرت عمر اور حضرت ابن عباس اس کو سمجھ گئے۔ تو قرآن و حدیث کے معانی اولی اور ہوتے ہیں اور ان کے مقاصد اور، ان ہی مقاصد قرآن کے بیان کے لئے نبی کی بعثت ہوتی ہے اور وہ یعلمہم الکتاب کرتا ہے۔

تفسیر اذا جاء واقعہ بھی اس طرح تھا کیونکہ آپ کی بعثت اس وقت ہوئی تھی جب بت پرستی عام تھی، توحید کا نام مٹ رہا تھا خود خانہ کعبہ میں ۳۶۰ بت موجود تھے اور باہر تو معلوم نہیں کتنے کہاں کہاں تھے، برائیوں کو مستحسن سمجھا جاتا تھا، غرض انسانوں کا روحانی مزاج خراب ہو گیا تھا۔ تو جس طرح امراض مادیہ کی دوا ہوتی ہے اسیطرح امراض روحانیہ کے علاج کیلئے انبیاء تشریف لاتے ہیں۔

حضور تشریف لائے اور آپ نے بے پناہ جد و جہد فرمائی تو بت پرستی ختم ہو گئی بت نکال دیئے گئے حکومتیں فرماں بردار ہو گئیں قومیں فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے لگیں تو اذا جاء نصر اللہ نازل

ہوئی کہ آپ کی بعثت کا جو مقصد تھا وہ پورا ہوگیا۔

فسبح بحمد ربک سے آپ کے وصال ہی کی خبر ہے جیسے طلباء مدرسہ کی سند حاصل ہونے کے بعد مدرسہ میں نہیں رہتے اسی طرح سلطنتِ خداوندی کو اعداء اللہ سے خالی کرکے آپ تشریف لے گئے صلی اللہ علیہ وسلم۔

ابن عباسؓ یہ حضور کے چچازاد بھائی ہیں آپ کے دور میں مراہق تھے (۱۲ برس کی عمر تھی) بہت سمجھدار تھے حضور کی خصوصی دعائیں ان کے ساتھ تھیں۔ ایک مرتبہ حضورؐ استنجاء کے لئے گئے تو یہ چھاگل میں پانی بھر کر لئے کھڑے رہے، آپ نے دیکھا تو بہت خوش ہوئے دعائیں دیں اللّٰہم علمہ الکتاب وفقہہ۔ ان کو حدیث و قرآن کی بہت جستجو رہتی تھی جب کوئی بات کھٹکتی تو صحابہ کرام سے بے جھجک پوچھ لیا کرتے تھے کیونکہ شرم سے علم نہیں حاصل ہوتا اور تکبر انسان کو علم سے محروم کر دیتا ہے۔

حضرت عمرؓ ان کی ذکاوت اور جد وجہد سے واقف تھے اسی وجہ سے انہیں اپنی مجلس میں بٹھایا کرتے تھے (اسی طرح کی تربیت سے یہ بچے حضرت ابن عباس بن جایا کرتے ہیں) شوق کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ حضور کی تہجد دیکھنے کے لئے حضور کی اہلیہ حضرت میمونہ کے گھر جاکر لیٹ رہے وہ ان کی حقیقی خالہ تھیں پھر حضور نے تہجد شروع کی تو جاکر آپ کے بائیں کھڑے ہوگئے آپ نے سر پکڑ کر دائیں کر دیا (یہ باتیں بہت بچپن کی ہیں مگر علمی ذوق و شوق بتلاتی ہیں) تہجد کی روایات اکثر ان ہی سے مروی ہیں۔

تعلیم حکمت آپ کا تیسرا وظیفہ تھا تعلیم حکمت، یعنی احکام الٰہی کی علت و غایت بیان کرنا۔

تزکیہ باطن آپ کا چوتھا وظیفہ تھا تزکیہ نفس، چنانچہ صحابہ فرماتے ہیں کہ جب ہم حضور کی خدمت میں رہتے ہیں تو سب چیزیں بھول جاتے ہیں صرف خدا رسول ہمارے سامنے ہوتے ہیں لیکن جب گھر جاتے ہیں تو وہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے جیسا کہ حضرت حنظلہ کا واقعہ مشہور ہے کہ وہ اس صورت حال کو محسوس کرکے گھر بیٹھ گئے اور اسے انھوں نے نفاق سمجھ لیا پھر بہت پریشان ہوئے اور گھر سے نہیں نکلے، آپ نے مجلس میں دریافت فرمایا کہ حنظلہ کہاں ہیں؟ اور حضرت ابوبکر کو بھیجا انھوں نے آکر بیوی سے پوچھا کہ حنظلہ کہاں ہیں؟ اس نے اندر بتادیا وہاں جاکر دیکھا تو اک گوشے میں پڑے رو رہے ہیں، حال پوچھا تو انھوں نے اپنے قلبی احساسات بتائے اور کہا کہ حضور کی مجلس

میں دل کا حال اور ہوتا ہے گھر پہنچ کر اور ہو جاتا ہے۔ حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ یہی حال تو میرا بھی ہے اس پر دونوں مل کر خوب روئے، اس کے بعد علاج کے لئے حضور کے پاس دونوں حضرات آئے، آپ نے فرمایا کہ اگر تم لوگ اسی طرح ہر وقت رہنے لگو جس طرح میرے پاس رہتے ہو تو دنیا سے قطع تعلق کر لوگے، بیویوں کو چھوڑ دوگے اور جنگلات میں روتے پھروگے۔ چنانچہ حضرت انس بن مالک فرماتے ہیں کہ جب آپ مدینہ تشریف لائے تھے تو ہم لوگوں کو مدینہ کی در و دیوار روشن نظر آتی تھیں پھر فرماتے ہیں کہ ہم نے آپ کو دفن کر کے ہاتھ کی مٹی نہیں جھاڑی تھی کہ اپنے دلوں میں تاریکیاں دیکھنے لگے۔

مقاصد بعثت

یہ تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ کرام پر روحانی اثر کہ آپ کی صحبت میں پہنچ کر دلوں کی گندگیاں ختم ہو جاتی تھیں لیکن یہ اثر ابوجہل وغیرہ پر اس لئے نہیں پڑا کہ ان کے قلوب میں صلاحیت ختم ہو گئی تھی۔ ورنہ آپ کی روحانیت روح کی تمام کثافتوں کو جلا کر خاک کر دیتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا ولی بھی کسی بدوی صحابی سے افضل تو کیا برابر نہیں ہو سکتا۔

تو تزکیہ باطن حضور کا چوتھا وظیفہ تھا، اور چاروں وظائف کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بعثت کا مقصود سمجھ کر انجام دیا کرتے تھے۔ اسی کے بارے میں قرآن کہتا ہے۔

ان میں سے تین چیزیں آپ کے اقوال سے متعلق ہیں ایک چیز تزکیہ قلوب وہ آپ کے قلبی عمل سے متعلق ہے تو امور دینیہ کے تمام کے تمام کام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور آپ کی بعثت کا مقصد ہیں۔ یہاں سے حدیث کی اہمیت ظاہر ہوئی ہے۔

مکاتب اور ان کا نظام تعلیم و تربیت

مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری

اسلام میں بچوں کی تعلیم و تربیت اور تادیب کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ تم اپنے بچوں کو سب سے پہلے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ سکھاؤ اور موت کے وقت بھی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کی تلقین کرو، حضرات صحابہ و تابعین کا پسندیدہ معمول تھا کہ جب بچہ بولنے لگتا تھا تو اس کو سات بار لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ پڑھاتے تھے۔ [۱] اور سات سے دس سال کی عمر تک بچوں کو قرآن اور دعا وغیرہ کی اتنی تعلیم دیدیا کرتے تھے کہ وہ اس عمر میں باقاعدہ نماز ادا کریں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا تھا کہ تم سات سال کے بچوں کو نماز کا حکم دو، اور دس سال کے بچوں کو نماز نہ پڑھنے پر تنبیہی مار مارو۔ [۲] عہد رسالت تک بچوں کی تعلیم کے لئے علیحدہ اور مستقل مکتب نہیں تھا بلکہ صحابہ اپنے اپنے گھروں میں بچوں، بچیوں کو قرآن اور دین کی ضروری باتوں کی تعلیم دیتے تھے۔ ایک مرتبہ صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! علم دین کیسے اٹھ جائیگا جب کہ ہم لوگ خود قرآن پڑھتے ہیں، اپنے لڑکوں کو پڑھاتے ہیں اور ہمارے لڑکے اپنے لڑکوں کو پڑھاتے ہیں۔ [۳] عرب کے مختلف قبائل سے آنے والے وفود کے ساتھ بچے بھی رہا کرتے تھے، اور بڑوں سے زیادہ شوق اور رغبت کے ساتھ خدمت نبوی میں آکر

---

[۱] غریب الحدیث عبید بن سلام ج ۱ ص ۱۹۳ ۔ [۲] سنن ابو داؤد ۔ [۳] سنن ترمذی، باب ذہاب العلم، واسد الغابہ ج ۲ ص ۲۶۴ ۔

قرآن اور دین کی تعلیم حاصل کرتے تھے، ان باتوں کی تفصیل گذشتہ بیانات سے معلوم ہو چکی ہے۔

دورِ فاروقی میں تین مکتب کا اجراء اور ان کے معلمین

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں سب سے پہلے بچوں کی تعلیم کے لئے مکتب جاری کر کے اس میں معلم مقرر کیا، بعض لوگوں نے اس کو حضرت عمرؓ کی اوّلیات میں شمار کیا ہے۔

انّ اوّل من جمع الاولاد فی المکتب لتعلیم القراٰن عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ عنہ	عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے قرآن کی تعلیم کیلئے بچوں کو مکتب میں جمع کیا ہے۔

محلی ابن حزم اور کنز العمال میں وضین بن عطاء کی روایت میں ہے۔

کان بالمدینۃ ثلاثۃ معلّمین یُعلّمون الصبیان فکان عمر یرزق کلّ واحدٍ منہم خَمسَۃَ عشرَ کل شہرٍ۔ [1]	مدینہ میں تین معلّم بچوں کو تعلیم دیتے تھے اور حضرت عمران میں سے ہرایک کو ماہوار پندرہ درہم برائے خورد ونوش دیا کرتے تھے۔

کنز العمال کی روایت میں خَمسَۃَ عشرَ درھمًا کی تصریح ہے، اس روایت میں یاجر (اجرت دیتے تھے) کے بجائے یرزق کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت قرآن اور دین کی تعلیم دینے والے معلّمین بقدرِ کفایت کچھ رقم لے لیتے تھے۔

ہمارے علم میں مدینہ کے مکتب میں تعلیم دینے والے تین معلّم یہ حضرات ہیں۔ بناتہ والبی، عامر بن عبداللہ خزاعی، اور ابو سفیان، نباتہ والبی کے بارے میں امام بخاری نے تصریح کی ہے۔

وکان من المعلّمین علی عہد عمر، کوفی، عنہ سُوید بن غفلۃ۔ [2]	وہ حضرت عمر کے دورِ خلافت میں معلّم تھے کوفہ کے رہنے والے تھے، ان سے سوید بن غفلہ نے روایت کی ہے۔

عامر بن عبداللہ خزاعی کے متعلق "الفواکہ الدوانی علی رسالۃ ابن ابی زید القیروانی" میں لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے مکتب جاری کر کے عامر بن عبداللہ خزاعی کو

---

[1] محلی ابن حزم ص ۱۹۵ ج ۸، وکنز العمال ص ۱۹۲ ج ۲ طبع قدیم [2] تاریخ کبیر ج ۴ قسم ۲ ص ۱۳۱۔

بچوں کی تعلیم کا حکم دیا اور بیت المال سے ان کے لئے اجرت نہیں بلکہ وظیفہ جاری کیا، اور حکم دیا کہ کند ذہن بچے کے لئے تختی پر لکھیں اور ذہین بچے کو زبانی تعلیم دیں، اس حکم کے مطابق عامر بن عبداللہ صبح سے شام تک مکتب میں بیٹھتے رہے، لوگوں نے حضرت عمرؓ سے اس کڑی پابندی کے بارے میں بات کر کے اس میں تخفیف کرائی اور حضرت عمرؓ نے عامر بن عبداللہ کو حکم دیا کہ نمازِ فجر کے بعد (ضحیٰ عالی) دس گیارہ بجے تک اور ظہر کے بعد عصر تک تعلیم دیں، باقی وقت آرام کریں۔ [1]

ابوسفیان کی معلمی کا ذکر ایک المیہ میں یوں آیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ابوسفیان نامی ایک شخص کو بادیہ اور صحرا کے باشندوں کی تعلیم کے لئے بھیجا، جو طالب علم نہیں پڑھتا تھا ابوسفیان اس کو مارتے تھے، چنانچہ انہوں نے اسی بات پہ ایک بچے اوس بن خالد طائی کو کئی کوڑے مارے اور اس کا انتقال ہوگیا، اس کی ماں نے رونا پیٹنا شروع کیا اور حادثہ کی اطلاع حریث بن زید الخیل طائی کو کر دی جس نے ابوسفیان کو قتل کر دیا۔ [2]

پورے عالم اسلام میں قرآن کی تعلیم اور اس کی کتابت کا انتظام

حضرت عمرؓ قرآن کی تعلیم کے لئے عالم فاضل اور قابل معلموں کو مقرر کرتے تھے جو عربیت اور لغت کے عالم ہوں، ایک مرتبہ ایک اعرابی مدینہ میں قرآن پڑھنے آیا ایک شخص نے اس کو پڑھایا اِنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلِهٖ (رسول کو زیر کے ساتھ) اس پر اعرابی نے کہا کہ جس سے اللہ برارت کرتا ہے میں بھی اس سے بری ہوتا ہوں، شدہ شدہ اس کی خبر حضرت عمر کو ہوئی تو اعرابی کو بلا کر پوچھا کہ کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے برارت اور بے تعلقی ظاہر کرتے ہو؟ اعرابی نے اپنا پورا واقعہ بیان کیا حضرت عمرؓ نے شفقت سے کہا کہ اے اعرابی! اس طرح نہیں ہے بلکہ اِنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ ہے، یہ سن کر اعرابی نے کہا کہ جس سے اللہ اور اس کے رسول برات کرتے ہیں، میں بھی اس سے برارت کرتا ہوں، اس واقعہ کے بعد حضرت عمرؓ نے حکم جاری

---

[1] بحوالہ مجلہ منار الاسلام ابوظبی جمادی الاولیٰ سن ۱۴۱۱ھ۔ [2] اصابہ ج ۱ ص ۱۲۳۔

کیا کہ لَا یُقْرِئُ الْقُرْآنَ اِلَّا عَالِمٌ بِاللُّغَةِ (صرف عربی زبان ولغت کا عالم قرآن پڑھائے) اسی کے ساتھ ابوالاسود کو علم نحو وضع کرنے کا حکم دیا۔ [۱] مشہور روایت کی بنا پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حکم سے ابوالاسود نے علم نحو وضع کیا ہے۔

حضرت عمرؓ اپنے امراء کو قرآن کی تعلیم کا حکم دیتے تھے، اور کہتے تھے کہ تم لوگ ابتداء میں طوالِ مفصّل کی سورتیں پڑھو، وہ آسان ہیں۔ [۲] آپ نے پورے قلمرو خلافت میں مکتب جاری کرائے اور اپنے امراء کو اس بارے میں حکم دیا، قرآن کی کتابت کا انتظام کیا، اور کثیر تعداد میں قرآن لکھواکر تقسیم کرایا، نافع بن ظُریب بن عمرو بن نوفل مستقل طور سے حضرت عمر کے لئے قرآن لکھتے تھے۔ [۳] ان کے علاوہ دوسرے اہلِ علم بھی یہ خدمت انجام دیتے تھے، قیس بن مروان جعفی کا بیان ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمرؓ کو بتایا کہ امیرالمؤمنین! میں ایسے شخص کو جانتا ہوں جو مصحف لکھتا ہے [۴]۔ غالباً خبر دینے کا منشاء یہ رہا ہوگا کہ آپ کتابتِ قرآن کی خدمت اس شخص سے لے سکتے ہیں۔

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو لکھا کہ میں نے غاضرہ بن سمرہ عنبری کے ہاتھ مصحف بھیجا ہے۔ اگر فلاں دن تمہارے پاس پہونچ جائے تو اس کو دو سو درہم دیدینا اور اگر اس کے بعد آئے تو اس کو کچھ مت دینا اور میرے پاس لکھنا کہ وہ کس دن تمہارے پاس پہونچا [۵]۔

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں پورے عالم اسلام میں مکاتب کی کثرت، قرآن کی کتابت واشاعت اور اس کے پڑھنے پڑھانے کی سرگرمی کا اندازہ ابن حزم کے اس بیان سے ہوسکتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو فارس، شام، جزیرہ اور مصر کے تمام شہر فتح کرلئے گئے، ان ملکوں کے ہر شہر اور بستی میں مسجدیں تعمیر کی گئیں۔ مصاحف لکھے گئے، مشرق سے مغرب تک ائمۂ مساجد نے قرآن پڑھا، اور مکاتب کے بچوں کو پڑھایا اور

---

[۱] انباہ الرواۃ علی انباہ النحاۃ، قفطی ج ۱ ص ۴۔ [۲] مصنف عبدالرزاق ج ۳ ص ۳۸۱۔ [۳] الاشتقاق، ابن درید، ج ۱ ص ۸۹۔ [۴] طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۱۳۶۔ [۵] طبقات ابن سعد ج ۷ ص ۱۳۶۔

سال سے زائد مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ حضرت عمرؓ کی شہادت کے وقت مصر، عراق، شام، یمن کی حدود میں اگر ایک لاکھ قرآن کے نسخے نہیں تھے تو اس سے کم بھی نہیں تھے، اسکے بعد حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں غزوات و فتوحات کا دائرہ اور وسیع ہوا، اس دور میں عالمِ اسلام میں قرآن کا شمار ہو ہی نہیں سکتا۔ [1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے بارہ سالہ دورِ خلافت میں مکاتب میں قرآن کی تعلیم اور ان کے معلّموں پر خاص توجہ کی، اور حضرت عمرؓ کی طرح موذنوں، اماموں، اور معلّموں کے وظائف مقرر کئے۔ [2]

خلیفہ ولید بن عبد الملک نے یتیموں کے ختنہ کا انتظام کیا اور ان کے لئے مؤدّب مقرر کئے جو قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔ (تاریخ الخلفاء ص۱۷۸)

قرآن اور دینی علوم کی تعلیم پر وظیفہ

حضرت عمرؓ نے قرآن پڑھنے والوں اور یاد کرنے والوں کا . . . . گران قدر وظیفہ مقرر کیا تھا تاکہ طلبہ ذوق و شوق اور اطمینان سے تعلیم حاصل کریں۔ محرم ۲۰ھ میں وظائف و عطایا کا انتظام ہوا تو آپ نے قرآن پڑھنے والوں کا بھی وظیفہ جاری کیا۔

ثم فرض للناس علی منازلھم و قراء تھم القرآن وجھادھم۔ [3]

حضرت عمرؓ نے لوگوں کے مرتبہ کے مطابق اور قرآن پڑھنے اور جہاد کرنے پر وظیفہ مقرر کیا۔

ابو عبید قاسم بن سلّام نے کتاب الاموال کے باب الفرض علی تعلیم القرآن و علی سابقۃ الاسلام میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے بعض عمّال کو لکھا کہ تم لوگوں کو قرآن کی تعلیم پر وظیفہ دو، اس پر عامل نے لکھا کہ آپ نے مجھے تعلیمِ قرآن پر لوگوں کو وظیفہ دینے کے لئے لکھا ہے۔ ایسی صورت میں وہ لوگ بھی قرآن کی تعلیم حاصل کریں گے جن کو تعلیمِ قرآن کے بجائے وظیفہ میں رغبت ہوگی۔ حضرت عمرؓ نے اس کے جواب میں لکھا کہ تم ان کو شرافت و مروّت اور صحابیت کے نام پر وظیفہ دو۔ [4]

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے بھی اپنے دورِ خلافت میں طلبۂ علم کے لئے رزق اور وظیفہ کا فرمان جاری کیا۔ اور اپنے امراء و عمّال کو لکھا کہ

ان اجروا علی طلبۃ العلم وفرّغوھم للطلب [5]

طالب علموں کا وظیفہ جاری کرکے انکو طلب علم کیلئے فارغ کرو

---

[1] الملل والنحل ص۸۰۔ [2] سیرۃ العمرین، ابن جوزی۔ [3] فتوح البلدان ص۴۶۰۔ [4] کتاب الاموال ص۲۳۱۔ [5] جامع بیان العلم ۱/۱۲۶

مکتب میں جمعہ کی تعطیل

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جمعہ کے دن مکتب کے بچوں کو چھٹی کا رواج ہوگیا تھا، الفواکہ الدوانی علی رسالۃ ابن ابی زید القیروانی، سے یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ جب حضرت عمرؓ ملک شام کے سفر سے مہینوں کے بعد مدینہ واپس ہوئے تو اہل مدینہ اور ان کے ساتھ چھوٹے چھوٹے بچے استقبال کے لئے شہر کے باہر نکلے، یہ پنجشنبہ کا دن تھا، سب نے مدینہ کے باہر حضرت عمرؓ کے ساتھ رات بسر کی اور جمعہ کو شہر میں آئے، چونکہ سب چھوٹے بڑے تھکے ماندے تھے۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے ان دونوں دنوں (جمعرات وجمعہ) میں آرام کرنے کے لئے رخصت دیدی اسی وقت سے اس تعطیل کا رواج ہوا۔ [1]۔ یہ روایت مجھے دوسری کتابوں میں نہیں مل سکی ہے۔ صحابہ اور تابعین کے دور میں جمعہ کے دن مکاتب کی تعطیل کا رواج ہوگیا تھا، ایوب بن حسن رافعی کا بیان ہے۔

كنّا نخرج كلّ يوم جمعةٍ مع غلمَان المدينة غلمان الكُتّاب۔	ہم لوگ ہر جمعہ کو مدینہ کے مکتب کے لڑکوں کے ساتھ باہر نکلتے تھے۔

اور مقام دقم پر کھڑے ہوکر مصعب بن زبیر کے لڑکوں کو دیکھتے تھے کہ اُحد کے قریب جوانیہ سے نکل کر عربی گھوڑوں پر کود کود کر چڑھتے تھے۔ [2]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مکاتب میں جمعہ کو تعطیل ہوتی تھی اور بچے کھیل کود میں لگے رہتے تھے، ابن مجاہد مقری بچوں کو تعلیم دیتے تھے، انہوں نے ایک بھاری بھرکم آدمی کو دیکھ کر کہا۔

هو اَثقَلُ مِنْ يَوْمِ السَّبْتِ عَلَى الصِّبْيَانِ۔ [3]	بچوں پر سنیچر کا دن جس قدر ثقیل اور گراں گذرتا ہے یہ شخص اس سے زیادہ ثقیل ہے۔

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کے دن مکتبوں میں تعطیل ہوتی تھی اور بچوں کو سنیچر کے دن مکتب جانا گراں معلوم ہوتا تھا۔

---

[1] بحوالہ مجلہ منار الاسلام، ابوظبی، جمادی الاولیٰ ۱۴۰۱ھ۔ [2] جمہرۃ نسب قریش واخبارہا صفحہ ۳۲۷۔ [3] ثمار القلوب (؟) خاص الخاص، ثعالبی صفحہ ۱۵۔

عصر حاضر میں

اختر امام عادل

(۱) عصر حاضر کے حالات اس کے متقاضی ہیں کہ مسلم قوم دنیا کی امامت کے لئے تیار ہو جائے دنیا کے انقلابات سیاسی اتھل پتھل، معاشی بحران، اور سرمایہ داری واشتراکیت کے انہدام نے پوری انسانیت کو انگشت بدنداں کر دیا ہے۔ وہ کسی ایسے صالح نظام حیات کی جستجو میں ہے جو تمام تقاضوں کا حل رکھنے کے ساتھ پائیدار بھی ہو۔ روس کا اشتراکی نظام بکھر چکا ہے۔ امریکہ کی جمہوریت سسک رہی ہے۔ لندن کا الحاد دم توڑ رہا ہے اور لوگ مذہب کی پناہ مانگ رہے ہیں اور جرمنیت و برہمنیت کا خاتمہ ہو رہا ہے اور دنیا کسی آب حیات کی پیاسی ہو رہی ہے جو صرف اور صرف مسلمانوں کے پاس ہے، اس وقت اگر مسلمانوں نے آگے بڑھ کر سسکتی انسانیت کو سینے سے نہ لگایا۔ اور دم توڑتی دنیا کو آب حیات کے چند قطرے مہیا نہ کئے تو کل خدا کے یہاں ان کو حساب دینے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ اسوقت اسلام اور اسلامی نظام کی اشاعت کا جس قدر امکان ہے ماضی قریب میں ایسے امکانات نہ تھے بس شرط صرف یہ ہے کہ مسلمان موقع کو پہچانیں اور اس کی قدر کریں۔ ؎

سبق پڑھ پھر صداقت کا شجاعت کا عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

(۲) عالم اسلامی جو متعدد سلطنتوں پر مشتمل ہے ان میں اگرچہ بہت سے ایسے علاقے ہیں جو صحرائی اور بیابانی ہیں۔ جیسے برّ اعظم ایشیا میں صحرائے سندھ، ایران، اور جزیرہ عرب وغیرہ

افریقہ کے بعض ممالک اور مصر وسوڈان کے مغربی کنارے محیط اطلسی کے سواحل تک ۔ لیکن اس کے باوجود ان کو تروتازہ، قابل کاشت زندگی ذخائر میں تبدیل کرنا عالم اسلام کے لئے کچھ مشکل نہیں۔ اس لئے کہ پانی کا جس قدر ذخیرہ عالم اسلام میں موجود ہے اتنا کہیں اور نہیں۔ دنیا کی بڑی اور مشہور ندیاں اسلامی علاقوں میں موجود ہیں ـــــ دریائے نیل، فرات، دجلہ، بحر سندھ، ام الربیع، وغیرہ ایسی زبردست ندیاں ہیں جو پانی کا بڑا ذخیرہ عالم اسلام کو فراہم کرتی ہیں۔ ان کی مدد سے اگر تمام صحرائی علاقوں کو سرسبز وشاداب بنانے کا عمل کیا جائے اور جو پہلے سے صلاحیت کے حامل ہیں ان پر مزید محنت کی جائے تو پورا عالم اسلام لہلہا اٹھے گا اور غذائی اشیار کی اتنی کثرت ہو جائے گی کہ کوئی مسلمان دنیا میں بھوکا نہیں رہے گا۔ پھر علم وعمل کی فضا پیدا ہوگی، غذائی اشیار کی کثرت کی صورت میں اس کے بعض حصوں کو فروخت کرکے ملک میں بہترین کارخانے اور فیکٹریاں بھی قائم کی جاسکتی ہیں جس کے نتیجے میں عالم اسلام بہترین تجارتی منڈی بن جائے گا۔ یہاں کے تاجر کہیں اور جائیں گے بھی تو اپنا سامان لے کر فروخت کرنے کے لئے جائیں گے دوسرے ملکوں کا سامان لانے کے لئے نہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ جو بھی مصنوعات تیار کی جائیں وہ خالص اور پختہ ہوں، نقلی اور کمزور چیزوں کی صنعت ملک کو صنعتی لحاظ سے آگے بڑھانے کے بجائے اور بھی ناکارہ کردے گی۔

دوسری شرط یہ ہے کہ تمام اسلامی ممالک باہمی اتحاد پیدا کریں تاکہ آبی ترسیل و ابلاغ میں سہولت ہو اور پورا عالم اسلام یکساں طور پر ایک دوسرے کے تعاون سے اقوام عالم کی امامت یا کم از کم ان کے دوش بدوش چلنے کے قابل ہو جائے۔

(۳) پٹرول جو اس عہد جدید کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ آج پوری دنیا اسی محور پر گردش کر رہی ہے اس کے بغیر کسی ملک کا سیاسی اور اقتصادی استحکام عمل میں نہیں آسکتا۔ اس کا سب سے بڑا ذخیرہ عالم اسلام ہی میں موجود ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جہاں سے عالم اسلام میں پٹرول کا انکشاف ہوا ہے تمام مغربی ممالک کی نگاہیں اس وقت سے اس پر مرکوز ہیں اور ہر ایک پٹرول کے چشموں پر قبضہ جمانے کی

فکر میں ہے۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس، اٹلی، البانیہ، اور ہالینڈ سب للچائی ہوئی نگاہوں سے عالم اسلام کے ایک ایک کنویں کو دیکھ رہے ہیں اور مختلف تدبیروں سے پٹرول حاصل کرنے کی فکر میں ہیں۔ تمام مغربی ممالک پٹرول کا ذخیرہ جمع کر رہے ہیں تاکہ وقت ضرورت کام آئے۔ مگر مسلمان ہیں کہ ان سے خاطر خواہ فائدہ بھی نہ اٹھا سکتے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جب سے عالم اسلام میں پٹرول کا انکشاف ہوا ہے اس وقت سے اس کی پیداوار کی شرح روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر عالم اسلام میں پٹرول کی شرح پیداوار سولہ ملین ٹن تھی۔ اس کے دس سال کے بعد ۱۹۵۵ء میں اس کی شرح بڑھ کر ایک سو ستر ملین ٹن ہوگئی اس کے بعد ۱۹۷۳ء میں شرح پیداوار نو سو ستر ملین ٹن ہوگئی۔ پھر ۱۹۸۶ء تک اس کی شرح بڑھ کر ۲،۹۱۳،۹۰۲ ہزار ٹن ہوگئی۔

(ملتقی الفکر الاسلامی العاشر بالجزائر ص ۳۹۹/۴۴۶)

اس اندازے سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم اسلام میں پٹرول کی پیداوار کس تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے مگر اس کے بالمقابل اس کے اپنے مصارف اور استعمال کی شرح بہت معمولی ہے جو کچھ خرچ ہو رہا ہے وہ دوسرے مغربی ممالک کے ہاتھ فروخت کی شکل میں ہو رہا ہے۔ ذاتی صنعتوں میں اس کا استعمال درجۂ صفر میں ہے۔

اگر پٹرول کا عالمی پیمانے پر تقابل کیا جائے تو بھی اس کی شرح سب سے زیادہ عالم اسلام ہی میں نظر آئے گی۔ مثال کے طور پر ایک عالمی سروے کے مطابق عالم اسلامی میں پٹرول کی شرح پیدائش ۱۳۵۰ ملین ٹن ہے۔

امریکہ میں پٹرول کی شرح ۴۹۳ ملین ٹن ہے یعنی عالم اسلام کے آدھے سے بھی کم، سوویت یونین (جب وہ متحد تھی) اس کی شرح ۶۰۰ ملین ٹن۔ قزویلا کی ۱۶۵ ملین ٹن کینڈا کی ۷۰ ملین ٹن۔ اور ان کے علاوہ باقی ممالک کی مجموعی شرح صرف ۶۳ ملین ٹن ہے۔ اس حساب سے گویا پوری دنیا میں پٹرول نکلنے کی جو مجموعی مقدار ہے وہ تنہا عالم اسلام کے پاس موجود ہے۔

(۳) صرف پٹرول کی بات نہیں ہے بلکہ دنیا کی تمام خام اشیاء جن پر تمام صنعتوں اور

تجارتوں کا دارومدار ہے وہ بھی بڑی بھاری مقدار میں عالم اسلام کے اندر موجود ہیں محمود دشا کرنے جو عالمی سروے کیا ہے اس کے مطابق عالمی پیداوار کے تناظر میں اسلامی ممالک کی شرح حسب ذیل نقشہ کے مطابق ہے۔

خام اشیاء	عالمی شرح پیدائش	عالم اسلام کی شرح پیدائش	عالم اسلام کا درجہ
پٹرول	۲۳۰۰ ملین ٹن	۱۳۵۰ ملین ٹن	پہلا
کوئلہ	۱۹۸۸ ملین ٹن	۶۵ ملین ٹن	ساتواں
لوہا	۲۵۰ ملین ٹن	۲۸ ملین ٹن	تیسرا
تانبا	۴ر ملین ٹن	۱ر ملین ٹن	دوسرا
رانگا	۱۷۹/۶۰۰ ٹن	۱۰۰/۰۰۰ ٹن	پہلا
سیسہ	ایک ملین ٹن	۲۰۰/۰۰۰ ٹن	پانچواں
منگنیز	۸ر ملین ٹن	۱/۹ ملین ٹن	پہلا
کروم	۲/۵ ملین ٹن	۱ر ملین ٹن	پہلا
بوکسیت	۳۰ر ملین ٹن	۷ ملین ٹن	پہلا
فوسفات	۸۵ ملین ٹن	۲۱ ملین ٹن	دوسرا

(اقتصادیات العالم الاسلامی ص۲۲۸)

اس نقشہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ عالم اسلام کے پاس خام اشیاء کتنی بڑی مقدار میں موجود ہیں، اور اس کے پاس کس قدر موقع ہے کہ اس سے فائدہ اٹھائے مگر افسوس کہ اس کی توجہ اس طرف نہیں ہے۔ ورنہ کسی صنعت وحرفت، تجارت وسیاست اور عسکری قوت میں اس کا کوئی جواب نہ ہوتا۔ آج مسلمان خدا کے دیئے ہوئے امکانات اور وسائل کو ٹھکرا رہے ہیں اور ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں۔ مگر ایک وقت ایسا بھی آسکتا ہے جب ان کے پاس آگے بڑھنے کا کوئی امکان نہ ہوگا اور وہ

بڑھنے کے آرزومند ہونگے مگر اسوقت انکی ساری کوششیں لاحاصل اور تمام آرزوئیں محض مالیخولیائی تصورات قرار پائیں گی ضرورت اس بات کی ہے کہ آج ہی عالم اسلام بیدار ہوکر زندگی کے تمام شعبوں کی طرف توجہ دے اور پوری سرگرمی اور اخلاص کے ساتھ کام کرے۔

(۵) مسلمان قوم فطرتاً جفاکش واقع ہوئی ہے بس شرط یہ ہے کہ ان سے کام لینے کا سلیقہ کسی کے پاس ہو آج دنیا مسلم قوم کو راحت پسند کام چور اور معطل سمجھ رہی ہے مگر تاریخ سے پوچھئے کہ یہ ہاتھ ایسے شل نہ تھے انہی ہاتھوں نے تاج محل کی تاریخی عمارت بنائی تھی قطب مینار کو آسمان کی بلندیوں سے ہم کنار کیا تھا۔ اور انہی کاندھوں پر لادلاد کر آگرہ اور دلی کے لال قلعہ کے سرخ پتھر منگوائے گئے تھے اور پھر انہی معماروں نے ان آہنی قلعوں کی تعمیر کی، مسجد قرطبہ، قصر الحمرا اور مدینۃ الزہرا انہی پستہ حال مسلمانوں کے فن تعمیر کی یادگار ہیں اسلئے کوئی مسلمانوں کو یہ طعنہ نہ دے کہ یہ کسی کام کے نہیں، بلکہ انکو شکایت یہ ہے کہ ان سے سلیقہ سے کام نہیں لیا گیا۔ انکو ہر موقع پر نظرانداز کیا گیا۔ ان سے ذرا کام لیکر تو دیکھئے یہ کیسے مخلص، محنتی، اور لائق ثابت ہوتے ہیں۔ آج اسلامی ممالک اور اداروں کو چاہئے کہ مسلمانوں کے محنت کش طبقہ کی اس شکایت کو دور کریں اور ان کیلئے ہر طرح علمی اور عملی کاوشوں کے اسباب و وسائل فراہم کریں مناسب اجرتیں دیں، عمل اور محنت کا توازن درست کریں، کارآمد عناصر کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالیں، ان کی حوصلہ افزائی کریں انکی بہتر تربیت کا معقول نظم کریں ہر مقام پر مسلمانوں کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں تاکہ یہ روزگار یا کام کے ماحول کی تلاش میں ملک سے باہر نہ چلے جائیں بلکہ وہ اپنے ملک ہی میں رہ کر ملک کی خدمت کریں اور ملک کو ترقی یافتہ بنانے میں تعاون کریں۔

آج جاپان صنعتی و تجارتی لحاظ سے سب سے پیش پیش ہے اور مصنوعات کی دنیا میں اسکی سب سے زیادہ مانگ ہے اسکی وجہ یہی تو ہے کہ انہوں نے محنتی اور قابل افراد سے کام لیا، خالص اشیاء سے پختہ مصنوعات تیار کئے کاریگروں کو مناسب اجرتیں دیں، انکی حوصلہ افزائی کی اور مصنوعات کی مناسب قیمتیں مقرر کیں۔ آج عالم اسلام کے پاس بھی اسی طرح آگے بڑھنے اور ترقی پانے کے امکانات ہیں اور حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ بھی سیاسی، عسکری، اقتصادی اور علمی، ہر لحاظ سے مضبوط ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ ان امکانات کی قدر کرے اور ان کو ضائع کرنے کی غلطی نہ کرے۔

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار ۔ لاکہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

موجودہ مادّی نظریات میں سب سے زیادہ گمراہ کن نظریہ "نظریۂ ارتقاء" ہے جو آج عالمگیر شکل میں اہلِ علم کے اذہان پر چھایا ہوا ہے۔ اس نظریہ کا خلاصہ ایک لفظ میں یہ ہے کہ "انسان" نچلے درجے سے ترقی کرتا ہوا "موجودہ انسان" کی شکل میں آیا۔ اس نظریہ کو صحیح تسلیم کر لینے کا مطلب ہے، خالقِ کائنات اور اس کی ربوبیت وخلّاقیت کا انکار۔ کیونکہ اس "ارتقاء" سے مُراد ہے کہ "تمام چیزیں"، بغیر خدائی مداخلت کے "خودبخود" عالمِ وجود میں آئیں اور "خودبخود ترقی" کر رہی ہیں۔ اور ادنیٰ سے اعلیٰ "حالت" تک "خودبخود" پہنچ رہی ہیں۔ حتّٰی کہ خود "مادّہ" یعنی وہ مواد، جس سے دنیا بھر کی تمام اشیاء "مرکّب" ہیں، بھی کسی "ہستی" کا پیدا کردہ نہیں ہے۔ بلکہ خودبخود ہی "وجود" میں آیا ہے۔ یہ "مادّہ"، ترقی کرتے کرتے پہلے "مادّۂ حیات" بنا، پھر اُس سے "جرثومۂ حیات" کا وجود از خود عمل میں آیا۔ پھر یہی "جرثومۂ حیات" اپنی "سادہ شکل" سے ترقی کرتے کرتے "پیچیدہ انواع" کی شکل میں خودبخود آگے بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ پہلے "نباتات" اور پھر "حیوانات" کی بے شمار انواع وجود میں آنے لگیں۔ پھر یہی جرثومۂ حیات بغیر کسی خالق وکارساز کی کرشمہ سازیوں کے ترقی کر کے "خودبخود" ایک "انسان" کی شکل میں نمودار ہوگیا۔ اور اس ہونے والے "ابتدائی مادّۂ حیات" کو "انسانی شکل" اختیار کرنے میں کروڑوں سال لگ گئے۔ جیسا کہ علم طبقات الارض، علمِ اثریات اور

علمِ حیاتیات وغیرہ کی تحقیقات واکتشافات سے ظاہر ہے۔

یہ نظریہ سب سے پہلے بفن (۱۷۸۳ء — ۱۷۰۷ء) ۔اس کے بعد کانٹ (۱۷۲۴ء — ۱۸۰۸ء) نے پیش کیا۔ اور پھر مزید تحقیقات واستدلالات سے مزین کرکے زیادہ علمی قوت کے ساتھ ڈارون نے اسے ایک علمی مسلمہ کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی۔ چارلس رابرٹ ڈارون (۱۸۸۲ء — ۱۸۰۹ء) بجائے خود محققانہ ذہن لے کر پیدا ہوا تھا لیکن یہ اس کی بدقسمتی کہ اس نے اپنی صالح ذہنیت کو غلط رُخ دے دیا۔ ۱۷ دسمبر ۱۸۳۱ء سے ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۶ء تک برطانیہ سے نکل کر امریکہ اور دیگر جزائر وجنگلات کا تقریباً ۴۰ ہزار کلومیٹر پر مشتمل ۵ سالہ طویل بحری سفر نے اسے ایک نئے طریقے سے دنیا کو سمجھنے پر اکسایا۔ اپنے اس طویل سفر میں ڈارون نے برازیل کے جنگلات اور انڈینہ کے کوہی سلسلوں کی خاک چھانی۔ یہاں اُس نے عجیب وغریب جانور دیکھے۔ اُس نے "فنچ" طوطی کی ۲۲ نسلیں دیکھیں۔ جن میں سے ہر چڑیا کا رنگ، غذا، چونچ کی ساخت اور سائز اُس کی غذا کے اعتبار سے دوسری سے مختلف تھے۔ اس نے دیکھا کہ قدیم ترین چوہے "آرماڈِلّو" کی ممی اور موجودہ اِس آرماڈِلّو کی ساخت اور سائز میں بڑا فرق نہیں ہے۔ اِن مشاہدات کا تجزیہ کرتے ہوئے اس نے یہ نظریہ قائم کیا کہ تمام جانوروں کی ابتداً ایک ہی نسل وجود میں آئی۔ پھر جب افزائشِ نسل ہوئی تو یہ نسل دور دور تک پھیل گئی۔ اور چونکہ ہر جگہ کے جغرافیائی حالات علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں، اس لئے جن جانوروں نے خود کو مقامی حالات کے مطابق ڈھال لیا وہ باقی رہ گئے۔ ورنہ ہلاکت اُن کا مقدر بن گئی۔ اِن میں سے کئی نسلیں تو اتنی مختلف ہیں کہ بجائے خود وہ ایک جدید نسل بن گئیں۔ اُس کا یہ بھی کہنا تھا کہ جانداروں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے زیادہ سے زیادہ غذا اور محفوظ ٹھکانوں کی حاجت ہوتی ہے۔ قدرتی غذاؤں کے ذخائر ان کے نزدیک محدود ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ تحصیلِ غذا کے لئے تمام جاندار آپس میں مقابلہ یا جنگ کرتے ہیں اور اس جنگ میں مدد کے لئے نئی نسلیں پیدا کرتے ہیں۔ لیکن جو جانور اتنی تیزی کے ساتھ نئی نسل پیدا نہیں کرسکے وہ فنا کے گھاٹ اُتر جاتے ہیں۔

یہ نظریہ ہی اس کی زندگی کا حاصل تھا۔ اُس نے اِس موضوع پر وسیع ترین تحقیقات

کیں۔ اسی تحقیق کے دوران اپنی تھیوری کے مطابق اس نے یہ بھی کہا کہ انسان بھی ایک جاندار ہے۔ اور اس کی ابتداء "ہاؤکر" نسل کے بندر سے ہوئی ہے۔ اس بندر کی نفسیاتی کیفیت، جسمانی ساخت، مزاج و افعال اور غذائی اشیاء انسان سے بہت مناسبت رکھتی ہیں۔ اس نے اپنی نسل میں زیادہ تیز رفتاری سے افزائش کی۔ زمین کے مختلف خطوں میں پھیلتے رہنے کے سبب مختلف جغرافیائی حالات سے مقابلہ کرنا پڑا۔ اس نے مختلف خطوں میں رہنے کے سبب مختلف موافق اور ناموافق حالات کے مطابق نبرد آزمائی کی۔ یہ خود لڑتا رہا اور اپنے اندر تبدیلیاں کرتا رہا۔ اور یہاں تک کہ "ترقی" کرتے کرتے "موجودہ انسان" وجود میں آگیا۔ اس عمل میں کروڑوں سال کا وقت لگا ہے۔ رابرٹ ڈارون نے اپنی سب سے پہلی اور مایہ ناز تصنیف "آن دی اوریجن آف اسپیسیز بائی مینس آف نیچرل سلیکشن" (انواع کی فطری تقسیم) میں اس بحث کو سب سے پہلے مفصل اور جزئیات کے ساتھ پیش کیا۔ اسی کتاب میں اس نے اپنی تھیوری اور مفروضے کی فلسفیانہ بنیاد رکھی۔ اس کی بحث کے مطابق آج کی ہر چیز جاندار ہو یا بے جان اپنا جواز اپنی پچھلی نسل میں چھوڑتی چلی جارہی ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اس دنیا کو اور اس میں موجود تمام اشیاء اور انسانوں کو کسی خالق اور رب نے بنایا اور وہی کارساز اس عظیم کائنات کو چلا رہا ہے قطعی احمقانہ اور درجۂ جہالت کا غیر معمولی تصور ہے۔ اسے رد کیا جانا چاہئے۔

اس نظریہ کو تسلیم کر لینے سے منطقی طور پر یہ نتیجہ نکل آیا کہ انسان ایسے اسباب کی پیداوار ہے، جن کا پہلے سے سوچا سمجھا کوئی مقصد نہیں۔ اس کا آغاز، اس کی نشوونما، اسکی تمنائیں اور اندیشے، اس کی محبت اور عقائد سب کے سب محض آوارہ "ایٹموں" کی "اتفاقی ترتیب کا نتیجہ" ہیں۔ اس کی زندگی کی انتہا قبر ہے اور اس کے بعد کوئی چیز بھی اُسے زندگی عطا کرنے والی نہیں۔ قرنہا قرن کی جد وجہد، تمام قربانیاں، بہترین احساسات اور عبقریت کے روشن کارنامے سب نظامِ شمسی کے خاتمے کے ساتھ فنا ہو جانے والے ہیں۔ انسانی کامرانیوں کا پورا محل ناگزیر طور پر کائنات کے ملبے کے نیچے دب کر رہ جائے گا۔

انسان نے خود اپنا مورخ، اپنا سوانح نگار اور خود اپنا قاضی و منصف ہونے کی

وجہ سے خود کو ایک اعلیٰ مقام اور یہاں تک کہ خدائی کے منصب پر رکھ لیا ہے لیکن ...
کے حقائق ہمیں بتاتے ہیں کہ انسان کے مورثان "آدم و حوا" نہیں بلکہ رینگنے والے حیوا...
حشرات الارض تھے۔ یہی وہ طبقہ ہے جس سے سانپوں، چھپکلیوں اور مگرمچھوں کا تعلق ...
اس کے اس سے پہلے متعلقین جل تھلی یعنی ایسے جانور رہتے جو کہ پانی و خشک زمینوں دو...
میں رہ سکتے تھے۔ جن کی سب سے زیادہ مشہور مثال مینڈک ہے۔ اور اس کے ...
سے بھی زیادہ دور کے مورث یکے بعد دیگرے تسلسل کے ساتھ مچھلیاں، ٹینسلیٹ ...
شکلیں، جن کا شمار نرم ہڈی والے جانوروں میں ہوتا ہے، سمندری خار پشتوں کے رشتے ...
سمندری امینی مون یعنی ایسے جانور جن میں خلیئے کی دو تہیں ہوتی ہیں اور بالآخر ایک ...
والے چھوٹے جانور ہیں۔

اِس نظریہ کی تائید میں جو سب سے بڑی اور اہم دلیل پیش کی جاتی ہے وہ یہ کہ ز...
کی کھدائی میں جو قدیم ترین دور کی ہڈیاں ملی ہیں اور جن کو "امفوری آثار" کہا جاتا ہے، ...
بارے میں قیاس ہے کہ وہ لاکھوں سال پرانی ہیں۔ ان میں سے بعض انسانوں سے کمتر قسم کی ا...
سے بھی متعلق ہیں۔ یعنی اُن انواع سے متعلق جو "انسان نما" تھیں۔ اور جن کا درجہ انسانوں اور چمپنیز...
خاندان کے بندروں کے درمیان تھا۔ یہ حشراتی اور اعلیٰ بے دُمے بندروں وغیرہ کے گروہ ...
عرصے تک باقی رہے جو کروڑوں برسوں پر محیط ہے۔ ان کے مقابلے میں زمین پر انسان...
وجود کی مجموعی مدت تقریباً ۱۵ لاکھ سال ہے۔ جو کہ تیزی سے گذرنے والا محض ایک لمحہ ...
اس اعتبار سے گویا کہ موجودہ انسان نچلے حیوانات سے درجہ بدرجہ ترقی کرتا ہوا بغیر ...
خدائی مداخلت کے خود بخود ایک اعلیٰ جانور یا "ذی عقل حیوان" کے روپ میں جلوہ ...
ہوا۔ اور ان متعدد انواع میں "آدم" کا کوئی مقام نہیں۔ بالفاظِ دیگر حشرات الارض یا ...
خاندان سے لے کر موجودہ انسان تک جتنی بھی انواع گذر چکی ہیں ان میں سے کسی بھی نوع کو ...
کے ساتھ موسوم کرنا ممکن نہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ "خود بخود" والی تھیوری کیسے قبول کر لی جائے کسی معجز...
کا وجود تسلیم کئے بغیر ان حیاتیاتی مسائل کی توجیہ ناممکن ہے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ اتفاقیہ ...

یہ مختلف عناصر کا ایک خاص ترتیب کے ساتھ جمع ہو کر محض ایک "سالمے" کو تشکیل دینے کیلئے زمین کی پوری عمر تقریباً ۴ ارب سال بھی خود سائنس دانوں کے نزدیک ناکافی ہے۔ مشہور فرانسیسی محقق ڈو نوائے نے لکھا ہے کہ "اگر بالفرض اس تجربہ کے تحت یہ بات (یعنی کسی "سالمے" کا ظہور) واقع ہو بھی جائے تو یہ بات ایک معجزہ ہو گی اور نتیجہ ایک "واحد سالمہ" یا دو تین سالمے ہو سکتے ہیں۔ مگر اس کے آگے زندگی کے باقی مسائل کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی۔ اس موقع پر زندگی کا نہیں، وہ تو بہت دور کی چیز ہے، سوال محض کسی ایک "مادّے" کا ہے۔ جو زندہ اشیاء کو تشکیل دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس موقع پر ایک "سالمے" سے کوئی بھی فائدہ نہیں۔ بلکہ زندگی تشکیل دینے کے لئے تو سینکڑوں ملین ویسے ہی سالمے ضروری ہیں"۔

ماہر حیاتیات ڈاکٹر اسیمو ولکھتے ہیں "سائنس تسلیم کرتی ہے کہ زندگی کا بنیادی "مادّہ" ایک ڈی این اے ہے جو حیوانی و نباتاتی خلیوں میں ایک خاص کیمیاوی عمل اور ردِّ عمل کے تحت موجود رہتا ہے۔ بغیر اس ڈی این اے کے زندہ "سالمے" وجود میں نہیں آ سکتے اور زندگی جیسا کہ ہم جانتے ہیں شروع نہیں ہو سکتی"۔ زندہ مادّے کے تمام مرکبات یعنی انزائم اور دیگر اجزا جن کی تیاری میں انزائم کے ذریعہ کیمیاوی تغیّر پیدا کیا جاتا ہے اپنے آخری تجزیہ میں ڈی این اے پر انحصار کرتے ہیں۔ لہٰذا اب سوال یہ ہے کہ ڈی این اے کس طرح بنا اور زندگی کیسے وجود میں آئی؟ یہ ایسا سوال ہے جس کے پوچھے جانے پر سائنس ہمیشہ ہچکچاتی ہے۔ کیونکہ اس سوال کا اس کے پاس کوئی معقول جواب نہیں ہے۔

معلوم ہوا کہ وہ ہڈیاں جنہیں "مغوری آثار" کہتے ہیں۔ اور جن کا تعلق "جاوا کے انسان" یا "ہائیڈل برگ کے انسان"، یا "تحت الانسان"، یا "انسان نما بندروں" سے ہے یہ بھی ڈی این اے کے عمل اور ردِّ عمل کے تحت ہی وجود میں آئے ہیں۔ اور آج تک اس نظریہ کے موجد یا مؤیّد یہ نہیں ثابت کر سکے کہ خود ڈی این اے کیسے "وجود" میں آیا۔ بات پھر اتفاق کی آتی ہے۔ مگر سائنس کے نزدیک "اتفاق" اتنے آسان نہیں۔ ریاضیاتی طور پر یہ اتفاق دس ارب میں سے ایک چانس کا اوسط رکھتا ہے۔ جب کہ زمین کی زیادہ سے زیادہ عمر ½۴ ارب سال ہے

اور اس پر زندگی کا وجود محض ایک ارب سال قدیم ہے۔ اور انسان کی مجموعی عمر تقریباً۔ ارلاکھ سال تسلیم کی گئی ہے۔ یہ اتفاق ایسا ہی ہے جیسے یہ معجزہ کہ کسی سائنس داں کے گلاس سے پانی چھلک کر گر جائے اور فرش پر تمام دُنیا کا نقشہ بنادے۔ یا سینکڑوں بندر کسی ٹائپ رائٹر پر بیٹھ کر اربوں سال تک اُس کے "کی بورڈ" کو پیٹتے رہیں تو سیاہ کئے کاغذوں کے اِس دفتر سے غالب کی ایک غزل تیار ہو جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈارون اور اس کے ہم نواؤں نے ارتقائی نقطۂ نظر سے جو بھی تشریح و توجیہ کی ہے وہ بعض مشابہات کی بنا پر محض "چند قیاسات" ہیں۔ ایک مشہور محقق آر۔ ایس۔ لل لکھتا ہے کہ "ڈارون کے بعد سے "نظریۂ ارتقاء" زیادہ قبولیت حاصل کرتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ اب سوچنے اور جاننے والے لوگوں میں اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہ گیا ہے کہ یہ واحد "منطقی طریقہ" ہے، جس کے تحت عملِ تخلیق کی توجیہ ہو سکتی ہے۔ اور اُسے سمجھا جا سکتا ہے" سوال یہ ہے کہ یہ نظریہ جس کی صداقت پر سائنس دانوں کا اس قدر اتفاق ہو گیا ہے۔ کیا اُسے کسی نے دیکھا ہے؟ یا اس کا تجربہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اور نہ ہو سکتا ہے "ارتقاء" کا مزعومہ "عمل" اتنا پیچیدہ اور اتنے بعید ترین ماضی سے متعلق ہے جس کو دیکھنے یا تجزیہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ماہرِ حیاتیات چارڈن لکھتا ہے:

"اِس کہانی (نظریۂ ارتقاء) کی تفصیلات ہمیں کبھی حاصل نہیں ہو سکتیں۔ خواہ اس بارے میں تاریخی نوعیت کی تحقیقات کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو جائیں۔ جب تک کہ مستقبل کی سائنس "لیبارٹری" میں اِس عمل کو دُہرانے کے قابل نہ بن جائے"

سر آرتھر کیتھ نے ۱۹۵۳ء میں کہا تھا "ارتقاء ایک غیر ثابت شدہ نظریہ ہے۔ اور وہ ثابت بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہم اُس پر صرف اس لئے یقین کرتے ہیں کہ اس کا واحد بدل "تخلیق" کا عقیدہ ہے جو سائنسی طور پر بالکل ناقابلِ فہم ہے" یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ آخر اس نظریہ کو تسلیم کرنے اور تخلیق و خالق کا انکار کرنے کی آخر کون سی وجہ ہے؟ تو مسٹر جی ایچ بلنٹ کے الفاظ نقل کروں گا "خدا پرستی کی معقولیت اور انکارِ خدا کا نچھتنہ بجائے خود ایک آدمی کے لئے عملاً خدا پرستی اختیار کرنے کا سبب نہیں بن سکتا۔ لوگوں کے

دل میں یہ شبہ چھپا ہوا ہے کہ "خدا" کا وجود تسلیم کر لینے کے بعد اُس کی آزادی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ وہ علماء جو ذہنی آزادی کو پسند کرتے ہیں، آزادی کی محدودیت کا تصور بھی ان کے لئے سخت وحشت کا سبب ہے؛ درحقیقت یہ حضرات اب تک ایسی کوئی معقول علمی دلیل نہ لاسکے جو اُن کے نظریہ کو "علمی مسلّمہ" کی حیثیت دے سکے۔ ڈاکٹر ایم آر ساہنی کے الفاظ پر یہ دل چسپ بحث ختم کی جاتی ہے۔ وہ "انسانی ارتقاء" میں لکھتے ہیں:

"کس طرح وقت کا سویرا ہونے پر مادّے کے ایک سے ذرّے غذا جذب کرنے نیز اپنے ہی جیسا دوبارہ پیدا کرنے لگے اور کس طرح اپنے آپ میں جان ڈالی۔ یہ اب بھی ایک راز ہے۔ اور غالباً ابھی کافی دنوں تک یہ ایک معمہ رہے گا۔ مختصراً یہ اعتراف شکست ہے۔ اور انسان، فلسفی اور سائنس داں جو بے قابو اپنے گھمنڈ میں کبھی کبھی خود کو طاقتوروں میں سب سے زیادہ طاقت ور سمجھتا ہے، وہ زندگی کی ابتداء کے بارے میں اتنا ہی کم جانتا ہے جتنا کے عالمین بالا کے بارے میں جہاں ہم سب کو لازماً جانا ہے اس وقت جب کہ وہ درخشاں اور خدائی شرارہ جسے "زندگی" کہا جاتا ہے، اسی طرح ابدیت میں فنا ہو جائے جس طرح سے کہ شمع کی زرد لو نسیمِ شام کے محض ہلکے سے جھونکے سے بجھ جاتی ہے۔"

کتابیات:

۱۔ علم جدید کا چیلنج — مولانا وحید الدین خاں

۲۔ انسانی ارتقار — ڈاکٹر ایم آر ساہنی

۳۔ تخلیقِ آدم اور نظریۂ ارتقار — مولانا سید شہاب الدین ندوی

۴۔ اسلام اور عصرِ حاضر — " "

۵۔ اسلام اور جدت پسندی — مفتی محمد تقی عثمانی

۶۔ رسالہ فکر و نظر لاہور — ڈاکٹر عبدالواحد ہالی پوتا

اگست ۶۸ء

حضرت مولانا محمد قمر الزماں صاحب

شیخ سعدی جن کا نام شرف الدین، مصلح الدین لقب اور سعدی تخلص تھا، ۵۸۹ھ میں یا اس سے قبل پیدا ہوئے۔ بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں شیخ ابو الفرج ابن الجوزی کی خدمت میں تحصیل علم کی، اس کے بعد ایک مدت دراز تک سیر و سیاحت میں رہے۔ انہوں نے ایشیائے کوچک، بربر، حبش، مصر، شام، آرمینیا، کاشغر، ہندوستان وغیرہ کا سفر کیا۔ اور سیاحت کے سلسلہ میں بکثرت علماء و صلحاء اور اولیاء کی صحبتوں سے مستفیض ہوئے۔ غالباً شیخ شہاب الدین سہروردی سے بیعت تھے جیسا کہ گلستاں کے ایک قطعہ سے مفہوم ہوتا ہے۔ شیخ کی تصنیفات گلستاں اور بوستاں پند و نصائح اور حکمت و سیاست کے موضوع پر اس قدر مقبول ہوئیں کہ ایسی مقبولیت معدودے چند ہی کتابوں کو نصیب ہوئی ہوگی، ان کتابوں میں شیخ کا انداز بیان اس قدر شیریں اور اتنا دل فریب ہے کہ اس قسم کی دوسری کسی کتاب میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔

شیخ کو حج سے بڑا شغف اور اس پاک سرزمین سے ان کو والہانہ عقیدت تھی، اکثر تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ انہوں نے چودہ حج پاپیادہ کئے ہیں، اور خود شیخ کے کلام سے تعداد کی تو نہیں مگر پاپیادہ حج کرنے کی تصدیق ہوتی ہے، شیخ گلستاں میں فرماتے ہیں کہ مکہ کے بیابان میں ایک رات جاگتے جاگتے چلنے کی سکت نہیں رہ گئی تو میں زمین پر سر رکھ کر پڑ رہا اور شتربان جو قافلہ میں تھا اس سے میں نے کہا بس اب ہم سے ہاتھ اٹھالے۔

پائے مسکیں پیادہ چند رود کز تحمل ستوہ شد بختی
تا شود جسم فربہے لاغر لاغرے مردہ باشد از سختی

یعنی پیدل چلنے والے مسکین کے پیر کب تک چلیں گے کہ اب تو بختی (اونٹ) بھی
سے بھی باہر ہو گیا جب تک کسی موٹے کا جسم لاغر ہوگا، اتنے دنوں میں دبلا آدمی سختی کی و
مر جائے گا۔

شتربان نے کہا کہ بھائی احرم مکہ سامنے ہے اور ڈاکو چور پیچھے ہیں اگر ہمت کر
اور چلو تو میدان مار لو گے اور اگر پڑ کے سو گئے تو ہلاکت کے سوا دوسرا کوئی نتیجہ نہیں۔
گیا ہے کہ۔ ؎

خوش است زیر مغیلاں براہ بادیہ خفت		شب رحیل و لے ترک جاں بباید گفت

یعنی ببول کے درخت کے نیچے میدان میں سوتے ہوئے بہت اچھا لگتا ہے۔
کے لئے جان دینے کا ارادہ نہیں کرنا چاہئے (گلستاں ب) بوستاں میں بھی اسی طرح
قصہ لکھا ہے جو بیابان فید میں ان کو پیش آیا تھا۔ شیخ نے اپنے سفر حج کے متعدد
خود بیان کئے ہیں جو سننے کے قابل ہیں۔ گلستاں میں فرماتے ہیں کہ ایک شخص ننگے پیر
سر پیادہ پا حج کرنے کا ارادہ کر کے کوفہ سے حجاز جانے والے قافلہ کے ساتھ ہوا، میں
معلوم کیا تو اس کے پاس روپیہ پیسہ بھی نہیں تھا، بایں ہمہ بالکل مستانہ چال سے
ساتھ یہ کہتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ؎

نہ بر اشتر سوارم نہ چو اشتر زیر بارم		نہ خداوند رعیت نہ غلام شہریار
غم موجود و پریشانی معدوم ندارم		نفسے می زنم آسودہ و عمرے بسر آر

یعنی میں نہ اونٹ پر سوار ہوں نہ اونٹ کی طرح بوجھ سے دبا ہوں نہ بادشاہ
نہ حاضر کا غم ہے نہ غائب کی پریشانی ہے، آرام سے سانس لے رہا ہوں اور عمر پوری
ایک شترسوار نے اس سے کہا کہ اے درویش کہاں جا رہا ہے، لوٹ جا ورنہ
مر جائے گا اس نے ایک نہ سنی اور چلتا رہا، جب نخلہ بنی محمود میں قافلہ پہونچا تو اتفا
کہ وہ شتر سوار مالدار مر گیا۔ اس وقت اس درویش نے اس کے سرہانے جا کر کہا
نمردیم و تو بر بختی بمردی"۔ یعنی ہم تو سختی سے نہیں مرے مگر تم بختی اونٹ پر مر گئے۔ (گلستاں،
ایک دوسرا واقعہ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ سفر حجاز میں چند ہمدم و ہمقدم اور صا

جوانوں کا ساتھ ہوگیا تھا وہ کبھی کبھی جوش میں آکر کچھ عارفانہ شعر ترنم کے ساتھ پڑھ دیا کرتے تھے، قافلہ میں ایک عارف وشتی بزرگ بھی تھے وہ ... کا اور ڈانٹا کرتے تھے، جب ہم نخیل بنی ہلال میں پہونچے تو وہاں کی آبادی سے ایک حبشی بچے نے نکل کر ایسی پُردرد اور دل ہلا دینے والی آواز سے ایک شعر پڑھا کہ اُڑتی ہوئی چڑیاں فضا میں رُک گئیں اور ان بزرگ کا اونٹ ناچنے لگا وہ دہم سے زمین پر آگرے اور اونٹ جنگل کی طرف نکل گیا۔ (گلستاں ب)

ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ ہمارے ساتھ حجاز جانے والے قافلہ میں ایک خرقہ پوش بزرگ بھی تھے، ان کو عرب کے ایک امیر نے منیٰ میں قربانی کرنے کے لئے سَو دینار دیئے تھے، جاتے جاتے ایک مقام پر قبیلہ بنوخفاجہ کے چوروں نے ہم پر چھاپہ مارا اور جتنا کچھ تھا سب لوٹ لے گئے، دوسرے تمام لوگوں نے تو رونا دھونا چیخنا چلّانا اور بے کار واویلا مچانا شروع کیا مگر اس خرقہ پوش پر کوئی اثر نہ تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ ہوا ہی نہیں، میں نے اس سے کہا شاید وہ رقم (جو امیر عرب نے دی تھی) چور نہیں لے گئے، فرمایا لے کیوں نہیں گئے، لیکن مجھ کو اس سے ایسی اُلفت نہیں تھی کہ اس کے جانے کا قلق ہو۔ ؎

نباید بستن اندر چیز و کس دل کہ دل بر داشتن کاریست مشکل

یعنی کسی چیز اور آدمی سے دل کو وابستہ نہیں کرنا چاہئے اس لئے کہ وابستگی کے بعد علیٰحدگی دشوار ہوتی ہے۔

ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ ہم نے ایک بدّو کو دیکھا جو اپنے لڑکے سے کہہ رہا تھا یابُنیَّ انك مسئولٌ یومَ القیٰمۃِ ماذا اکتسبتَ ولا یُقال بمن انتسبت یعنی قیامت میں تم سے یہ سوال ہوگا کہ تمہارے پاس عمل کیا ہے؟ یہ سوال نہ ہوگا کہ تمہارا پدر کون تھا۔ ؎

جامۂ کعبہ را کہ می بوسند او نہ از کرم پیلہ نامی شد

با عزیزے نشست روزے چند لاجرم ہمچو او گرامی شد

یعنی کعبہ کے غلاف کو جو بوسہ دیتے ہیں تو اس کو یہ عزت ریشم کے کیڑے کی وجہ سے نہیں ملی ہے بلکہ ایک قابل عزت واحترام شے (کعبہ) کے ساتھ اس کو چند دن صحبت کا شرف حاصل ہوا اس لئے وہ بھی معظم ومحترم ہوگیا۔ (گلستاں ب)

ساتویں باب میں فرماتے ہیں کہ ایک سال پیدل جانے والے حاجیوں میں جھگڑا ہوگیا، اس سفر میں مَیں بھی پیدل تھا حق بات یہ ہے کہ ہم خوب لڑے اور فسق وجدال کی اچھی طرح داد دی ہمارا یہ حال دیکھ کر ایک حاجی جو کجاوہ میں سوار تھا اپنے ساتھی سے بولا کہ عاج (ہاتھی دانت) کا پیادہ تو شطرنج کی بساط میں مسافت طے کرکے فرزین (یعنی پہلے سے بہتر) ہوجاتا ہے اور حاج (حاجیوں) کا پیادہ اپنا راستہ قطع کرکے پہلے سے بدتر ہوگیا۔

از من بگوے حاجی مردم گزائے را ۔۔۔ کہ پوستین خلق بآزار می درد

حاجی تو نیستی، شتر است، از برائے آنکہ ۔۔۔ بیچارہ خار می خورد و بار می برد

یعنی آدمیوں کو کاٹ کھانے والے حاجی سے جو مخلوق خدا کو آزار دیتا ہے میری طرف سے کہہ دے کہ تو حاجی نہیں ہے، بلکہ اونٹ حاجی ہے کہ وہ بیچارہ کانٹے کھاتا ہے اور بوجھ ڈھوتا ہے۔

اور سب سے زیادہ مؤثر اور رقت خیز و درد انگیز یہ واقعہ لکھا ہے کہ میں نے ایک درویش کو دیکھا کہ وہ آستان کعبہ پر اپنا سر رگڑ رہا تھا اور رو رو کر کہہ رہا تھا کہ اے غفور رحیم! تو جانتا ہے کہ ظلوم وجہول انسان سے ظلم ونادانی کے سوا ہو ہی کیا سکتا ہے۔

عذر تقصیر خدمت آوردم ۔۔۔ کہ ندارم بطاعت استظہار

عاصیان از گناہ توبہ کنند ۔۔۔ عارفاں از عبادت استغفار

یعنی میرے پاس طاعت وعبادت نہیں ہے کہ اس سے مجھ کو تقویت حاصل ہو، اس لئے میں خدمت میں کوتاہی کی صرف معذرت لایا ہوں، گناہگار گناہ سے توبہ کرتے ہیں اور عارف لوگ اپنی عبادتوں کی خامیوں سے استغفار کرتے ہیں۔

عبادت گذار بندے عبادتوں کا ثواب مانگتے ہیں اور تاجر لوگ سودے کی قیمت، لیکن میں ایک بیکس غلام ہوں اُمید لایا ہوں نہ طاعت، اور بھیک مانگنے آیا ہوں نہ تجارت کے لئے۔ اصنع بی ماانت اھلہ ولا تفعل بنا مانحن اھلہ (تو ہمارے ساتھ وہ کر جو تیرے لئے سزاوار ہے وہ نہ کر جس کے ہم مستحق ہیں)۔

گر کُشی ور جُرم بخشی روے وسر بر آستانم ۔۔۔ بندہ را فرماں نباشد ہر چہ فرمائی برآنم

یعنی تو چاہے تو ہلاک کر دے چاہے تو بخش دے ہمارا منھ اور سر تیرے آستانہ پر ہے، بندہ حکم نہیں دے سکتا جو تیرا حکم اور مرضی ہو ہم اس پر راضی ہیں۔

قطعہ

بر درِ کعبہ سائلے دیدم ۔۔۔ کہ ہمی گفت و می گریستی خوش

من نگویم کہ طاعتم بپذیر ۔۔۔ قلمِ عفو برگنہ ہم کش

یعنی کعبہ کے دروازہ پر ایک سائل کو دیکھا کہ خوب رو رہا تھا اور یہ کہہ رہا تھا کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میری طاعت وعبادت قبول فرما، بلکہ میری عرض صرف یہ ہے کہ میرے گناہوں پر معافی کا خط کھینچ دے۔

شیخ نے اپنی کتاب بوستاں میں بھی بعض واقعاتِ حج لکھے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ؎

مرا حاجیے شانہ عاج داد ۔۔۔ کہ رحمت بر اخلاق حجاج باد

شنیدم کہ بارے سگم خواندہ بود ۔۔۔ کہ از من بنوعی دلش ماندہ بود

بینداختم شانہ کیں استخواں ۔۔۔ نمی بایدم دیگرم سگ مخواں

مپندار چوں سرکہ خود خورم ۔۔۔ کہ جورِ خداوند حلوا برم

یعنی ایک حاجی نے مجھ کو ہاتھی دانت کی ایک کنگھی دی (حجاج کے اخلاق پر خدا کی رحمت ہو) میں نے سنا تھا کہ کبھی اس کو مجھ سے شکایت ہو گئی تھی اور اس نے مجھ کو کتا کہہ دیا تھا اس لئے میں نے کنگھی اس کی طرف پھینک دی اور کہا مجھ کو یہ ہڈی نہیں چاہئے ہاں آئندہ آپ مجھ کو کتا نہ کہئے۔ جب میں اپنے سرکہ پر قناعت کرتا ہوں تو یہ نہ سمجھئے کہ حلوے والے کا ستم برداشت کر دوں گا۔ (ب)

شیخ نے بوستاں کے دسویں باب میں ایک شوریدہ سر حاجی کی درد و سوز سے بھری ہوئی مناجات نقل کی ہے جس کو پڑھ کر ممکن نہیں کہ کوئی آنکھوں پر قابو رکھ سکے شیخ کا سال وفات ۶۹۱ھ ہے۔ شیراز میں مزار ہے۔

(اعیان الحجاج ص۱۰۳ ج ۲)

سبحان اللہ! حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی مدظلہ نے شیخ سعدی علیہ الرحمہ

تذکرہ خوب سے خوب تر ارقام فرمایا ہے جو آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہے تاہم جی چاہتا ہے کہ شیخ کے ارشادات مزید درج کیے جائیں تاکہ مزید بصیرت حاصل ہو بلکہ ممکن ہے کہ موجب نصح و موعظت ثابت ہو۔

حضرت الشیخ کی گلستاں و بوستاں پوری کی پوری دفتر معرفت اور گنجینۂ حکمت ہے حضرت مرشدی مصلح الامت عارف باللہ مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہٗ کے نزدیک ان کی بڑی قدر و منزلت تھی اس لئے اپنی مجالس میں ان کے مضامین مفیدہ کو سنا کر حاضرین کو مستفیض فرماتے تھے بلکہ اس کے ذریعہ تصوف کی تعلیم اور راہِ سلوک کی تشریح فرماتے تھے۔ لہٰذا پہلے ایک حکایت ملاحظہ فرمائیے۔

یکے از ملوک عرب شنیدم که با متعلقانِ ایوان می گفت که مرسوم فلاں راچندانکه ہست مضاعف کنید که ملازم درگاه است و مترصدِ فرمان و دیگر خدمت گاراں بلہو و لعب مشغول و در ادائے خدمت متہاون۔

عرب کے ایک بادشاہ کے بارے میں سنا کہ وہ دفتر والوں سے کہہ رہا تھا کہ فلاں شخص کی تنخواہ جس قدر ہے اس سے دوگنی کر دو کیونکہ وہ بارگاہ کا حاضر باش ہے اور حکم کا منتظر رہتا ہے اور دوسرے خدمت گار لہو لعب میں مشغول اور خدمت میں سست ہیں۔

صاحب دلے بشنید و فریاد و خروش از نہادش بر آمد پرسیدندش که چه دیدی؟ گفت۔ مراتب بندگانِ بارگاہِ خدائے تعالیٰ ہمیں مثال دارد۔

ایک صاحب دل نے یہ بات سن لی اور ان سے فریاد و چیخ نکل گئی لوگوں نے دریافت کیا کہ آخر تم نے کیا دیکھا (جس سے اس قدر وجد و حال میں آگئے) تو فرمایا کہ بندوں کے مرتبے اللہ کے دربار میں اسی طرح ہیں (یعنی جو جتنا عمل و فرماں برداری کرتا ہے ویسے ہی قرب و قبول اور مرتبہ سے نوازا جاتا ہے)۔

نظم

دو بامداد گر آید کسے بخدمت شاہ — سوم ہر آئینہ در وے کند بلطفِ نگاہ

یعنی دو صبح بھی اگر کوئی بادشاہ کی خدمت میں حاضری دیتا ہے تو تیسرے دن ضرور

بادشاہ اس کی طرف نظرِ کرم کرتا ہے۔

امید ہست پرستندگانِ مخلص را — کہ نا امید نگردند ز آستانِ الٰہ

یعنی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مخلص عابدوں کو اپنے آستانہ سے نا امید نہ فرمائیں گے۔

مثنوی

مہتری در قبول فرمان است — ترک فرمان دلیلِ حرمان است

یعنی سرداری تو فرمان کے قبول کرنے میں ہے۔ رہی نافرمانی تو یہ محرومی کی علامت ہے۔

ہر کہ سیمائے راستاں دارد — سر خدمت بر آستاں دارد

یعنی جو شخص سچّوں کی پیشانی رکھتا ہے تو وہ خدمت گذاری کے لئے سر کو جھکا دیتا ہے۔ (گلستاں ب)

ف۔ سبحان اللہ شیخ سعدیؒ نے کیسی نصیحت آموز حکایت نقل فرمائی جس میں ایک ایسی حقیقت بیان فرمائی جو ہر مسلمان کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی جس قدر طاعت و عبادت کی جائے گی اسی قدر اُدھر سے رحمت کا نزول اور عنایت کا ورود ہوگا اور اسی کے مناسب قُرب و قبول سے بندہ نوازا جائے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا کہ۔ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ۔ یعنی غایت طاعت کا بدلہ غایت عنایت کے علاوہ اور بھی کچھ ہو سکتا ہے۔

اور شاید اسی سرو نکتہ کے تحت ترجمان الغیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ خیر العمل ما دیم علیہ۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہترین عمل وہ ہے جس پر مداومت کی جائے۔ جب اللہ تعالیٰ کو بندوں کی طاعت اور اس پر مداومت محبوب ہے تو پھر بندوں کو بھی ان کے در کی ملازمت اور ان کے بیت کا اعتکاف مطلوب مقصود ہونا چاہئے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کے قرب و قبول سے نوازے جائیں۔ اسی لئے مردانِ خدا اور سالکین راہ مداومت علی الاعمال کی سعی کرتے ہیں اور مشائخ کرام اس کی ترغیب دیتے ہیں تاکہ دوام عمل سے دوام قُرب کی دولت سے شاد کام ہوں۔ (از مرتّب عفی عنہ)

اب ذرا حضرت شیخ کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے جس میں توحید باری تعالیٰ کی تعلیم

ری ہے اگر آدمی اس کو کامل طور پر اپنائے تو بہت سی کلفتوں سے نجات پاجائے وہ یہ ہیں:

گر گزندت رسد ز خلق مرنج　　　کہ نہ راحت رسد ز خلق نہ رنج

یعنی اگر مخلوق کی جانب سے کوئی تکلیف کی بات تم تک پہونچے تو رنجیدہ نہ ہو بلکہ یہ یقین کرلو کہ راحت و رنج درحقیقت مخلوق کی طرف سے نہیں پہونچتا۔

از خدا داں خلاف دشمن و دوست　　　کہ دلِ ہر دو در تصرف اوست

دوست و دشمن کی مخالفت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھو کیونکہ دونوں کے دل اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔

گرچہ تیر از کمان می گزرد　　　از کماں دار بنیند اہل خرد

اگرچہ تیر بظاہر کمان سے نکلتا ہے مگر عقل مند آدمی اس کو کمان والے کی طرف سے سمجھتا ہے۔

حکمت۔ خبرے کہ دانی دل بیازارد تو خاموش باش تا دیگرے بیارد۔ ؎

بلبلا مژدۂ بہار بیار　　　خبرِ بد بہ بوم شوم گذار

جس خبر کے متعلق تم کو معلوم ہے کہ وہ دل آزار ثابت ہوگی تو خاموش ہی رہو تاکہ کوئی دوسرا اس کو پہونچائے۔

اے بلبل! تم بہار کی خوشخبری سناؤ اور بری خبر کو منحوس الّو کے لئے چھوڑ دو۔

(گلستاں)

شیخ سعدی کے والد کی نصیحت

پدر چوں دَورِ عمرش منقضی شد　　　مرا یک نصیحت کرد و بگذشت

ہمارے پدر محترم جب قریب المرگ ہوگئے تو مجھے ایک نصیحت فرمائی اور رحلت فرماگئے۔ ؎

کہ شہوت آتش است از وے بپرہیز　　　بخود بر آتشِ دوزخ مکن تیز

شہوت آگ ہے اس لئے اس سے بچتے رہو اور اپنے اوپر آتشِ دوزخ کو تیز نہ کرو۔

دراں آتش نداری طاقتِ سوز　　　بہ صبر آبے بریں آتش زن امروز (ب)

جب اُس آگ دوزخ میں جلنے کی تمہیں سہار و برداشت نہیں ہے تو پھر آج اس شہوت کی آگ پر صبر و ثبات کا پانی ڈال کر بجھا دو۔

ف۔ سبحان اللہ پہلے ایسے باپ ہوتے تھے جو بلا تکلف اپنی اولاد کو ایسی نصیحت فرماتے تھے تاکہ ان کی اصلاح ہو اور عذابِ دوزخ سے نجات پائیں جو فوزِ عظیم اور اصل کامرانی ہے۔ (از مرتب)

حکمت۔ مشورہ با زنان تباہ ست و سخاوت با مفسداں گناہ۔

عورتوں کے ساتھ مشورہ کرنا باعثِ تباہی ہے اور مفسدوں کے ساتھ سخاوت کرنا موجب گناہ ہے

ترحّم بر پلنگِ تیز دنداں ستمگاری بود بر گوسفنداں

تیز دانت والے چیتے پر رحم کرنا بکریوں پر ظلم کے مرادف ہے۔

ف۔ اس سے ظلم اور ظلم پر اعانت کی کیسی کچھ مذمت ثابت ہوئی۔ اللہ تعالےٰ ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے۔ (از مرتب)

شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی نصیحت شیخ سعدیؒ کو

خود شیخ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔ ؎

مرا پیر دانائے فرخ شہاب دو اندرز فرمود بر روئے آب

مجھ کو پیر دانا حضرت شہاب الدینؒ نے دو نصیحت سفرِ دریا کے اثنا میں فرمائیں۔

یکے آنکہ بر خویش خود بیں مباش دوم آنکہ بر غیر بد بیں مباش

اوّل یہ کہ خود پسندی اور خود بینی سے پرہیز کرنا اور دوم یہ کہ دوسروں کو بُرائی سے نہ دیکھنا۔

ف۔ سبحان اللہ کیسی عمدہ نصیحت ہے جو صفحاتِ قلوب پر لکھے جانے کے قابل اور لائحہ عمل بنانے کے لائق ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ روحِ تصوف اور طریقِ صوفیہ کا خلاصہ ہے، اور یہ سب نصیحتیں کوئی نئی نہیں ہیں۔ یہ سب کتاب و سنت سے مقتبس اور ماخوذ ہیں اور ظاہر ہے کہ اگر کوئی بات اپنی جانب سے ہو اور کتاب و سنت سے اس کو تائید حاصل نہ ہو تو پھر نہ اس کا اعتبار رہے اور نہ اس کی قدر و منزلت ہے۔ چنانچہ آپ دیکھ لیجئے کہ صوفیہ جو کبر وغیرہ کی مذمت کرتے ہیں اور دوسروں کی تحقیر و تذلیل سے پرہیز رہنے کی جو نصیحت فرماتے ہیں تو ان سب کی اصل کتاب و سنت میں مذکور ہے جو اہل علم پر مخفی نہیں ہے۔

عام معاشرت

جاہلی دنیا کی دینی و روحانی جہالت عوام کے ساتھ ان کے رویہ، طبقاتی تفاوت اور عورت کے سلسلہ میں ان کے خیالات و معاملات اور اس کے بالمقابل مذہبِ اسلام کے اس سلسلہ میں خیالات و تعلیمات کا تقابلی صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی معاشرتی و سماجی زندگی پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔

چنانچہ روم و ایران اور اہل عجم پر عام طور پر عیش پرستی کا بھوت سوار تھا مصنوعی تہذیب اور پُرفریب زندگی کے سیلاب میں سر سے پاؤں تک غرق تھے۔ سلاطینِ روم اور شاہانِ ایران اور ان کے امراء و رؤسا کو سامانِ تعیش کی فراہمی اور دولت ستانی کے سوا کسی بات کی فکر نہ تھی۔ عیاشی، تکلفاتِ زندگی، تعیشات اور سامانِ آرائش کی پُھنات اور ان میں باریکیاں و نکتہ سنجیاں محیر العقول اور قیاس سے بالا و برتر تھی۔

والیانِ ریاست، شاہزادے، امراء، اونچے گھرانوں کے نیز متوسط طبقہ کے افراد بادشاہوں کے نقش قدم پر چلنے کی اور کھانے پینے، پوشاک اور طرزِ رہائش میں ان کی نقل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک ایک شخص اپنی ذات اور اپنی پوشاک پر اتنا صرف کرتا جس سے ایک پوری بستی کی پرورش ہو سکے ۔۔۔ اس عیش پسند اور مسرفانہ زندگی کا نقشہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی جلیل القدر تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" میں اس طرح کھینچا ہے۔

"صدیوں سے آزادانہ حکومت کرتے کرتے اور دنیا کی لذتوں میں انہماک، آخرت سے غفلت اور شیطان کے ان پر پورا مسلط ہو جانے کی وجہ سے اہل عجم اور روم نے زندگی کی آسائشوں

میں بڑی موشگافی پیدا کر لی تھی، اور اس میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے اور فخر کرنے کی کوشش کرتے تھے، دنیا کے مختلف گوشوں سے ان کے پاس بڑے بڑے اہل ہنر جمع ہو گئے تھے جو اس سامانِ آرائش و آسائش میں نزاکتیں اور نئی نئی تراش خراش نکالتے تھے، اور ان پر فوراً عمل شروع ہو جاتا تھا اور اس میں برابر اضافے اور جدّتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اور ان باتوں پر ناز کیا جاتا تھا۔ معیارِ زندگی اتنا بلند تھا کہ اُمرا میں سے کسی کے لئے ایک لاکھ درہم سے کم کا پٹکا باندھنا اور تاج پہننا سخت معیوب اور باعثِ عار تھا۔ اگر کسی کے پاس عالی شان محل، فوارہ، حمام، باغات، خوش خوراک اور تیار سواریاں خوش رو اور حسین غلام نہ ہوتے اور کھانے پینے میں تکلفات اور لباس و پوشاک میں تجمّل نہ ہوتا تو ہم چشموں میں اس کی کوئی عزت نہ ہوتی۔" (حجۃ اللہ البالغہ ص۱۰۵ ج۱ "باب اقامۃ الارتفاقات واصلاح الرسوم" مطبوعہ رشیدیہ دہلی)۔

آگے فرماتے ہیں: "یہ تکلفات اور سامانِ تعیّش بیش قرار رقمیں صرف کئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے تھے اور یہ بے پایاں مال و دولت کاشتکاروں، تاجروں اور دوسرے پیشہ وروں پر محصول اور ٹیکس بڑھانے اور ان پر تنگی کئے بغیر دستیاب نہیں ہو سکتی تھیں۔ اگر وہ ان مطالبات کے ادا کرنے سے انکار کرتے تو ان سے جنگ کی جاتی اور ان کو سزائیں دی جاتیں اور اگر وہ تعمیل حکم کرتے تو ان کو گدھوں اور بیلوں کی طرح بنا لیتے جن سے آبپاشی اور کاشتکاری میں کام لیا جاتا اور صرف خدمت کرنے کے لئے ان کو پالا جاتا۔" (حوالہ بالا)

تعیّش کی چند مثالیں

طبری کی روایت ہے کہ: "عربوں کو مدائن کی فتح میں ترکی خیمے نظر آئے جو سر بمہر ٹوکروں سے بھرے ہوئے تھے، عرب کہتے ہیں کہ ہم نے خیال کیا کہ ان میں کھانے پینے کا سامان ہوگا مگر ان میں سونے چاندی کے برتن نکلے۔"

آگے فرماتے ہیں کہ: "اہل فارس کا تعاقب کرتے ہوئے دو خچر ملے۔ ایک کے اوپر سے دو تھیلے نکلے جن میں کسریٰ (شاہِ ایران) کی ریشم کی پوشاکیں تھیں اور وہ سونے کے تاروں سے بنی ہوئی تھیں اور جواہرات سے آراستہ تھیں۔ اور دوسرے تھیلے میں کسریٰ کا مرصّع تاج تھا جو جواہرات سے جڑا ہوا تھا۔"

ایک جگہ لکھتے ہیں کہ: "ایک دوسرے تعاقب میں دوگدے دستیاب ہوئے۔ ان میں سے ایک پر دو تھیلے تھے۔ ایک میں سونے کا بنا ہوا گھوڑا تھا جس کی زین چاندی کی تھی اس کے منہ کے اندر اور گردن پر یاقوت اور زمرد چاندی سے پروئے ہوئے تھے۔ لگام بھی اسی قسم کی تھی۔ اس کا سوار چاندی کا بنا ہوا تھا اور اس کا تاج جواہرات سے مرصع تھا۔ اور دوسرے میں چاندی کی بنی ہوئی ایک اونٹنی تھی جس پر سونے کا نمدہ تھا اور استر بھی سونے کا تھا۔ باگ بھی سونے کی تھی اور ہر چیز میں یاقوت پروئے ہوئے تھے۔ اس پر سونے کا بنا ہوا ایک مرد سوار تھا جس کا تاج جواہرات سے مرصع تھا۔ کسریٰ (شاہِ ایران) ان دونوں کو تاج کے دو ستونوں پر رکھتا تھا۔" (تاریخ طبری اردو ص ۵۰۳-۵۰۴ ج ۲)

ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ: "کسریٰ کے خزانوں میں تین ارب کا مال تھا۔ انہوں نے نصف مال رستم کے ساتھ بھیج دیا۔ باقی نصف خزانوں میں تھا۔" (حوالۂ بالا ص ۴۹۵ ج ۲)

ایک جگہ لکھتے ہیں کہ: "رستم جب پانی میں گھسا تو اس نے بہت سی چیزیں اتار دی تھیں اور ہلکا ہو گیا تھا۔ تاہم اس کا موجودہ سامان بھی ستر ہزار میں فروخت ہوا۔ اس کا تاج اگر مل جاتا تو اس کی قیمت ایک لاکھ تھی۔" (ایضاً ص ۴۲۰ ج ۲)

خسرو دوم (شاہِ ایران) نے ۶۰۷ ـ ۶۰۸ء میں مدائن میں اپنے خزانہ کو نئی عمارت میں منتقل کیا تو اس میں چھیالیس کروڑ اسی لاکھ (۴۶۸۰۰۰۰۰۰) مثقال سونا تھا۔ یعنی تقریباً پانچ ارب روپئے۔ حکومت کے تیرہویں سال بعد اس کے خزانے میں اسّی کروڑ مثقال وزن کا سونا تھا۔ اس کے تاج میں ۱۲۰ پونڈ یعنی ڈیڑھ من خالص سونا تھا۔ (ایران بعہد ساسانیاں ص ۵۳۱ بحوالہ "مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" ص ۷)

مؤرخین نے اس فرش بہار کی جس پر امراء ایران موسم خزاں میں بیٹھ کر شراب پیتے تھے تفصیل لکھی ہے:

"یہ ساٹھ گز مربع تھا، تقریباً ایک ایکڑ زمین گھیر لیتا۔ اس کی زمین سونے کی تھی جس پر جا بجا جواہرات اور موتیوں کی گلکاری تھی۔ چمن تھے جن میں پھولدار اور پھلدار درخت تھے درختوں کی لکڑی سونے کی، پتے حریر کے، کلیاں سونے چاندی کی اور پھل جواہرات کے بنے

گئے تھے۔ ارد گرد ہیروں کی جدول تھی، درمیان میں روشیں اور نہریں بنائی گئی تھیں جو سب جواہرات کی تھیں۔ موسم خزاں میں تاجدارانِ آلِ ساسان اس گلشن بے خزاں میں بیٹھ کر شراب نوشی کرتے اور دولت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ نظر آتا جو زمانہ نے کبھی کہیں اور نہ دیکھا تھا۔" (تاریخ اسلام از مولوی عبدالحلیم شرر ص۳۵۴ ج۱ بحوالہ بالا ص۷۵)

غرض کہ شاہوں، شاہزادوں، ان کے متعلقین ووابستگان اور جاگیرداروں و دولتمندوں کا طبقہ سدا بہار پھولوں کی سیج پر زندگی گزارتا۔ ان کے اہلِ خانہ اور بچے سونے چاندی سے کھیلتے اور دودھ و گلاب میں نہاتے، یہ لوگ اپنے گھوڑوں کی نعلیں بھی جواہرات سے جڑتے اور در و دیوار کو بھی ریشم و کمخواب سے سجاتے تھے۔

اور دوسرا طبقہ یعنی چھوٹے تاجر، کاشتکار و اہل حرفہ کی زندگی سراپا کلفت تھی۔ یہ ٹیکسوں اور نذرانوں کے بار سے کچلے جارہے تھے۔ دوسری مصیبت یہ تھی کہ یہ لوگ بہت سی باتوں میں اونچے طبقہ کی نقل اتارنے کی بھی کوشش کرتے جس سے اور زیادہ پریشان ہوتے۔

یہ تھے جاہلی دنیا کے سامان تعیشات و تکلفات کے چند مختصر سے نمونے جو "مشتے از خروارے" کے طور پر ہیں۔ اب ذرا صرف ایک مثال زمانۂ قریب کی بھی بیان کرنی مناسب ہوگی۔

زمانۂ قریب کی ایک مثال

حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی مدظلہ اپنی کتاب "اسلام اور جدت پسندی" میں چاند پر کمند ڈالنے کے متعلق رقمطراز ہیں: "سوال یہ ہے کہ اس کارنامہ کی انجام دہی کی انسان کو جو قیمت ادا کرنی پڑی ہے کیا اس کے پیش نظر یہ کارنامہ انجام دینے کے لائق بھی تھا؟ ...... صرف ایک اپالو ہشتم کی آمد و رفت پر "ایک کھرب بتیس ارب روپئے کا صرفہ ہوا۔ واضح رہے کہ یہ ایک خلائی جہاز پر خرچ کی جانے والی رقم پاکستان کے کم از کم بیس سال کے بجٹ اور دس کروڑ عوام کی چھ سال کی کمائی کے مساوی ہے۔ اور اپالو دہم پر جو خرچ آیا وہ یقیناً اس سے کہیں زیادہ ہے ...... باہر کی دنیا کو چھوڑیئے خود امریکہ میں جس نے یہ "عظیم کارنامہ" انجام دینے کا اعزاز حاصل کیا ہے ٹھیک اسی مہینے جس میں اپالو ہشتم پر مذکورہ رقم خرچ کی گئی یہ رپورٹ شائع ہوئی تھی کہ وہاں نو آدمیوں میں ایک مفلس ہے۔ اس موضوع پر برطانیہ کے ایک ممتاز مؤرخ اور فلسفی ڈاکٹر آرنلڈ ٹائن بی

کہتا ہے "لیکن آج بھی امریکہ کی دس فیصد یا بیس فیصد آبادی افلاس زدہ افراد پر مشتمل ہے۔ اور اگر دنیا کو بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو اس کی بڑھتی ہوئی آبادی کا صرف ایک تہائی حصہ ایسا ہے جس کو صحیح طریقہ سے خوراک مل رہی ہے۔" کیا ایسے ملک میں کھربوں روپیہ صرف چاند تک پہنچنے کے بے فائدہ شوق میں پھونک دینا عقل، دیانت، انصاف اور ہمدردی سے کہیں میل کھاتا ہے۔"؟ (کتاب مذکورہ ص۷۶-۷۸ اشاعت ۱۹۹۱ء بتغیر واختصار)

یہ تھی جاہلی دنیا اور اس کے "مشابہ دنیا" کا بہت مختصر حال۔ اب ذرا۔

مذہب اسلام

اور اس کے پیروکار و متبعین پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ مذہب اسلام کی تعلیمات اور مسلمانوں کے بھی چند واقعات پڑھ لیجئے اور پھر تقابل کیجئے کہ دونوں میں کتنا فرق ہے۔ کہاں جاہلی دنیا تحت الثریٰ میں اور کہاں مذہب اسلام اور اس کے کامل متبعین آسمان پر۔ چنانچہ سب سے پہلے ہم ایک آیت اور تین حدیثیں ذکر کرتے ہیں۔ اس کے بعد چند واقعات ملاحظہ فرمائیں۔

ارشاد باری ہے:

یٰایھا الذین اٰمنوا لا تأکلوا اموالکم بینکم بالباطل الّاأن تکون تجارۃ عن تراض منکم (الی قولہ تعالیٰ) وکان ذلک علی اللہ یسیرًا۔

(النساء آیت ۲۹-۳۰)

اے ایمان والو نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کے آپس میں ناحق، مگر یہ کہ تجارت ہو آپس کی خوشی سے، اور نہ خون کرو آپس میں۔ بے شک اللہ تم پر مہربان ہے۔ اور جو کوئی یہ کام کرے (یعنی بلا وجہ ظلم و زیادتی سے ناحق اوروں کے مال کھائے یا ان میں کچھ بھی تصرف[1] کرے) تعدّی اور ظلم سے تو ہم اس کو ڈالیں گے آگ میں اور یہ اللہ پر آسان ہے۔

احادیث بسلسلہ تعلیم

حدیث[۱]: عن عبداللہ بن عمر قال أخذ .... حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

[1] قولہ کچھ بھی تصرف الخ: جیسا کہ اس پر آئندہ حدیث[۱] دلالت کرتی ہے۔ فافہم۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بمنکبی فقال: کن فی الدنیا کانک غریب أو عابر سبیل۔ (بخاری شریف ص۹۳۹ ج۲)

صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے دونوں مونڈھے پکڑ کر مجھ سے ارشاد فرمایا: دنیا میں ایسے رہ جیسے کہ تو پردیسی ہے بلکہ راہ چلتا مسافر۔

یعنی جس طرح کوئی مسافر پردیس کو اور رہگذر کو اپنا اصلی وطن نہیں سمجھتا اور وہ اپنے لئے لمبے چوڑے انتظامات نہیں کرتا اسی طرح مومن کو چاہئے کہ اس دنیا کو اپنا اصلی نہ سمجھے اور یہاں کی ایسی فکر نہ کرے جیسے کہ یہیں اس کو ہمیشہ رہنا ہے۔ بلکہ اس دنیا کو ایک پردیس اور رہگذر خیال کرے۔

حدیث۲: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لُعِنَ عبد الدینار و لُعِنَ عبد الدرهم۔ (ترمذی ص۵۸ ج۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: بندۂ دینار خدا کی رحمت سے محروم ہو اور بندۂ درہم خدا کی رحمت سے دور رہے۔

یعنی جو لوگ مال و دولت کے پرستار ہیں اور انہوں نے مال و دولت ہی کو اپنا معبود اور محبوب و مطلوب بنالیا یعنی اس کی چاہت اور طلب میں اللہ کے احکام اور حلال و حرام کی حدوں کو بھی پار کر جائے، اس حدیث میں ان سے بیزاری کا اعلان اور ان کے حق میں بددعا ہے کہ وہ خدا کی رحمت سے محروم اور دور رہیں۔

حدیث۳: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رجالاً یتخوّضون فی مال اللہ بغیر حق فلهم النار یوم القیٰمة۔ (بخاری ص۴۳۹ ج۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلاشبہ وہ لوگ جو اللہ کے (یعنی مسلمانوں کے) مال میں ناحق تصرف کریں تو قیامت کے دن ان کے لئے آگ ہے۔

یعنی جو لوگ عام مسلمانوں کے مالوں کو غلط، باطل طریقہ سے اور ناحق کھاتے اور تصرف کرتے اس حدیث میں ان کے لئے قیامت میں اس کے بدلہ دوزخ کی آگ میں جھونک دیئے جانے کا اعلان ہے۔

واقعات

واقعہ۱: ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے فرمایا

ت رکھی کہ اگر تم دولت مند بننا چاہو تو ہم تمہارے لئے مکہ کی وادی کو سونا بنادیں اور سونے سے بھر دیں۔ تو میں نے عرض کیا کہ میرے پروردگار: میں اپنے لئے یہ نہیں مانگتا بلکہ میں ایسی ناداری اور غریبی کی حالت میں رہنا پسند کرتا ہوں کہ ایک دن پیٹ بھر کر کھاؤں اور ایک دن بھوکا رہوں۔ تو جب مجھے بھوک لگے تو آپ کے سامنے عاجزی اور گریہ وزاری کروں اور آپ کو یاد کروں، اور جب آپ کی طرف سے مجھے کھانا ملے اور میرا پیٹ بھرے تو میں آپ کی حمد اور آپ کا شکر کروں (ترمذی ص۵۸ ج ۲)

واقعہ: سعید مقبریؒ حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک دفعہ ان کا گذر کچھ لوگوں پر ہوا (جو کھانے پر بیٹھے تھے) اور ان کے سامنے بھنی ہوئی بکری رکھی ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے بھی کھانے میں شرکت کی استدعا کی۔ تو آپ نے انکار کر دیا اور (بطور معذرت) کہا کہ (میرے لئے اس کھانے میں کیا مزہ ہے جبکہ مجھے معلوم ہے کہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے اس حال میں تشریف لے گئے کہ جَو کی روٹی سے بھی آپ نے پیٹ نہیں بھرا۔

(بخاری بحوالہ معارف الحدیث ۲۷)

واقعہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جب آپؐ کی وفات کے بعد خلیفہ بنائے گئے تو کچھ دنوں تک تو اسی طرح تجارت کرتے رہے، مگر اس سے امورِ خلافت میں حرج ہونے کی وجہ سے بیت المال سے وظیفہ لینا شروع کر دیا۔ لیکن وفات کے وقت وصیت کی کہ جتنی رقم اب تک میں نے بیت المال سے لی ہے سب واپس کر دو اور فلاں زمین اس رقم کے معاوضہ میں دے دو۔ چنانچہ وہ زمین، ایک اونٹنی، ایک غلام، اور کچھ غلہ تقریباً پانچ درہم کی قیمت کا سب چیزیں واپس کر دیں۔

(تاریخ طبری اردو ص۲۵۶ ج ۲)

واقعہ: آذربائیجان میں کھجوروں اور گھی ملا کر ایک حلوا تیار کیا جاتا تھا جس کو "خبیص" کہتے تھے۔ ایک مرتبہ خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں والی آذربائیجان حضرت عتبہ بن فرقد رضی اللہ عنہ نے دو پٹاریوں میں وہ حلوا تیار کرا کے آپ کی خدمت میں مدینہ بھیجا۔ آپؓ نے اس کو کھول کر چکھا تو لذیذ پایا۔ پھر لانے والوں سے پوچھا "کیا عتبہؓ کی فوج کے سب لوگ یہ حلوا سیر ہو کر کھاتے ہیں؟" یہ جواب نفی میں ملا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: "یہ حلوا واپس

لے جاؤ، جو چیز سب مسلمانوں کو میسر نہیں میرے لئے اس کا کھانا کیسے درست ہے۔" پھر حضرت عتبہ کو پُر عتاب خط لکھا ہے جس میں سادہ زندگی کے متعلق ہدایات کیں۔ (ستر ستارے۔ طالب الہاشمی ص۲۱۳)

واقعہ: حضرت حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو ان کے زمانہ خلافت میں دیکھا کہ مسجد میں لیٹے ہوئے تھے۔ اور سنگ ریزوں کے نشانات پہلو میں بن گئے تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ امیر المؤمنین ہیں اور اس حالت میں رہتے ہیں۔ (خلفاء راشدین مولانا عبدالشکور ص۱۷۵)

واقعہ: ایک مرتبہ حضرت امیر معاویہؓ نے حضرت ضرار اسدیؓ سے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اصحاب میں سے تھے درخواست کی کہ اے ضرار حضرت علیؓ کے کچھ اوصاف بیان کرو۔ انہوں نے بہت سے اوصاف بیان کئے اور کہا کہ "روتے بہت تھے، فکر میں زیادہ رہتے تھے۔ لباس کم قیمت کا پسندیدہ تھا۔ ادنیٰ درجہ کا کھانا مرغوب تھا، اور بہت سے اوصاف بیان کئے۔ (خلفاء راشدین ص۱۹۹)

واقعہ: حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں ملک شام کے گورنر بنائے گئے (ملک شام اس وقت ان چار ملکوں پر مشتمل تھا۔ شام، اردن، فلسطین، لبنان) تو حضرت عمرؓ شام کا معائنہ کرنے کے لئے تشریف لائے اور حضرت ابوعبیدہ کا گھر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی (تاکہ دیکھیں گورنری کے زمانہ میں کہیں مال تو اکٹھا نہیں کر لیا) حضرت ابوعبیدہ آپ کو لے کر چلے جب پورا شہر دمشق گذر گیا تو آخر میں کھجور کے پتّوں کا بنا ہوا ایک جھونپڑا دکھایا۔ آپؓ اندر داخل ہوئے تو چاروں طرف سوائے ایک مصلّٰی کے کچھ نظر نہ آیا۔ پھر ابوعبیدہؓ سے سوال کیا کہ یہاں تو کھانے پینے اور سونے وغیرہ کا کچھ بھی نظم نہیں تم یہاں کیسے رہتے ہو۔ جواب دیا کہ امیر المؤمنین یہاں میری ضرورت کے سارے سامان میسّر ہیں۔ اس مصلّٰی پر رات کو نماز پڑھ لیتا ہوں اور اسی پر سو جاتا ہوں۔ پھر اپنا ہاتھ اوپر چھپّر کی طرف بڑھایا اور ایک پیالہ نکالا اور کہا کہ یہ برتن ہے۔ امیر المؤمنین نے وہ برتن دیکھا تو اس میں پانی تھا اور سوکھی روٹی کے کچھ ٹکڑے بھیگے ہوئے تھے۔ پھر عرض کیا کہ امیر المؤمنین امور حکومت سے فرصت نہیں ہوتی، ایک خاتون دو تین دن کی روٹی ایک وقت میں پکا دیتی ہے۔ جب وہ سوکھ جاتی ہے تو اس کو پانی میں بھگو دیتا ہوں اور رات میں سوتے وقت کھا لیتا ہوں۔

(سیر اعلام النبلاء ص۔ بحوالہ اصلاحی خطبات مفتی تقی عثمانی ص۱۱۱ ج ۳)

یہ تھی مذہب اسلام کی معاشرتی زندگی کے سلسلہ میں بہت مختصر سی تعلیم اور اسلامی حکام کے معاشرتی زندگی کے واقعات کی ایک جھلک۔ اگر ان تعلیمات کا اور اس طرح کے واقعات کا احاطہ کیا جائے تو یقیناً ایک دفتر بھی ناکافی ہوگا۔ جاہلی اور اس کے مشابہ دنیا اور اسلامی دنیا میں یہی فرق ہے۔

حاصل معروضات

کلام کا مختصر سا حاصل یہ ہے کہ یہ دنیا دارالامتحان والمحن ہے۔ نیز یہ دنیا اللہ تعالیٰ کی نظر میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ اس کی وقعت ایک مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں جیسا کہ حدیث میں ہے (ترمذی ص۲/۵۶) اور یہ دنیا کھیل کود اور دھوکے کا سامان ہے (سورۂ حدید آیت ۲۰)

لہٰذا اللہ تعالیٰ کی رضا اگر حاصل کرنی ہے جو مالک کون ومکان ہے اور اس کے عذاب سے بچنا ہے تو اس دنیائے دوں کے محبوب ومطلوب نہ ہو۔ اور آخرت جو اصل زندگی ہے اس کی اصل فکر ہونی چاہئے۔ اور اپنی دوڑ دھوپ اور فکر وسعی بس آخرت کے لئے ہو اور دنیا سے اس کا تعلق صرف ناگزیر ضرورت کے بقدر ہو۔ اور اس کے قلب مؤمن کی صدا یہ ہو۔ ع

باخدا داریم کار و باخلائق کار نیست

اللہ تعالیٰ اپنے فضل ورحمت اور اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں اس پر عمل کی توفیق نصیب فرمائے۔ (آمین)۔
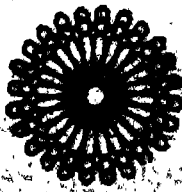
مسلم ریاست قازقستان میں

قادیانیت کا تعاقب

عبدالرحمٰن باوا ـــــــــــــــــــ دفتر ختم نبوت لندن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

قادیانی سربراہ مرزا طاہر نے قادیانی سالانہ جلسہ یوکے مورخہ ۲۹ جولائی ۹۵ء سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "سابقہ سوویت یونین سے آزاد ہونے والی مسلم ریاستوں میں قادیانیت کا نفوذ ہو رہا ہے اور اس جلسہ میں ۲۵ افراد پر مشتمل قازقستان کا بھرپور وفد آیا ہے۔ ایک شخص کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ وہاں آبائی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آبائی تحریک کے سربراہ کے غالباً پڑپوتے ہیں۔ ان کا وہاں رسوخ ہے۔ آبائی تقریب کے سلسلے میں جب قازقستان کے صدر یہاں تشریف لائے تھے تو یہ بھی شامل تھے۔" اس کے علاوہ قازقستان سے مسلسل ایسی اطلاعات مل رہی تھیں کہ وہاں قادیانیوں نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دی ہیں اور منظم منصوبے کے تحت مسلمانوں کو مرتد بنانا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے تمام وسائل بروئے کار لائے گئے یہاں تک کہ وہاں کے لوگوں پر اپنی تجوریوں کے دروازے کھول دیئے گئے۔

قادیانیوں نے ہمیشہ عیسائی مشینری کی طرح اپنے مذہب کے فروغ کے لئے زن، زر کا ہتھیار استعمال کیا۔ اس کی تصدیق ایک جگہ سے نہیں، بار بار کئی جگہ سے ہوئی ہے۔ بہرحال حالات کا جائزہ لینے نیز قازقستان کے مسلمانوں تک اسلام کا صحیح پیغام پہنچانے اور ان کو عقیدہ ختم نبوت وقادیانیت کے کفریہ عقائد اور ان کی اسلام دشمن سرگرمیوں سے باخبر کرنے کے لئے قازقستان سفر کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت نے ہمیشہ سے مسلم امت کی اس سلسلے میں راہ نمائی کی ہے۔ قادیانیت نے جہاں بھی جڑ پکڑنے کی کوشش کی، چاہے اندرون ملک ہو یا بیرون ملک ہر جگہ

صرف ان کا تعاقب کیا بلکہ اس کے سد باب کے لئے کوششیں کیں۔ اس کی مثالیں موجود ہیں۔ جمہوریہ مالی میں جب وہاں کے ۳۰ ہزار مسلمانوں کو دھوکہ سے قادیانی بنالیا گیا تو پھر فوری طور پر سفر کیا گیا۔ وہاں پہنچ کر وہاں کے مسلمانوں کو ان کے ارتدادی وزندیقانہ عقائد سے آگاہ کیا گیا جس کے نتیجہ میں وہ تمام مسلمان جو قادیانی بن گئے تھے بفضلہ تعالیٰ قادیانیت سے توبہ کرکے دوبارہ داخل اسلام ہوئے۔ بخارا میں قادیانیوں کو ایک پرانی مسجد کی چابی دی جارہی تھی تو عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کا ایک وفد وہاں گیا اور وہاں کے حکام سے ملاقات کرکے قادیانیت کی حقیقت سے آگاہ کیا تو الحمدللہ قادیانیوں کو مسجد کی چابی نہیں دی گئی۔ اس قسم کے بہت واقعات ہیں طوالت کے خوف سے اسے چھوڑتا ہوں۔ غرضیکہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کی یہ ذمہ داری رہی ہے اور انشاء اللہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہے۔

قازقستان کو آزاد ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا۔ معاشی حالات انتہائی خراب ہیں ذہنی مذہبی و اخلاقی قدریں مٹ گئیں ہیں۔ سینٹرل ایشیاء کی تمام ریاستوں کا حال تقریباً ایک جیسا ہے۔ اگرچہ بعض جگہ علماء کام کررہے ہیں لیکن ان کے پاس وسائل نہیں ہیں۔ روسی جبر واستبداد کے دور میں بھی علماء کرام، اندرون خانہ دین کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے رہے یہی وجہ ہے کہ آج ان ریاستوں میں دین کی جھلک نظر آتی ہے۔ ورنہ عمومی حالات تو یہ ہیں کہ وہاں کے مسلمان اتنا تو جانتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں لیکن بے چارے کلمہ تک پڑھنا نہیں جانتے۔ الماتا شہر میں بسوں اور ٹیکسیوں میں سفر کے دوران لوگوں سے گفتگو کرتے ہوئے کلمہ پڑھایا بعض لوگ پڑھ لیتے اور بعض شرماتے تھے۔ بہت کم لوگ کلمہ پڑھنا جانتے تھے۔ بہر حال یہ ہمارے لئے لمحہ فکریہ ہے۔

قازقستان میں قازقی وروسی بولی اور پڑھی جاتی ہے۔ ان زبانوں میں اسلامی لٹریچر عقائد، عبادات، فقہ، سیرۃ رسول ﷺ کے موضوع پر کتابوں کی ضرورت محسوس کی، صدیقی ٹرسٹ اور جمعیت تعلیم القرآن کراچی نے اگرچہ نماز اور تعلیم الاسلام جیسی کتب کا قازقی وروسی زبان میں ترجمہ کرکے پورے سینٹرل ایشیاء میں پھیلایا ہے لیکن یہ ابھی ناکافی ہے۔ اس سلسلے

میں ایک حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ قازقستان کے ایک ممتاز عالم دین شیخ خلیفہ الطائی جو میرے دائی تھے مجھے بتایا کہ یہاں روسی و قازق زبان میں سیرۃ رسولؐ کے موضوع پر کتاب نہ ہونے کی وجہ سے ایک یہودی نے اس عنوان پر ایک ایسی کتاب شائع کی جو رطب ویابس سے بھری ہوئی ہے اور لوگ اسے خرید رہے ہیں۔ شیخ نے بتایا کہ میں نے ٹی وی و ریڈیو پر اس کتاب کو دکھا کر لوگوں کو خریدنے سے منع کیا لیکن اس کے باوجود وہ کتاب فروخت ہو رہی ہے۔

قازقستان کے دارالحکومت الماتا کے بارے میں مجھے بتایا کہ وہاں تقریباً ۶۰ فی صد مسلمان اور ۴۰ فی صد روسی ہیں۔ یہ شہر بہت بڑا ہے لیکن اندرون شہر، مسجدیں غالباً ۱۰ سے زائد نہیں اور وہ بھی خستہ حالت میں، ان میں ایک دو مسجدیں ایسی ہیں جن میں پنج وقتہ نمازوں کا اہتمام ہے ورنہ صرف صبح اور عشاء کی نماز میں چند لوگ ہوتے ہیں۔ الماتا شہر کی سب سے بڑی مسجد، جو سینٹرل مسجد کہلاتی ہے اور حکومت کی نگرانی میں ہے ابھی زیر تعمیر ہے۔ اس کا حال یہ ہے کہ اتنی بڑی مسجد کی تعمیر میں چند مزدور نظر آئے۔ نہ معلوم وہ کب تک پایہ تکمیل کو پہنچے گی۔ کسی مسجد میں بچوں کا مکتب نہیں ہے۔

یہ وہ حالات ہیں جس کی بناء پر مسلمانوں کی دین سے بے خبری کا فائدہ اٹھا کر عیسائی، یہودی، ہندو اور قادیانی، مسلمانوں کو تر نوالہ سمجھ کر اس کا شکار کر رہے ہیں۔ وہاں غربت بھی ہے اور غربت تو انسان کو ہر کام کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

قادیانیوں نے سب سے پہلے ایک ایسے شخص پر ہاتھ ڈالا جو ایک شاعر اور ملک کے صدر کا کلچرل مشیر ہے اس کا نام رولینڈ سکشیبن بائی ہے۔ اس کو اپنی کتاب شائع کرنے کے لئے قادیانیوں نے بڑی رقم دی۔ اس شخص نے کتاب کے آخر میں قادیانی مذہب کے سچا ہونے کا اعلان کیا۔

میں نے قازقستان کا سفر اکتوبر کے آخری ہفتہ میں کیا۔ اپنے قیام کے دوران قازقستان کے ممتاز عالم دین، شیخ خلیفہ الطائی، ورلڈ ایسوسی ایشن آف قازق کے نائب صدر سلطان علی بلغابائف، قازقستان میں پاکستان کے سفیر عزت مآب جناب سلطان حیات خان، قازقستان

حکومت کے مذہبی امور کے رئیس ڈاکٹر بختیار عثمانوف کے علاوہ الماتا کے ائمہ مساجد، دینی تنظیموں کے رہنماؤں، دانشوروں، صحافیوں، ٹیچروں، قازق زبان کے ہفتہ روزہ اخبار ترکستان کے مدیر، اور قازقستان میں مقیم پاکستانی تاجروں و قازق شہریوں سے ملاقات کر کے ان کو اسلام، عقیدہ ختم نبوت، اور قادیانی فتنہ کے بارے میں ملت اسلامیہ کا موقف پیش کیا اور ان کو بتایا کہ قادیانیت کے بارے میں، مسلمان کتنے حساس ہیں، انہیں یہ بھی بتایا کہ پوری ملت اسلامیہ، قادیانیوں کو خارج از اسلام قرار دیتی ہے۔ اسی لئے حرمین شریفین میں ان کا داخلہ ممنوع ہے۔ رابطہ عالم اسلامی نے ۱۹۷۴ء کے اپنے ایک اجلاس میں مسلم ممالک پر زور دیا تھا کہ قادیانیوں کو اپنے اپنے ملکوں میں غیر مسلم اقلیت قرار دیں۔ مجمع الفقہ الاسلامی نے بھی ۱۹۸۵ء میں قادیانیت کو کفر قرار دیا۔ حکومت پاکستان نے بھی ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء میں قادیانیوں کے غیر مسلم اقلیت ہونے کا اعلان کیا اور ۱۹۸۴ء میں ان کی غیر اسلامی سرگرمیوں پر پابندی لگائی۔ میں نے ان تمام حضرات کے سامنے قازقستان میں قادیانی سرگرمیوں پر اپنی گہری تشویش کا اظہار کیا اور بتایا کہ پوری مسلم امت قازقستان میں قادیانی مسئلہ پر کتنی متفکر ہے۔ ان سے درخواست کی گئی کہ ملت اسلامیہ کے یہ جذبات حکومت تک اور قازقستان کے صدر تک پہنچائیں۔ میری ان گذارشات پر شیخ خلیفہ الطائی نے کہا کہ فکر کی بات نہیں جونہی یہاں کے مسلمانوں پر قادیانیت کی اصلیت ظاہر ہو جائے گی یہاں کے مسلمان اسے پنپنے نہیں دیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ یہاں کے مسلمانوں میں دینی و مذہبی شعور پیدا کیا جائے اور انہیں اسلامی تعلیمات سے آراستہ کیا جائے۔ صحیح اسلامی لٹریچر مہیا کیا جائے تاکہ وہ حق و باطل میں تمیز کر سکیں۔ اس سلسلے میں، میں نے انہیں یقین دلایا کہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ہر ممکن تعاون کرے گی اور قازقی و روسی زبان میں عقیدہ ختم نبوت و قادیانیت کے موضوع پر لٹریچر تیار کرے گی۔ مذہبی امور کے رئیس ڈاکٹر بختیار نے کہا کہ میں نے اس سلسلے میں کچھ اقدامات کئے ہیں اور قادیانی سرگرمیوں پر گہری نظر ہے اور حکومت کو قادیانیت کے سلسلے میں شرعی نکتہ کی بنیاد پر تجاویز مرتب کر کے دوں گا۔ اس کے علاوہ ان سے مفصل گفتگو ہوئی۔ ڈاکٹر موصوف عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کی خدمات پر خراج تحسین پیش کیا اور

(بقیہ صــ پر)